خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
مارچ 2014
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پسِ زنداں
طاہر جاوید مغل کے فسوں خیز اور تحیر انگیز قلم سے
ایک طویل کہانی

سسپنس ڈائجسٹ
مدیر اعلیٰ: عذرا رسول

CPNE — MEMBER APNS

جلد 44 • شمارہ 03 مارچ 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

"بے معنی"

تم دیکھ رہے ہو کہ انسانوں نے انسانیت کی طرف سے کس طرح آنکھیں پھیر لی ہیں۔ محبت ہماری بستیوں میں کس طرح نایاب ہوگئی ہے۔ ہر طرف نفرت کا دور دورہ ہے۔ نفرت کے جو مناظر ہم نے اپنے دور میں دیکھے ہیں، انہوں نے انسانیت کی نگاہیں نیچی کردی ہیں۔ سیاست نے کیا کیا؟ زندگی کے خلاف فقط سازشیں کیں۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ زندگی حرام ہو کر رہ گئی ہے۔ غرض مند علم نے کیا فرض انجام دیا؟ جہل کے حوصلے بڑھائے۔ اس کا فیضان یہ ہے کہ لوگ بدی کے نئے نئے گر سیکھ گئے ہیں۔

ہمارے مدبر بے تدبیری میں طاق اور مشاق ہیں۔ سن لو! وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں جو غریبوں، سادہ لوحوں اور مظلوموں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا دشمن بنادیں۔ یہ لسانی، علاقائی اور مذہبی تفرقہ کیوں پیدا کیا جارہا ہے؟ اس لیے کہ مظلوم اور محروم آپس میں ٹکرا جائیں اور ظالم اور غاصب تماشا دیکھیں۔ یہی ان کا تدبر ہے اور یہی ان کی حکمت۔

سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ تعصب کے سب سے بڑے وکیل ہیں۔ اگر یہ لوگ فریب کار نہیں ہیں تو یقیناً فریب خوردہ ہیں۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ اس ملک میں جتنی نفرتیں پھیلائی ہیں، وہ پڑھے لکھے لوگوں ہی نے پھیلائی ہیں۔ یہاں پڑھا لکھا ہونا اور متعصب ہونا، دونوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ علم نے جہل کو جس گرم جوشی کے ساتھ اپنے سینے سے لگا رکھا ہے، وہ ہمارے زمانے کا ایک طرفہ ماجرا ہے۔

تم ان لوگوں سے بات کرو جو پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ اگر انہیں بری طرح بہکانہ دیا گیا ہو تو پھر تم دیکھو گے کہ نہ ان میں زبان کا تعصب ہے اور نہ علاقے کا۔ اگر انہیں کسی پر غصہ آئے گا یا کسی وجہ سے نفرت کریں گے تو وہ اپنے غصے اور نفرت کے حق میں کوئی فلسفہ نہیں گھڑیں گے۔ ان کی نفرت اس شخص کی ذات سے آگے نہیں بڑھے گی جس سے انہیں کوئی اذیت پہنچی ہو مگر یہ پڑھے لکھے لوگ اپنی نفرت اور غصے کو ایک منطق اور فلسفہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ مفسدانہ کلیے بناتے ہیں اور گروہوں کے درمیان مستقل فتنے پھیلاتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کی زبان سے اس قسم کے مقولے سننے کو ملتے ہیں کہ ہر فلاں تعصبی ہوتا ہے...... فلاں شر پسند ہوتا ہے۔ اس قسم کے بے رحمانہ کلیے صرف چند مثالوں کو سامنے رکھ کر بڑی شانتی اور نہایت بے حسی اور بے شرمی کے ساتھ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں پر تھوپ دیے جاتے ہیں۔

آج کل ان "حکیمانہ کلیوں" اور "دانش مندانہ مقولوں" کی سماعتوں کے بازاروں میں بڑی مانگ ہے۔ لوگ یہ کلیے اور مقولے تحفے کے طور پر ایک دوسرے کی سماعت کو پیش کرتے ہیں۔ زہر ہے کہ پھیل رہا ہے، نفرتیں ہیں کہ بڑھ رہی ہیں۔ عقل دیوانی ہوگئی ہے اور دماغ ماؤف اور دانش بے دانشی کے چبوترے پر بیٹھی ہوئی بکواس کررہی ہے۔ سمجھا جائے کہ ہم تاریخ کے جس دور سے گزر رہے ہیں، وہاں خود غرض اور مطلبی طبقے اس قسم کے شوشے اٹھایا کرتے ہیں اس طرح کے اشغلے چھوڑا کرتے ہیں ورنہ تم خود سوچو کہ زبانوں، تہذیبوں اور علاقوں کے درمیان بھلا کیا جھگڑا ہے۔ آخر اس بات کے کیا معنی ہیں کہ میں فلاں گروہ سے اس لیے نفرت کرنے لگوں کہ وہ ایک خاص زبان بولتا ہے اور ایک خاص گرد و پیش سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہر گروہ کو اپنے گروہ کے سوا ہر گروہ کا دشمن ہونا چاہیے۔ یہ کتنی مجنونانہ بات ہے اور کتنی بے معنی ہے سنو کہ ہمیں اس بات کو اور ایسی ہی باتوں کو سختی سے رد کرنا ہے

محترم قارئین

تسلیمات!

مارچ 2014ء کا سسپنس آپ کے زیر نظر ہے۔ وقت کی تیز رفتاری نے ذہنوں کو کچھ اس طرح متاثر کر دیا ہے کہ جانے والے دنوں کی یاد بھی نہیں ہو پاتی کہ آنے والے ماہ و سال دبے قدموں آکر گزر جاتے ہیں۔ جیسے 23 مارچ 2013ء گویا کل ہی کی بات لگتی ہے اور اب 2014ء میں 23 مارچ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ معلوم نہیں کہ وقت کی بساط جلد لپٹ رہی ہے یا عہد حاضر کی افتاد ہی کسی یاد کو دیرپا نہیں رہنے دیتیں۔ 23 مارچ یعنی قرارداد پاکستان کا دن تاریخ کے ایک خوب صورت انقلاب کا حوالہ مگر وہ جوش و خروش اب بغاوتوں کی شوریدہ سری میں کہیں دبتا چلا جا رہا ہے۔ وحشت اور لاقانونیت کے اس دور میں بے قراری اور بے دادرسی نے کچھ اس طرح گھیر لیا ہے کہ ہر آنکھ میں بے یقینی اور خوف و ہراس کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق بوسنیا میں بے روزگاری کے باعث ہنگامے، احتجاج اور متعلقہ حکمرانوں سے مستعفی ہونے کا مطالبہ آج کل زوروں پر ہے...... اگرچہ یہ کوئی ایسی چونکانے والی بات تو نہیں مگر ایک نکتہ ضرور قابل غور ہے کہ عوام میں اتنا شعور ہے کہ اپنے جائز حق اور قومی مسئلے کے لیے مناسب احتجاج کا مناسب رستہ اختیار کیا جائے...... یہی قوم کا مثبت عمل ہے جبکہ ہمارے ہاں احتجاج، دھرنوں اور مطالبوں کی ایک طویل فہرست ہے مگر نتائج صفر کیونکہ جب مقاصد فرقہ واریت اور مفاد پرستی پر مبنی ہوں تو اتفاق نہیں ہوتا۔ کبھی مہنگائی اور ادویات کے نرخوں میں بے جا اضافے پر کوئی احتجاجی مظاہرہ نہیں ہوتا جو انسانی جانوں سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ جب نفسیاتی مریض اساتذہ کے روپ میں معصوم بچوں پر ظلم ڈھاتے ہیں تو کوئی آواز نہیں اٹھاتا...... جیسا کہ پچھلے دنوں ایک چھ سالہ معصوم بچی کو ٹیچر نے دیر سے آنے پر اتنا تشدد کا نشانہ بنایا کہ جسم پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے اور ناک کی ہڈی تک ٹوٹ گئی...... بااختیار طبقہ صرف ایک لمحے کو یہ سوچ کہ ہم اپنی نئی نسل کو کیا دے رہے ہیں تو شاید کسی مثبت تبدیلی کی امید کی جا سکے۔ بہرحال امید کا دامن کسی بھی حال میں ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ امید ہے تو آنے والا کل ہماری زندگی کا حصہ ہے...... حصہ تو ہم اپنی اس نٹ کھٹ محفل کا بھی ہیں جو اب بھی پیار محبت اور اتفاق کی پیامبر ہے۔ جہاں اب بھی چاہتوں کی اقدار باقی ہیں...... تو چلیے جناب دیر کس بات کی۔

✠ **محمد جاوید**، تحصیل علی پور سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”بالی عمریا 16 سالہ چٹکتی ہوئی کلی نے زرق برق 16 سنگھار پر 16 گھنٹے صرف کر کے ماہ دولت حسن شناس سے 16 بار پوچھ چکی ہے کہ میں کیسی لگ رہی ہوں۔ ہم نے بھی اکتا کے کمال فیاضی کہہ دیا، ٹھیک لگ رہی ہو۔ گلستان ادب سے پہلے چاند ستاروں کی بزم سسپنس کلب میں انٹری دیتے ہیں۔ محترم ہم ویلنٹائن جیسے خرافات تہوار نہیں مناتے اگر ہم اچھے ہیں تو ہمارا ہر دن محبتوں چاہتوں کا دن ہے (ویری گڈ) نعیم صاحب کا محبت نامہ اس لائق تھا کہ آسمان پر چاند کی طرح ٹانک دیا جائے۔ ٹماٹر سستے ہو گئے ہیں پڑھ کر قسم سے خوشی سے آنسو آ گئے۔ کیوٹ بے بی شہلا گل بے مروت آپ کا 99 فیصد سچ ہمیں بے حد و حساب پسند آیا۔ سید اکبر شاہ اینڈ ہارون رشید کے سرخ رخساروں پر برادرانہ پیار کرنے کے بعد اویس احمد خان ہم مکافات کے انجام سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہماری شیریں سرائیکی میں ہر زبان خاص و عام پر مثل مشہور ہے کہ ماں مارتی تو ہے مگر مارنے نہیں دیتی۔ نیازی صاحب آپ کی بات بجا مگر اظہار رائے اور بے کار رائے میں بھی فرق محسوس کرنا چاہیے۔ میرے ہم نام میرے شہر کے باسی محمد جاوید شبیر آپ کا قلم میرے لیے ہمیشہ گونگا کیوں رہتا ہے؟ قیصر گوا چاچا کو میرے بارے میں سوتے ہوئے پایا ظاہر ہے پھر جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ قیصر گوا چاچا صاحب ایسے ہی سوتے رہو گے تو ہمیشہ کھوتے ہی رہو گے۔ عائل مستانہ دیوانہ میڈم مہرین بہت اچھی خاتون ہیں اور اب تیری میری تیری پکی گواہی کے بعد میڈم مہرین کی جنت کی ٹکٹ تو پکی ہی سمجھیں۔ میڈم مہرین صاحبہ اگر آپ کے...... وہ...... آپ کی لن ترانیاں پڑھ لیں تو سمجھو آپ کو تو چھکا پکا۔ بشریٰ افضل آپ ایک اور ایک ایک بارہ کے چکر میں پڑی رہیں ادھر قلمی مخالفوں نے سعدیہ بخاری کو سعدیہ بے چاری بنا کے رکھ دیا۔ متین سلطان جس کھیت کی تم مولی ہو اس کھیت میں ہل ہم نے چلائے ہیں۔ بیج ہم نے بویا ہے پانی ہم نے دیا ہے تم اپنے پوپلے تو تلے منہ سے ہمیں کیا سمجھاؤ گے؟ زویا اعجاز آپ پر بے وقوف قیصر گوا چاچا کے پوچھے گئے بے تکے سوال کا جواب فرض نہیں بنتا ایک ان پڑھ ٹیچر سے ایسے ہی بے تکے سوال کی امید کی جا سکتی ہے۔ بابر عباس کیا کالی زبان پائی ہے آپ نے ادھر کہا اور ادھر کشکول ختم۔ گلستان ادب سے سب سے پہلے محی الدین نواب کی ماروی کا مطالعہ کیا۔ حسن بذات خود عورت کا بہت بڑا دشمن ہوتا ہے ایک انار سو بیمار من کی مورت ماروی مرا دیا۔ مجوبہ معلوم نہیں کس کس کے من کی مراد بن کر من کے محل کی ملکہ بنتی ہے۔ کشکول لاسٹ اپی سوڈ میں انڈر ورلڈ ڈان شیخ حامد نے اپنا فیصلہ خود کر کے ثابت کر دیا۔ ڈان ڈان ہے باقی تو سب ڈاؤن ہیں۔ فخر پنجاب پولیس دراز قامت ریٹائرڈ ڈی ایس پی نے دہرے قتل کے کیس کو محض 72 گھنٹوں میں چٹکیوں میں حل کر کے ریکارڈ قائم کیا۔ عقدہ کے تمام کردار اپنی اپنی جگہ پر قصوروار تھے۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی اندھیر اپڑھ کر آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا جہاں انسان ہوتے ہیں وہاں چند شیطان صفت بھی ہوتے ہیں۔ بے داغ منصوبہ میں اول و آخر تک ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ستارے رقص کرتے رہے۔ سلسلۂ درس و تدریس نے قلب کو خوب منور کیا۔ اللہ جان ضیا تسنیم بلگرامی کی لحد کو جنت کے پھولوں سے بھر دیں جن کے قلم سے ہمیشہ ایمان افروز چشمے پھوٹتے رہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے محفل مشاعرہ میں ہمیں اپنی تخلیق اپنا شعر ہی شیر لگا۔ تاریخ کا جھروکے عبرت اثر بے اقتدار کی آخری شمع عیش و مستی میں ڈوبے بادشاہ کی نااہلی کے باعث بجھ گئی۔ ایسی شمع جس کی روشنی سے خلق خدا مستفید نہ ہو بجھ جانا ہی بہتر ہے۔ کاشف زبیر کے ترجمے کمال و باجمال ہوتے ہیں تندرستی صحت کے بعد آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ چند غالب حکمرانوں کے

ساتھ آزادی کی جدوجہد کامیاب رہی نہایت عقل امندی سے عقل مندوں سے چھٹکارا پا لیا گیا اس موقع پر حضرت عمر فاروقؓ کا فرمان یاد پڑتا ہے تم نے انسانوں کو کب سے غلام سمجھ لیا...... حالانکہ ان کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا۔ ثمر عباس کی جواری بھی بے ثمر نہ رہی گو کہ جوا کسی کا نہ ہوا پھر بھی جواری میدان پر میدان مارتا جا رہا ہے۔ کائنات مریم اینڈ جانوی دیوی، حوریہ علی، مروت نیازی مردان، طارق خان مانسہرہ ویلکم ٹو سسپنس کلب۔ ارے رے رے ڈاکٹر نعیم بھیا سنیے تو ٹماٹر تو سستے ہو گئے ہیں مگر ٹنڈے اور کریلے مہنگے ہو گئے ہیں۔“ (جی اب عوام کو اس کی فکر مار دے گی)

✠ **آبشار احمد**، ملیانی سے تشریف لا رہے ہیں ”جی جناب ہم دوسری بار حاضر ہوئے ہیں۔ پہلی بار تو خط کو اتنی بے دردی سے ردی کی ٹوکری میں پھینکا گیا کہ ہمارا نام تو ان لوگوں میں بھی شامل نہ تھا جن کے خطوط شائع نہیں ہوئے (اب تو آپ خوش ہیں ناں) سرورق کافی پسند آیا۔ ایک بات کلیئر کرتا چلوں کہ ڈائجسٹ پڑھ پڑھ کے اب ہم اتنے ذہین ہو چکے ہیں کہ تحریروں کے نام سے ہی ہمیں بہت کچھ پتا چل جاتا ہے کہ یہ کیسی ہے۔ باقی رہی بات پسند اور ناپسند کی تو وہ بھی ایک ہی بات میں ساری وضاحت کرنا چاہوں گا کہ ہر کسی کی اپنی نیچر ہوتی ہے ورنہ کوئی رائٹر یہ نہیں سوچتا کہ اس کی اسٹوری کی تعریف نہیں کی جائے گی۔ ہر رائٹر لفظوں کے اتار چڑھاؤ سے کہانی کو نہ صرف چار چاند لگا دیتا ہے بلکہ ایسی سچویشن کری ایٹ کرتا ہے کہ سسپنس کے مارے رات کو نیند نہیں آتی۔ بس یہی کہنا چاہوں گا کہ ہر ایک اسٹوری موسٹ بیوٹی فل تھی، ہر تحریر گڈ گڈ اینڈ ویری ویری گڈ تھی۔ ایک ریکوئسٹ ہے کہ پلیز اپنے شمارے میں کسی کا انٹرویو بھی شائع کیا کریں۔“

✠ **ڈاکٹر نعیم اکبر**، مانسہرہ سے محفل کی زینت بنے ہیں ”نائٹل گرل کیا کہوں کچھ سونے کے زیورات سے پیلی ہو رہی تھی اوپر سے یرقان کی پیلاہٹ بھی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ خاتون تو جیسی بھی تھی خیر! خاتون کا ہاتھ غلطی سے ذاکر چچا نے مردانہ بنا دیا۔ سرورق کیا تھا خوش خبری تھی بھئی۔ پس زنداں! محترم طاہر جاوید مغل صاحب کے قلم کا اعجاز ہے جو سسپنس کو جگمگاہٹ عطا کر رہا ہے۔ اسی سے شروعات ہوئی۔ ہادی صاحب کی انٹری بطور ہیرو ہمارے خوابوں کی سرزمین وینس میں ہوئی۔ کہانی شروع ہی سے تیز رفتار ہے۔ ہیروئن بھی مل گئی۔ علیزا باسط جس کی خوبی چمکتی پیشانی اور جگمگاتی مسکراہٹ ہے۔ مغل صاحب خواتین کی بعض عام سی باتوں کو خصوصیت عطا کرنے کے ماہر ہیں۔ مغل صاحب کی تمام ہیروئنز کسی نہ کسی خوبی میں کامل ہوتی ہیں۔ پس زنداں کی پہلی قسط تیز ترین تعارف کی بہترین مثال ہے۔ مغل صاحب تک میرا پیغام پہنچا دیں کہ وہ ہیروئن میں جو خوبیاں بیان کرتے ہیں وہ خوبیاں میں اپنے دل سے قریب خاتون میں کھوجتا ہوں تو کچھ زائد ہی پاتا ہوں۔ معلوم نہیں یہ میرا حسن نظر ہوتا ہے، حسن ظن ہوتا ہے یا حسن زن ہوتا ہے یا پھر مغل صاحب کی طلسماتی تحریر کا جادو ہوتا ہے۔ انکل پچھلے خط میں بھی شکایت کی تھی کہ فہرست کے دائیں بائیں چڑیلیں دیکھ کر رسالہ ہاتھوں سے گر گیا تھا۔ اس مرتبہ تو میں خود گر گیا۔ اس مرتبہ کی مخلوق دیکھ کر سابقہ ماہ والی چڑیلیں تو حور پریاں لگتی ہیں۔ جون ایلیا مشاعرہ برپا کیے بیٹھے تھے۔ لہٰذا ہم آہستہ سے آگے کھسک گئے اور خطوط کی محفل میں جا پہنچے۔ آپ نے جگہ دی، تخت ماہانہ کی تاجپوشی کے لیے ہمیں نامزد کیا بہت مشکور ہوں۔ شکریہ گل! آپ نے ہمیں بھائی بنایا بھائی سمجھا۔ ہم رشتے نبھانے والے لوگ ہیں آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ عائل سائیں مستانہ بے پروا کی انٹری اچھی لگی۔ سائیں جی! آپ کا نام سوا گز لمبا ہے۔ ہم نے اختصار کی چھری سے سائیں جی کر دیا ہے امید ہے کہ مائنڈ نہیں فرمائیں گے۔ محمد ہمایوں ہنولی کی تجویز سے میں اتفاق کرتا ہوں۔ بلکہ ہماری محفل میں خواتین کا گزر نہ ہوتا تو ہم پڑھنے والوں کے تعارف کا بھی مطالبہ کرتے کہ ہر ماہ کسی نہ کسی قاری کا باتصویر تعارف شائع ہو وہ بھی اول نمبر پر۔ تاریخ کے عبرت ناک نظاروں کے ساتھ الیاس سیتاپوری آخری شمع لے کر آئے۔ غیاث الدین بلبن ایک شاندار بادشاہ اور اس کا نالائق پوتا کیقباد ہوس کا مارا نالائق خود بھی گیا اور خاندان کا نام بھی ڈبو دیا۔ کاشف زبیر صاحب کی چھٹکارا ایک چٹخارا تحریر تھی۔ ہم نے بھی ایسے ہی خوابوں کی جنت سجائی تھی۔ صد شکر کہ کاشف صاحب نے ہمیں بتلا دیا کہ اس جنت میں بھی سرمایہ دار کی صورت میں شیطان ہیں۔ ملک صفدر حیات صاحب سے گزارش ہے کہ وہ کیا چیز تھی آپ کے پاس جو آپ کو احساس ذمہ داری عطا کرتی تھی۔ اگر بازار سے دستیاب ہو تو ہمارے پاکستان کے محکمۂ پولیس کو ضرور خرید کر دے دیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی اندھیر اپڑھ کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ پاکستان سے محبت کرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک۔ محی الدین نواب صاحب کی ماروی ابھی تک تعارفی دائرے میں چکرا رہی ہے۔ سر پیر کچھ معلوم نہیں ہو رہا۔ ماروی باہر نکلے۔ پھر پتا چلے گا سیاست دان کی سیاست کا۔ وڈیرے کے جور و ستم کا۔ زردار کے زر کی طاقت کا اور کمزور عوام کی ہمت کا۔ ابھی تک سب ہی جال بچھا کر منتظر بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب ”چال“ کے ساتھ آخری صفحات پر جلوہ افروز تھے۔ ماشاء اللہ شاندار کہانی تھی۔ میں مختصر تبصرہ کرتا ہوں کہ چال میں مبارک احمد جو صفیہ کے شوہر ہیں۔ اس کہانی میں اس شخص کے کردار نے روح ڈال دی ہے۔ مبارک احمد نے صفیہ سلطانہ کے ماضی اور ماضی کی غلطیوں کو نہ صرف معاف کیا بلکہ اس کی مدد بھی کی۔ درحقیقت یہی ”مردانہ کردار“ ہے ورنہ کلہاڑی سے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے، گولی سے اڑا دینے والے اور تین لفظ کہہ کر اپنی زندگیوں سے نکال دینے والے کردار قدم قدم پر ملتے بھی ہیں۔“

✠ **راجا راحیل**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے حاضر ہوئے ہیں ”سب سے پہلے تو معراج صاحب نگران اعلیٰ سسپنس ڈائجسٹ سے خفگی کا اظہار کروں گا کہ انہوں نے جنوری کے ڈائجسٹ میں میرا خط شائع نہ کیا۔ (خفا ہو کر کیا ملے گا...... پہلے یہ بتاؤ) جنوری 2014ء کا شمارہ 7 جنوری کو سیشن عدالت میں اپنے والد سے وصول کیا۔ اس کے بعد جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا، دنیا اسی امید پر قائم ہے۔ اور اسی امید کے سہارے انسان مہد سے لحد تک سفر کرتا ہے۔ خطوط کی محفل میں بلیک کیٹ آف بلدیہ کراچی کرسی صدارت پر براجمان نظر آئیں۔ رانا منشی حماد فریاد آف ساہیوال جیل میری رب سے دعا ہے کہ خدا کی ذات آپ کو اس قید خانہ سے رہائی دلوائے۔ سب سے پہلے کشکول پڑھی۔ شاہ جی کی بیوی گل بی بی کا کردار پسند آیا کہ اس نے شاہ جی کو بڑے ہوتے ہوئے بھی قبول کیا۔ میڈم روبی نے .D.I.G سے شادی کر کے سچے پیار کا ثبوت دیا۔ ماروی کہانی کے خالق، ادارے کے پرانے رفیق کار اور مصنف محی الدین نواب کی اہلیہ کے انتقال کا دلی رنج ہوا۔ خدا انہیں جنت میں جگہ دے۔ ماروی کی کہانی پڑھی۔ مجبوب چانڈیو ماروی پر احسانات کی بارش کیے جا رہا ہے اور ماروی کی حفاظت کی خاطر رحمت جلالی پر گولی چلوائی۔ دوسری طرف معروف جگی مجبوب چانڈیو کے کاروبار کو بچانے اور ماروی اور مجبوب کو ملوانے کے لیے پتا نہیں کیا سوچ بیٹھا ہے۔ محفل شعر و سخن میں ہارون رشید اور ڈاکٹر ناہید شیخ کے اشعار اچھے لگے۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے کیونکہ میں قسط وار کہانیاں زیادہ پڑھتا ہوں۔“

ابرار وارث، سندیلیانوالی سے چلے آرہے ہیں ”فروری 2014ء کا شمارہ پورے 4دن لیٹ ملا۔ جتنا شدت سے انتظار تھا اس سے بڑھ کر صبر کرنا پڑا۔ سب سے پہلے سرورق پر نظر پڑی تو ہنسی نکل گئی۔ ڈاکر انکل جی یہ کیا مہرین ناز کو ہی سرورق پر بٹھاتا تھا، خیر مبارک ہو مہرین آپا ارے اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں کاربن کاپی ہے آپ کی، جلدی سے ”مشاعرہ“ پہ نظر ڈالی۔ ایک ایک لفظ سچائی سے بھرا تھا جون ایلیا کا، خطوط کی محفل میں ڈاکٹر نعیم اکبر کو کرسی صدارت پر دیکھا۔ ان کا تبصرہ شاندار تھا جتیں بڑی آتی ہیں آپ کو ڈاکٹری کے ساتھ...... ہے نا؟ اکبر شاہ مبارک ہو آپ کا تبصرہ بھی شامل ہے اب دل لگا کے محنت کرو...... پڑھائی میں یار...... قدرت اللہ نیازی حیرت ہے آپ کو ہر دفعہ اٹھارہ کے نزدیک شمارہ کیسے مل جاتا ہے۔ عروہ خان آپ کی بابر عباس والی بات سے ہم Agree ہیں اس دفعہ تو بے چارہ بلیک لسٹ میں تھا۔ اپنا خط دیکھ کراتنی خوشی ہوئی کہ بیان نہیں۔ اللہ جی سسپنس ٹیم کو ہمیشہ کامیابیاں ہی دے (آمین) تہمین سلطان کا خط زبردست تھا بڑا عجیب انداز تحریر ہے رضوان بھائی آپ کا آپ بھی کستوری لگا کے بہت اچھا لکھتے ہیں۔ اعجاز راحیل اور مہرین ناز دونوں بہن بھائی اکٹھے نظر آئے، واہ جی تبصرہ زبردست تھا۔ سسپنس کے باقی افراد سے گزارش ہے کہ پلیز پلیز میری جگہ پر ہی سمی بٹ طاہرہ آپی کا خط ضرور شائع کریں۔ چاہے میرا تبصرہ بلیک لسٹ میں کر دیں۔ سلسلے وار کہانی ”پس زنداں“ طاہر جاوید مغل کی تحریر سے آغاز کیا۔ اٹلی کی اور وینس کی آبی نہروں میں گھما گھما کر ہادی کے ساتھ ہمیں بھی وینس کی گلیوں میں گھومنے کا مزہ آگیا۔ واہ جی کیا طرز تخاطب ہے اتنا پیارا اور اچھوتا انداز بیان یہ صرف جاوید مغل کا ہی خاصا ہے کہانی کی شروعات تو بہت زبردست طریقے سے ہوئی۔ ماروی پڑھی اور حیرت زدہ رہ گیا۔ ماروی کو کون کون اور چاہے گا، محبوب کی دیوانگی پر اس دفعہ مجھے بہت دکھ ہوا۔ مراد پہ غصہ آیا۔ محبوب بہت سچا اور کھرا ثابت ہو رہا ہے لیکن ماروی اس کی کوٹھی سے نکل کر خود موت کے منہ میں جانے والی ہے۔ کاشف زبیر کی سائنسی معلومات اور مجرمانہ سرگرمیوں پر مشتمل چھنکارہ پڑھی۔ ایک دفعہ تو حیرت کے جھٹکے لگے جب یہ پڑھا کہ سب بیماریوں کا علاج ہے لیکن حکمران اعلیٰ اور دوسرے لوگوں نے اسے اتنا مہنگا کر رکھا ہے کہ نچلے طبقے کی رسائی ممکن ہی نہیں اور انسانوں کے کلون بھی بننے لگے تھے کہ ہیرو اور کاشن جیسے عظیم سوچ والے لوگوں نے ہمیشہ کے لیے ایسے لوگوں سے چھنکارہ دلا دیا۔ محفل شعر و سخن میں کوئی شعر قابل ذوق و داد نہیں تھا سب ایویں سے تھے۔ کترنیں بہت مزے کی تھیں، باقی کہانیوں پر تبصرہ سے معذرت رسالہ لیٹ ملنے اور ٹائم کی کمی کی وجہ سے میں کچھ زیادہ نہیں پڑھ سکا۔“

زاہد چودھری، چھور کینٹ سے محفل کی زینت بنے ہیں ”قارئین کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم یہ بھی ہے کہ پبلشر نے جو کچھ شائع کر دیا غنیمت جانا اور چپکے چپکے پڑھ کر چپ رہے، انہی لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں، کافی عرصے سے سسپنس ڈائجسٹ کا عادی نشئی ہوں۔ نشہ کوئی سا بھی ہو آخر بندے کو ذلیل ضرور کراتا ہے۔ اس کا تجربہ دوران ڈیوٹی ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے کافی مرتبہ ہو چکا ہے۔ ہر بار جان بخشی اس وعدے پہ ہوئی کہ آئندہ خیال رکھوں گا۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آپ کا یہ مجبور و مغموم بھتیجا کیا کرے (صبر اور ذمہ داریوں کا احساس بھی) کبھی بہنوں اور بھائیوں کے تبصرے کہانیوں پر اور ایک دوسرے پر بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ جب صنف نازک میرا مطلب نازک اور صنف شجاعت کی آپس میں نوک جھوک ہوتی ہے۔ اچھا لگتا ہے۔ فروری کے شمارے میں، وکٹری اسٹینڈ حاصل کرنے پر ڈاکٹر نعیم اکبر کو بہت مبارک۔ تبصرہ نہایت خوب صورت پیرائے میں لکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ تہمین سلطان، اعجاز احمد راحیل، زویا اعجاز کے تبصرے بھی کافی اچھے لگے۔ سلسلے وار کہانی ماروی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ محبوب علی چانڈیو کا ماروی کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ واقعی اپنے پیارے اور محبوب لوگوں کو اپنے پاس رکھنا اور ان کے کانوں اور چہروں پر کہنا کہ تمہیں ان کی کس قدر ضرورت ہے۔ پس زنداں کی شروعات بڑے اچھے انداز سے ہوئی ہے۔ گو کہانی میں نارسائی، کج ادائی انسانی رویوں کی عکاسی طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریروں میں موجود مماثلت اکثر ہوتی ہے لیکن عظیم تخلیقات اسی طرح کی مشابہت کے ساتھ منظر عام پر آتی ہیں۔ چال میں صارم کی کمینگی کی حد تک بڑھی ہوئی چالاکی اسے لے ڈوبی۔ محفل شعر و سخن میں ثمینہ حبیب، ڈاکٹر ابن شیخ، احمد خان توحیدی کا انتخاب پسند آیا۔“

محمد ہمایوں سعید، بنوں سے تبصرہ کر رہے ہیں ”اللہ کے فضل سے اور والدین کی دعاؤں سے ہم دنیا کے سب سے بڑے دوا ساز ادارے ایبٹ انٹرنیشنل میں بطور پی ایم تعینات ہو گئے۔ اسی سلسلے میں کچھ عرصہ کراچی میں مقیم رہے۔ سرورق پر موجود لڑکی کسی نواب زادی کی بچپن کی سہیلی لگی۔ ڈاکٹر صاحب کا تاثرنامہ غور سے پڑھا۔ جو مریضوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے شماروں پر ریسرچ کر رہے تھے۔ گل مروت کا تبصرہ بھی مروتاً ملاحظہ کیا۔ اکبر شاہ صاحب شاہ رخ نے کالی بلی کا نہیں جنگلی بلیوں کا ذکر کیا تھا۔ ابرار صاحب آپ نے مجھے جذبات سے عاری انسان کیوں کہا۔ تہمین سلطان کا تبصرہ پیارا سا لگا مگر دیکھو ڈیئر! جن کو چچا یا انکل کہہ دیا تو انہیں احترام سے مخاطب کرو۔ اسی طرح آنٹی بھی احتراماً استعمال نہ کر لڑکا۔ اس ماہ کی خاص الخاص بات طاہر جاوید مغل کی کہانی ہے۔ محبتوں اور لافانی جذبوں کے شہنشاہ کو دل کی گہرائیوں سے سلام۔ پس زنداں بھی وینس کی پانیوں پہ چلتی کشتی کی طرح حسین احساسات سموئے ہوئے تھی۔ علیزا کا نام ہی بہت اسپیشل لگا۔ یقیناً یہ کہانی بھی لمبے عرصے تک دلوں پہ حکمرانی کرے گی۔“

فوزیہ، خانیوال سے تشریف لائی ہیں ”میں عرصہ 4 سال سے سسپنس پڑھ رہی ہوں۔ مگر خط لکھنے کا پہلا اتفاق ہے (خوش آمدید) فروری کا شمارہ 22 جنوری کو ہمارے خوب صورت ہاتھوں میں آیا۔ گو کہ سرورق پر لڑکی کا چہرہ مسکراتا ہوا تھا پر کچھ ڈراؤنا سا لگا۔ خطوط کی محفل میں پہلا خط ڈاکٹر نعیم کا تھا۔ اکبر بھائی! فلمیں کم دیکھا کرو۔ قدرت اللہ نیازی بھائی، آپ کا تبصرہ اچھا ہوتا ہے۔ ثمینہ جبیں، بہن جی! اب بلی کے کیا منہ لگنا۔ عروہ باجی! اب بابر عباس انکل کو کھری کھری تو نہ سنائیں آپ۔ مستانہ انکل! سسپنس علاج غم بھی ہے؟ مہرین صاحبہ، ہوا ایسی یا ظاہراً ایسا کرتی ہو؟ چال میں جہانگیر کا جاندار کردار کہانی پر چھایا رہا۔ رچرڈ کی ساری کو دی گئی انوکھی سزا پسند آئی۔ پرویز کا بے داغ منصوبہ اسے لے ڈوبا۔ سری سقطی کے خوردہ فروش ولی کی صورت میں ایمان کو منور کرنے والے واقعات پڑھنے کو ملے۔ مال غنیمت وہ بھی نام کے پیٹ میں، جگہ اچھی سوچی تھی۔ ماروی ابھی تک تو ردھم میں نہیں آسکی۔ آگے کا نواب صاحب کو پتا ہوگا۔ احمد کے گھر والوں

جیسا حشر اس بے حس معاشرے میں اندھیرے کی طرح چھا چکا ہے۔ محفل شعر و سخن کا سلسلہ مجھے بہت پسند ہے۔ جواری نے آخر تک اچھا جوا کھیلا۔ عقدہ میں نوید اور صفدر اپنے حتمی انجام تک پہنچے۔ آزاد معاشرے کی بے راہ روی اور مجرمانہ سرگرمیوں کو بے نقاب کرتی کو اہی اچھی لگی۔ کلاؤن ڈے کا حیران کن اینڈ پسند آیا۔ مغل انکل کی پس زنداں سسپنس کو 4 چاند ضرور لگائے گی۔ چھنکارا ایک بہترین کہانی تھی۔ مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان آخری شمع ابتدائی صفحات پر ایک بہترین تاریخی کہانی۔ اب کی بار کترنیں بھی کافی اور معیاری لگیں۔ فروری کا سسپنس ہر لحاظ سے بہترین رہا۔“ (بہت شکریہ)

محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال سے محفل میں حاضر ہیں ”فروری کا شمارہ جنوری کی دھند بھری شام میں ملا۔ ٹائٹل موسم بہار حسینہ شاید بہار کی تیاری کر رہی ہیں۔ پس زنداں بھی نمایاں کر کے دکھایا گیا تھا جون ایلیا مشاعرے اور شاعری کی اقسام پر تحقیق کرتے نظر آئے اداریہ آس و یاس کا مرکب رہا۔ خطوط کی محفل بہت گرما گرم رہی اور دھند میں بھی گرم موسم سا لطف آنے لگا، کئی نئے اور پرانے ساتھی نظر آئے۔ ایک ندا آئیں تو طاہرہ یاسمین نہ آئیں۔ کرسی صدارت پر نعیم اکبر براجمان تھے۔ نعیم اکبر! آپ کا تاثرنامہ خوب رہا۔ آپ کی وزیر اعظم گل مروت اپنے ”لالانامہ“ کے ساتھ نظر آئیں، ہمارے ننھے میاں ”سید اکبر شاہ“ کا تبصرہ بھی خوب رہا۔ ثمینہ حبیب! بلیک کیٹ آپ کی بات کا جواب دینے سے قاصر ہے کیونکہ اب ان کی انٹری چھ ماہ بعد ہی ممکن ہو سکے گی۔ شوکت شہریار! یار بہت لمبی نہیں ”چھوڑ دی“ آپ نے؟ ابرار وارث! آپ کی نیندیں تو ویسے ہی اڑ چکی ہیں، محلے میں چوکیداری ہی شروع کر دیں۔ جاوید شبیر، بے روزگاروں کی ضمانت واقعی کوئی نہیں دے گا اور منظور نظر افراد قرضہ لے جائیں گے۔ اعجاز احمد راحیل اور مہرین ناز ایک ہی سکے کے دو رخ لگے۔ دونوں کے تبصرے ایک دوجے کی تعریف میں ہی صرف ہوئے۔ آنٹی بشریٰ افضل! آپ کے تبصرے میں وہ پہلے سا ”کرنٹ“ نہیں ہے۔ صوبیہ اقبال راولپنڈی! ویلکم اینڈ ویلڈن۔ اس بار کترنیں کافی زیادہ تعداد میں نظر آئیں۔ معیار بھی کافی بہتر رہا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے چال پڑھی۔ صارم اپنی مکاریوں اور چالبازیوں کے ساتھ فنا ہو گیا۔ جہانگیر نے زیادہ ہی جلد بازی دکھائی۔ صفیہ سلطانہ کا شوہر کو اپنے ماضی سے آگاہ کرنے کا فیصلہ غیر فطری لگا۔ طاہر جاوید مغل کی پس زنداں امید ہے دلچسپ رہے گی۔ ثمر عباس کی جواری بور کہانی تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی اندھیرا آنکھوں کو نمناک کر گئی۔ پاکستان کی خاطر سب کچھ قربان کرنے والوں کے ساتھ پاکستان میں رہ کے انتا برا سلوک بہت افسوس ناک رہا۔ نواب صاحب کی ماروی کے لیے نوریمارکس۔ ڈاکٹر مقبول حسین کی مال غنیمت بہت دلچسپ رہی۔ نام کی حماقتیں مسکرانے پر مجبور کر گئیں۔ ہیرے محفوظ کرنے کے لیے ان کو کھالینا نام جیسے کردار سے ہی متوقع تھا۔ امجد رئیس کا بے داغ منصوبہ بائنڈ پہ داغ دار ہو ہی گیا۔“

شبانہ، لاہور کینٹ سے محفل میں تشریف لائی ہیں ”ماہ فروری کا شمارہ کافی انتظار کے بعد ملا۔ سرورق بھی بہت اچھا ہے۔ ڈاکر انکل نے خوب محنت کی ہے اپنی محفل میں انٹری دی تو ڈاکٹر نعیم اکبر کو صدارت کی کرسی پر براجمان پایا۔ نعیم بھائی مبارک ہو۔ گل مروت جی، مہرین ناز آپی کو اپنے جیسا مت سمجھو، یا انگور آپ خود کھاؤ۔ سید اکبر شاہ بھائی مہرین ناز نے ایک عام سی بات کی تھی آپ دل پہ ہی لے گئے ہیں۔ ہارون رشید بھائی ہم آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ قدرت اللہ بھائی قیصر اقبال واقعی خوش نصیب انسان ہیں۔ عالی سائیں مستانہ بے پرواصاحب پلیز آپ ہمارے لیے دعا کیا کریں۔ اعجاز احمد راحیل آپ بہت خوش قسمت انسان ہو جو حیدر آباد میں کچھ دن گزار آئے ہو۔ سب سے پہلے آخری کہانی چال پڑھی پتا نہیں کیوں لڑکے لڑکیوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں؟ صارم جیسے فلرٹ ٹائپ لڑکے کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہانی کے اینڈ پر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ عقدہ اس دنیا میں کسی کو بھی دو محبت کرنے والوں سے خوشی نہیں ہوتی۔ اکرم اور نرگس کی محبت کو زمانے نے اچھا نہ سمجھا۔ ملک صفدر حیات نے قاتل کو پکڑ کر ثابت کیا کہ قانون کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی نئی اسٹوری پس زنداں بہت ہی اچھی اسٹوری ہے۔ مغل صاحب نے ہمیشہ اچھا لکھا۔ پتا نہیں مغل صاحب ہادی کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ پہلی کہانی آخری شمع بھی لاجواب تحریر ہے۔ انسان ہمیشہ اپنے لوگوں سے دھوکا کھاتا ہے۔ بادشاہ کیقباد کے ساتھ بھی یہی سب ہوا۔ فروری کا شمارہ اچھا لگا۔“

عباسہ مغل، ڈنگہ ضلع گجرات سے چلے آرہے ہیں ”جھلمل کرتی بارش میں سسپنس نے شرف ملاقات بخشا اور موسم کے لطف کو دوبالا کر دیا، ٹائٹل حسب معمول خوب صورت رہا۔ انشائیے میں جون ایلیا نے مشاعرے کے معنی و آغاز سے روشناس کروایا۔ انشائیہ عام سا رہا۔ کچھ مختلف لگا تو انکل کا پیغام، ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے اور اسلامی تہواروں کو صرف انجوائے کرنا چاہیے۔ سلیکٹر جس نے کرسی صدارت کے لیے ڈاکٹر نعیم اکبر کا تبصرہ سلیکٹ کیا اب کی بار تو داد دینے کو دل چاہتا ہے کہ واقعی یہ تبصرہ قابل صدارت تھا۔ ڈاکٹر نعیم اکبر مبارک ہو۔ سسپنس میں ہے ہی کیا جو اچھا نہ ہو سب کچھ سابقہ شمارے سے بڑھ کر اچھا ہوتا ہے۔ تبصرے سب کے ہی اچھے تھے مگر کچھ کا انداز بیان باقیوں سے مختلف ہے۔ ہارون رشید صاحب ہمیں آپ کا خوشی خوشی بلیک لسٹ میں نام قبول کرنا بہت پسند آیا۔ ہم تو بہت عام فہم اور سادہ لکھتے ہیں اسی لیے تو کسی کی نظر سے نہیں گزرے۔ کہانیوں میں پہلے پس زنداں پڑھی، مغل صاحب نے بڑی خوب صورت منظر کشی کی کہ کہانی نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ ماروی نے کوئی خاص تاثر نہ چھوڑا، اب کے شمارے میں دو کہانیوں اندھیرا اور چھبن میں ہجرت کا ذکر تھا۔ ہجرت کرنے والوں میں سے ہر کی داستان کو زیر قلم نہیں لا سکتے ہر انسان جس نے ہجرت کی بہت سے اپنوں کو قربان کر کے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی عزت و دولت، خون کو قربان ہوتے دیکھا یہ سب ناقابل بیان ہے۔ کلاؤن ڈے رچ ٹیڈ کے لیے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ انوکھی سزا میں راکیل کی موت کا ذمے دار سارہ کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ تو باپ کی اندھی محبت ہے۔ خوردہ فروش ایک ایمان افروز کہانی جو کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالے سے بہت اچھی لگی۔ بے داغ منصوبہ میں ممنون تو اندازے سے بھی زیادہ ڈرپوک نکلے اور مرتے مرتے منصوبے کو داغ دار کر گئے۔ جواری بھی اچھی رہی۔ مال غنیمت بھی عام سی کہانی تھی چال جبکہ پرانے تھیم پر لکھی گئی نئے اسٹائل کی کہانی بہت اچھی لگی۔ لاہور سے محمد عارف کی کترن بے حد پسند آئی۔“

صوبیہ اقبال، راولپنڈی سے تبصرہ کر رہی ہیں ”بارش کے بعد موسم نکھرا نکھرا سا تھا جب 20 جنوری کی صبح فروری کا سسپنس ملا۔ سرورق عام سا لگا۔ انشائیہ مشاعرہ کا سرسری سا جائزہ لیا اور اپنی محفل میں قدم رکھا۔ ڈاکٹر نعیم اکبر کو عام قیمت سے 40 روپے کم ریٹ پر ثمار بیچنے پر صدارت ملی۔ خوش ہو جاؤ

بھائی۔گل مروت، بہن، نازاں آنٹی کو بے موسم کا پھل اچھا لگتا ہے۔ کھٹا ہونے کا واویلا مچاتی ہے۔ پر کھا جاتی ہے۔ قدرت اللہ بھائی، سحر یہ بیمار شاک پروف ہونے کے ساتھ ساتھ بے عزتی پروف بھی لگتی ہیں۔ مستانہ بھائی، مندروالی داسی کی کوئی خیر خبر؟ نازاں آنٹی، آپ کو بھی تو چاپلوسی میں بیسٹ ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ آغاز پہلی کہانی آخری شمع سے کیا۔ خاندان غلاماں کے واقعات سے بھرپور استفادہ کیا۔ کاشف زبیر ہمیشہ کی طرح ایک بہترین کہانی چھنکارا کی صورت میں لے کر آئے۔ اندرونی صفحات پر مغل صاحب کی شاندار کہانی، جس کا ابھی آغاز ہے۔ آگے چل کر مغل صاحب اپنی سابقہ کہانیوں کی طرح پس زنداں کی صورت میں بھی قارئین کو اپنا گرویدہ بنالیں گے۔ کلاؤن ڈے میں وکٹر کی ہوشیاری اپنی جگہ مگر وہ رہوڈ ارڈ کو جھانسہ نہ دے سکا۔ گواہی سے پتا چلا کہ ہر سیر کا سوا سیر ضرور ہوتا ہے۔ عقدہ کی صورت میں ملک صاحب نے ایک اور کارنامہ اپنے کھاتے میں ڈالا۔ جواری میں قلب کالارا کے بارے میں کیا گیا فیصلہ اچھا لگا۔ ڈاکٹر شیر شاہ اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اندھیرا کی صورت میں ایک تلخ حقیقت لے کر آئے۔ نواب صاحب کی ماروی بھی اب قارئین کو آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لیتی جارہی ہے۔ خوردہ فروش ولی میں ایمان افروز واقعات سے آگاہی ملی۔ ڈاکٹر بھٹی صاحب کی آخری کہانی چال بیسٹ رہی۔ محبت تو قربانی مانگتی ہے اور جہانگیر نے محبت کا حق ادا کردیا۔ محفل شعروسخن اور چٹکلے بھی پسند آئے۔“

✠ **حوریہ علی مروت اینڈ مقدس**، نورنگ سے تبصرہ کررہے ہیں ”جنوری کے سسپنس نے ہمیں پہلی پرواز کرنے کے لیے خط لکھنے پر مجبور کیا تھا۔ مگر فروری کے رسالے میں پتا چلا کہ ہمارے پر کاٹ کر ہمیں بلیک لسٹ کے سپرد کردیا گیا ہے۔ مایوس ہوئے بغیر دوسری پرواز کررہے ہیں۔ فروری کا شمارہ کافی لیٹ ملا۔ سرورق پر مسکراتی لڑکی بہت اچھی لگی۔ چونکہ مشاعروں سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں اس لیے انشائیہ مشاعرہ میں شاعروں کو بنا داد دیے ہم چل پڑے اپنی محفل کی جانب۔ ڈاکٹر نعیم اکبر کے ٹماٹر گو کہ سستے تھے پھر بھی اسٹال کامیاب رہا۔ ٹماٹروں کے بیسٹ سیلر پر مبارک باد۔ بہت ہی پیاری گل مروت باجی، ناز آنٹی کو کچھ انگور اور دو، ہاضمے کی مریضہ لگتی ہے۔ اکبر شاہ بھائی دو بھینسوں کے آگے ایک ساتھ بین مت بجاؤ۔ عروہ آپی، حیران نہ ہوں، بلیک کیٹ نے ہمایوں کے تبصرے کو پسند کیا ہے تو عروہ آپی، ہر کوئی اپنی برادری کے لوگوں کو ہی پسند کرتا ہے۔ اعجاز بھائی بھی شہر بے قدراں کے گن گاتے نظر آئے۔ کالج کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود ہم نے مشکل سے وقت نکال کر تبصرہ لکھا ہے۔“ (مگر کہانیوں پر تبصرہ کہاں ہے بھئی)

✠ **قمر ستی**، کہوٹہ راولپنڈی سے تشریف لائے ہیں ”طویل عرصے کے بعد بالآخر محفل میں شریک ہونے کا من چاہا اور سوچا کہ ان تمام دوستوں کا گلہ بھی ختم کروں جو کافی عرصے سے مجھے محفل میں واپس بلا رہے ہیں۔ فروری کا سسپنس 22 جنوری کو موصول ہوا۔ سرورق کی خاتون حسینہ بس گزارے لائق تھیں مگر ان کے زیورات کافی Latest قسم کے لگے۔ اشتہارات اور انشائیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے محفل میں پہنچے جہاں ڈاکٹر نعیم اکبر صاحب ٹماٹروں کی قیمت بڑھنے پر دھرنا دیے بیٹھے تھے۔ گل مروت بھی اب اونچا اڑنے لگی ہیں آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا...... سید اکبر شاہ اوگی! آپ کا بابر عباس کو دیا گیا مشورہ بہت پسند آیا۔ ہارون رشید! آپ کا طاہرہ گلزار کو لڑکی کہنے والی بات پر بہت پیار آیا۔ ابرار وارث بھائی! آپ کے خواب تو واقعی کمال کے ہوتے ہیں، اب اگلی دفعہ سسپنس کی کرسی صدارت کا خواب دیکھ لینا۔ تہمین سلطان! آرام سے بابا! اتنی اونچی چھلانگیں مت لگاؤ، پھسل جاؤ گے۔ سید محی الدین اشفاق اشکول جیسی تیز رفتار کہانی آئے تو بھی آپ کو مسئلہ اگر گرداب جیسی سلو تھیم والی کہانی آئے تو بھی آپ کو اعتراض؟ لوجی! محفل میں ایک عامل بابا بھی تشریف لے آئے۔ عامل بابا آپ کتنے ذہین ہیں؟ اس کا اندازہ مجھے مہرین ناز کے متعلق آپ کے سنہری خیالات پڑھ کر ہوا۔ زویا اعجاز اس رسالے کو کم معیار اور بدذوق لوگ نہیں خریدتے، سو آپ بے فکر رہیں۔ کہانیوں میں بھاگم بھاگ پس زنداں سے آغاز کیا اور پھر انجام تک گردوپیش سے غافل ہوگئے۔ پہلی قسط نے ہی بتا دیا کہ کہانی بہت سپرہٹ ہوگی۔ طاہر جاوید مغل صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ماروی کے متعلق یہی کہوں گا کہ یہ کہانی کم اور لیکچر زیادہ ہے، مصنف کہانی سے زیادہ تحریر میں اپنے تجربات کا نچوڑ شامل کردیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی چال ایک سیدھی خاندانی مسائل اور جوانی کی غلط راہوں پر چلنے کے خمیازے اور نقصانات پر مبنی تھی، کہانی اچھی تھی مگر جہانگیر کا آخری خط افسردہ کر گیا۔ آخری شمع واقعی ایک تاریخی اور بے مثال کہانی تھی۔ بادشاہ کیقباد نے اپنے باپ کا کہنا مانا اور ہوس وعشرت میں پڑ کر ذلت کی موت سے دوچار ہوا۔“

✠ **مہرین ناز**، حیدرآباد سے چلی آرہی ہیں ”ماہ فروری کا خوش نما ودیدہ زیب شمارہ اس بار 18 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نظر پڑی تو ہر طرف لوبان کی خوشبو نے ہمارا احاطہ کرلیا۔ حسینہ سر پر دوپٹا اوڑھے محفل میلاد میں جانے کے لیے تیار ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب نے ہمیں ایک نئے قسم کے مشاعرے سے روشناس کرایا۔ اداریہ میں ایڈیٹر صاحبہ نے ملکی حالات پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں 14 فروری ویلنٹائن ڈے کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ اب چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب جہاں اتنی ٹھنڈ کے باوجود کافی گرما گرمی ہے۔ صدارت اس بار ٹماٹروں کو، سوری ڈاکٹر نعیم اکبر صاحب کو ملی، مبارکباد۔ ہمارے چند تبصرہ نگار اپنے بچوں اور لڑکیوں کے پلو میں چھپ کر آرہے ہیں کیا بات ہے، گل بانو چھتری اپنی ہی اچھی ہوتی ہے، دوسروں کی چھتری میں پناہ لوگی تو یہی انجام ہوگا۔ اکبر شاہ آپ کی بات نے متاثر کیا کہ آپ دوسروں کی خوبیوں پہ نظر رکھتے ہیں۔ ہارون رشید بھائی، محمد قدرت اللہ بھائی آپ کے تبصروں کا انداز دلچسپ ہے۔ صوبیہ آنٹی ہم تنگ نظر لوگوں کو منہ ہی نہیں لگاتے۔ سرکاظمی صاحب پس زنداں پڑھتے وقت آنسو نہیں آنے چاہیے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے الیاس سیتاپوری کی آخری شمع پڑھی، کیقباد بادشاہ میں وہ خوبیاں نہیں تھیں جو ایک کامیاب حکمران میں ہوتی ہیں، وہ اپنے امیروں کی سازشوں کا شکار ہوا۔ محی الدین نواب کی ماروی بہت اہمیت اختیار کرگئی، محبوب چانڈیو حسب سابق ماروی کی خوشنودی میں لگا ہوا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ ماروی کو اغوا ہونے سے کون بچاتا ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی پس زنداں کے لیے اتنا کہوں گی کہ جس کا تھا انتظار وہ شاہکار آگیا۔ اس اسٹوری میں منظر نگاری اتنی خوب ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ ہادی اور علیزا کے کردار سامنے آئے۔ مختصر کہانیوں میں محمد خواجہ صاحب کی چبھن بہت پسند آئی۔ اکرام الدین کو جو سانحہ پیش آیا وہ تا حیات انسانی

دل ودماغ میں چبھن بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ہمیشہ حساس موضوع لے کر آتے ہیں۔ اندھیرا میں حقیقت بیان کی گئی، احمد جو دوسروں کی جان وعزت بچانے گیا۔ ان کے گھر کی عزت اپنوں کے ہاتھوں پامال ہوئی۔ چال میں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کامیاب رہے۔ صفیہ وصغیرہ کی محبت، میرال کا یقین، صارم کا دھوکا اور جہانگیر کا ایثار، غلط چال چلنے والے گرہی جاتے ہیں، ملک صفدر حیات کی عقدہ، سبق آموز اسٹوری ہے حرص وحسد انسان کے سب سے بڑے دشمن مگر انسان نہیں سدھرتا۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔“

✠ **علی ڈوگر**، ساہیوال سے تشریف لارہے ہیں ”فروری 2014ء کا خوبصورت شمارہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ ٹائٹل اس دفعہ گزارے لائق ہے۔ جون ایلیا صاحب کا انشائیہ ہویا آپ کا اداریہ ہمیشہ سچ کو ہی سامنے لاتا ہے۔ صدارت اس دفعہ ڈاکٹر نعیم کے حصے میں آئی جو ٹماٹر سستے ہونے پر خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے۔ اپنے جگری یار سید اکبر کا خط مزہ دے گیا۔ ابرار وارث صاحب کیا مہرین ناز آپی نے آپ کو کچھ کہا ہے جو اتنی ٹینشن لے رہے ہو۔ آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ لالہ قیصر اقبال لگتا ہے آپ کے قلم کا زور ختم ہوگیا ہے۔ عامل سائیں مستانہ صاحب کا انداز بیان دل کو بھا گیا۔ اچھے بھائی اعجاز احمد راحیل عرف جگا ڈوگر کا تبصرہ ہمیشہ کے مانند پیارا لگا۔ مہرین ناز آپی آپ کے ذومعنی جملے اور دل کو موہ لینے والا انداز تحریر مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ سب سے پہلے آخری شمع پڑھی۔ یہ سچ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا کیقباد بادشاہ بھی اپنوں کی سازشوں کا شکار رہا۔ محی الدین نواب کی ماروی نواب انکل کی تیسری قسط الجھن کا شکار رہی۔ نواب صاحب سے ریکوئسٹ ہے کہ ماروی کو اس کے اصل ٹریک پہ لایا جائے۔ مغل اعظم جناب طاہر جاوید مغل صاحب نیو رودا پس زنداں دل خوش کرگئی۔ کہانی کی اٹھان اچھی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی چال سبق آموز تحریر ثابت ہوئی۔ انسان کو ہمیشہ اپنی خواہشیں اختیار میں رکھنی چاہئیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی اندھیرا نصیحت آموز تھی۔ یہ سچ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنوں ہی کے ظلم وستم کا شکار ہوتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی عقدہ حسد وحرص کی آگ انسان کو ہمیشہ جلا دیتی ہے۔ کترنیں اور اشعار A-one ہیں۔“

✠ **بشریٰ افضل**، بہاولپور سے تشریف لائی ہیں ”20 جنوری کو سسپنس ملا۔ صنف نازک ٹائٹل پر سج دھج سے براجمان ہے اس کی مسکراہٹ نے کتنوں کے دل موہ لیے ہوں گے۔ انشائیہ میں جون ایلیا کا مشاعرہ پڑھا اچھا لگا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو انکل کی باتیں دل کو لگیں۔ مابدولت اٹھارویں کرسی پر براجمان تھے۔ نئے لوگوں کو محفل میں خوش آمدید! ڈاکٹر نعیم اکبر کرسی صدارت مبارک ہو۔ ڈاکٹر صاحب سبزیوں کے بھاؤ تاؤ کرتے نظر آئے۔ محمد قدرت اللہ نیازی دراصل انکل انصاف کرتے ہیں کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ سب کو ایک ہی جگہ اکٹھا کردیا۔ بلیک کیٹ آپ بھی تو سکون سے بیٹھ جاتیں۔ چوٹ تو نہیں لگی بلیک کیٹ اب تو اپنے اصل نام سے شروع کردیں لکھنا! عامل سائیں مستانہ آپ نے یہ کیا کام شروع کررکھا ہے۔ اندھیرا مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی تحریر دل کو بھاگئی مال غنیمت میں خاصا سسپنس تھا۔ تام ہر مشکل سے نکلتا ہی رہا مگر آخر میں ڈاکٹر کے بغیر اس مشکل سے نکلنا ناممکن تھا خوردہ فروش ولی معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ ایمان افروز واقعات سے دل معمور ہوجاتا ہے۔ کلاؤن ڈے میں وکٹر نے بڑی ہوشیاری دکھائی کہتے ہیں نا بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی چبھن مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی اگر بھائی خود کو پولیس کے حوالے کردیتا تو تمام عمر ضمیر کے بوجھ تلے نہ دبتا۔ پس زنداں میں ہادی نے پورے وینس کی سیر کرادی، علیزا کے ہمراہ۔ صارم نے چال تو چلی مگر اپنی ہی چال میں پھنس گیا۔ جمشید رضا پر آفرین ہے کہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے قتل جیسا جرم کر بیٹھا۔“

✠ **شوکت شہریار**، اوکاڑہ سے محفل میں شامل ہوئے ہیں ”اس دفعہ 15 تاریخ کو ہی سسپنس مل گیا اور میں اپنے سسپنس کا شکر گزار ہوں جس کی وجہ سے قیصر اقبال اور اعجاز احمد راحیل جیسے خوب صورت اور پرخلوص دوستوں کی دوستی نصیب ہوئی۔ اس دفعہ کرسی صدارت پر ڈاکٹر نعیم اکبر ٹماٹروں کا رونا رو رہے تھے جناب ڈاکٹر صاحب اگر آپ ٹماٹر کی قیمت سے اتنے ہی تنگ ہیں تو ہانڈی میں دہی ڈال لیا کریں۔ گل مروت اور صوبیہ اقبال نے مہرین ناز کی خوب کھنچائی کی۔ اب دیکھیں مہرین ناز کیا جواب دیتی ہیں۔ ہارون رشید صاحب نے بخار کی حالت میں خط لکھا اور خوب لکھا۔ ثمینہ حبیب صاحبہ آپ اپنی سالگرہ کے دن (19 دسمبر) کے ساتھ 1960 لکھنا بھول گئی ہیں شاید۔ مہرین ناز فرام حیدرآباد آپ کے خط پر صرف اتنا تبصرہ کروں گا کہ ویلڈن سید اکبر شاہ صاحب جناب ذرا ہتھ ہولا رکھیں، مسٹر اینڈ مسز بابر عباس تو محفل کی جان ہیں۔ سب سے پہلے الیاس سیتاپوری کی آخری شمع پڑھی جس میں بادشاہ کیقباد نے ایک اور بادشاہ محمد شاہ رنگیلا کی یاد دلادی۔ جس ملک کا بادشاہ ہی ایسا ہو تو اس ملک نے کیا خاک ترقی کرنی ہے اس کا انجام اچھا ہوا۔ کاشف زبیر کی چھنکارا کچھ خاص نہ لگی۔ پس زنداں کی پہلی قسط نے بہت مزہ دیا۔ ایسا لگا کہ ہم خود بھی وینس کی سیر کررہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کہانی طاہر صاحب کی شاہکار کہانیوں میں ایک نیا اضافہ ہوگی۔ کلاؤن ڈے بینک ڈکیتی کی واردات پر مشتمل ایک انوکھی تحریر تھی۔ وکٹر کو کلاؤن ڈے پر ریوالور رکھنا مہنگا پڑ گیا۔ ملک صفدر حیات کی عقدہ اچھی تحریر تھی۔ جواری میں قلب نے اپنی منہ بولی بہن لارا کو بچانے کے لیے اچھا جوا کھیلا اب پولیس اگر جسٹن کی بہن کے قاتل تک پہنچ جاتی ہے تو یہ لارا کی اپنی قسمت محی الدین نواب صاحب کی تحریر ماروی آہستہ آہستہ زور پکڑتی جارہی ہے اور ماروی کے خلاف سازشوں کا جال بنا جارہا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ محبوب چانڈیو ماروی کو دشمنوں سے بچا پاتا ہے یا نہیں۔ انوکھی سزا میں رچرڈ مرفی نے اپنی بیٹی کی قاتلہ کو واقعی انوکھی سزا دی ہے۔ دیگر کہانیوں میں چبھن، گواہی، اندھیرا، مال غنیمت، بے داغ منصوبہ اچھی کہانیاں تھیں۔ آخری صفحات پر مشتمل کہانی چال میں صفیہ سلطانہ نے اپنے شوہر مبارک احمد کو تمام حقیقت بتا کر اچھا کیا اور مبارک احمد جیسے عظیم انسان اس دنیا میں کم ہی ملتے ہیں۔ محفل شعروسخن میں اعجاز احمد راحیل، رضا علی، سوہا جی، مہرین ناز، قدرت اللہ نیازی کے اشعار اچھے لگے۔ کترنیں اس دفعہ سب کی سب شاندار تھیں۔ آخر میں سسپنس کو ایک شاندار شمارہ پیش کرنے پر مبارک باد۔“

✠ **حسیب احمد چنائے**، الگڈی کرک سے تبصرہ کررہے ہیں ”فروری کا شمارہ 21 جنوری کو ملا۔ مسلسل بلیک لسٹ ہونے کے بعد ایک مرتبہ

پھر قلم اٹھایا ہے کہ شاید انکل کو ہم غریبوں پر رحم آجائے۔ 20 مارچ کو میری سالگرہ ہے (مبارک ہو) ٹائٹل پر بیٹھی چڑیل دیکھ کر ڈر کے مارے کمبل میں چھپ گئے۔ پھر آنکھیں بند کر کے سرورق پھاڑ دیا کہ ایسا نہ ہو دوبارہ ڈر کے مارے بے ہوش ہو جائیں۔ جون ایلیا کا مشاعرہ پڑھا اور پھر خطوط میں جھانک کر دیکھا، ڈاکٹر نعیم اکبر صدارت کر رہے تھے۔ مبارکاں بھئی، ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوب صورتی سے ثمائز پر تبصرہ کیا اچھا لگا۔ گل مروت پشتو میں دوستوں کو نک نیم سے بلاتی ہے بلیک کیٹ کے لیے استعمال کیا ہوا لفظ (تورہ پشو) پڑھ کر ہنسی نکل گئی۔ ویسے آپ کی عمر کتنی ہے کیونکہ ہر دوست کے نام کے ساتھ باجی یا بھائی جان لگانا مجھے تعجب میں ڈال دیتا ہے۔ ابرار وارث برادر! تو تو میں میں کیا سیکھ لی کہ سیدھے صنف نازک پر وار کرنے لگے۔ زویا اعجاز کی دلی خواہش بھی پوری ہوگئی، طاہر جاوید مغل اس مہینے سلسلے وار ناول کے ساتھ حاضر ہیں اس مرتبہ بلیک کیٹ پر زیادہ تنقید ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے چبھن پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے خوب صورت انداز میں ملکی حالت کو اجاگر کر دیا۔ احمد کی بہن عیدی کی طرح پاکستان میں روزانہ سیکڑوں لڑکیوں کو پامال کیا جاتا ہے۔ کیا اس لیے قائد اعظم نے پاکستان بنایا تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کے باوجود بھی ہم جاہلانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھیں آمین۔"

✠ **بلیک کیٹ**، کراچی کی ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد فتح، کامیابی سے سرشار نعرہ مستانہ بلند کرتی دھواں دھار حاضری۔ "ماہ فروری کے حسین ٹائٹل کی الیلی نخریلی مہ جبیں، نازنین نہ جانے کتنے صنف کرخت کے بھوتوں کے دلوں پر تیر چلا گئی 17 کی خوشگوار شام میرے کومل ہاتھوں کی زینت بنی...... اداریے میں آپ کی بچی اٹل باتوں سے مکمل اتفاق کرتی ہوں...... صدارت کے تخت پر فائز بھوت برادری کے خوب صورت نام کے نعیم اکبر جامع اور عمدہ تبصرہ تخلیق کر کے اول قرار پائے۔ مبارک باد...... ابرار وارث، اکبر شاہ، ادریس احمد، منشی محمد عزیز مے، سید شکیل حسین کاظمی آپ سب کو بلیک کیٹ کا سلام پرخلوص ڈیئر بشریٰ افضل اور زویا اعجاز خم ٹھونک کے میدان میں ڈٹی رہنا، عظیم بہادر خاتون مہرین ناز صاحبہ آپ نے مظہر سلیم کو بھاشن دے کے دل خوش کر دیا۔ ویلڈن...... سعدیہ بخاری آپ کے نام سے ہی صنف کرخت کو بخار چڑھ جاتا ہے...... اپنی نٹ کھٹ سی تصویر آئینہ درشن تو کرا دو...... قدرت نیازی نے ماہا ایمان کے رنگ برنگے چولے سے تفسیر عباس کو بالآخر برآمد کر کے محفل کا غازی ہونے کا ثبوت پیش کر دیا۔ کترنیں بھی خوب رہیں...... اشعار سے مجھے بالکل دلچسپی نہیں سو اشعار کے تبصرے سے معذرت۔ چال عبدالرب بھٹی کی شاہکار تخلیق، لفظ لفظ سطر سطر اپنے سحر میں جکڑے چال دل پر ان مٹ نقوش چھوڑ گئی، میرال خوش قسمت بھی رہی اور بدقسمت بھی جہانگیر کی محبت کو سوسلام، ڈاکٹر بھٹی کو اتنی پیاری کہانی لکھنے کی مبارک باد...... کاشف زبیر کی چھنکار امجھ سے بالاتر کہانی اوسط درجے کی کوشش رہی۔ اسلامی صفحات سسپنس کو چار چاند لگا دیتے ہیں میں ضیا تسنیم بلگرامی کی مشکور ہوں جو بلگرامی صاحبہ ہمیں اولیائے کرام کی سوانح حیات پیش کرتی رہتی ہیں۔"

✠ **منشی محمد عزیز مے**، لڈن ضلع وہاڑی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "اب جبکہ میں باقاعدہ طور پر سسپنس کا سالانہ خریدار بن چکا ہوں اور پھر گزشتہ دو ماہ میں شائع ہونے والے دوستوں کے خطوط سے یہ پتا چل چکا ہے کہ عموماً سسپنس ڈائجسٹ 18 سے بیس تاریخ تک مارکیٹ میں آجاتا ہے۔ سرورق والی حسینہ کو ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے یقیناً محبوب نے گفٹ دیا ہے جسے پاکر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی اور نمائش کر رہی ہے کہ دیکھو! محبوب ہو تو ایسا۔ کہانیوں کی فہرست کے پاس بھی حسینائیں پھول ہاتھ میں لیے مسکرا رہی ہیں۔ یقیناً یہ بھی ویلنٹائن ڈے منانے کی تیاریاں ہیں، کوئی ہمیں بھی بتلائے کہ ہم "بوڑھے لوگ" کیسے منائیں یہ ویلنٹائن ڈے؟ کیونکہ ہمارے لیے تو سارا سال ہی ویلنٹائن ڈے ہے۔ ساتھیو! محبت کو بھلا قید کیا جاسکتا ہے۔ عجیب ہی سلسلہ چل نکلا ہے یہ...... عجیب وغریب "Days" ...... منانے کا۔ آپ کے خط میں سب سے پہلے اپنا خط تلاش کیا۔ صد شکر کہ آخری لمحات میں بھی آپ نے شائع تو کر دیا۔ ڈاکٹر نعیم اکبر صاحب! ایک ماہ کے لیے کرسی صدارت پر بیٹھنے کی مبارکباد قبول فرمائیے۔ ویسے کس کس چیز کا رونا روئیں گے آپ اور ہم لوگ۔ ثمینہ حبیب جی! آپ کو ستائیسویں سالگرہ مبارک ہو۔ شوکت شہریار اوکاڑوی! آپ کی تیز رفتاری نے گزرا وقت یاد دلا دیا، جب ہم بھی لالٹین کی روشنی میں سسپنس ایک ہی رات میں ختم کر دیا کرتے تھے۔ ابرار وارث جی! بڑے خوش نصیب ہیں آپ کہ فوراً ہی اپنے خواب کی تعبیر پالی ہے، مبارکباد۔ مہرین ناز جی! کمال ہے جی! بزرگوں سے اتنی بے رخی اور بے اعتنائی؟ ارے بھئی! بزرگوں کے دم سے ہی تو یہ رونق سلامت ہے سسپنس کی۔ بشریٰ افضل جی! آپ کے خط میں وہ پہلے والی سی شوخی نظر نہیں آئی۔ محفل شعروسخن میں حسنین عباس، طاہرہ یاسمین، حسنین سلطان، سوہا جی اور احسان سحر کا انتخاب پسند آیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی اندھیرا پڑھ کر دل تڑپ کر رہ گیا۔ ملک صفدر حیات نے بالآخر عقدہ کھول ہی لیا۔ اتنا ہی کافی ہے۔"

✠ **زویا اعجاز**، تخت شاہی، لاہور سے حاضر ہوئی ہیں "باادب باملاحظہ ہوشیار! تخت شاہی لاہور سے ہم تبصرہ لیے سسپنس کی محفل میں حاضر ہیں امید ہے اب چراغوں میں روشنی نہ رہے گی۔ دھند آلود موسم کے باعث سسپنس ڈائجسٹ کی پرواز تخت شاہی میں قدرے تاخیر سے ٹیک آف ہوئی۔ مغل صاحب اس بار روم اور وینس کی سیر کرواتے نظر آئے۔ منظر نگاری کا فن تو گویا ان پر ختم ہے آبی گزرگاہوں چرچ اور پارکس کا خود کو حصہ محسوس کرتے رہے انتہائی شاندار آغاز ہے، پتا نہیں اگلی قسط تک کیسے صبر کر پائیں گے اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے اپنی چال میں لانا چاہا ابتدا میں تو ہم ان کی چال میں پھنس گئے مگر اینڈ کے صفحات نے وہ سارا طلسم توڑ ڈالا۔ جہانگیر کا کردار بہت پسند آیا تاہم اختتام پڑھ کر مایوسی ہوئی اسی مایوسی کے عالم میں ماروی سے ملنے چل دیے۔ ساری قسط میں اس کی ذات کو لے کر جو رسا کشی اور کھینچا تانی جاری رہی اس نے انتہائی کوفت زدہ کیا بھی ماروی نہ ہوتی کترینہ کیف ہوگئی۔ بھلا ہو ملک صفدر حیات کا جنہوں نے اس مایوسی و کوفت کا کافی حد تک ازالہ کر دیا جوان اولاد کے والدین اگر احتیاط و دانش مندی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں تو آگ اور پیٹرول کا ملاپ کئی آشیانے خاکستر کر دیتا ہے۔ آخری شمع بھی عمدہ رہی تاریخ میں جتنے بھی حکمران اپنی اخلاقی کج رویوں کے باعث ذلت ورسوائی کی عمیق گہرائیوں میں دھنسے ہیں آج ہم انفرادی طور پر ان آلائشات کا شکار ہیں، مختصر کہانیوں میں چھنکار زبردست تھی انسانیت کی بقا واقعی فکری اور شخصی آزادی میں پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی اندھیرا دل کو خون کر گئی بلاشبہ یہ ہماری تاریخ کا تاریک ترین دور ہے۔ چبھن جیسے ان گنت المیے ہمارے ماضی کی بازگشت میں شامل ہیں اور پاک سرزمین کی خون سے کی

کی آبیاری کا احساس دلاتے ہیں۔ جواری کے اختتام نے کافی چونکایا، گواہی اور مال غنیمت قدرے ایوریج تھیں۔ بے داغ منصوبہ بندی پر اینڈ میں جو داغ لگا اس نے کافی محظوظ کیا۔ خوردہ فروش ولی بھی متاثر کن رہی۔ اب کچھ ذکر ہو جائے اپنی محفل کا جہاں نیازی صاحب کسی خرانٹ ساس کی طرح جلی کٹی سنانے کو آزادی رائے سمجھ بیٹھے ہیں۔ کمال کرتے ہو پانڈے جی۔ قیصر اقبال کو پتا ہی نہیں کہ فہم وادراک کا حصول جس جس ادارے سے ممکن ہے وہاں داخلے کی عمر سے نہ صرف وہ تجاوز کر چکے ہیں بلکہ داخلے کے دیگر لوازمات کی بھی کمی رکھتے ہیں۔ باقی محفل میں اس بار الٹی گنگا بہتی نظر آئی۔ مراسلات میں طالب حسین کا انتخاب بہت مثبت تھا جبکہ کریڑوی کے مراسلات نے کافی منفی تاثر دیا۔ اشعار میں ذوالفقار خان اور محمد اکرم کا انتخاب عمدہ تھا۔"

✠ **سید شکیل حسین کاظمی**، اسلام آباد سے تشریف لائے ہیں "اس دفعہ ذرا سا بھی دل نہیں تھا کہ تبصرہ لکھوں مگر سوچا اتمام حجت کے طور پر آپ سے الوداعی گفت وشنید کر لی جائے۔ کیونکہ جولائی سے لے کر اب تک میں نے تین تبصرے ارسال کیے جن میں سے دو کو سسپنس کے قیمتی صفحات پر جگہ ملی اور وہ بھی اس لحاظ سے کہ مجھے اپنا تبصرہ دیکھ کر یک فیصد بھی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ میرا تبصرہ زیادہ باریک بینی سے شاید پرکھا جاتا ہے۔ میرا یہ خط تو شائع ہونے سے رہا اس لیے کہانیوں پر تبصرہ کرنے کا فائدہ نہیں۔ بس صرف آپ کو احساس دلانا تھا کہ شاید اور کسی کی نظر میں میرے الفاظ کی کوئی قدر نہ ہو مگر اپنی نظر میں میرے اپنے الفاظ کی بہت قدر ہے۔ یہ صرف ایک مستقبل کے خاموش قاری کا چھوٹا سا احتجاج تھا۔" (یہ تو آپ شاید زیادتی کر رہے ہیں...... یقیناً آپ کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے...... بہرحال سسپنس آپ کا اپنا پرچہ ہے اور اپنوں کے ساتھ ایسا سلوک...... قارئین کیا کہتے ہیں؟)

✠ **طاہرہ یاسمین**، سرگودھا سے چلی آرہی ہیں "جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں اس وقت سے سسپنس سے پیار کرتی ہوں جب پتا بھی نہ تھا کہ یہ رسالہ ہوتا کیا ہے بس ماموں کو پڑھتے دیکھتی تو شوق پیدا ہوا۔ آج اس مقام پر ہوں کہ رسالہ نہ پڑھوں تو جیسے اپنی ذات ادھوری لگتی ہے۔ میں بہت عرصے بعد محفل میں لکھ رہی ہوں اس کی وجہ صرف اور صرف ماروی کی زبردست انٹری ہے جو کہ اتنی پسند آئی کہ ہزار کام چھوڑ کر لکھنا پڑا ویلڈن نواب انکل۔ عمران بلوچ کی وفات کا سن کر دل بہت اداس ہوا خدا ان کو جنت میں جگہ دے۔ آمین۔ پس زنداں ہمارے فیورٹ لکھاری طاہر مغل صاحب کی تحریر کردہ بہت اچھی ابتدا ہے۔ ہماری طرف سے طاہر صاحب کو شکریہ۔ محفل کے اشعار بھی کچھ کچھ پسند آئے اور تاریخی کہانیاں پڑھ کر تو بہت مزہ آتا ہے۔ ملک صفدر حیات اور مرزا امجد بیگ کی آج تک کوئی ایسی تحریر نہیں جو پسند نہ آئی ہو۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔"

✠ **سید اکبر شاہ**، اوگی مانسہرہ سے محفل میں شریک ہیں "سسپنس کا ساتھ ہمیشہ رہے، یہ دعا ہمارے دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے۔ اس بار شمارہ اکیس تاریخ کو ملا۔ حسینہ سرورق بس قبول صورت تھی۔ محفل میں پہنچے۔ ہم شہر ڈاکٹر نعیم کو اول پایا۔ آپ کی نو دو گیارہ پسند آئی۔ گل مروت کا تبصرہ اچھا تھا۔ تیسرے نمبر پر اپنا تبصرہ دیکھ کر خوشی سے تین کے تیرا ہو گئے۔ شکیل کاظمی ہمیشہ کی طرح دلنشین تبصرہ لیے شریک محفل تھے۔ بلیک لسٹ (کالی فہرست) میں بڑے بڑے نام دیکھ کر دکھ ہوا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف...... مغل اعظم کے شربار قلم مانند تیغ سے نکلی پس زنداں کا مطالعہ کیا۔ حدود قیود سے نبرد آزما باہمت اور پراسرار حسینہ (علیزا) کی داستان بہت زبردست تھی۔ ہادی بھی خوب دلجمعی سے اپنا کردار نبھاتا رہا۔ نواب صاحب نے ماروی کے ذریعے قارئین کو ماروی کا محبوب بنا دیا۔ ملک صاحب کی عقدہ بھی اچھی تھی۔ اپنی ہزیمت کا انتقام دو انسانوں کا قتل کر کے لینا سفا کی کی حدوں کو پار کرنے والی بات ہے۔ امجد رئیس کی بے داغ منصوبہ اچھی رہی۔ پرویز کی خوش فہمیاں ہی اسے لے ڈوبیں۔ اندھیرا پڑھ کر دل دکھی ہو گیا۔ اشعار ہمیشہ کی طرح عمدہ تھے۔"

✠ **احمد خان توحیدی**، اسٹیل ٹاؤن کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "سسپنس 16 جنوری کی شام آ گیا تھا، انشائیہ جون ایلیا، مشاعرہ دو عظیم شاعروں کا مقابلہ۔ قتل وغارت روزمرہ کا معمول بن چکی ہے۔ تھکے ماندے ذہن کو تفریح فراہم کرنے والے عظیم ڈراما نگار اصغر ندیم سید جیسے بے ضرر انسان کو بھی گولیاں مار دیں۔ رہی بات شاعری ورثہ کی حفاظت تو پیٹ و مجبوری کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر نعیم اکبر کو کرسی صدارت پر اکڑے بیٹھے دیکھا مبارکباد جی، دیگر ساتھیوں کے مختصر جامع تبصرے اچھے ہیں۔ خود کو پھر رہ جانے والوں میں پایا۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ (شکریہ...... بس آپ کا انداز تحریر تھوڑا مشکل ہے) مغل صاحب سے پس زنداں میں ہاتھ ملایا۔ ہادی وعلیزا کا دلچسپ ملاپ علیزا کا غائب ہونا تجسس میں مبتلا، دوسری قسط کا انتظار ہے۔ الیاس سیتاپوری کی آخری شمع کو جلایا۔ غیاث الدین بلبن کے بارے میں تاریخ میں بہت پڑھا۔ تفصیل کا شکریہ۔ پھر نواب صاحب کی ماروی سے ملنے آئے۔ سیاست دانوں کا زیادہ تذکرہ کہانی کے لطف کو پھیکا کرتا ہے۔ دیکھیں مراد منگی کی مراد کب پوری ہوتی ہے۔ کاش ہم خود صفدر حیات جیسے تھانیدار اور بیگ صاحب جیسے وکیل ہوتے۔ شادی سے قبل لڑکے لڑکی کا ملنا غلط اقدام۔ بزرگوں کو درمیان میں لانا چاہیے۔ چبھن، بدرالدین کا بہن کی عزت بچانے کے لیے خود مار ڈالنا بوقت تقسیم برصغیر ایسے بہت سے واقعات پڑھے ہیں۔ محفل شعروسخن میں حسنین وکمیل، جواہر سعید، عمر دراز، طاہرہ یاسمین صفدر معاویہ، ماہین حنیف کے اشعار اچھے ہیں۔ اندھیرا وطن کی خاطر قربانیاں دینے والوں کی حالت بلکہ اب بھی ہر طرف یہی ہو رہا ہے۔ خوردہ فروش ولی ایمان تازہ کرنے والی کہانی ہے۔ بے داغ منصوبہ میٹرک فیل پرویز ممنون کا قاتل، سائنٹیفک طریقہ انجام خوب رہا۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر بھٹی خوب چال چلتی اسٹوری لائے صفیہ وصغیرہ کو بالغ ہونے پر میرال کو حقیقت بتا دینی چاہیے تھی۔ آخر میں جذباتی لغزش سے پابند سلال ہونے والے ساتھیوں کو اللہ جلد آزادی عطا کریں۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

عادل خان سرور یاب، ضلع چارسدہ۔ قیصر اقبال گچھ، بکول ضلع بھکر۔ عاطف شاہین، اروتی۔ محمد زبیر ساگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ مقصود علی، ملیر کینٹ کراچی۔ بشیر احمد بھٹی، بہاولپور۔ رانا منشی حماد فرہاد، قیصر گل، ملک اعجاز۔ سینٹرل جیل ساہیوال۔ افتخار حسین اعوان، مظفر آباد، آزاد کشمیر۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ ادریس احمد خان، ناظم آباد کراچی۔ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی۔ اشفاق شاہین، کراچی۔ ثمینہ حبیب، کوئٹہ۔

آخری بادشاہ

ایچ اقبال

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

تاریخ گواہ ہے کہ حاکم اور محکوم کا سلسلہ ازل سے جاری ہے اور چولا بدل بدل کر ابد تک جاری رہے گا... طاقت ایک خمار ہے جو بااختیار طبقے کی ضرورت بن گیا ہے لیکن ہر دور کے تقاضے الگ رہے ہیں بالکل اسی طرح مغلیہ حکمرانوں نے بھی برصغیر پر ایک طویل عرصہ حکومت کی اور بالآخر جب رفتہ رفتہ یہ عہدِعروج سے زوال کی سمت محوِ سفر ہوا تو آخری تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر پر آکر یہ سلسلہ تھم گیا۔ مغلیہ سلطنت میں سب سے زیادہ پُرآشوب اور اذیت ناک یہی دور گزرا جب اس خاندان کا ہر فرد ایک الگ ہی داستان رقم کر رہا تھا... یہ اوراق ایک ایسی ہی مغل شہزادی کی شجاعت اور بے بسی کی داستان سے پردہ اٹھا رہے ہیں جو اپنے ماضی سے بے خبر اپنوں سے دور دیارِ غیر میں ایک اور ہی انداز میں زندگی بسر کر رہی تھی لیکن شاہی اطوار پھر بھی مزاج کا حصہ رہے جو اردگرد کے لوگوں کے چونکنے کا سبب بنتے تھے مگر شاہی خاندان کا لہو قدم قدم پر خراج دیتا رہا کہ یہی کاتبِ تقدیر نے لکھا تھا کہ وہ جنگ وجدل اور محبت کے درمیان سولی پر لٹکی رہے اور خوابوں کو آنکھوں سے دور کرتی رہے... اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس مغل خاندان کی لاج کیسے رکھتی جس کا آخری غزل گو شہنشاہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ انگریز حکومت کی گرفت میں قید وقفس کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا... جس کے بعد مغلیہ عہد کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ جس کا سارا دردِ دورانِ اسیری اس کی شاعری میں سمٹ آیا۔

وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

انگریزوں کی ایک پولیس چوکی، چٹلی قبر سے بہ مشکل ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھی اس لیے وہاں موجود تینوں انگریز سپاہیوں نے گولی چلنے کی آواز صاف سنی۔ انہیں اپنے تجربے سے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ وہ آواز چٹلی قبر کی طرف سے آئی تھی اور گولی کسی طمنچے سے چلائی گئی تھی۔

وہ رات کا پہلا ہی پہر تھا لیکن ہر طرف ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ عشا کی نماز کے بعد پریشان حال اور کسی نہ کسی حد تک سہمے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہوجاتے تھے۔ یہی حال مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کا بھی تھا۔

ایک زمانہ تھا جب چٹلی قبر پر معتقدین کا ہجوم رہا کرتا تھا۔ وہ قبر تیرھویں صدی کے ایک بزرگ سید روشن صاحب کی تھی جہاں اب دن میں بھی کم ہی لوگ نظر آتے تھے۔ معتقدین کی بھیڑ نظر نہیں آتی تھی اور رات کو تو ہو کا عالم ہوتا تھا۔

نادر شاہ افشار اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں، قتل وغارت گری اور لوٹ مار کے بعد سے دہلی کی رونقیں بتدریج کم سے کم تر ہوتی چلی گئی تھیں پھر رہی سہی کسر مرہٹوں، روہیلوں اور سکھوں نے پوری کی تھی اور اس میں آخری کیل ٹھونکنے والے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز تھے۔ عالم گیر ثانی کے زمانے سے انہوں نے خاصا زور پکڑنا شروع کیا تھا اور عالم گیر ثانی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے شاہ عالم ثانی کو تو انہوں نے مختلف حیلوں، بہانوں سے بارہ سال تک دہلی سے بہت دور ہی رکھا تھا۔ پھر شاہ عالم ثانی کی وفات تک انہوں نے اپنی جڑیں بہت مضبوط کرلی تھیں۔ شاہ عالم ثانی کے بعد جب اس کا بیٹا معین الدین، اکبر ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا تو وہ ہندوستان کا نہیں، صرف دہلی کا حکمران تھا اور صحیح معنوں میں تو اسے صرف قلعۂ معلیٰ کا فرماں روا کہا جاسکتا تھا۔ شہر پر اس کی عملداری کم ہوچکی تھی۔ کئی علاقوں میں انگریزوں نے اپنی پولیس چوکیاں قائم کرلی تھیں۔ اکبر ثانی سے اس کی رسمی اجازت لینے کے لیے انہوں نے ''پنڈاری تحریک'' کی ریشہ دوانیوں کو بہانہ بنایا تھا۔

اس تحریک کو جنم لیے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ ابتدا میں وہ لوگ جاگیرداروں اور امرا کو لوٹ کر غریب رعایا کی مدد کرتے تھے لیکن پھر اس میں کم پڑھے لکھے اور جرائم پیشہ عناصر بڑھتے چلے گئے۔ اب وہ صرف لٹیروں کی تنظیم بن چکی تھی۔ لوٹ مار اور خواتین کی آبروریزی کرنا ان کا شعار بن چکا تھا...... ان کا کوئی سردار کہیں مارا جاتا تو وہ کسی اور کو اپنا سردار منتخب کرلیتے تھے۔

ان لوگوں کی گوشمالی، انگریزوں کا تو صرف بہانہ تھا۔ وہ اس طرح دہلی پر بھی اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرنا چاہتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی نے انہیں اس کی اجازت صرف اس خوف کی وجہ سے دی تھی کہ کہیں انگریز سرکار ناراض ہوکر شاہی خاندان کے وظیفے میں کمی نہ کردے جو پہلے ہی کچھ ایسا اطمینان بخش نہیں تھا۔ اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی 1806ء میں ہوئی تھی۔

ساٹھ ستر سالہ ایک شخص کی لاش چٹلی قبر سے کچھ ہی فاصلے پر پائی گئی تھی اور جب دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا تھا تو اسی علاقے میں ترکمان دروازے کے قریب رہنے والے ایک ضعیف شخص دادا رحمان نے لاش شناخت بھی کرلی تھی۔ مقتول روہیل کھنڈ کا تھا جس کا نام صفدر خاں تھا۔

☆☆☆

اسی دن دوپہر کو دہلی ہی میں واقع انگریز پولیس کے صدر دفتر میں ایک اجلاس ہوا جو صفدر خاں روہیلہ کے قتل ہی کے سلسلے میں تھا۔ اس اجلاس میں دو کیپٹن، دو سارجنٹ اور وہ تینوں سپاہی تھے جنہوں نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی اور چٹلی قبر کے پاس پڑی ہوئی لاش تک پہنچے تھے۔

''تم لوگوں نے وہاں کسی اور شخص کو آتے جاتے نہیں دیکھا؟'' ایک کیپٹن نے تینوں سپاہیوں کے چہروں پر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

تینوں سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ ''جی نہیں سر......! مسلمانوں کی عبادت کا وقت ایک گھنٹے پہلے ختم ہوچکا تھا۔ اس کے بعد تو اس سارے علاقے میں بالکل سناٹا چھا جاتا ہے۔''

''بس کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی ہے۔'' دوسرا سپاہی بول پڑا۔

دونوں کیپٹن اس بے تکی بات پر اس سپاہی کو سخت نظروں سے دیکھنے لگے۔ سپاہی نے سٹپٹا کر سر جھکالیا۔

''سر!'' ایک سارجنٹ بولا۔ ''یہ قتل پنڈاری تحریک کے کسی آدمی نے کیا ہو شاید۔''

''نہیں۔'' کیپٹن نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''وہ لوگ صرف لوٹ مار کے لیے قتل کرتے ہیں کسی کو۔ صفدر خاں کو کسی نے دور ہی سے گولی ماری ہے۔ اسے لوٹا نہیں گیا۔ اس کی جیب میں خاصی رقم تھی۔''

''اس معاملے میں ایک بات معنی خیز ہے۔'' دوسرے کیپٹن نے پہلے سے کہا۔ ''گزشتہ گیارہ ماہ میں آٹھ قتل ہوئے ہیں اس علاقے میں۔ صرف ایک قتل سینے میں چاقو مار کر کیا گیا تھا۔ وہ واردات قطعی طور پر لوٹ مار کی تھی۔

باقی سات آدمیوں کو گولی مار کر قتل کیا گیا۔ ان ساتوں کے سر پر گولی لگی تھی یا گردن میں...... اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ ساتوں قتل کسی ایک ہی شخص نے کیے ہیں جس کا نشانہ بہت سچا ہے۔ اسے دوسری گولی چلانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ گولیاں بھی کسی بندوق سے نہیں، پستول سے چلائی گئی تھیں اور فاصلے سے بھی! ان میں سے کوئی واردات بھی لوٹ مار کی نہیں تھی۔''

پہلے کیپٹن نے سر ہلاتے ہوئے اپنے سامنے رکھی ہوئی ڈائری پر نظر ڈالتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''پہلا قتل شاہ کلن کی ڈگڈگی میں ہوا تھا۔ دوسرا اعظم خان کی حویلی کے محلے میں، تیسرا امام کی گلی میں، چوتھا فیض بازار میں، پانچواں موم گروں کے چھتے میں، چھٹا دہلی دروازے کے قریب اور اب ساتواں چٹلی قبر کے پاس۔''

''کیا تم ان علاقوں کے ناموں پر زور دے رہے ہو؟''

''ہاں۔ کیا یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ ان سب کا قاتل ایک ہی ہے اور انہی علاقوں کے دائرے کی کسی بستی میں رہتا ہے۔ یہ سبھی علاقے ایک دوسرے سے متصل ہیں۔''

''شبہ ٹھیک ہوسکتا ہے تمہارا اور ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ یہ ساتوں مقتول روہیلے تھے۔''

''ابھی یہ بات میری زبان پر آنے ہی والی تھی۔''

''تو کیا یہ انتقامی کارروائی نہیں ہوسکتی؟''

''ہو تو سکتی ہے۔ اگر ان سب کا قاتل ایک ہی ہے تو شاید وہ کسی وجہ سے روہیلوں کا دشمن ہو۔''

''سر!'' ایک سارجنٹ بول پڑا۔ ''ان سات افراد کے قتل میں کیونکہ ایک بات مشترک ہے تو پھر ہمیں تین اور وارداتوں کو بھی اسی کڑی میں لانا چاہیے، ان میں سے دو قتل...... یا یہ کہیں کہ دو لاشیں گلال باڑی کے ڈھیر پر پائی گئی تھیں اور ایک قتل حوض شمسی پر ہوا تھا۔ یہ دونوں مقام چٹلی قبر کے علاقے سے دور ہیں لیکن قتل ہونے والے وہ تینوں افراد بھی روہیلے تھے۔ ان میں سے بھی دو کی گردن پر اور ایک کے سر پر گولی ماری گئی تھی۔''

دونوں کیپٹن غور سے سارجنٹ کی طرف دیکھنے لگے، پھر انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں۔'' کیپٹن نے کہا۔ ''یہ امکان نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ساتوں اور وہ تینوں قتل بھی ایک ہی شخص نے کیے ہوں مگر ان سات وارداتوں کی وجہ سے مجھے خیال آرہا ہے کہ قاتل شاید اسی علاقے میں رہتا ہو۔ یہاں اسے واردات کرنے میں آسانی ہوتی ہوگی۔''

''گویا ہمیں اس علاقے میں رہنے والے کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا چاہیے جو روہیلوں کا دشمن ہو۔''

''یہ کام آسان نہیں ہوگا سر!'' دوسرا سارجنٹ جواب تک خاموش رہا تھا، بول پڑا۔ ''دہلی کی کثیر آبادی ایسی ہے جو روہیلوں کو پسند نہیں کرتی کیونکہ ان کے بادشاہ، شاہ عالم ثانی کی دونوں آنکھیں نکالنے والا ایک روہیلہ ہی تھا۔ میں اس کا نام بھول رہا ہوں۔''

''غلام قادر روہیلہ۔'' پہلے کیپٹن نے سر ہلاتے ہوئے کسی قدر متفکر انداز میں کہا۔

دوسرا کیپٹن بولا۔ ''میں نے سنا ہے کہ اس کے باپ ضابطہ خاں روہیلہ نے بھی شاہی خاندان پر بہت ظلم کیے تھے۔''

''تب تو پھر......'' پہلا کیپٹن سوچتے ہوئے بولا۔ ''اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ اس معاملے میں شاہی خاندان کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے۔ خصوصاً اکبر شاہ کا، کیونکہ غلام قادر نے اسی کے باپ کو بڑی بے رحمی سے اندھا کیا تھا۔''

''یقیناً ہمیں یہ بات نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔''

''لیکن اس کا امکان میرا خیال میں نہیں کہ یہ قتل شاہی خاندان کے کسی فرد نے خود کیے ہوں۔ یہ کام کسی قسم کا لالچ دے کر کسی شخص سے کروایا جارہا ہوگا۔''

''اور وہ شخص غالباً اسی علاقے میں رہتا ہو۔ میرا مطلب ہے، چٹلی قبر کے آس پاس کے علاقوں میں۔''

''ترکمان دروازہ بھی وہاں سے قریب ہی ہے۔'' کیپٹن نے ایک سارجنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور وہیں کے ایک ضعیف شخص نے صفدر خاں کی لاش شناخت کی تھی۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟''

''دادا رحمان کہا جاتا ہے اسے؟''

''تم نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اس نے صفدر خاں کو کیسے پہچان لیا؟''

''یہ میں اس سے نہیں پوچھ سکا سر!'' سارجنٹ نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ بیمار تھا اور اسے شفا خانے جانے کی جلدی تھی لیکن میں نے ایک اور شخص سے دادا رحمان کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم ہوسکا کہ اسے دادا رحمان کیوں کہا جاتا ہے لیکن یہ معلوم ہوگیا کہ اس کا بیٹا فیضان علی شاہی لشکر کے کسی دستے کا سالار ہے۔''

''گڈ!'' کیپٹن نے پرجوش انداز سے میز پر گھونسا

مارا۔ ”اتنی اہم بات تم اب بتارہے ہو؟“

دوسرے کیپٹن کے چہرے سے بھی خفگی کا اظہار ہونے لگا تھا۔

سارجنٹ شرمندہ سانظر آیا۔

میز پر گھونسا مارنے والے کیپٹن نے اس سے کہا۔ ”اب تم ہی فیضان علی اور اس کے باپ کے بارے میں مکمل چھان بین کرکے جلد از جلد رپورٹ دو۔ اگر فیضان ہی ہمارا مطلوبہ شخص ثابت ہوا تو سارا کام آسان ہوجائے گا۔ براہِ راست شاہی خاندان سے پوچھ گچھ کرنا ہمارے لیے آسان نہیں۔“

اس گفتگو میں چونکہ شبہات کا رخ شاہی خاندان کی طرف ہورہا تھا لہٰذا اجلاس اس بات پر ختم ہوا کہ یہ سارا معاملہ لازمی طور پر ریذیڈنٹ کرنل متکاف کے علم میں لایا جائے۔

☆☆☆

موم گروں کا چھتّا، شرفا اور قدرے آسودہ حال لوگوں کا محلّہ تھا۔ وہیں ایک مکان میں تین خواتین ایک ضعیف ملازم اور ایک پختہ عمر کی ملازمہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان تین خواتین میں سب سے زیادہ ضعیف خاتون کے بارے میں، پاس پڑوس کے لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی عمر سو سال سے کم تو ہرگز نہیں ہوگی۔ وہ لوگ انہیں دایہ بیگم کہا کرتے تھے کیونکہ ان کی بیٹی نجم النسا بھی انہیں اسی نام سے مخاطب کیا کرتی تھی۔ اس کی عمر بھی پینسٹھ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی جبکہ اس کی بیٹی کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی۔

”میری عمر اس وقت پینتالیس سال ہوچکی تھی جب زرتاج پیدا ہوئی۔“ نجم النسا نے پڑوس میں رہنے والی جان پہچان کی خواتین کو بتایا تھا۔ ”میں اور میرے شوہر تو اولاد کی طرف سے مایوس ہوچکے تھے لیکن خدا نے ہمیں اس عمر میں بھی نواز دیا۔“

نجم النسا کے شوہر کا نام ذیشان تھا جس کا انتقال ہوئے ڈیڑھ سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کا زربفت سے تیار کیے جانے والے کم خواب کا کارخانہ تھا۔ وہ اس کپڑے کی تجارت کے لیے لکھنو جاتا رہتا تھا کیونکہ دہلی کے زیادہ تر لوگ اب اتنے خستہ حال ہوچکے تھے کہ اتنا قیمتی کپڑا خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ ذیشان کے انتقال کے بعد کارخانہ فروخت کردیا گیا تھا لیکن مرحوم خاصا کچھ پس انداز بھی کرگیا تھا۔

سنا جاتا تھا کہ دایہ بیگم کے پاس ایک چھوٹی موٹی جاگیر بھی تھی جو ان کو اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد عالم گیر ثانی کے زمانے میں کسی اہم عہدے پر فائز تھے۔ جب عالم گیر ثانی کو ایک درباری سازش کے بعد قتل کردیا گیا تھا۔ اس وقت دایہ بیگم اپنی بیٹی نجم النسا اور اس کے شوہر ذیشان کے ساتھ دہلی ہی میں کسی جگہ رہا کرتی تھیں، لیکن دہلی اور شاہی خاندان کے ابتر حالات نے انہیں دل برداشتہ کردیا تھا۔ یہ دل برداشتگی اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب روہیلوں کا زور بڑھا اور غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم ثانی کو اندھا کردیا جو اپنے والد عالم گیر ثانی کے بعد تخت نشیں ہوا تھا۔ خصوصاً نجم النسا تو دہلی سے بہت ہی زیادہ وحشت زدہ ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ سے دایہ بیگم اسے اور اس کے شوہر ذیشان کے ساتھ دہلی سے ریاست میسور چلی گئی تھیں جہاں ٹیپو سلطان انگریزوں سے نبرد آزما تھا۔ اس وقت نجم النسا کی عمر اٹھارہ سال تھی اور اس کی شادی ہوئے تقریباً تین سال ہوچکے تھے۔ ریاست میسور میں انہوں نے ایک طویل عرصہ گزارا۔ وہ طویل عرصہ گزارنے کے بعد نجم النسا کو وطن کی یاد ستانے لگی۔ اسی کی وجہ سے وہ لوگ میسور سے پھر دہلی آگئے۔ میسور میں ابتدائی ڈیڑھ عشرے سے کچھ زیادہ گزارنے کے بعد انہیں یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ عالم شاہ ثانی کے بعد اس کا بیٹا معین الدین، اکبر شاہ ثانی کے لقب سے تخت دہلی پر بیٹھ چکا تھا لیکن حالات پہلے سے زیادہ ابتر ہوچکے تھے۔ اسی لیے دایہ بیگم نے دہلی لوٹنے کا ارادہ نہیں کیا حالانکہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد دہلی سے نجم النسا کی وحشت ختم ہوچکی تھی۔ پھر مزید ایک عشرے سے زائد گزر جانے کے بعد جب میسور کا شیر دل ٹیپو سلطان انگریزوں سے لڑتے ہوئے جاں بحق ہوگیا تو نجم النسا میسور کے حالات سے دل برداشتہ ہوئی۔ اسے وطن کی یاد بھی ستانے لگی۔ اس کے اصرار پر اس سے شدید محبت کرنے والے شوہر ذیشان اور دایہ بیگم نے اس کی خواہش نظر انداز نہیں کی۔ چار افراد پر مشتمل خاندان نے دہلی آکر موم گروں کے چھتے میں ایک مکان خرید لیا اور ذیشان نے اپنا کارخانہ قائم کیا۔ اس وقت زرتاج کی عمر تین سال تھی اور اب انہیں دہلی میں رہتے ہوئے دو عشروں سے کچھ کم وقت گزر چکا تھا۔

نجم النسا کے شوہر کی زندگی میں ان کے یہاں ایک سے زیادہ ملازم نہیں تھا مگر اس کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد دایہ بیگم علیل ہوئیں تو ایک ادھیڑ عمر ملازمہ کا بندوبست کرلیا گیا تاکہ وہ ہمہ وقت دایہ بیگم کے قریب رہ سکے۔

انہی دنوں میں پڑوس کی کوئی عورت دایہ بیگم کی مزاج

پرسی کے لیے آئی تھی تو دایہ بیگم نے اس سے کہا تھا۔ ”مجھے اپنی بیٹی اور نواسی سے بہت پیار ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے وہ ہر وقت میرے بستر سے لگی بیٹھی رہیں۔ بس اسی لیے ملازمہ رکھ لی ہے۔“

لیکن نجم النسا کو ملازمہ رکھنا گراں گزرا تھا۔

”آخر میرا بھی تو کچھ فرض ہے دایہ بیگم!“ نجم النسا نے کہا تھا۔ ”کیا میرا اور زرتاج کا فرض نہیں کہ ہم آپ کی خدمت کریں؟“

دایہ بیگم نے یہ بات کسی طرح ٹال دی تھی مگر کچھ ہی دن بعد جب ان کی علالت نے شدت اختیار کی تھی، تب زرتاج کو اس کا علم ہوا تھا کہ ملازمہ دراصل کیوں رکھی گئی تھی۔

اس بات کو اب ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ دایہ بیگم کی علالت کی شدت بہ دستور تھی۔ ایک بہت اچھی طبیبہ کے علاج کے باوجود ان کے روبہ صحت ہونے کا امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ ملازمہ کے ہوتے ہوئے بھی نجم النسا اور زرتاج بھی ان کا بہت خیال رکھتی تھیں لیکن زیادہ رات گزر جانے پر دایہ بیگم کے اصرار پر انہیں اپنے کمرے کا رخ کرنا پڑتا تھا۔

دونوں ماں بیٹی ایک ہی کمرے میں سوتی تھیں۔ جس روز صفدر خاں روہیلہ کے قتل کا چرچا ہوا، اس رات نجم النسا رات کو دیر تک زرتاج سے اس کے بارے میں بات کرتی رہی۔ موضوع یہی سوال تھا کہ آخر وہ کون ہوسکتا ہے جو روہیلوں کا جانی دشمن بنا ہوا ہے۔

پھر رات گئے نجم النسا تو سوگئی لیکن زرتاج جاگتی رہی۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے آثار جیسے منجمد ہوکر رہ گئے تھے۔ پھر جب اس پر ہلکی سی غنودگی طاری ہوئی تھی تو نجم النسا کی ہلکی سی چیخ نے اسے چونک کر اٹھنے پر مجبور کردیا تھا۔

نجم النسا بستر پر بیٹھی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی اور پسینا اس کی پیشانی پر چمک رہا تھا۔ زرتاج اس سے کوئی سوال کیے بغیر اٹھی اور جلدی سے ایک پیالے میں پانی لے آئی۔

پانی پی کر نجم النسا کی حالت بتدریج سنبھلنے لگی۔

”پھر وہی خواب؟“ زرتاج نے سنجیدگی سے پوچھا۔

نجم النسا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہاں! یہ خواب تو شاید مرتے دم تک میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“ جواب دیتے ہوئے وہ آہستگی سے بستر پر لیٹ گئی۔ ”اس کی وجہ سے کئی بار تمہاری نیند خراب ہوچکی ہے۔“

زرتاج خاموش رہی۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ صرف غنودگی میں تھی، ابھی سوئی نہیں تھی۔

نجم النسا ذرا دیر میں پھر سوگئی لیکن زرتاج کی آنکھوں میں اب غنودگی بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے دماغ میں وہ خواب چکرانے لگا تھا جو نجم النسا اسے بتاچکی تھی۔

وہ خواب جو محض خواب نہیں تھا۔ خواب میں نظر آنے والا وہ منظر نجم النسا جیتی جاگتی آنکھوں سے اس وقت دیکھ چکی تھی جب اس نے بیسویں سال میں قدم رکھا تھا۔ اس کی شادی ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ وہ دایہ بیگم کے ساتھ کچھ خریداری کے لیے بازار گئی تھی۔ واپسی پر وہ ایک ایسی راہ سے گزری تھیں جو لال قلعے سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ وہاں بہت سے لوگ ادھر ادھر جمع تھے اور درختوں سے لٹکے ہوئے ان انسانی اعضا کو دیکھ رہے تھے جن سے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ جس لاش کے ٹکڑے تھے، اس کا ایک ہاتھ ایک درخت سے اور دوسرا ہاتھ کسی اور درخت سے لٹک رہا تھا۔ دونوں ٹانگیں بھی مختلف درختوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک درخت سے گردن سے کمر تک کا دھڑ اور دوسرے درخت سے کٹا ہوا سر لٹک رہا تھا۔ وہاں جمع ہونے والے لوگ بڑی نفرت سے لاش کے ان ٹکڑوں پر جوتے پھینک رہے تھے یا پتھراؤ کررہے تھے۔

نجم النسا اس منظر کو دیکھ کر اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ دایہ بیگم نے اسے کسی نہ کسی طرح سنبھالا اور ایک خالی پالکی دیکھ کر اس میں جا بیٹھی۔ وہ پالکیاں لوگوں سے کرایہ لے کر انہیں ان کی منزل تک پہنچایا کرتی تھیں۔ پالکی چار آدمی اٹھاتے تھے۔

گھر پہنچنے تک، پالکی میں بھی نجم النسا دایہ بیگم سے لپٹی کانپتی رہی تھی۔ گھر پہنچنے کے بعد بھی اس کا خوف بتدریج کم ہوا تھا اور اس نے دایہ بیگم سے پوچھا تھا کہ وہ لاش کس کی تھی جس کے ٹکڑے کرکے درختوں سے لٹکائے گئے تھے۔

دایہ بیگم نے جواب میں کہا تھا۔ ”خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ تم اس کے بارے میں بالکل نہ سوچو۔“

لیکن نجم النسا اتنی چھوٹی سی بچی نہیں تھی۔ وہ بیس سال کی ہوچکی تھی۔ اسے آسانی سے نہیں بہلایا جاسکتا تھا۔ اس نے باقی سارا دن اسی منظر کو یاد کرتے اور دہشت زدہ ہوتے ہوئے گزارا۔

شام کو نجم النسا کا شوہر ذیشان اپنے کام سے گھر واپس لوٹا تو اسے لاش کی ساری حقیقت معلوم ہوچکی تھی۔ اس نے دایہ بیگم اور نجم النسا کو بتایا کہ وہ لاش غلام قادر روہیلہ کی تھی۔

غلام قادر سلطنت مغلیہ کے باغی ضابطہ خاں کا بیٹا تھا۔

جس زمانے میں شاہ عالم ثانی اپنے باپ عالم گیر ثانی کے قتل کے بعد دربدری کی زندگی گزار رہا تھا اور انگریز اسے کسی طرح دہلی پہنچنے سے روکتے رہے تھے، اس زمانے میں اس کا بیٹا جواں بخت اپنی والدہ زینت محل کے ساتھ شاہی محل میں تھا۔ بہ ظاہر امورِ مملکت زینت محل نے سنبھال رکھے تھے لیکن دراصل دہلی پر روہیلوں کی حکومت تھی۔ ان کا سردار ضابطہ خاں روہیلہ ہی دہلی کا حکمران بنا ہوا تھا۔ اس کے ایک رسالے کے تین ہزار سوار قلعہ معلی کی حفاظت یا نگرانی پر مامور تھے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ضابطہ خاں کو کسی بھی معاملے میں روک ٹوک سکتا۔ وہ جب چاہتا شاہی محل تو کیا، حرم سرا میں بھی داخل ہوجاتا اور شہزادیوں سے ناشائستہ حرکتیں کیا کرتا تھا۔ بعد میں جب شاہ عالم ثانی مرہٹوں کی مدد سے دہلی پہنچنے میں کامیاب ہوا تو روہیلے، مرہٹوں کا مقابلہ نہ کرسکے۔ ضابطہ خاں گرفتار ہوا۔ اسے ذلیل کرنے کے لیے اسے زنانہ لباس پہنا کر شاہ عالم ثانی کے حضور پیش کیا گیا اور اس کے بیٹے غلام قادر کو خصی کردیا گیا۔

اگرچہ اس سارے معاملے میں شاہ عالم ثانی کی تائید شامل نہیں تھی لیکن غلام قادر کے دل میں آگ بھڑکتی رہی کہ وہ شاہ عالم ثانی سے ان ساری باتوں کا انتقام لے۔ اپنے باپ ضابطہ خاں کے انتقال کے بعد جب بوجوہ مرہٹہ سردار مادھوجی سندھیا، عسکری طور پر بہت کمزور پڑ گیا تو غلام قادر نے اپنے تیار کردہ لشکر کے ساتھ دہلی پر یلغار کردی۔ مرہٹے اس کا مقابلہ نہ کرسکے۔ غلام قادر نے شاہی محل کو نہ صرف لوٹا بلکہ شہزادیوں تک کے کوڑے لگوائے اور خنجر سے شاہ عالم ثانی کی دونوں آنکھیں نکال دیں لیکن بعد میں اسے اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔

مادھوجی سندھیا نے طاقت حاصل کرنے کے بعد دوبارہ دہلی فتح کی۔ غلام قادر گرفتار ہوا اور سندھیا نے اسے قتل کرکے اس کی لاش کے ٹکڑے درختوں پر لٹکوادیے۔

یہی وہ منظر تھا جسے دیکھ کر نجم النسا دہشت زدہ ہوئی تھی اور اسے دہلی کے گلی کوچوں سے بھی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اس کی وجہ سے دایہ بیگم اور ذیشان نے دہلی چھوڑی تھی اور تینوں ریاست میسور میں جابسے تھے۔ وہیں زرتاج کی پیدائش ہوئی تھی۔

☆☆☆

چار نفوس پر مشتمل یہ خاندان جب دہلی واپس لوٹا تو انیسویں صدی شروع ہوئے تین عشرے سے زیادہ گزر چکے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کو تخت نشین ہوئے بھی انتیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔

جب صفدر خاں روہیلہ کے قتل کا واقعہ پیش آیا، اس وقت اکبر شاہ ثانی کی عمر چھہتر سال ہوچکی تھی۔ انگریزوں کا وظیفہ خوار ہونے کے باوجود اس کی بیویوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ شاہ عالم ثانی کا چھوٹا اور سب سے لاڈلا بیٹا تھا۔ جس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ اسی لیے صرف اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی اٹھارہ ہی بیویاں تھیں۔ بعدازاں بھی اس نے متعدد شادیاں کی تھیں اور اسی لیے اس کی اتنی اولادیں تھیں کہ اب چھہتر سال کی عمر میں اسے اپنی کچھ ہی اولادوں کے نام یاد رہ گئے تھے۔

لیکن جن لوگوں کی رسائی شاہی محل تک نہیں تھی، وہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ کے چھ لڑکے اور آٹھ لڑکیاں تھیں۔ بہت سی اولادیں مر بھی چکی تھیں، جو زندہ تھے، وہ بھی پختہ عمروں تک پہنچ چکے تھے۔ بعض نے بڑھاپے میں بھی قدم رکھ دیا تھا۔ انہی میں سے ایک بیٹے، شہزادہ سراج الدین کی عمر ساٹھ سال ہوچکی تھی۔ کئی اور شہزادوں کی طرح وہ بھی جوان اولادوں کا باپ تھا...... اس کی ماں لال بائی راجپوت تھی۔

عربی فارسی کی کتب بینی کا شوق زیادہ تر مغل شہزادوں کو تھا۔ اسی لیے شہزادہ سراج کو بھی ہمہ وقت پڑھتے رہنے یا شعر کہنے کی عادت تھی۔ صبح ناشتے کے بعد وہ اپنے کمرے میں لیٹا ابراہیم ذوق کا وہ قصیدہ پڑھ رہا تھا جو اس کے باپ اکبر شاہ ثانی کی شان میں کہا تھا۔ اسی قصیدے کے باعث ابراہیم ذوق کو ”خاقانی ہند“ کا خطاب ملا تھا۔ اس قصیدے سے متاثر ہوکر ہی شہزادہ سراج نے خود بھی ابراہیم ذوق سے اپنے اشعار پر اصلاح لینی شروع کی تھی۔

وہ قصیدہ شہزادہ سراج نے متعدد بار پڑھا تھا لیکن اس وقت بھی اتنے انہماک سے پڑھ رہا تھا جیسے پہلی بار پڑھ رہا ہو۔ وہ اس وقت چونکا جب ایک خواجہ سرا نے دروازے پر آکر دستک دی اور اندر آکر کہا۔ ”اعلیٰ حضرت نے آپ کو یاد فرمایا ہے شہزادہ حضور!“

شہزادہ سراج فوراً اٹھا۔ اکبر ثانی کے کمرے میں پہنچ کر وہ کورنش بجالایا۔ اکبر ثانی اس وقت بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ چہرے پر اضطرابی کیفیت تھی۔ ”پسرِ عزیز!“ وہ بولا تو اس کی آواز میں نقاہت سی تھی۔

شہزادہ سراج نے چونک کر پوچھا۔ ”نصیب دشمناں!...... آپ کی طبیعت کیا کچھ ناساز ہے؟“

”وہی سر کا درد...... جو دس پندرہ دن کے وقفے سے اچانک اٹھتا ہے۔ ابھی ہم نے طبیب کو بلایا ہے۔ آتا ہی ہوگا۔ تم کو میں نے اس لیے بلایا ہے کہ دیوان خاص میں جاکر ریذیڈنٹ بہادر سے مل لو۔ وہ ہم سے ملنے تشریف لائے ہیں۔“ اس فقرے میں ”تشریف لائے ہیں“ کہتے ہوئے اکبر ثانی کے لہجے میں چبھن تھی۔ ”بتا دینا کہ ہماری طبیعت کچھ ناساز ہے۔“

”وہ اتنی صبح......“

”خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“ اکبر ثانی نے شہزادہ سراج کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم جاکر بات کرو گے، تبھی علم ہوگا کہ وہ کیوں آیا ہے۔“

”بہتر......“

شہزادہ سراج کمرے سے نکل کر دیوان خاص میں پہنچا۔ بیٹھا ہوا انگریز ریذیڈنٹ اسے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہوا لیکن شہزادہ سراج خوب جانتا تھا کہ وہ فرنگی شاہی خاندان کے لوگوں کی عزت دل سے نہیں کرتے تھے۔ یہ ان مکاروں کی سیاسی مصلحت تھی۔

”یور ہائی نس، صبح بخیر!“ ریذیڈنٹ نے کہا۔ ”آپ نے زحمت فرمائی، شکر گزار ہوں لیکن مجھے ہز میجسٹی سے ملاقات کی خواہش تھی۔“

”آج ان کی طبیعت ناساز ہوگئی ہے۔“ شہزادہ سراج نے جواب دیا۔ ”دو ماہ سے چل رہا ہے یہ سلسلہ۔ دس پندرہ دن کے وقفے سے یکایک سر میں درد ہوتا ہے اور چوبیس گھنٹے یا اڑتالیس گھنٹے کے بعد رفع ہوتا ہے۔ ابھی تک اطبا اس کا سبب سمجھنے قاصر رہے ہیں۔ ذاتی طور پر ہمیں درد شقیقہ کا شبہ ہے لیکن...... خیر چھوڑیے......! آپ نے اتنی صبح کیسے زحمت فرمائی؟“

ریذیڈنٹ نے جواب دینے کے بجائے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا کمپنی کی طرف سے کسی اچھے ڈاکٹر کو بھیجا جائے؟“

”اس کی احتیاج نہیں۔“ شہزادہ سراج نے کہا۔ ”ہمارے طبیب کچھ کم نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ ہمارے خاندان میں سبھی کو حکمت پر اعتقاد ہے۔“

ریذیڈنٹ جواب میں کہہ سکتا تھا کہ کئی مغل بادشاہوں نے کمپنی کے ڈاکٹروں سے شفا پائی ہے لیکن وہ بات ٹال گیا۔ ”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ اس نے کہا۔

شہزادہ سراج مستفسرانہ نگاہوں سے ریذیڈنٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ اتنی صبح ریذیڈنٹ کی آمد کسی خاص سبب کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی۔

”دراصل۔“ ریذیڈنٹ نے شہزادہ سراج کی آنکھوں کا استفسار پڑھتے ہوئے جواب دیا۔ ”بات کچھ ایسی ہے کہ میں ہز میجسٹی ہی سے بات کرتا تو زیادہ مناسب رہتا لیکن اب ان کی طبیعت ناساز ہے تو پھر......“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن واضح ہوگیا کہ وہ شہزادہ سراج سے بھی وہ بات کرسکتا تھا جس کے لیے آیا تھا۔

”کوئی خاص معاملہ ہے کیا ریذیڈنٹ صاحب؟“ شہزادہ سراج نے پوچھا۔

”خاص؟...... جی ہاں...... مگر...... یوں سمجھیے کہ خاص ہے بھی اور نہیں بھی...... ویسے تو پنڈاری تحریک کے لوگوں ہی کی وجہ سے آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے لیکن پرسوں رات ایک ایسا قتل ہوا کہ تحقیقات کرنے والوں کے ذہن کا رخ ایک خاص جانب ہوگیا۔ اس قتل کے بارے میں تحقیقات کرنے والے افسران کا خیال ہے کہ یہ واردات پنڈاری تحریک کے لوگوں کی نہیں ہوسکتی اور یہ کہ گزشتہ ایک سال میں...... بلکہ واضح طور پر بتاؤں کہ گیارہ ماہ میں اسی قسم کے دس قتل ہوچکے ہیں۔“

”خوب!“ شہزادہ مسکرایا۔ ”ہمیں آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ قتل کی بھی اقسام ہوتی ہیں۔“

ریذیڈنٹ کے چہرے پر پل بھر کے لیے جھنجلاہٹ کا تاثر ابھرا جس پر اس نے فوری طور پر قابو پالیا اور بولا۔ ”دراصل بات کچھ یوں ہے کہ یہ سب قتل ایک ہی انداز میں ہوئے ہیں۔ ہر مقتول کے سر پر یا گردن پر گولی ماری گئی ہے اور دور سے ہی ماری گئی ہے۔ یعنی کسی مقتول کے قریب جاکر اسے لوٹا نہیں گیا۔ اسی لیے یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ وارداتیں پنڈاری والوں نے نہیں کی ہوں گی۔ اس کے علاوہ بھی ان میں ایک قدر مشترک ایسی ہے کہ تحقیقات کرنے والوں نے یہ ضروری سمجھا کہ یہ صورتِ حال ہز میجسٹی کے علم میں لائی جائے۔“

”ایسی کیا قدر مشترک ہے؟“ شہزادہ سراج متجسس ہوا۔

”وہ سبھی روہیلے تھے۔“ ریذیڈنٹ نے بڑی تیزی سے کہا۔

”اوہ!“ شہزادہ سراج یکایک سنجیدہ ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں فوراً آگیا تھا کہ فرنگیوں کی سوچ کس راہ پر نکل گئی تھی۔ اس کے قیاس کی تصدیق خود ریذیڈنٹ نے کردی جب اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ضروری اس لیے سمجھا گیا کہ شاہی خاندان سے روہیلوں کی کشمکش خاصے عرصے تک چلی تھی اور غلام قادر روہیلہ نے تو نہایت سفاکی کا ثبوت دیا تھا کہ خنجر سے آپ

کے دادا کی آنکھیں نکال لی تھیں۔“

ریذیڈنٹ کے دل کی بات شہزادہ سراج نے فوراً سمجھ لی۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ اگر اس وقت اس کی جگہ اس کا چھوٹا بھائی شہزادہ مرزا جہانگیر ہوتا تو بھڑک اٹھتا۔ انگریزوں کی برتری تسلیم کر لینے کے باوجود شہزادہ مرزا جہانگیر کے مزاج کی گرمی ختم تو کیا، کم بھی نہیں ہوئی تھی۔ شہزادہ مرزا جہانگیر اس کا سوتیلا بھائی تھا جس کی ماں ممتاز بیگم تھی۔

”بہت خوب ریذیڈنٹ صاحب، بہت خوب!“ شہزادہ سراج نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”گویا آپ لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ شاہی خاندان اب آنجہانی شاہ عالم ثانی کا انتقام لینے کے لیے روہیلوں کو قتل کر رہا ہے یا قتل کروا رہا ہے۔“

”ہرگز نہیں یور ہائی نس!“ ریذیڈنٹ نے جلدی سے کہا۔ ”دراصل صرف یہ قیاس کیا جا رہا ہے کہ ہز میجسٹی شاید کسی ایسے شخص سے واقف ہوں جو شاہی خاندان سے بے پناہ محبت اور روہیلوں سے شدید نفرت کرتا ہو اور ہز میجسٹی ہرگز نہیں چاہیں گے کہ کوئی شخص ان کے خاندان کی محبت میں اس قسم کی وارداتیں کرے۔“

”ریذیڈنٹ صاحب!“ شہزادہ سراج نے سکون سے کہا۔ ”ہمیں یقین ہے کہ والد بزرگوار ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں گے۔ اگر واقف ہوتے تو ہم سے اس کا ذکر تو ضرور کرتے۔ اس قسم کے معاملات وہ کم از کم ہمارے علم میں ضرور لاتے ہیں، تاہم یہ سب باتیں ہم ان کے علم میں ضرور لے آئیں گے اور جو بھی ان کا جواب ہوگا، وہ آپ تک پہنچ جائے گا۔ شاید ہم آج ہی دوپہر تک آپ کو پیغام بھجوا دیں۔“

”ہز میجسٹی کی طبیعت ناساز ہے اس لیے جلدی کی ضرورت نہیں۔“ ریذیڈنٹ نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”ان کی طبیعت کی بحالی تک انتظار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ بس اب مجھے اجازت دیجیے!“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”ارے نہیں۔“ شہزادہ سراج جلدی سے بولا۔ ”آپ کوئی مشروب پیے بغیر تو ہرگز نہیں جائیں گے۔ ہم آپ لوگوں کے خاص مشروب کا بندوبست تو رکھتے ہیں۔ ہر چند اب ہمارے حالات پہلے جیسے نہیں رہے لیکن......“ اس نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ اس کے لہجے میں کسک تھی۔

”اس کی ضرورت نہیں یور ہائی نس!“ ریذیڈنٹ نے کہا۔

شہزادہ سراج نے تالی بجا دی تھی۔ فوراً ہی ایک خواجہ سرا اندر آیا۔ شہزادہ سراج نے اس سے شراب لانے کے لیے کہا۔

”اچھا۔“ ریذیڈنٹ طویل سانس لے کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اب آپ کی خواہش کا احترام تو مجھ پر لازم ہے لیکن میں بس ایک ڈرنک لوں گا۔“

شہزادہ سراج نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگرچہ یہ اصول میزبانی کے خلاف ہوگا لیکن ہم آپ کا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ ریذیڈنٹ مسکرایا۔ ”لیکن ہز میجسٹی اس کے بہت شوقین ہیں۔ ایک مرتبہ میں انہیں بہت اعلیٰ درجے کی شراب کا تحفہ بھی دے چکا ہوں۔ ایک مرتبہ مجھے ان کے ساتھ پینے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔“

شہزادہ سراج مسکراتا رہا۔ اگرچہ وہ بھی شراب نوشی کا عادی تھا لیکن اب تک اس نے انگریزوں پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ وہ ریذیڈنٹ کی آمد کا سبب جان کر مکدر بھی ہوا تھا لیکن اس نے نمائشی خوش مزاجی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

☆☆☆

صفدر خاں روہیلہ کے قتل کے سلسلے میں انگریز پولیس کے صدر دفتر میں جو پہلا اجلاس ہوا تھا، اس کی صدارت بیک وقت دو افسروں نے کی تھی۔ وہ دونوں کیپٹن تھے۔ ان میں سے ایک کا نام اسٹیورٹ اور دوسرے کا نام اسمتھ تھا۔ وہ دونوں سہ پہر کے وقت صدر دفتر کے ایک کمرے میں بیٹھے اسی قتل کے سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے۔

کیپٹن اسمتھ کہہ رہا تھا۔ ”ریذیڈنٹ آج صبح پرنس سراج سے مل چکے ہیں۔ بادشاہ کی طبیعت خراب تھی اس لیے اس سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ریذیڈنٹ کا خیال ہے کہ پرنس سراج روہیلوں کے قتل کے معاملے میں ہرگز ملوث نہیں ہے۔“

”اس یقین کی وجہ؟“ کیپٹن اسٹیورٹ نے سوال کیا۔

”انہوں نے مجھے وہ سب باتیں بتائی ہیں جو پرنس سراج سے ہوئی تھیں۔“ کیپٹن اسمتھ نے جواب دیا اور پھر اس نے تفصیل سے وہ ساری گفتگو دہرا دی جو ریذیڈنٹ اور شہزادہ سراج کے مابین ہوئی تھی۔

سب کچھ سننے کے بعد کیپٹن اسٹیورٹ نے کہا۔ ”ان باتوں سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا گیا کہ پرنس سراج اس معاملے میں ملوث نہیں۔“

”تم ابھی دو ہی مہینے پہلے انگلینڈ سے آئے ہو لیکن میں یہاں بہت عرصے سے ہوں اور ریذیڈنٹ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بلا کے چہرہ شناس ہیں۔ اسی بنا پر انہیں یقین ہے کہ پرنس سراج اس معاملے میں ہرگز ملوث نہیں۔ اس نے بہت سچائی سے باتیں کی تھیں۔ اس کے لہجے میں جھوٹ کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ وہ اس خیال سے جھنجلا رہا تھا کہ ہم اس سلسلے میں شاہی خاندان پر شبہ کر رہے ہیں لیکن وہ بڑے سلیقے سے اپنی جھنجلاہٹ چھپا گیا تھا۔ ریذیڈنٹ صاحب کا دعویٰ ہے کہ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پرنس سراج کی جھنجلاہٹ کو قطعی محسوس نہیں کرتا۔“

کیپٹن اسٹیورٹ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”چلو مان لیا کہ پرنس سراج اس معاملے میں ملوث نہیں لیکن اکبر شاہ تو ہو سکتا ہے۔“

”تیسرے پہر کو پرنس سراج نے پیغام بھجوایا تھا کہ اکبر شاہ بھی اس سارے معاملے سے بے خبر ہے۔“

”کیا اکبر شاہ اپنے بیٹے سے جھوٹ نہیں بول سکتا؟“

”ابھی بتا چکا ہوں میں تمہیں! پرنس سراج نے ریذیڈنٹ سے کہا تھا کہ اس کا باپ اسے اتنے اہم معاملات سے بے خبر نہیں رکھتا۔“

”یہ اس کی خوش فہمی بھی ہو سکتی ہے۔“

کیپٹن اسمتھ نے ایک طویل سانس لی۔ ”گویا تم اس شبہے سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں کہ اکبر شاہ اس معاملے میں ملوث ہو سکتا ہے۔“

”اکبر شاہ کے علاوہ خاندان کا کوئی اور فرد بھی ہو سکتا ہے۔“ کیپٹن اسٹیورٹ نے کہا۔ ”اور مجھے خاصی حد تک شبہ ہے کہ یہ کام غالباً فیضان علی سے لیا جا رہا ہو۔“

”دادا رحمان کے بیٹے سے؟“

”ہاں۔“ کیپٹن اسٹیورٹ نے کہا۔ ”سارجنٹ جیکب نے بھی مجھے آج ہی رپورٹ دی ہے۔ اس نے دادا رحمان سے بہت صاف صاف سوال کیا تھا کہ اس نے لاش دیکھ کر صفدر خاں روہیلہ کو کیسے پہچان لیا تھا۔ دادا رحمان نے اس کا بہت تفصیلی جواب دیا تھا جو خاصا قابل غور ہے۔“

”قابل غور؟“

”ہاں۔“ کیپٹن اسٹیورٹ نے جواب دیا۔ ”دادا رحمان نے بتایا تھا کہ آج بھی دہلی میں روہیلوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے لیکن مقامی لوگوں کی وجہ سے انہوں نے یہ بات راز میں رکھی ہے کہ وہ روہیلے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ صفدر خاں کے علاوہ جو روہیلے قتل کیے جا چکے ہیں، وہ انہیں بھی جانتا تھا۔ وہ سب غلام قادر کے ان ساتھیوں میں سے تھے جنہوں نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔“

کیپٹن اسمتھ نے چونک کر کہا۔ ”یعنی جب غلام قادر نے شاہ عالم کی دونوں آنکھیں نکال لی تھیں؟“

”ہاں۔“

”دادا رحمان انہیں کیسے جانتا تھا؟“

”اپنے بیان کے مطابق وہ اس زمانے میں بحیثیت دربان شاہی محل میں ملازم تھا۔ اس نے حملہ آوروں کو دیکھا تھا اور ان میں سے بہت سوں کی شکلیں اسے یاد رہی تھیں۔ دادا رحمان کے اب دو ہی شوق رہ گئے ہیں، وہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ اپنے گھر کے ایک کمرے میں بیٹھا شطرنج یا پچیسی کھیلتا ہے یا ساری دہلی میں گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ وہ یہاں کے ہر گلی کوچے سے واقف ہے۔ اس نے شہر میں رہنے والے بارہ ایسے روہیلوں کو پہچان لیا تھا جو غلام قادر کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اس نے ان کے بارے میں کبھی کسی کو نہیں بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گڑے مردے اکھڑیں۔ یعنی مقامی لوگوں اور روہیلوں میں فساد کھڑا ہو جائے۔ اب میں تمہیں ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ تم پھر چونک پڑو گے۔“

کیپٹن اسمتھ تیزی سے بولا۔ ”جو دس روہیلے قتل ہو چکے ہیں، وہ انہی بارہ میں سے تھے کیا؟“

کیپٹن اسٹیورٹ مسکرایا۔ ”تم ٹھیک سمجھے۔ میں تمہیں یہی بتا کر چونکانا چاہتا تھا۔“

”گویا غلام قادر کے ان ساتھیوں میں سے دو ابھی زندہ ہیں؟“

”ہاں۔“

”تو پھر ان روہیلوں کا قاتل ان دونوں کو بھی قتل کر سکتا ہے؟“

”دونوں کو تو نہیں لیکن ایک کو ضرور قتل کر سکتا ہے۔ وجہ یہ کہ ان دونوں میں سے ایک، تین چار ماہ پہلے دہلی چھوڑ کر جا چکا ہے۔ سارجنٹ جیکب نے دادا رحمان سے بات کرنے کے بعد ان دونوں روہیلوں کے بارے میں بھی چھان بین کی تھی تو اسے اس کا علم ہوا تھا لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ روہیلہ دہلی کیوں چھوڑ گیا۔ بس قیاس ہی کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ اپنے ساتھیوں کے پے در پے قتل سے ہی ڈر کر دہلی سے بھاگا ہو۔ اب دہلی میں ان میں سے صرف ایک ہی ہے۔ یہاں اسے لوگ افضال میاں کے نام سے جانتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جب وہ روہیلہ ہے تو اس کا نام افضال خاں ہوگا۔ وہ اپنے نام سے خاں کا لفظ اس لیے خارج کر سکتا ہے کہ لوگوں کو اس پر

روہیلہ ہونے کا شبہ نہ ہو۔"
"یہ تو دل کے چور کی بات ہوگی ورنہ یہاں ریاست رام پور اور مراد آباد کے لوگ بھی آباد ہیں جن کے ناموں کے ساتھ خاں لگا ہوا ہے۔"
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ دل کے چور کی ہی بات ہو سکتی ہے۔"
"پھر تو خفیہ طور پر اس کی حفاظت کی جانی چاہیے۔ اگر اسے بھی قتل کرنے کی کوشش کی گئی تو قاتل ہمارے ہاتھ لگ سکتا ہے۔"
"سارجنٹ جیکب سے یہ رپورٹ ملنے کے بعد ہی میں اس کا بندوبست کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ دادا رحمان کے پوتے فیضان علی پر بھی خفیہ طور سے نظر رکھی جائے گی۔"
"پوتے؟" کیپٹن اسمتھ نے حیرت سے کہا۔
"ہاں۔ پہلے ہمیں غلط معلوم ہوا تھا کہ فیضان علی اس کا بیٹا ہے۔"
"تو فیضان علی کے ماں باپ؟"
"وہ مر چکے ہیں مگر دادا رحمان کی بیوی زندہ ہے، وہ گھر میں اپنے پوتے اور پوتی کے ساتھ رہتے ہیں۔"
"یعنی فیضان کی بہن؟"
"ہاں، اس کی بہن کا نام گوہر جہاں ہے۔"
"بہت خوب۔" کیپٹن اسمتھ مسکرایا۔ "اس لڑکی کا نام بھی معلوم کر لیا سارجنٹ جیکب نے؟"
"جیکب بہت ذہین ہے۔ مجھے یہاں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن میں نے اس کے بارے میں اندازہ لگا لیا تھا۔ اسی لیے میں نے اسی کو ہدایت کی تھی کہ وہ رحمان دادا سے ملے۔ وہ رحمان دادا کے نام سے اسی لیے مشہور ہوا ہے کہ فیضان علی اور گوہر جہاں اسے رحمان دادا کہتے ہیں۔"
کیپٹن اسمتھ مسکرایا۔ "میں فطرتاً حاسد نہیں ہوں ورنہ مجھے یہ بات گراں گزرتی کہ تم..... کچھ ہی عرصے پہلے یہاں آئے ہو لیکن اس سارے معاملے کی تحقیقات کا ذمے دار تمہیں ہی بنایا گیا ہے۔ مجھے صرف معاونت کرنا ہے تم سے۔"
حقیقت یہی تھی کہ کیپٹن اسٹیورٹ عمر میں بھی کیپٹن اسمتھ سے چند سال بڑا تھا اور اس قسم کے معاملات میں اس کا تجربہ بھی بہت تھا۔
کیپٹن اسمتھ سنجیدہ ہو کر بولا۔ "کیا رحمان دادا نے اپنے پوتے کو ان روہیلوں کے بارے میں بتایا تھا؟"
"سارجنٹ جیکب نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے یہ سوال براہ راست نہیں کیا تھا۔ گھما پھرا کر یہ بات معلوم کی تھی کہ دادا رحمان نے اپنے گھر میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔"
"رحمان دادا اس معاملے میں جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔"
"سارجنٹ جیکب کا بیان ہے کہ اس نے رحمان دادا کے لب و لہجے میں جھوٹ کی ذرا بھی آمیزش محسوس نہیں کی۔ جس طرح تم نے مجھے بڑے یقین سے بتایا تھا کہ ریذیڈنٹ بلا کے چہرہ شناس ہیں، اسی طرح مجھے بھی سارجنٹ جیکب کی غیر معمولی ذہانت کا یقین ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ دادا رحمان کا سارا بیان بالکل سچا ہوگا۔"
"تو پھر فیضان علی پر نظر رکھنے کا سبب؟"
"وہ چونکہ شاہی سپاہ کے ایک رسالے کا سالار ہے اس لیے یہ شبہ تو کیا جا سکتا ہے کہ اسے کسی اور ذریعے سے ان روہیلوں کا علم ہو گیا ہو اور وہ ان سے شاہی خاندان کا انتقام لے رہا ہو جس کا وہ نمک خوار ہے اور جس کا نمک خوار اس کا دادا بھی رہ چکا ہے۔"
"یہ شبہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔"
"یقیناً ہو سکتا ہے لیکن جب تک کوئی زیادہ مشتبہ شخصیت سامنے نہیں آجاتی، اس وقت تک فیضان ہی کو شبہات کے دائرے میں رکھنا ہوگا۔ کام شروع تو کرنا ہوگا نا ہمیں سے!...... اس کے علاوہ افضال میاں یا افضال خاں کی خفیہ حفاظت سے بھی ہم کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔"
"رحمان دادا کے مالی حالات کیسے ہیں؟"
"وہ شاہی محل میں دربان تھا اس لیے اس کے مالی حالات اچھے نہیں ہوتے لیکن اس کے بیٹے نے کوئی کاروبار کر لیا تھا اور مرنے سے پہلے کاروبار خاصا جما بھی لیا تھا۔ اس کی موت کے بعد وہ کاروبار دادا کے رشتے کے کسی بھائی نے سنبھال لیا ہے جو دادا رحمان کے مطابق بہت ایمان دار شخص ہے۔ اسی کاروبار کی وجہ سے ان لوگوں کی زندگی آسودہ حالی سے گزر رہی ہے۔ فیضان علی صرف شوق میں سپاہی بنا ہے۔ وہ اب ایک دستے کا سالار ضرور بن گیا ہے لیکن اس کی وجہ سے ان کا گھر اتنا آسودہ نہیں ہو سکتا تھا۔ شاہی خاندان کو ہماری سرکار انگلشیہ سے بہت مناسب وظیفہ نہیں ملتا اس لیے......"
"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" کیپٹن اسمتھ نے کیپٹن اسٹیورٹ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "شاہی سپاہ کو وقت پر تنخواہیں نہیں ملتیں۔ بعض مہینے تو ملتی ہی نہیں ہیں۔ اسی لیے خاصی سپاہ ملازمت چھوڑ بھی چکی ہے لیکن جو شاہی خاندان کے بہت زیادہ وفادار ہیں، وہ اب بھی وفاداری نباہ رہے ہیں۔"
کیپٹن اسٹیورٹ کھڑا ہوا۔ "آؤ ذرا ہم بھی اس وقت

امیر خاں کے بازار کا چکر لگا لیں۔ تم میری رہنمائی کرو۔"
"وہاں کیوں؟" کیپٹن اسمتھ نے کھڑے ہوتے ہوئے سوال کیا۔ "اس بازار میں زیادہ تر دکانیں چمڑے کا کاروبار کرنے والوں کی ہیں۔"
"افضال خاں کا چمڑے ہی کا کاروبار ہے اور خاصا بڑا ہے۔ ایک ہی قطار کی کئی دکانیں ملا کر اس نے ایک دکان بنا لی ہے۔ اس بازار کے خاتمے ہی پر افضال خاں کا گھر بھی ہے۔"
کیپٹن اسمتھ ہنسا۔ "بہت تیز جا رہا ہے سارجنٹ جیکب!..... ایک ہی دن میں اس نے یہ سب معلوم کر لیا۔"
"نہیں۔" کیپٹن اسٹیورٹ نے جواب دیا۔ "وہ کل سے سرگرم ہے۔"
وہ دونوں باہر نکلے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر امیر خاں کے بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

زرتاج گھر سے باہر جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی جب نجم النسا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "پالکی منگوائی ہے تم نے؟"
"جی۔" زرتاج نے کہا۔ "میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔ گوہر نے بلایا ہے مجھے۔ اس کا ملازم آیا تھا۔ دیکھا تو تھا آپ نے!"
"میں اس وقت جلدی میں تھی۔ دایہ بیگم نے بلایا تھا مجھے۔ میں تم سے کہتی ہوئی گئی تھی کہ اب دن ڈھل رہا ہے۔ جلدی بھی واپس آ گئی تو اندھیرا پھیل چکا ہوگا۔ کل صبح چلی جانا۔"
"گوہر کا ملازم کہہ رہا تھا کہ کوئی بہت ضروری بات ہے۔ مجھے جانا ہی چاہیے۔"
"فیضان سے ملنے تو نہیں جا رہی ہو؟"
"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ!" زرتاج نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بڑے پیار سے نجم النسا کے گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اگر فیضان کی بات ہوتی تو میں آپ سے چھپاتی کیوں!"
یہ نجم النسا کے علم میں آ چکا تھا کہ زرتاج اور فیضان ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس کا علم فیضان کی بہن گوہر کو بھی تھا۔ ان تینوں نے ایک ہی مکتب میں تعلیم حاصل کی تھی۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ زرتاج اور فیضان کی انسیت بڑھتی رہی تھی اور جوان ہوتے ہوتے وہ ایک دوسرے کو شدت سے چاہنے لگے تھے۔ ان کی شادی بھی ہو جاتی لیکن دو وجوہ سے اب تک یہ معاملہ اس حد تک آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔
زرتاج کی پالکی جب دادا رحمان کے گھر پہنچی تو گوہر بڑی بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ اس نے حسب معمول زرتاج سے لپٹ کر اس کا استقبال کیا۔ عمر میں وہ زرتاج سے تین چار سال چھوٹی تھی لیکن دونوں نہایت بے تکلف سہیلیوں کی طرح ملتی تھیں۔ گوہر کو زرتاج اور فیضان کی محبت کا علم بہت شروع ہی میں ہو گیا تھا اور تب سے تو وہ زرتاج کو بے حد چاہنے لگی تھی۔
گوہر نے کہا۔ "بھیا اب آتے ہی ہوں گے۔"
"اس کا مطلب!"
"بہت صحیح وقت پر آ گئیں!" زرتاج بولی۔ "تمہارے ملازم نے تو بتایا تھا کہ تمہیں ہی مجھ سے کوئی خاص بات کرنا ہے۔ مجھے خیال آیا تھا کہ تم اپنے منگیتر کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتی ہو گی۔"
گوہر کی منگنی ہو چکی تھی لیکن وہ اس معاملے میں خوش نہیں تھی اور کسی باعث چاہتی تھی کہ اس کی منگنی ٹوٹ جائے۔
"نہیں، میری کوئی بات نہیں ہے۔" گوہر نے سنجیدگی سے کہا۔ "بھیا ہی نے آج گھر سے جاتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں اس وقت بلوالوں۔ تو...... شاید وہ آ ہی گئے۔"
کسی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز گھر کے قریب آ کر رکی تھی۔
"فیضان!" زرتاج نے تعجب سے کہا۔ "اس وقت؟...... کیا بات ہو سکتی ہے کہ......"
"بات کا مجھے نہیں معلوم۔" گوہر نے زرتاج کی بات کاٹتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "بس اتنا اندازہ ہے کہ انہوں نے صرف چاہت میں تمہیں دیکھنے کے لیے نہیں بلایا ہے، کوئی خاص بات ہے۔ وہ بہت ہی سنجیدہ اور فکر مند تھے آج صبح۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب وہ تم سے ملیں تو میں کمرے سے چلی جاؤں۔ ویسے تو تم سے ملاقات کے وقت ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ میں تم دونوں کو تنہا چھوڑ دوں لیکن ایسی خواہش کے وقت مجھ سے کچھ جھینپے بھی لگتے ہیں لیکن آج جب انہوں نے مجھ سے یہ بات کی تھی تو مجھ سے نظریں بھی نہیں چرائی تھیں۔"
"ایسا کیا معاملہ ہو سکتا ہے۔" اب زرتاج بھی فکر مند ہوئی۔
"تم بیٹھو تو!" زرتاج ابھی تک کھڑے کھڑے باتیں کرتی رہی تھی۔ وہ بیٹھ گئی۔ "بھیا ہی ہیں۔" گوہر نے تیزی سے قریب آتے ہوئے قدموں کی آہٹ سن کر کہا۔
فیضان کمرے میں بھی بہت تیزی سے آیا تھا۔ وہ سپاہ

کی وردی میں تھا۔

"بھیا!" گوہر بولی۔ "میں ادرک کا شربت بھجواتی ہوں ملازمہ سے۔"

زرتاج کو ادرک کا شربت بہت پسند تھا۔

فیضان کے چہرے پر ایسے تاثرات قائم رہے جیسے اس نے گوہر کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں اس وقت سے پہلے گھر آ نہیں سکتا تھا ورنہ تمہیں دن ہی میں بلواتا۔ اچھا ہوا کہ تم آ چکی ہو۔ میں گھر آتے ہوئے سوچتا رہا تھا کہ تمہیں کہیں دیر نہ ہو جائے۔ ویسے تو اب بھی تم گھر لوٹو گی تو اندھیرا ہو چکا ہوگا۔ مجھے تمہاری پالکی کے ساتھ جانا تو ہوگا لیکن پھر بھی میں چاہتا تھا کہ زیادہ رات نہ ہو جائے۔"

گوہر کمرے سے جا چکی تھی۔

"آخر بات کیا ہے فیضان؟" سرتاج بولی۔

"کل ایک بات میرے علم میں آئی تھی۔ دادا نے مجھے اس وقت بتایا تھا جب وہ خاصی رات کو چوپسی کھیل کر بیٹھک سے گھر میں آئے تھے۔ انہوں نے مجھے سارا معاملہ سرسری انداز میں بتایا تھا۔ ان کا مزاج تو ایسا ہی ہے۔ ان کے لیے اس کی خاص اہمیت بھی نہیں تھی اور سچی بات یہ ہے کہ اس کی کوئی خاص اہمیت ہے بھی نہیں لیکن اچانک میرے دماغ میں ایک ایسا خیال آیا کہ میری آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ فجر تک جاگتا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر سو سکا۔ نہ جانے کیوں یہ خیال کل ہی رات میرے ذہن میں آیا۔ پہلے کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔"

"بات تو بتاؤ!" زرتاج نے پہلو بدلا۔ "پہیلیاں سی بجھوا رہے ہو۔"

"دو دن پہلے ایک روہیلے کا قتل ہوا ہے۔" فیضان نے سرتاج کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام صفدر خاں تھا۔ دادا نے ہی انگریز پولیس والوں کو بتایا تھا کہ وہ لاش صفدر خاں روہیلے ہی کی تھی۔ اسی شناخت کی وجہ سے کل صبح ایک سارجنٹ ان سے پوچھنے کے لیے آیا تھا کہ انہوں نے صفدر خاں کی لاش کیسے شناخت کر لی جبکہ دہلی کے لوگ جانتے ہی نہیں کہ روہیلے اب بھی یہاں آباد ہیں۔"

"پھر؟"

"دادا نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔"

"کیا بتا دیا؟"

"یہ تم بھی جانتی ہو، اور یہ بھی جانتی ہو کہ دادا نوجوانی ہی سے شراب نوشی کے عادی ہیں۔ دادی کو اس کا علم شروع ہی سے ہے لیکن میرے والد کی پیدائش کے بعد انہوں نے شراب نوشی کم کر دی تھی۔ بس رات کو بیٹھک میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر پیا کرتے تھے اور رات کو خاصی دیر سے بیٹھک سے گھر کے اندرونی حصے میں آیا کرتے تھے۔ اب بھی ان کا یہی معمول ہے۔ دن میں شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بیٹھک میں کسی دوست کے ساتھ بیٹھ کر پی لیں۔ غالباً سوا یا ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے کہ انہوں نے دن میں پی تھی اور ان کا دماغ اتنا بے قابو ہوا تھا کہ انہوں نے احتیاط بھی نہیں برتی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ پینے کے بعد گھر کے اندرونی حصے میں بھی آ گئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اور ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ تم اس روز صبح ہی سے آئی ہوئی تھیں۔ کھانے کے وقت تم نے اپنے گھر جانے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن گوہر کے شدید اصرار پر رک گئی تھیں۔ دادا گھر میں آنے کے بعد ہم لوگوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے تھے۔"

زرتاج بچپن ہی سے فیضان کے گھر میں آیا کرتی تھی بلکہ کبھی کبھی اس کی والدہ اور دایہ بیگم بھی آیا کرتی تھیں۔ ذیشان اور اس کے گھر والے بھی زرتاج کے گھر آیا کرتے تھے اور اسی پرانے گھریلو قسم کے تعلقات کے باعث دونوں گھروں میں خواتین کے پردے کا اہتمام باقی نہیں رہا تھا۔ جس دن کی بات فیضان نے چھیڑی تھی، اس دن بھی دادا رحمان اندر آ کر بے تکلفی سے کھانے میں شریک ہو گئے تھے جبکہ زرتاج بھی موجود تھی۔

فیضان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "نشے کی وجہ سے دادا کھانے کے دوران میں مسلسل بولتے رہے تھے۔ دنیا جہان کی باتیں کر ڈالی تھیں انہوں نے۔ ان بارہ روہیلوں کے بارے میں بھی بتایا تھا جو غلام قادر خاں کے ساتھی تھے اور دہلی کے مختلف محلوں میں رہ رہے تھے۔ انہوں نے دہلی میں کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ روہیلے ہیں لیکن دادا نے انہیں اس لیے پہچان لیا تھا کہ غلام قادر خاں کے حملے کے وقت وہ شاہی محل میں دربان کی حیثیت سے ملازم تھے۔ انہوں نے انگریز سارجنٹ کو بھی یہ سب کچھ بتا دیا تھا۔"

"ظاہر ہے کہ جب سارجنٹ نے پوچھ گچھ کی ہوگی تو انہوں نے بتایا ہی ہوگا۔" زرتاج نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ میں بھی جانتی ہوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی میں شاید مصلحتاً بھی کبھی جھوٹ نہیں بولا ہوگا۔"

فیضان نے زرتاج کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "ان بارہ میں سے دس روہیلوں کو گزشتہ گیارہ مہینوں میں قتل کیا جا چکا ہے۔ ایک چند ماہ قبل دہلی سے چلا گیا ہے لیکن بارھواں اب بھی دہلی میں ہے۔"

"تم ان باتوں سے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟"

"سارجنٹ نے دادا سے پوچھا تھا کہ انہوں نے پہلے کبھی کسی کو ان روہیلوں کے بارے میں بتایا تھا اور دادا نے جواب دیا تھا کہ انہوں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا۔"

زرتاج نے ایک طویل سانس لی۔ "انہوں نے یہ جھوٹ کیسے بول دیا۔ تم نے ابھی جس دن کا ذکر کیا ہے، اس دن انہوں نے کھانے کے دوران میں ہم سبھی کو بتا دیا تھا۔"

"میں جانتا ہوں کہ وہ کسی بھی قیمت پر کسی سے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ دراصل انہیں یاد ہی نہیں رہا ہوگا کہ وہ ہم لوگوں کو بتا چکے ہیں۔ وہ اس وقت خاصے نشے میں تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں اس دن کی کوئی اور بات بھی یاد نہیں رہی ہوگی۔ انہوں نے سارجنٹ سے یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے اپنے گھر والوں تک کو ان روہیلوں کے بارے میں کبھی نہیں بتایا۔ جب انہوں نے مجھے سارجنٹ سے اپنی اس گفتگو کے بارے میں بتایا تو بھی مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں بھی ان روہیلوں کے بارے میں اب اس لیے بتا رہا ہوں کہ جب سارجنٹ کو بتا چکا ہوں تو تم سے کیوں چھپاؤں۔"

"میری سمجھ میں اب بھی نہیں آ رہا ہے کہ مجھے یہ سب کچھ بتانے کے لیے تم اتنے بے چین کیوں تھے؟"

"اس کی اصل وجہ بتانے سے پہلے میں تم کو یہ بھی بتا دوں کہ آج ابھی جب میں گھر آ رہا تھا تو ایک انگریز عورت یا لڑکی بہت دور رہ کر میرا تعاقب کر رہی تھی۔"

"کیوں؟" زرتاج تیزی سے بولی۔

"شاید دادا کی اس بات پر یقین نہیں کیا گیا کہ انہوں نے اپنے گھر والوں کو بھی ان روہیلوں کے بارے میں نہیں بتایا۔ سارجنٹ کی باتوں سے دادا نے اندازہ لگایا ہے کہ انگریزوں کے شبے کے مطابق ان روہیلوں کو قتل کروانے میں شاہی خاندان کا ہاتھ ہو سکتا ہے اور اس کام کے لیے وہ کسی کو اپنا آلۂ کار بنا سکتے ہیں۔ میں کیونکہ شاہی دستے کا سالار ہوں اس لیے شاید انہیں یہ شبہ ہو گیا ہے کہ شاہی خاندان کا آلۂ کار بھی بن سکتا ہوں۔ انہوں نے اپنے محکمے کی کسی عورت کو میری نگرانی پر لگایا ہے۔"

"اس میں بھی مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جو تمہاری پریشان کا سبب ہو۔ ظاہر ہے کہ ان روہیلوں کو تم نے قتل نہیں کیا ہوگا لہٰذا کچھ عرصے تک تمہاری نگرانی کے بعد یہ فرنگی مطمئن ہو جائیں گے۔"

"بے شک میں نے ان روہیلوں کو قتل نہیں کیا۔ لیکن شاید......" فیضان نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "تم نے قتل کیا ہے ان روہیلوں کو۔"

یکلخت زرتاج کا چہرہ جیسے پتھرا گیا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر فیضان کو تکنے لگی، پھر اس نے کھوکھلی سی آواز میں کہا۔ "یہ عجیب خیال تمہیں کیسے آ گیا فیضان؟ میں یہ قتل کیسے کر سکتی ہوں......؟ اور کیوں کروں گی؟"

اس سے پہلے کہ فیضان جواب میں کچھ کہتا، ایک ملازمہ دستک دے کر اندر آئی۔ گوہر نے اس کے ہاتھوں ادرک کا شربت بھجوایا تھا۔

جب ملازمہ چلی گئی تو فیضان نے دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ تو میں نہیں جانتا کہ تم یہ قتل کیسے کر سکتی ہو اور نہ یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کرو گی لیکن یہ خیال مجھے اس لیے آیا کہ جب دادا نے ان روہیلوں کے بارے میں ہمیں بتایا تھا، اس کے ایک یا ڈیڑھ ماہ بعد ہی تم نے مجھ سے کہا تھا میں تمہیں پستول چلانا سکھاؤں۔ مجھے تمہاری اس خواہش پر ہنسی آئی تھی لیکن تم نے اپنی خواہش کا جواز یہ بتایا تھا کہ ابھی تو شہر کے حالات ٹھیک ہی ہیں لیکن دہلی پر آفات کا نزول اچانک ہی ہوتا رہتا ہے اور کیونکہ اپنے والد کے انتقال کے بعد تم صرف اپنی والدہ اور نانی کے ساتھ رہتی ہو اور گھر میں کوئی مرد نہیں رہا اس لیے تم احتیاطاً پستول چلانا سیکھنا چاہتی ہو تاکہ اگر اچانک حالات خراب ہوں اور تمہارے گھر پر کوئی مصیبت آئے تو تم اپنی حفاظت کے لیے کچھ تو کر سکو۔"

فیضان خاموش ہوا تو زرتاج بولی۔ "اور کچھ؟"

"مجھے یہ ظاہر کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے شدید اصرار کے بعد میں نے تمہاری بات مان لی تھی۔ میں تمہیں شہر سے باہر ایک ویرانے میں لے جایا کرتا تھا۔ وہاں میں نے تمہیں پستول چلانا بھی سکھایا اور نشانہ بازی کی مشق بھی کرائی۔"

"یہ سب تو میں بھی جانتی ہوں۔ کیا صرف اسی وجہ سے تمہیں یہ خیال آیا ہے کہ ان روہیلوں کو میں نے مارا ہوگا؟"

"نہیں۔" فیضان نے سنجیدگی سے کہا۔ "جب تم نے مجھ سے پستول چلانا سیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی، اس کے بعد سے اب تک کئی مرتبہ میں نے محسوس کیا تم روہیلوں سے شدید نفرت کرنے لگی ہو۔ اس کے علاوہ ایک بات اور...... ہمارے گھر والوں کو ہماری شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ابتدا میں خود میں ہی اس معاملے کو ٹالتا رہا۔ میری خواہش تھی کہ میں جب سپاہ میں کوئی اچھا مقام حاصل

کرلوں، اس کے بعد ہی ہماری شادی ہو۔ پھر جب تم نے پستول چلانا سیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی تو میں ایک دستے کا سالار بن چکا تھا اور شادی کے لیے تیار تھا لیکن اس کے بعد تم نے شادی سے گریز کرنا شروع کردیا۔ دو تین بار تم نے یہ کہا کہ سال بھر اور ٹھہر جاؤ۔ جب بھی میں نے یہ پوچھا کہ سال بھر میں کیا ہوجائے گا تو تم نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ گھما پھرا کر بات ٹال گئیں۔ اسی لیے دادا سے بات کرنے کے بعد جب سے مجھے یہ خیال آیا کہ ان روہیلوں کو مارنے والی شاید تم ہو، تبھی سے مجھے یہ خیال بھی آنے لگا کہ سال بھر کی مہلت تم شاید اس لیے چاہتی تھیں کہ اپنے خیال کے مطابق سال بھر میں تم ان روہیلوں کو ختم کرچکی ہوگی۔"

"مجھے اب بھی حیرت ہو رہی ہے کہ تمہیں یہ خیال کیوں آیا۔ آخر میں ان روہیلوں کو کیوں مارنا چاہوں گی؟"

"اسی سوال کا جواب مجھے اپنے دل و دماغ سے نہیں مل رہا تھا اور نہ اب مل رہا ہے۔ میں اپنے دماغ میں آنے والے اس خیال سے خود بھی پریشان تھا۔ نہ صرف پریشان بلکہ بہت بے چین۔ اسی لیے میں نے گوہر سے کہا تھا کہ وہ تمہیں کسی طرح بھی آج ہی بلوائے۔ میں یہ باتیں کرنے کے لیے تمہارے گھر بھی آسکتا تھا لیکن وہاں شاید تمہاری والدہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھی رہتیں۔ مجھے سکون سے یہ باتیں کرنے کا موقع شاید نہ ملتا۔ یہاں تو میں گوہر سے کہہ سکتا تھا اور میں نے اس سے کہہ بھی دیا تھا کہ وہ ہمیں تنہا چھوڑ دے۔ آج کل دادی بیمار رہنے لگی ہیں اس لیے اپنے کمرے تک محدود ہوگئی ہیں اور دادا گھر میں ٹکتے ہی کب ہیں۔ شہر میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں یا اپنی بیٹھک میں شطرنج جمائے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔"

زرتاج کے چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات قائم رہے۔ وہ بولی۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ ان روہیلوں کو میں نے مارا ہوگا؟"

"یقین کی بات تو میں نے شروع سے اب تک نہیں کی۔ بس اپنے شبہے کی وجہ سے میں بے چین رہا ہوں۔ تمہیں اسی لیے بلوایا تھا کہ تم خود ان وارداتوں سے اپنی لاتعلقی ظاہر کردو تاکہ میری بے چینی ختم ہوجائے۔ اس کا مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گی۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ تم مجھ سے کوئی بات چھپاؤ۔ جیسے اب تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ سال بھر سے تم نے شادی سے گریز کرنا کیوں شروع کردیا ہے۔"

"ہاں فیضان! میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

زرتاج نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "ان روہیلوں کو میں نے ہی قتل کیا ہے۔"

"کیا!" فیضان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ ہکا بکا سا نظر آنے لگا تھا۔

"کیوں؟" زرتاج پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ "تم جو شبہ کررہے تھے، اسے اب میں یقین میں بدل رہی ہوں تو حیران کیوں ہوگئے؟"

"میں...... میں......" فیضان جیسے ہکلا کر رہ گیا۔

"ہاں، ہاں، بولو!"

"میں تم سے...... میں تم سے...... ہاں...... میں اس جواب کی توقع نہیں کررہا تھا۔ اپنے شبہے کے باوجود میرا خیال تھا کہ تم ان وارداتوں سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کروگی اور میری بے چینی ختم ہوجائے گی۔"

"میں نے ابھی کہا تھا نا...... میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

"مگر کیوں؟ کیوں زرتاج......؟ تم نے آخر ایسا کیوں کیا؟...... اور پھر یہ سب کچھ تو بہت خطرناک تھا۔ تمہاری زندگی بھی خطرے میں پڑسکتی تھی۔ تم گرفتار بھی ہوسکتی تھیں۔"

"سب سوچ لیا تھا میں نے...... یہ فیصلہ کرتے وقت میرے دماغ میں یہ خیال یقیناً آگیا تھا کہ اس طرح میں اپنی زندگی داؤ پر لگاؤں گی مگر ان کتوں کو ختم کرنے کے لیے میں اپنی جان پر کھیلنے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔" زرتاج کے لہجے میں شدید نفرت عود کر آئی۔ "اب ایک افضال خاں باقی رہ گیا ہے۔ میں اسے بھی ختم کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے رنج ہے کہ ان بارہ میں سے ایک یہاں سے کہیں بھاگ گیا ہے۔ کاش مجھے ان سب روہیلوں کا پتا چل سکتا جو غلام قادر کے ساتھ تھے۔ اگر وہ سب ابھی زندہ ہوں اور مجھے ان کا پتا چل جائے تو میں انہیں ختم کرنے کے لیے دنیا کے آخری سرے تک جانے کے لیے تیار ہوں۔ چاہے اس مقصد کے لیے میری ساری زندگی ختم ہوجائے یا کوئی مجھے ہی ہلاک کردے۔"

فیضان کے چہرے پر حیرت کے تاثرات میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ "تمہیں ان سے نفرت کیوں ہے زرتاج؟" وہ بولا۔ "اتنی نفرت تو شاہ عالم ثانی کی کسی اولاد ہی کو ہوسکتی ہے۔"

"ہاں فیضان!" زرتاج آب دیدہ ہوگئی۔ "میں بدنصیب ایک مغل شہزادی ہی ہوں۔"

ایک بار پھر فیضان کے چہرے سے ایسا لگا جیسے وہ

ہکا بکا رہ گیا ہو۔

زرتاج کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک گئے۔ "میں شاہ عالم ثانی کی چھوٹی بہن شہزادی مہرالنسا کی اولاد ہوں۔ میری ماں شہزادی مہرالنسا کی بیٹی ہیں۔"

فیضان گنگ سا ہوگیا تھا اور زرتاج کو تکے جارہا تھا۔

☆☆☆

جن دنوں شاہ عالم ثانی الٰہ آباد میں انگریزوں کی حراست میں اور انگریزوں کے بہ قول ان کی حفاظت میں تھا، انہی دنوں اسے یہ اطلاع تو مل چکی تھی کہ روہیلے شاہی محل پر قابض ہوگئے تھے اور روہیلوں کے سردار ضابطہ خاں نے اس کی چھوٹی بہن شہزادی مہرالنسا کو بے آبرو کردیا تھا لیکن اس معاملے کی ساری تفصیل اسے اس وقت معلوم ہوئی تھی جب وہ مرہٹوں کی مدد سے دہلی پہنچے اور مرہٹوں ہی کی مدد سے روہیلوں کو ختم کرکے تخت شاہی پر متمکن ہوسکا تھا۔

اس معاملے کی تفصیلات اسے دایہ بیگم سے معلوم ہوئی تھیں۔

دایہ بیگم شاہی محل کی ایک کنیز تھیں۔ ان کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن بروقت ایک دایہ نہ ملنے کے باعث ایک شہزادی کی زچگی انہوں نے ہی کرائی تھی۔ اسی باعث شاہ عالم ثانی کی بیوی نے ان کو دایہ بیگم کا لقب دیا تھا۔

دایہ بیگم نے شاہ عالم ثانی کو بتایا تھا کہ ضابطہ خاں سے بے آبرو ہونے کے بعد شہزادی مہرالنسا سکتے کی سی حالت میں چلی گئی تھیں۔ ان دنوں روہیلوں کی وجہ سے سب صرف اپنی اپنی فکر میں رہتے تھے۔ شہزادی مہرالنسا کا خیال صرف دایہ بیگم نے رکھا تھا کیونکہ ان دنوں میں وہی شہزادی مہرالنسا کی کنیز خاص تھیں۔ دو ڈھائی ماہ گزرنے کے بعد دایہ بیگم کو اس وقت پھر شدید صدمہ ہوا جب یہ بات ان کے سامنے آئی کہ ضابطہ خاں سے بے آبرو ہونے کے باعث شہزادی مہرالنسا حاملہ ہوچکی تھیں......

خود شہزادی مہرالنسا کو تو کسی بات کا احساس اور ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ وہ صرف ایک کمرے تک محدود بلکہ مقید ہوکر رہ گئی تھیں۔ اسی عالم میں انہوں نے ایک بچی کو جنم دیا۔ زچگی بھی دایہ بیگم نے کرائی تھی اور بعدازاں بچی کی دیکھ بھال بھی انہیں ہی کرنا پڑی تھی۔ بچی کی پیدائش کے چند دن بعد ہی شہزادی مہرالنسا وحشت کے عالم میں کمرے سے نکل گئی تھیں۔ دایہ بیگم اس وقت بچی کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں اگر وہ دیکھ لیتیں تو یقیناً بچی کو گود میں لیے لیے شہزادی مہرالنسا کے پیچھے پیچھے جاتیں۔ وہ انہیں کبھی پل بھر کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑتی تھیں۔ شہزادی مہرالنسا محل میں نہ جانے

دو صفات

پطرس بخاری کے کسی عزیز کا نکاح تھا۔ اس کے لیے مولوی درکار تھا۔ تلاش بسیار کے بعد ایک مولوی صاحب کو ڈھونڈ کر لایا گیا جو بہت دبلا پتلا تھا۔ پطرس بخاری صاحب اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور برجستہ بولے۔

"نکاح کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک نکاح خواں کی اور دوسرے چھوارے کی۔ ماشاءاللہ ان صاحب میں دونوں صفات موجود ہیں۔"

حاضر دماغی

شوہر گھر آیا۔ تو اپنی بیوی کے پاس زمانے بھر کی برائیاں بڑھا چڑھا کر بیان کرنے والی حاکم بی بی کو بیٹھا دیکھا۔ وہ تیوری چڑھا کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد شوہر نے اوپر سے ہی بلند آواز میں پوچھا۔ "کیا وہ چڑیل چلی گئی ہے؟ یا ابھی بیٹھی ہے۔"

بیوی نے حاضر دماغی سے کام لیا اور کہا۔ "وہ تو کب کی جاچکی ہے اس وقت میرے پاس مسز توصیف بیٹھی ہیں۔"

پندرہ دن بعد

تیز کار چلانے کے جرم میں ایک مالدار شخص کو جج نے پندرہ دن قید یا دو ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی۔ مالدار شخص نے سزا قبول کرلی۔ جب اسے کنجوسی کا طعنہ دیا گیا تو اس نے وضاحت کی۔ دراصل میری بیوی نے کہا ہے کہ باورچی پندرہ دن بعد آجائے گا۔

حکایت سعدی

ایک دیہاتی کو میں نے بصرہ کے جوہری بازار میں دیکھا۔ اس نے بتایا کہ ایک دن میں جنگل میں راستہ بھول گیا تھا اور میرے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی اور مجھے اپنی موت کا یقین ہوگیا کہ اچانک میں نے ایک تھیلی پائی جو موتیوں سے بھری ہوئی تھی...... میں ہرگز اس خوشی کو نہیں بھول سکتا کہ میں سمجھا اس میں بھنے ہوئے گندم ہیں۔ پھر میں اس ناامیدی کو نہیں بھول سکتا جب مجھے معلوم ہوا کہ اس میں تو موتی ہیں۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

کہاں کہاں بھٹکتی پھریں اور پھر انہوں نے وحشت میں کسی بلند جگہ سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ان کا سر پھٹ گیا اور وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔

دایہ بیگم نے اس کے بعد بھی دل و جان سے اس بچی کی دیکھ بھال کی۔ وہ اسے گود میں لیے لیے پھرا کرتی تھیں۔ محل میں اتنے شہزادے، شہزادیاں اور شہزادوں کی بیویاں اور ان کے بچے تھے کہ کسی نے ان سے پوچھا بھی نہیں کہ وہ کس شہزادے کی بچی کو گود میں لیے پھرا کرتی تھیں۔ شاہی خاندان کے صرف دو چار افراد کو اس بچی کی حقیقت کا علم تھا مگر وہ بھی اس معاملے میں خاموش رہتے تھے۔

شاہ عالم ثانی جب دہلی پہنچے تھے اور انہیں ان سب باتوں کا علم ہوا تھا تو وہ بے حد رنجیدہ خاطر ہوئے تھے۔ اس وقت بچی کی عمر دو سال ہو چکی تھی۔ شاہ عالم ثانی اپنی عزیز بہن کی اس بچی کو اپنی گود میں لے کر آنسو بہاتے رہے۔ انہوں نے ہی اس بچی کا نام نجم النسا رکھا تھا اور دایہ بیگم کو تاکید کی تھی کہ وہ اس بچی کی پیدائش کا معاملہ ہمیشہ راز میں رکھیں اور جب بچی کچھ سمجھنے بوجھنے لگے تو وہ اس پر یہی ظاہر کریں کہ وہ انہی کی بیٹی ہے۔

خود شاہ عالم نے بھی خاندان کے کسی فرد پر یہ راز افشا نہیں ہونے دیا، اس معاملے میں اپنی زبان پر گویا قفل ڈال لیا۔

لیکن جب نجم النسا چودہ سال کی ہو گئی تو اسے اپنی حقیقت کا علم خاندان کے ان دو چار افراد کی باتیں سن کر ہوا جو اس سارے معاملے سے واقف تھے۔ نجم النسا کو خاصا ذہنی جھٹکا لگا اور جب اس نے اپنے بارے میں یہ سوال دایہ بیگم کے سامنے رکھا تو وہ جیسے شل ہو کر رہ گئیں اور ان کی نظریں جھک گئیں۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شاہی خاندان کے جن افراد کی وجہ سے نجم النسا کو حقیقت کا علم ہوا تھا، انہیں جھوٹا قرار دے سکتیں۔ جب انہی کے ذریعے شاہ عالم ثانی کو سارے معاملے کا علم ہوا تو وہ خاندان کے ان لوگوں سے اتنا ناراض ہوئے کہ انہیں زنداں میں ڈلوا دیا تاکہ ان کی وجہ سے اس راز کا علم مزید لوگوں کو نہ ہو سکے۔

نجم النسا نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا۔ اس سے شاہ عالم ثانی کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ جب بھی موقع ملتا تھا، وہ نجم النسا کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ اس کی پیدائش کا سبب کچھ بھی سہی لیکن بہرحال وہ ایک مغل شہزادی ہی کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔

چند دن بعد نجم النسا کی آنکھوں کے آنسو تو خشک ہو گئے لیکن وہ ہمہ وقت اداس رہنے لگی، کھوئی کھوئی سی اور چپ!

محل میں رہنے والا ایک شہزادہ نجم النسا کو پسند کرنے لگا تھا۔ وہ نویں مغل بادشاہ فرخ سیر کی نسل سے تھا۔

جب نجم النسا پندرہ سال کی ہوئی تو شہزادے کی پسند شدید چاہت میں بدل چکی تھی۔ اس کا علم جب شاہ عالم ثانی کو ہوا تو اس نے فیصلہ کیا کہ نجم النسا جب اور بڑی ہو جائے گی تو وہ اس کی شادی اسی شہزادے سے کرا دے گا۔

شاہ عالم ثانی مرہٹوں کی مدد سے تخت شاہی پر بیٹھ سکا تھا مگر نام ہی کا بادشاہ تھا۔ صحیح معنوں میں اس کی حکومت قصر شاہی سے باہر نہیں تھی۔ سارے شہر دہلی پر مرہٹوں کے سردار سندھیا ہی کا راج تھا۔ بعض اوقات مرہٹے شاہی محل میں بھی گھس آتے تھے اور شاہ عالم ثانی اتنا بے بس تھا کہ ان مرہٹوں کو روک ٹوک بھی نہیں سکتا تھا۔

جب نجم النسا کی عمر پندرہ سال ہو چکی تھی تو اس کے ساتھ بھی وہ حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا جو اس کی ماں شہزادی مہر النسا کے ساتھ ہو چکا تھا۔ ایک مرہٹے نے نجم النسا پر دست درازی کی کوشش کی تھی مگر عین وقت پر شاہ عالم ثانی وہاں پہنچ گیا تھا اور نوجوان مرہٹہ گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

بعد میں شاہ عالم ثانی نے اس کی شکایت سندھیا سے بھی کی تھی لیکن نتیجے میں سندھیا نے اس مرہٹے کو معمولی سی سرزنش کی تھی، اسے کوئی سخت سزا نہیں دی تھی۔ اس پر یہ پابندی بھی نہیں لگائی تھی کہ اب وہ کبھی شاہی محل میں داخل نہیں ہوگا۔

اس صورتِ حال نے شاہ عالم ثانی کو بے حد فکر مند کر دیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ مرہٹہ پھر کبھی کسی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ایسی اندوہناک صورت حال سے بچنے کے لیے شاہ عالم ثانی نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر ایک ایسا فیصلہ کیا کہ آب دیدہ بھی ہو گیا۔ اس نے بہت خفیہ طور پر نہایت سادگی کے ساتھ نجم النسا کا نکاح اس شہزادے سے کرا دیا جو اسے چاہتا تھا اور یہ ہدایت بھی کی کہ وہ دایہ بیگم کے ساتھ چوری چھپے شاہی محل سے چلے جائیں اور شہر میں عام لوگوں کی طرح زندگی گزاریں۔

شاہ عالم ثانی کو دایہ بیگم کی وفاداری پر مکمل بھروسا تھا۔ اس نے ممکنہ حد تک کچھ رقم اور ہیرے جواہرات دایہ بیگم کو دیے تھے تاکہ ان تینوں کے لیے زندگی گزارنے کا سہارا تو ہو، اور ہیرے جواہرات بیچ کر شہزادہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار بھی شروع کر سکتا تھا۔

نجم النسا تو اس واقعے کی وجہ سے دہشت زدہ ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اور شہزادے کو محل چھوڑنے میں اس لیے تامل نہیں تھا کہ شاہی محل میں رہتے ہوئے بھی اس کی زندگی شہزادوں کی طرح نہیں گزر رہی تھی۔

محل کے حالات نہایت دگرگوں تھے اور خاندان شاہی کے افراد کی تعداد کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ شاہی حرم سرا کی عورتوں کی تعداد سیکڑوں میں تھی ان کی خدمت کے لیے کنیزیں بھی مامور تھیں۔ اسّی سے زیادہ شہزادے قلعے میں نظر بند تھے۔ وہ سابقہ بادشاہوں یا ان شہزادوں کی نسل سے تھے جو کبھی تخت شاہی کے دعوے دار رہے تھے لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ انہیں اس لیے نظر بند کیا گیا تھا کہ وہ محل میں کوئی بغاوت نہ کھڑی کر دیں۔ وہ شہزادے بال بچے دار بھی تھے مگر ان کے رہنے کے لیے مختصر قیام گاہیں تھیں۔ صرف ایک خواب گاہ، ایک باورچی خانہ اور اس سے ملحقہ کچھ حصے۔ ان کو وظیفہ بھی اتنا کم ملتا تھا کہ وہ خواجہ سرا بھی ملازم نہیں رکھ سکتے تھے۔ ان کی مختصر قیام گاہوں کے دروازوں پر ایک ناظر کی سرکردگی میں سپاہی پہرا دیا کرتے تھے۔ وہ ناظر شاہ عالم ثانی کا ایک معتمد خواجہ سرا تھا۔

ان نظر بند شہزادوں کے علاوہ شاہ عالم ثانی ہی کی ستائیس اولادیں تھیں۔ انہیں ملنے والا وظیفہ بھی کچھ ایسا اطمینان بخش نہیں تھا۔ ان میں سے بس چند شہزادے یا شہزادیاں ایسی تھیں جن کو ملنے والا وظیفہ کسی حد تک اطمینان بخش تھا۔ ان میں دو ایک شہزادے ایسے تھے جن پر شاہ عالم ثانی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ مہربان تھا۔

ان حالات کی ایک وجہ تو مرہٹے ہی تھے جو بہت کچھ ہڑپ کر جانا چاہتے تھے، دوسرے سلطنت کی دگرگوں حالت سے فائدہ اٹھا کر بہت سے صوبے خود مختار ہو چکے تھے جس کے باعث شاہی خاندان کی آمدنی بے حد کم ہو چکی تھی۔

نجم النسا سے محبت کرنے والا شہزادہ اس لیے نظر بند نہیں تھا کہ اس کی فطرت میں جاہ پرستی نہیں تھی اور شاہ عالم ثانی نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی وجہ سے محل میں کوئی بغاوت سر نہیں اٹھا سکتی تھی۔ وہ نہایت نیک اور بے ضرر شہزادہ تھا۔

جب رات کی تاریکی میں شاہ عالم ثانی نے ان تینوں کو محل سے رخصت کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے اپنی مہر شدہ ایک خط کا نصف حصہ پھاڑ کر اپنے پاس رکھا

تھا اور نصف دایہ بیگم کے حوالے کیا تھا۔ اس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی جب اس نے کہا تھا۔

”ہمیں اب امید نہیں کہ ہمارے خاندان کی شان وشوکت کبھی بحال ہوسکے گی لیکن اگر معجزانہ طور پر ایسا ہوجائے تو تم تینوں واپس آجانا۔ شاید ہماری زندگی میں ایسا نہ ہو اس لیے ہم نے خط کا آدھا حصہ تمہیں دے دیا ہے۔ ہمارے پاس اس کا جو نصف حصہ ہے، وہ ہم مرنے سے پہلے اپنے وارث کو دے جائیں گے، ہمارا وارث جب ان دونوں حصوں کو جوڑ کر دیکھے گا تو اسے یقین آجائے گا کہ نجم النسا واقعی مغل شہزادی ہے۔ شاید تیموری خانوادے کا جاہ وجلال کبھی بحال ہوسکے اور تم لوگ محل آسکو۔“

اس طرح دایہ بیگم، شہزادی نجم النسا اور اس کا شوہر قصر شاہی سے رخصت ہوئے تھے۔ وہ رات ان تینوں نے ایک سرائے میں گزاری تھی اور دوسرے دن قلعہ معلیٰ سے دور دراز کے علاقے میں ایک مکان خرید لیا تھا۔ دو تین روز اس مکان کا ساز وسامان خریدنے میں لگے تھے۔

شہزادے نے اپنا نام بدل کر ذیشان رکھ لیا تھا۔ اس کا امکان مفقود ہی تھا کہ اسے کوئی مغل شہزادے کی حیثیت سے پہچان سکتا۔ عالم گیر ثانی کے قتل کے زمانے ہی میں حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ شہزادوں نے لال قلعے سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت تک ذیشان پیدا ابھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی پیدائش 1763ء کی تھی۔ شاہی محل چھوڑتے وقت وہ اکیس سال کا تھا۔ دہلی شہر کے گلی کوچے اس کے لیے قطعی اجنبی تھے۔ دایہ بیگم کے کہنے پر اس نے دو ڈھائی ماہ شہر سے آشنا ہونے کے لیے گھوم پھر کر گزارے تھے۔ اس کے بعد دایہ بیگم نے کچھ جواہرات بیچ کر ذیشان کو ایک چھوٹا سا کاروبار کرا دیا تھا۔ وہ بہت دانش مند اور محتاط خاتون تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہ بڑا کاروبار کرانے کی صورت میں ذیشان کی ناتجربہ کاری کے سبب سارا سرمایہ ڈوب نہ جائے لیکن ذیشان نے اپنی ذہانت سے ثابت کردیا کہ اس میں کاروبار کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ یہ اندازہ ہوجانے کے بعد ہی دایہ بیگم نے مزید کچھ زیورات بیچے تاکہ ذیشان اپنے چھوٹے سے کاروبار کو کچھ وسعت دے سکے۔

پھر کچھ ہی عرصے بعد دہلی میں ایک بار پھر بھونچال آیا۔ سندھیا کی طاقت کمزور پڑتے دیکھ کر غلام قادر خاں روہیلہ نے دہلی پر یلغار کردی تھی اور شاہی محل پر بھی قابض ہوگیا تھا۔

اس دن دایہ بیگم، ذیشان اور نجم النسا پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے جب شہر بھر میں ہی یہ بات پھیل گئی تھی کہ غلام قادر خاں نے خنجر سے شاہ عالم ثانی کی دونوں آنکھیں ختم کردی تھیں……

اب دہلی پر مرہٹوں کے بجائے ایک بار پھر روہیلوں کا راج ہوچکا تھا لیکن کچھ عرصے بعد سندھیا نے تیاری کرکے دوبارہ حملہ کیا تھا اور دہلی پر مرہٹے قابض ہوگئے تھے۔ غلام قادر کو انہوں نے ہلاک کرکے اس کی لاش کے ٹکڑے درختوں سے لٹکا دیے تھے۔

اسی منظر سے نجم النسا اتنی دہشت زدہ اور دہلی سے اتنی دہشت زدہ ہوئی تھی کہ وہ تینوں دہلی چھوڑ کر میسور چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے خاصا طویل عرصہ گزارا تھا۔ وہاں انہیں دہلی کے حالات کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے وہ دہلی واپس جانے اور شاہی محل کا رخ کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتے تھے۔

سترہ سال بعد میسور میں ہی انہوں نے شاہ عالم ثانی کے انتقال کی خبر سنی اور ایک بار پھر ان کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

وہ 1806ء کا زمانہ تھا۔ اسی سال شاہ عالم ثانی کا بیٹا معین الدین اکبر شاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس زمانے میں شاہی محل کے حالات خاصی حد تک ٹھیک ہوچکے تھے کیونکہ انگریزوں نے مرہٹوں کو وہاں سے بھگا کر شاہی محل کو تحفظ دے دیا تھا۔ شہر پر تو اس کی حکومت کم ہی تھی لیکن شاہی محل پر وہ مکمل حکمران تھا۔

اس وقت دایہ بیگم کی عمر ستر سال ہوچکی تھی۔ انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ وہ نہ جانے کب مرجائیں۔ اس وقت انہوں نے چاہا تھا کہ دہلی واپس جاکر شاہی محل کا رخ کیا جائے لیکن نجم النسا اس کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت بھی اسے یہ احساس شدت سے تھا کہ وہ مغل شہزادی مہر النسا کے بطن سے پیدا تو ہوئی تھی لیکن ناجائز طور پر…… اس کا خیال تھا کہ اب تک اس کے بارے میں محل کے بہت سے لوگوں کو معلوم ہوچکا ہوگا۔ وہ ان لوگوں کے سامنے جاکر شرمندگی محسوس کرتی۔

دایہ بیگم کو خاموش ہوجانا پڑا۔ اگرچہ نجم النسا ان کی اتنی عزت کرتی تھی جیسے وہی اس کی سگی ماں ہوں اور ذیشان بھی ان کا اتنا ہی احترام کرتا تھا لیکن دایہ بیگم نے یہ فراموش نہیں کیا تھا کہ وہ بہرحال مغلیہ شاہی خاندان کی ایک کنیز تھیں اور ان کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ نجم النسا پر حکم چلاتیں۔ نجم النسا اگرچہ شہزادی مہر النسا کی ناجائز بیٹی تھی لیکن بہرحال ایک مغل شہزادی تھی۔

لیکن جب گیارہ سال اور گزر گئے اور میسور کا شیر دل سلطان ٹیپو انگریزوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تو میسور کے حالات بھی خطرناک محسوس ہونے لگے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد نجم النسا کو وطن کی یاد بھی ستانے لگی تھی۔ اس خبر پر دہلی واپس لوٹنے کی تیاری کی گئی۔ میسور میں ذیشان نے اچھا خاصا کاروبار جما لیا تھا لیکن اسے وہ سب کچھ سمیٹنا پڑا۔

وہ دہلی واپس آگئے لیکن نجم النسا اپنے اس فیصلے پر قائم رہی کہ وہ قصر شاہی کا رخ نہیں کرے گی۔ وہ مرتے دم تک کبھی اپنے خاندان میں واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔

زرتاج میسور میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ جب وہ لوگ دہلی واپس لوٹے تو وہ تین سال کی تھی۔ اس وقت نجم النسا کی عمر پینتالیس سال تھی۔ دونوں میاں بیوی اولاد کی طرف سے مایوس ہوچکے تھے جب خدا نے زرتاج کی صورت میں انہیں خوشیوں سے نوازا تھا۔

دہلی آکر ذیشان نے ایک نیا کاروبار جما لیا تھا۔

نجم النسا کی خواہش پر دایہ بیگم اور ذیشان نے زرتاج پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ مغل شہزادی تھی کیونکہ اس کے ماں باپ دونوں ہی مغل شہزادی اور شہزادے تھے۔

ذیشان نے ایک مرتبہ بڑے کرب سے کہا تھا۔ ”میں تو اب تقریباً بھلا چکا ہوں کہ میں کوئی مغل شہزادہ ہوں۔“

زرتاج انیس سال کی ہوچکی تھی جب ذیشان کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے چند ماہ بعد ہی دایہ بیگم شدید علیل ہوئی تھیں۔ انہی دنوں میں انہوں نے زرتاج کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ ملازموں کو غالباً انہوں نے ہی کمرے سے رخصت کردیا تھا لیکن نجم النسا کمرے میں موجود تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور فکرمندی کے ساتھ افسردگی کے تاثرات بھی تھے جس کا سبب زرتاج کی سمجھ میں فوری طور پر نہیں آسکا تھا۔

دایہ بیگم کے لہجے میں نقاہت تھی جب انہوں نے زرتاج سے کہا۔ ”قریب آؤ…… میرے قریب…… میرے بستر پر ہی بیٹھو میری شہزادی!“

اس وقت زرتاج کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ واقعی شہزادی تھی۔ اس انداز تخاطب کو اس نے دایہ بیگم کی محبت اور پیار کے سوا کچھ نہیں سمجھا تھا۔

اپنے قریب بٹھا کر دایہ بیگم نے کہا تھا۔ ”آج میں زندگی میں پہلی بار تمہاری ماں کی حکم عدولی کرنے والی ہوں۔“

اس بات پر زرتاج آہستہ سے ہنس پڑی تھی۔ ”یہ کیا کہہ بیٹھیں آپ! کوئی ماں اگر اپنی بیٹی کی خواہش کے خلاف کچھ کہنا چاہے گی تو اسے حکم عدولی کیسے کہا جاسکتا ہے۔“

”ابھی سمجھ جاؤ گی تم، جب میں تمہیں ایک راز سے آگاہ کروں گی۔“

”راز؟“ زرتاج حیران ہوئی۔

”ہاں۔ ایک بہت گہرا راز میری شہزادی…… اب یہ بہت ضروری ہوگیا ہے کہ تمہیں اس راز سے آگاہ کردیا جائے۔ تمہارے والد کا انتقال ہوچکا ہے۔ گھر میں اب کوئی مرد نہیں ہے۔ میری عمر بھی اب بہت ہوچکی ہے۔ خدا کی مصلحت کہ اس نے مجھے اتنے دن زندہ رکھا۔“

اس وقت دایہ بیگم سو سال سے زیادہ کی ہوچکی تھیں۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ ”تمہاری ماں کی عمر بھی اڑسٹھ سال ہورہی ہے۔ خدا ان کی عمر میری ہی عمر کی طرح دراز کرے لیکن اس دار فانی سے سبھی کو ایک نہ ایک دن کوچ کرنا ہے۔ یہ اب بھی اس کے خلاف ہیں کہ تمہیں اس راز سے آگاہ کیا جائے اور تم بھی اس دکھ سے دوچار ہوجاؤ جس دکھ میں تمہاری ماں نے زندگی گزاری ہے۔ تم اب تک شادی سے بھی انکار کرتی رہی ہو۔ اب مناسب یہی ہوگا کہ تم دونوں اپنے خاندان میں لوٹ جاؤ۔“

زرتاج حیرت سے بولی۔ ”کیا ہمارا کوئی اور خاندان بھی ہے؟“

”ہاں۔“ دایہ بیگم کے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی مرجھائی ہوئی تھی۔ ”اب میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔ بہ ظاہر وہ ایک کہانی سی لگے گی لیکن اس کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔“

اس وقت زرتاج نے حیرت سے دیکھا کہ اس کی ماں نجم النسا کی آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں۔

اس کے بعد زرتاج نے دایہ بیگم سے وہ سب کچھ سنا جس کا آغاز پندرہ سالہ مغل شہزادی مہر النسا سے شروع ہوا تھا۔

☆☆☆

وہی سب کچھ فیضان نے زرتاج سے سنا۔ سکتے میں تو وہ اسی وقت آگیا تھا جب زرتاج نے کہا تھا۔ ”میں بدنصیب ایک مغل شہزادی ہی ہوں۔“ لیکن وہ ساری کہانی سننے کے بعد تو اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ ہونق ہوگیا ہو۔

زرتاج کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ اس نے وہ پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ”سب کچھ بتانے کے بعد دایہ بیگم نے مجھے اس خط کا آدھا حصہ بھی دکھایا جو میری والدہ کے ماموں آنجہانی شاہ عالم ثانی نے

ان لوگوں کو محل سے رخصت کرتے وقت دایہ بیگم کو دیا تھا۔ وہ آدھا حصہ ایسا ہے کہ شاہی مہر بھی اس پر آدھی ہے۔ باقی آدھی اس خط کے دوسرے حصے پر ہوگی اگر آنجہانی شاہ عالم ثانی نے وہ اپنے بیٹے اکبر ثانی کے حوالے کر دیا ہوگا۔ اعلیٰ حضرت اکبر ثانی میری والدہ کے ماموں زاد بھائی اور اسی رشتے سے میرے ماموں ہیں۔"

"یہ سب کچھ سن کر...... میرے دماغ کی چولیں ہل گئی ہیں۔" فیضان اٹک اٹک کر بولا۔

"جو حالت اس وقت تمہاری ہے فیضان، وہی حالت اس وقت میری ہوئی تھی جب دایہ بیگم نے مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا اور میری والدہ تو اس وقت روتی ہوئی کمرے سے ہی چلی گئی تھیں۔"

کمرے میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ فیضان نے اٹھ کر موم شمعیں روشن کیں۔ وہ جب واپس زرتاج کے پاس جا کر بیٹھا تو اس کے چہرے سے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہو۔ گوہر کے بھیجے ہوئے شربت کی طرف ان دونوں ہی کا دھیان نہیں گیا تھا۔

"اس رات۔" زرتاج نے فیضان کی طرف دیکھے بغیر کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ "مجھے ایک پل کے لیے بھی نیند نہیں آسکی تھی۔ مجھے ان روہیلوں کا خیال بھی آیا تھا جن کے بارے میں دادا نے بتایا تھا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ان روہیلوں ہی سے اس زیادتی کا انتقام لیا جائے جو ان کے سردار نے میری ماں کی والدہ کے ساتھ کی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے مجھ میں اتنی جرأت پیدا ہو چکی تھی کہ میں ہی ان روہیلوں کو ختم کروں گی۔ میرا عزم بہت پختہ ہو چکا تھا۔"

"تم جیسی لڑکی کا اتنا جرأت مند ہو جانا حیرت انگیز ہے۔"

"بالکل حیرت انگیز نہیں ہے فیضان...... آخر میں ایک مغل شہزادی ہوں، جب میں تیرہ یا بارہ سال کی تھی تو دایہ بیگم نے مجھے بہت سی مغل شہزادیوں کے قصے سنائے تھے۔ اس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ میں کون ہوں لیکن اب تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میں کون ہوں۔ میرے جدِ امجد عظیم تیمور کی بیوی حمیدہ بیگم بھی رزم و بزم، دونوں میں طاق تھیں۔ امیر تیمور کے پوتے میران شاہ کی بیٹی شہزادی آغا بیگی نے بہت کم عمری میں فنون حرب سیکھ لیے تھے۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جب ان کے پاس سپاہ نہ تھی تو انہوں نے صرف کنیزوں اور غلاموں کے ساتھ اپنے دشمنوں سے ایک خوں ریز جنگ کی تھی اور دشمنوں کو بھاگ نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجھے دس بارہ مغل شہزادیوں کی زندگی کے حالات معلوم ہیں۔ کہاں تک سناؤں۔ وقت بھی کم ہے۔ اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔"

"بارہ تیرہ سال کی عمر میں سنے ہوئے وہ قصے تمہیں یاد ہیں لیکن مجھے اس پر حیرت نہیں۔ تمہاری یادداشت بہت غیر معمولی ہے۔"

"اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے ان روہیلوں کے نام کیسے یاد رہتے جن کے نام دادا نے بتائے تھے۔ بس یہ ذرا خلط ملط ہو گیا تھا کہ ان میں سے کون کس علاقے میں رہتا ہے لیکن علاقوں کے نام یاد تھے۔ بعد میں جستجو کر کے میں نے جان لیا تھا کہ ان میں سے کون کس علاقے میں رہتا ہے۔"

"ان سب کو تم نے قتل کیا کیسے؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ پھر کسی وقت سناؤں گی۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔ مجھے پالکی منگوا دو۔"

فیضان نے گوہر کو آواز دے کر اس سے کہا کہ وہ کسی ملازم کے ذریعے زرتاج کے لیے پالکی منگوائے۔

"تم بہت ہوشیار رہنا فیضان!" زرتاج نے کہا۔

"کس معاملے میں؟"

"ابھی تم مجھے بتا چکے ہو کہ کوئی فرنگن تمہارا تعاقب کر رہی تھی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کچھ دن کی نگرانی کے بعد وہ لوگ میری طرف سے مطمئن ہو جائیں گے۔ میں تو تمہارے لیے فکر مند ہو رہا ہوں۔ آئندہ کے لیے تمہارے عزائم کیا ہیں؟"

"افضال خاں۔" زرتاج نے دانت پر دانت جما لیے، وہ فیضان کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے بولی۔ "اس آخری روہیلے کو ختم کر کے ہی میرا کلیجا ٹھنڈا ہوگا۔"

"بہت ہو چکا ہے، اب اس کا خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔ اب تک قسمت نے تمہارا ساتھ دیا ہے اور تم پکڑی نہیں جا سکی ہو لیکن ضروری نہیں کہ قسمت ہمیشہ انسان کا ساتھ دیتی رہے۔"

"دس آدمیوں کے قتل تک قسمت نے میرا ساتھ دیا ہے تو اب بھی ساتھ دے گی اور اگر نہ دے تو اب میں یہ خیال بھی اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتی کہ مجھے افضال خاں کو ختم کرنا ہے۔"

"تم نے کچھ منصوبہ بندی کی ہے؟"

"ابھی نہیں کر سکی۔ اگرچہ میں تین ایسے روہیلوں کو بھی قتل کر چکی ہوں جو میرے گھر سے خاصے دور تھے لیکن افضال خاں تو خاصی دور رہتا ہے۔ اسی لیے میں ابھی تک کوئی منصوبہ نہیں بنا سکی ہوں۔"

"شاہی محل واپس جانے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"والدہ کسی قیمت پر تیار نہیں ہو رہی ہیں اور میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ دایہ بیگم کو یہی پریشانی لاحق ہے نا کہ اب گھر میں کوئی مرد نہیں لیکن......" زرتاج نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "میں افضال خاں کے معاملے سے فارغ ہو جاؤں تو ہماری شادی ہو جائے گی۔ مجھے ایک مرد کا سہارا مل جائے گا۔"

"لیکن دایہ بیگم اور تمہاری والدہ؟ وہ تو بے سہارا ہی رہ جائیں گی۔"

زرتاج نے کچھ چونکے ہوئے انداز میں فیضان کی طرف دیکھا اور پھر سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ "یہ خیال تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ دادا یقیناً اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے کہ تم گھر داماد بن کر ہمارے ساتھ رہو...... خیر چھوڑو۔ اس معاملے پر بعد میں غور کر لیا جائے گا۔"

"اچھا ہاں......! ایک ضروری خیال آیا۔ جب تم افضال خاں کے سلسلے میں کوئی منصوبہ بنالو تو مجھے ضرور بتانا۔"

"نہیں۔ میں تم کو اس سارے معاملے سے الگ رکھنا چاہتی ہوں۔ اسی لیے تو میں شادی سے پہلو بچاتی رہی ہوں۔"

"میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔ تم اس معاملے سے الگ ہی رہو۔"

"کیا یہ حکم ہے شہزادی صاحبہ؟" فیضان پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"مجھے اس طرح مخاطب کر کے میرا دل خون نہ کرو۔" زرتاج نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے لیے صرف زرتاج ہوں اور زرتاج ہی رہوں گی۔ آئندہ کبھی مجھے شہزادی کہہ کر مخاطب نہ کرنا۔"

فیضان نے ایک طویل سانس لی، پھر سنجیدگی سے بولا۔ "آج رات بھر تمہاری باتیں میرے ذہن میں چکراتی رہیں گی اور آئندہ بھی شاید کچھ دن تک مجھے یہی خیال رہے گا کہ تم نے مجھے خواب میں کوئی کہانی سنائی تھی اپنے بارے میں۔"

"دایہ بیگم سے سب کچھ سننے کے بعد مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگا تھا جیسے میں نے کوئی کہانی سنی ہو۔ اگر میں نے اپنے نانا...... میرا مطلب ہے...... اپنی نانی شہزادی مہرالنسا کے بھائی، آنجہانی شاہ عالم ثانی کو میں نانا ہی کہوں گی نا......! اگر میں نے ان کے خط کا نصف حصہ نہ دیکھا ہوتا تو شاید مجھے بھی مشکل ہی سے اس کا یقین آتا کہ دایہ بیگم نے مجھے حقیقت سے آگاہ کیا تھا، کوئی کہانی نہیں سنائی تھی۔"

"آج دایہ بیگم کی طبیعت کیسی تھی جب تم گھر سے چلی تھیں؟"

"جب سے وہ بیمار پڑی ہیں، ان کی حالت میں کوئی فرق ہی نہیں آرہا ہے۔ جب انہوں نے مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا، اس وقت ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا کہ ان کا آخری وقت بہت قریب آگیا ہے لیکن اب سال بھر سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی ان کی وہی حالت ہے۔ کچھ نہیں معلوم، کب وہ ہم ماں بیٹی کو داغ مفارقت دے جائیں۔" یہ جواب دیتے ہوئے زرتاج کی آواز جذبات سے بوجھل ہو گئی تھی۔

اسی وقت کمرے کے باہر سے گوہر کی آواز آئی۔

"پالکی آگئی ہے بھیّا!"

"اچھا!" فیضان نے جواباً کہا۔

پھر وہ اور زرتاج کمرے سے نکلے۔ گوہر نے غور سے ان دونوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً یہ اندازہ لگانا چاہتی ہوگی کہ آج تنہائی میں ان دونوں نے کیا باتیں کی ہوں گی۔

جب زرتاج پالکی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئی تو اس کے پیچھے فیضان کا گھوڑا بھی تھا۔

گھروں میں جلتی ہوئی موم شمعوں اور ان شمعوں کے فانوسوں کی روشنی بہ مشکل ہی دریچوں سے نکل کر راہ گزر تک آرہی تھی۔ رات کا ابتدائی پہر تھا اس لیے شاہی یا انگریز سپاہ کی طلایہ گردی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن نزدیک و دور سے کچھ گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ اندھیرا پھیلنے کے بعد اپنے گھروں کو جا رہے ہوں گے۔ کہیں کہیں کوئی پیدل جاتا ہوا بھی نظر آرہا تھا...... ترکمان دروازے سے گزرتے ہوئے ایک پالکی بھی جاتی نظر آئی تھی۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد کرائے پر چلنے والی یا لوگوں کی ذاتی پالکیاں کم ہی نظر آتی تھیں۔ وہ دہلی پر نادر شاہ افشار سے پہلے کا زمانہ تھا جب اس وقت بھی شہر بارونق نظر آیا کرتا تھا۔

زرتاج کا گھر موم گروں کے چھتے میں داخل ہوتے ہی تھا، فیضان یہ دیکھ کر چونک گیا کہ گھر کے باہر خاصے لوگ جمع تھے۔

زرتاج جب گھر میں داخل ہوئی تو وہ بھی ہکا بکا سی ہوگئی کیونکہ وہاں آس پاس رہنے والی خاصی عورتیں اور جوان لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ لڑکیاں لپک کر زرتاج کے قریب آگئیں۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ حقیقت جانتے ہی زرتاج کی کیا حالت ہوگی۔

گھر سے روانگی کے وقت زرتاج کو سان گمان ہی نہ تھا کہ اس کی واپسی پر ایک بہت بڑا سانحہ اس کا منتظر ہوگا۔ دایہ بیگم کا انتقال ہوچکا تھا۔ ان کی آخری ہچکی کے ساتھ انہیں بے حس وحرکت دیکھ کر ملازمہ چیخنے چلانے لگی تھی تو نجم النسا جو گھر کے کسی حصے میں کچھ کر رہی تھی، دوڑی دوڑی وہاں پہنچی تھی۔

ملازم جلدی سے قریب ہی رہنے والی اس طبیبہ کو بلا لایا تھا جو دایہ بیگم کا علاج کر رہی تھی۔ اس کی آمد تک نجم النسا آنکھیں پھاڑے ساکت پڑی دایہ بیگم کو تکتی رہی تھی لیکن جب طبیبہ نے ”اناللہ وانا الیہ راجعون“ پڑھتے ہوئے دایہ بیگم پر چادر ڈالی تو نجم النسا کھڑے کھڑے کسی اچانک کٹ جانے والے درخت کی طرح گر پڑی۔ طبیبہ جلدی سے اس کی طرف لپکی، کھیل وہاں بھی ختم ہوچکا تھا۔ نجم النسا کی حرکت قلب بند ہوگئی تھی۔

ملازم اور ملازمہ کی وجہ سے یہ خبر محلے میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ عورتیں جلدی جلدی زرتاج کے گھر میں پہنچیں۔ مرد گھر کے باہر جمع ہونے لگے۔

زرتاج نے اس سانحے سے باخبر ہوتے ہی اپنا سر دیوار سے ٹکرا دینا چاہا تھا مگر جو لڑکیاں پہلے ہی اس کے قریب آچکی تھیں، انہوں نے ایسا نہیں ہونے دیا لیکن روتے اور پچھاڑیں کھاتے ہوئے اسے روکنا کسی کے اختیار میں نہیں تھا۔ بہ مشکل اسے سنبھالنے ہی کی کوششیں کی جاتی رہیں۔

باہر جمع ہونے والے لوگوں سے فیضان کو اس سانحے کا علم ہوگیا تھا لہٰذا اس نے برق رفتاری سے اپنا گھوڑا واپس گھر کی طرف دوڑا دیا تھا۔ وہ بہت جلدی اپنی بہن گوہر کو وہاں لے آیا۔

گوہر جب وہاں پہنچی تو زرتاج پر غشی طاری تھی اور طبیبہ اس کے حلق میں کوئی عرق انڈیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اشک بار گوہر نے زرتاج کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

وہاں موجود عورتوں نے حیرت سے دیکھا کہ ایک انگریز جوان لڑکی بھی گھر میں گھس آئی تھی اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں اس سانحے کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔

☆☆☆

رات کا نصف پہر ہونے سے پہلے ہی کیپٹن اسٹیورٹ کو اس واقعے کی اطلاع ملی۔

سلویا اس سے کہہ رہی تھی۔ ”فیضان جب اپنے گھر واپس لوٹا تھا تو اس کے بعد بھی میں وہاں آس پاس خاصی دیر تک چکر لگاتی رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگانا چاہا تھا کہ فیضان کے گھر کے آس پاس رہنے والے لوگ کس قسم کے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے سارجنٹ جیکب کا بھی انتظار تھا جو میرے بعد فیضان کے گھر کی نگرانی جاری رکھتا لیکن سارجنٹ کو کچھ دیر ہوگئی تھی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا جب فیضان کے گھر سے ایک پالکی روانہ ہوئی فیضان بھی اپنے گھوڑے پر سوار اس پالکی کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں اس صورت حال میں سارجنٹ جیکب کا انتظار تو کر نہیں سکتی تھی۔ میں نے فیضان اور اس پالکی کا تعاقب شروع کر دیا۔ یہ تو میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس پالکی میں کوئی عورت ہوگی لیکن یہ اندازہ لگانا میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ عورت کون ہے اور فیضان اسے اس وقت کہاں لے جا رہا ہے۔“

کیپٹن اسٹیورٹ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس مختصر سے دورانیے میں اس نے شراب کا ایک پیگ بنا لیا تھا۔

سلویا کہہ رہی تھی۔ ”اس تعاقب کا اختتام موم گروں کے چھتے پر ہوا جہاں اچھے خاصے لوگ جمع تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہاں کوئی خاص واقعہ ہوچکا ہے۔“

”موم گروں کے چھتے“ کا نام سنتے ہی کیپٹن اسٹیورٹ کی پیشانی پر ہلکی سی شکن پڑ گئی تھی۔ کیپٹن اسمتھ کے ساتھ وہ چٹلی قبر کے آس پاس کا سارا علاقہ دیکھ چکا تھا اور اسے کیپٹن اسمتھ سے چٹلی قبر کے اردگرد کے تمام محلوں کے نام بھی معلوم ہوچکے تھے۔ انہی میں سے ایک نام ”موم گروں کا چھتا“ بھی تھا۔

”اس وقت میری نظر سارجنٹ جیکب پر بھی پڑی جو اپنا گھوڑا میرے گھوڑے کے قریب لے آیا تھا۔ تم تو جانتے ہی ہو کیپٹن کہ جیکب بہت شرارتی ہے اور خصوصاً مجھے تنگ کرنے میں اسے بہت مزہ آتا ہے۔ جب میں نے اس پالکی اور فیضان کا تعاقب شروع کیا تھا، اس وقت وہ وہاں آچکا تھا لیکن میرا لیکن محض مجھے ستانے کے لیے مجھ سے دور رہا تھا لیکن میرا تعاقب کرتا رہا تھا۔ اس کی یہ شرارت اس وقت کام آگئی۔ میں وہاں رک کر جاننا چاہتی تھی کہ وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا جو اتنے لوگ جمع تھے، لیکن اگر جیکب نہ مل گیا ہوتا تو میں فیضان ہی کے تعاقب میں جاتی جو وہاں جمع لوگوں سے پوچھ گچھ کے بعد اپنے گھوڑے پر تیزی سے روانہ ہوگیا تھا۔

میں نے جیکب سے کہا کہ وہ فیضان کے تعاقب میں جائے۔ میں نے وہاں کے لوگوں کی آپس کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ اس گھر میں دو عورتوں کی موت واقع ہوچکی تھی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد یہ نتیجہ تو اخذ کیا ہی جاسکتا تھا کہ جو عورت پالکی میں وہاں آئی تھی، وہ کوئی تیسری عورت ہوگی۔ میں نے اس کے بارے میں بھی جاننا ضروری سمجھا اور گھر میں گھس گئی۔ وہاں میں نے عورتوں سے اس طرح باتیں کیں جیسے محض تجسس کے باعث اندر پہنچ گئی تھی، کوئی خاص مقصد نہیں تھا میرا۔ اس طرح مجھے خاصی معلومات حاصل ہوگئیں۔“

کیپٹن اسٹیورٹ نے پہلا پیگ بہت تیزی سے ختم کرڈالا تھا اور اب دوسرا پیگ بنا رہا تھا لیکن اب بھی وہ خاموشی ہی اختیار کیے رہا۔ ابھی تک سلویا کی رپورٹ میں اسے اس کے علاوہ کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی تھی کہ جس گھر میں دو عورتوں کی موت واقع ہوئی تھی، وہ گھر موم گروں کے چھتے میں تھا۔

سلویا نے دایہ بیگم، نجم النسا اور زرتاج کے بارے میں وہ سب کچھ بیان کرڈالا جو ان تینوں کے بارے میں محلے کے لوگ جانتے تھے۔

”فیضان وہاں دوبارہ نہیں آیا؟“ کیپٹن اسٹیورٹ شراب کی ایک چسکی لے کر پہلی مرتبہ بولا۔

”اب میں اسی طرف آرہی تھی۔“ سلویا نے جواب دیا۔ ”فیضان واپس آیا تھا تو اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی کا نام گوہر جہاں ہے اور وہ فیضان کی بہن ہے۔“

”بہت اچھے سلویا، بہت اچھے۔“ کیپٹن اسٹیورٹ مسکرایا۔ ”مجھے تو خیر اس کا علم پہلے سے ہے کہ فیضان کی کوئی بہن گوہر جہاں بھی ہے لیکن تم نے جو اتنی معلومات کرلیں تو واقعی کمال کیا ہے۔“

”میں نے اس سے زیادہ اہم باتیں بھی معلوم کی ہیں کیپٹن!“ سلویا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دراصل وہاں جو لڑکیاں تھیں، ان میں سے ایک نے ہماری زبان سیکھی ہے اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ یہ ہندوستانی ہمارے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہوچکے ہیں۔ اس لڑکی نے انگریزی میں مجھ سے بڑے شوق سے باتیں کیں۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ فیضان اور زرتاج کے گھرانوں میں کوئی رشتے داری نہیں ہے لیکن شاید ہوجائے۔“

”کیا مطلب؟“

”دراصل فیضان، گوہر اور زرتاج نے بچپن سے ایک ہی مکتب میں پڑھا ہے اور ان کی دوستی گہری ہوجانے کے سبب دونوں گھروں کے لوگوں کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بھی ہوچکا ہے۔ اس لڑکی کو بڑی حد تک شبہ ہے کہ فیضان اور زرتاج ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں لیکن اب تک ان دونوں کی شادی کیوں نہیں ہوئی، اس کا اندازہ اس لڑکی کو بھی نہیں تھا جس نے مجھے یہ سب کچھ بتایا۔“

کیپٹن اسٹیورٹ نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شراب کی ایک چسکی لی۔

”مجھے بس یہی رپورٹ دینا تھی۔“ سلویا نے کہا۔ ”اس کے علاوہ کوئی بات میرے علم میں نہیں آئی۔“

”جیکب کہاں ہے؟“

”فیضان کیونکہ زرتاج ہی کے گھر پر تھا اس لیے میں جیکب کو وہیں چھوڑ کر آئی تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہوگا۔“

”وہیں ہوگا ابھی۔“ کیپٹن اسٹیورٹ نے کہا۔ ”چونکہ دونوں گھروں میں قریبی تعلقات ہیں اس لیے ابھی فیضان کو بھی وہیں ہونا چاہیے۔ اب تم جا کے آرام کرو سلویا!“

”ایک بات پوچھنا چاہوں گی۔“

کیپٹن اسٹیورٹ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ سلویا بولی۔ ”مجھے محسوس ہوا تھا کہ موم گروں کے چھتے کا نام سن کر تم چونکے تھے۔“

”یہ بھی سمجھ گئیں!“ کیپٹن اسٹیورٹ مسکرایا۔ ”تم بہت ذہین ہو سلویا! اسی لیے میں نے فیضان کی نگرانی پر جیکب کے ساتھ تمہیں مامور کیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے سلویا کہ تین کے علاوہ باقی قتل چٹلی قبر کے آس پاس ہی ہوئے ہیں اس لیے میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا کہ قاتل شاید اسی علاقے میں کہیں رہتا ہو اور موم گروں کا چھتا بھی اسی علاقے میں ہے۔“

سلویا چونک کر بولی۔ ”تو کیا اب تم یہ شبہ کرو گے کہ ان روہیلوں کو قتل کرنے والی زرتاج ہے؟“

کیپٹن اسٹیورٹ ہنس پڑا۔ ”نہیں، اس لڑکی پر قاتل ہونے کا شبہ کرنا تو بے کار بات ہے۔ ایک لڑکی یہ سب کچھ نہیں کرسکتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ فیضان کے بارے میں بھی مجھے بس شبہ ہی ہے۔ ضروری نہیں کہ میرا شبہ درست ثابت ہو مگر کیونکہ اس معاملے کا کوئی اور سرا ابھی ہاتھ نہیں آیا، اس لیے میں نے سوچا تھا کہ کام تو کہیں سے شروع کرنا ہی چاہیے۔“

”تو پھر میں ایک بات کہوں!“ سلویا بولی۔ ”یہ خیال ابھی اچانک ہی میرے دماغ میں آیا ہے۔ کیا یہ شبہ

نہیں کیا جاسکتا کہ ان روہیلوں کے قتل میں زرتاج اور فیضان، دونوں ہی ملوث ہوں۔"

"اوہ!" کیپٹن اسٹیورٹ یکایک سنجیدہ ہوا اور سلویا کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔ "جب میں فیضان پر شبہ کررہا ہوں تو پھر تمہارے دماغ میں آنے والے اس خیال کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"

"تو پھر زرتاج......"

"اب یہ موضوع ختم کرو۔" کیپٹن اسٹیورٹ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آج میں دن بھر اتنا مصروف رہا ہوں کہ دماغ بہت تھک گیا ہے۔ میں اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔ کل ہی سوچوں گا کہ مزید کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔"

"تو پھر میں چلتی ہوں۔" سلویا کھڑی ہوگئی۔

اسے رخصت کرنے کے بعد کیپٹن اسٹیورٹ نے اپنی خواب گاہ کا رخ کیا۔

☆☆☆

دوسرے دن نجم النسا اور دایہ بیگم کی تدفین ہوگئی۔ زرتاج رات بھر جاگتی رہی تھی۔ گوہر کے علاوہ پڑوس کی دو تین لڑکیاں اور دو ایک ادھیڑ عمر عورتیں بھی اس کے ساتھ رہی تھیں ورنہ تنہائی میں تو وہ وحشت زدہ ہو کر اپنا نہ جانے کیا حال کر بیٹھتی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں اتنی سرخ ہوگئی تھیں جیسے انگارے دہکنے لگے ہوں۔ جب دایہ بیگم اور نجم النسا کے جنازے اٹھے تھے، اس وقت بھی وہ دھاڑیں مار مار کر روئی تھی۔

جنازے میں رحمان دادا بھی شریک ہوئے تھے۔ جب وہ لوگ واپس لوٹے تو گوہر نے ذرا دیر کے لیے باہر آکر فیضان کو بتایا تھا کہ زرتاج اب بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ فیضان خود اسے دیکھنے اندر نہ جاسکا کیونکہ وہاں دیگر خواتین بھی موجود تھیں......

سب لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست رحمان دادا نے کیا تھا۔ کھانے کے بعد لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے۔ زرتاج کھانا تو کیا کھاتی، اس نے چکھا تک نہیں تھا۔

"تو پھر میں بھی کچھ نہیں کھاؤں گی۔" گوہر نے کہا تھا۔

زرتاج گم صم بیٹھی رہی تھی۔ تمام لوگوں کے جانے کے بعد زرتاج کے ساتھ صرف گوہر رہ گئی تھی۔ اس وقت فیضان کو زرتاج سے ملنے کا موقع مل سکا۔ زرتاج نے اسے دیکھا اور بس تکتی رہی، کچھ بولی نہیں۔ اس کی آنکھیں اب خشک لیکن سرخ تھیں۔ چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

"کچھ کھالو زرتاج...... دو چار لقمے۔" فیضان نے کہا تھا۔ "گوہر نے بتایا تھا کہ تمہاری وجہ سے اس نے کچھ نہیں کھایا تو پھر میرا دل بھی نہیں چاہا۔ جب تک تم نہیں کھاؤ گی، ہم دونوں بہن بھائی بھی بھوکے ہی رہیں گے۔"

زرتاج اس وقت بھی خاموش ہی رہی تھی، جیسے اسے فیضان اور گوہر کے بھوکا رہنے سے بھی کوئی دلچسپی نہ ہو۔ لیکن رات کو اس نے گوہر اور آس پاس کی دو ایک لڑکیوں کے مجبور کرنے پر دو چار لقمے کھالیے...... اس کے چہرے سے اب بہت زیادہ نقاہت ظاہر ہونے لگی تھی۔ رات کا نصف پہر گزر جانے کے بعد اسے نیند آگئی۔ گوہر اس کے ساتھ ہی سوئی۔ فیضان کی اجازت سے وہ وہیں رہ گئی تھی۔ خود رحمان دادا بھی یہی چاہتے تھے کہ جب تک کوئی بہتر صورت حال پیدا نہ ہوسکے، گوہر وہیں رہے ورنہ زرتاج صرف ایک ملازمہ کے ساتھ رہ جاتی۔ ایک ملازم بھی تھا لیکن وہ گھر کے باہر ہی رہتا تھا۔

دن گزرتے رہے۔ دایہ بیگم اور نجم النسا کا چہلم بھی گزر گیا۔

"اب تم اپنے گھر جاؤ گوہر!" ایک شام زرتاج نے کہا۔ "میرا تو مقدر ہی تنہائی ہے۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔"

"بھیا مجھے حکم دے چکے ہیں کہ میں یہاں سے نہیں ہلوں گی۔" گوہر نے جواب دیا۔ "دادا چاہتے ہیں کہ تم ہمارے گھر آجاؤ۔"

دایہ بیگم اور نجم النسا کے انتقال کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے اس لیے گوہر یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اب زرتاج کو اس کے بھائی سے شادی کرکے ان کے گھر آجانا چاہیے۔ لیکن زرتاج نے سنی ان سنی کردی۔ فیضان روزانہ سہ پہر کو آیا کرتا تھا اور خاصا وقت گزار کے اپنے گھر جایا کرتا تھا۔ دن میں وہاں کا ایک آدھ چکر رحمان دادا بھی لگالیتے تھے۔

ایک سہ پہر فیضان آیا تو زرتاج کمرے میں اکیلی ہی تھی۔ گوہر باورچی خانے میں ملازمہ کی مدد سے رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ دایہ بیگم اور نجم النسا کے سوئم تک تو دادا رحمان کھانا لاتے رہے تھے لیکن سوئم کے بعد گھر میں چولہا جلایا جاسکتا تھا اس لیے باورچی خانہ گوہر نے سنبھال لیا تھا۔ ملازمہ کو کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ وہ گوہر کی صرف مدد ہی کرسکتی تھی۔ اسے رکھا بھی صرف دایہ بیگم کی دیکھ بھال کے لیے گیا تھا۔

اس روز فیضان کو زرتاج سے تنہائی میں باتیں کرنے

کا موقع مل سکا۔

"یہ اتار چڑھاؤ، زندگی کا لازمی حصہ ہیں زرتاج!" اس نے کہا۔ "اس قسم کے حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ تم تن تنہا اس گھر میں کب تک رہو گی۔"

"میں ابھی تمہارے گھر نہیں جاسکتی فیضان!" زرتاج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں وہاں قید ہو کر رہ جاؤں گی۔"

"تم پر کوئی قدغن نہیں لگائی جائے گی۔ میں یہ وعدہ تو کر ہی سکتا ہوں۔"

"رات کے وقت تو تم مجھے نہیں نکلنے دو گے۔"

"رات کو عورتیں گھر سے نکلتی ہی کب ہیں۔"

"لیکن مجھے نکلنا ہے۔"

"کیوں؟"

"ایک کام کرنے کی قسم کھا چکی ہوں میں، اور ابھی وہ کام مکمل نہیں ہوا۔" زرتاج نے کہا۔ "اس کام کے لیے مجھے رات ہی کو نکلنا پڑے گا۔"

فیضان اس کا پہلا جملہ سنتے ہی چونک گیا تھا۔ وہ زرتاج کے خاموش ہوتے ہی بولا۔ "افضال خاں؟"

زرتاج نے کوئی جواب دیے بغیر سر جھکا لیا۔

فیضان نے ایک طویل سانس لی، پھر کہا۔ "اب تم اسے نہیں مار سکو گی۔"

"کیوں؟" زرتاج نے اسے غور سے دیکھا۔

"میں نے اس دوران میں اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ صفدر خاں کی ہلاکت نے غالباً اسے بھی خوف زدہ کردیا تھا۔ اس نے بھی سے اپنے گھر سے باہر نکلنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ کاروبار اس کے ملازمین سنبھال رہے تھے۔"

"تمہیں اس کے بارے میں چھان بین نہیں کرنا چاہیے تھی۔" زرتاج تیزی سے بولی۔ "میں نے کہا تھا کہ تم اس معاملے میں نہیں پڑو گے۔ تم مشتبہ بھی ہوچکے ہو۔ کوئی عورت تمہاری نگرانی کررہی ہے۔"

"کررہی تھی، اب نہیں کررہی ہے۔" فیضان نے کہا۔ "پندرہ بیس دن بعد میری نگرانی ختم کردی گئی تھی۔ انگریز مطمئن ہوگئے ہوں گے کہ روہیلوں کے قتل میں میرا ہاتھ نہیں ہوسکتا۔ اپنی نگرانی ختم ہونے کے بعد ہی میں نے افضال خاں کے بارے میں چھان بین کی تھی۔ اس نے نہ صرف گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا بلکہ ملازمین ہی کے ذریعے اپنا کاروبار بھی سمیٹنا شروع کردیا تھا۔ میری کل کی معلومات کے مطابق آج رات تک...... وہ اپنا کام مکمل کرلے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ دہلی سے چلا جانا چاہتا ہے اور اگر میرا خیال درست ہے تو وہ کل یا پرسوں دہلی سے چلا جائے گا۔"

یہ سب کچھ جانتے ہی زرتاج کے خون کی روانی بہت تیز ہوگئی۔ وہ چاہتی تھی کہ افضال خاں زندہ بچ کر ہرگز نہ جاسکے۔

"لہٰذا اب اسے بھول جاؤ زرتاج!" فیضان نے بات جاری رکھی۔ "ان میں سے ایک تو بچ کر نکل ہی چکا ہے۔ ایک اور نکل جائے گا تو کیا ہے۔ تم دس روہیلوں سے تو انتقام لے ہی چکی ہو اور خدا کا شکر ہے کہ محفوظ بھی رہی ہو۔"

اسی وقت کمرے کے باہر سے آواز آئی۔ "بھیا!"

"آجاؤ گوہر!" فیضان نے کہا۔

گوہر دروازہ کھول کر اندر آئی۔ "قہوہ پیو گی زرتاج؟"

"نہیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔"

"آپ، بھیا؟"

"نہیں، میں بس اب چلتا ہوں۔" فیضان نے کہا۔ "آج زیادہ نہیں رک سکوں گا۔ دادا تو آج گھر سے نکلے ہی نہیں ہوں گے۔ صبح جب میں گھر سے روانہ ہوا تھا تو دادی کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔"

"زیادہ خراب تھی؟" زرتاج تیزی سے بولی۔

"ہاں۔" فیضان نے جواب دیا۔ "پندرہ دن پہلے بھی ایسا ہوچکا ہے لیکن پھر وہ سنبھل گئی تھیں۔ اب اس عمر میں یہ اونچ نیچ تو چلتی ہی ہے۔ دادا کی تو ماشاءاللہ اب بھی صحت بہت اچھی ہے لیکن دادی خاصی بوڑھی لگنے لگی ہیں۔ وہ دادا سے زیادہ عمر کی معلوم ہوتی ہیں اب۔"

فیضان جانے کے ارادے سے کھڑا ہوا۔

"گوہر!" زرتاج بولی۔ "دادی کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو تمہیں بھی انہیں دیکھنے کے لیے جانا چاہیے۔"

"نہیں۔" فیضان نے زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا۔"

"میں پڑوس سے فرزانہ اور سلطانہ کو بلالیتی ہوں۔" زرتاج نے کہا۔ "دونوں بہنیں مجھ سے بہت گھلی ملی ہوئی ہیں۔ ان دنوں میں تو وہ گوہر سے بھی بے تکلف ہوگئی ہیں۔"

"کیسی لڑکیاں ہیں؟" اس مرتبہ فیضان نے گوہر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دونوں بہنیں بہت ہمدرد اور ملنسار ہیں بھیا!"

"ان کے گھر والے بھی بہت اچھے ہیں۔" زرتاج

بول پڑی۔ ”اگر میں ان دونوں کو رات بھر کے لیے بھی روکوں تو ان کے والدین کو اعتراض نہیں ہوگا۔“

”گوہر کو پالکی میں لے جاؤں گا تو گھر پہنچنے میں خاصا وقت لگے گا۔“ فیضان سوچتے ہوئے بولا۔ ”پھر اسے واپس یہاں چھوڑنے بھی آؤں گا۔ گھر پر بھی یہ کچھ دیر تو رکے گی۔ یہاں اسے واپس لاتے لاتے اندھیرا پھیل جائے گا۔ اتنی دیر تک رکی رہیں گی وہ دونوں......؟“

”میں نے ابھی کہا تو ہے کہ میں انہیں رات بھر بھی روک سکتی ہوں۔“ زرتاج نے کہا اور پھر آواز دے کر ملازمہ کو بلایا، اس کو ہدایت کی کہ وہ سلطانہ کے گھر جا کے اس کی والدہ سے کہے کہ میں نے رات تک کے لیے فرزانہ اور سلطانہ کو بلایا ہے۔ دوسری ہدایت اس نے یہ بھی کی کہ وہ کوئی پالکی لے آئے۔

فاضل خاں کے بارے میں فیضان سے معلومات حاصل ہوتے ہی زرتاج کے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ فاضل خاں کو کسی طرح آج ہی ختم کیا جانا چاہیے۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ پرسوں کے بجائے کل ہی دہلی سے کہیں چلا جاتا۔

فیضان کی دادی کی طبیعت کا علم ہوتے ہی اس کے دماغ نے بڑی تیزی سے کام کیا تھا۔ اپنے اس ارادے پر وہ اسی صورت میں عمل پیرا ہو سکتی تھی جب گوہر اس کے ساتھ نہ ہو۔ وہ اسے گھر سے نہیں جانے دیتی جبکہ سلطانہ اور فرزانہ کو وہ بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوسکتی تھی۔

دایہ بیگم اور نجم النسا کی موت کے صدمے کے باوجود زرتاج کا انتقامی جذبہ نہ صرف یہ کہ ختم نہیں ہوا تھا بلکہ اور شدید ہوگیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں رہ رہ کر یہ ٹیس اٹھتی رہی تھی کہ اس کی ماں اپنے خاندان میں واپس جانے سے پہلے ہی دنیا سے کوچ کر گئی تھی۔

☆☆☆

فرزانہ اور سلطانہ کے آنے کے بعد فیضان اور گوہر چلے گئے۔ جاتے جاتے بھی فیضان متفکر نظر آرہا تھا۔ نہ جانے اس کے دماغ میں کیا خیالات گردش کرتے رہے تھے۔

فرزانہ اور سلطانہ نے ایسی باتیں چھیڑ دیں کہ زرتاج کا دھیان بٹا رہے۔ اسے دایہ بیگم اور نجم النسا کی موت کا زیادہ خیال نہ آئے لیکن وہ دونوں اگر اس قسم کی باتیں نہ کرتیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس وقت زرتاج کے دماغ میں صرف یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ اسے آج ہی، گوہر کی واپسی سے پہلے اپنا کام ختم کرنا ہے۔

اس سے پہلے زرتاج نے جو قتل کیے تھے، وہ رات پھیلنے کے خاصی دیر بعد کیے تھے۔ ان تمام دنوں میں اس کا معمول یہ رہا تھا کہ وہ نجم النسا کے سونے کے بعد ہی بہت خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل جایا کرتی تھی۔ نجم النسا کی نیند بہت گہری تھی۔ ایک آدھ بار ہی ایسا ہوا تھا کہ سونے کے بعد صبح سے پہلے اس کی آنکھ کھلی ہو۔ زرتاج اسی بات سے فائدہ اٹھاتی رہی تھی۔ نجم النسا کے سونے کے کچھ ہی دیر بعد بہت خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل جایا کرتی تھی اور دبے قدموں ان علاقوں میں گھومتی رہتی تھی جہاں وہ روہیلے رہتے تھے۔ سناٹے اور اندھیرے میں گلی کوچے اس کو اپنی پناہ میں لیے رہتے تھے۔ اگر کبھی اسے طلایہ گردوں کی آہٹ یا ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے جاتی تھیں تو وہ خود کو کسی بہت ہی اندھیرے گوشے میں چھپالیا کرتی تھی۔ اس پر بھی کبھی اسے خود بھی تعجب ہوتا تھا کہ وہ اتنی دلیر کیسے ہوگئی تھی۔ لے دے کر اسے بس یہی خیال آتا تھا کہ اس کی رگوں میں اس مغل شاہی خاندان کا خون دوڑ رہا تھا جس کی بہت سی شہزادیوں نے بہت نڈر ہو کر بڑی جرأت سے ناسازگار حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ انتقام کا جذبہ بھی انسان کو جرأت آزما اور نڈر بنا دیتا ہے۔ وہی جذبہ زرتاج کے خون میں بھی سرایت کیے ہوئے تھا۔

ہر روہیلے کو قتل کرنے کے لیے زرتاج کو اس کے گھر کے آس پاس منڈلاتے ہوئے پندرہ پندرہ، بیس بیس دن گزرے تھے۔ اسے اس وقت کا انتظار کرنا پڑا تھا کہ جب وہ روہیلہ اپنے گھر سے نکلے تو وہ اسے گولی کا نشانہ بنائے۔

تین روہیلوں کے لیے تو اسے اپنے گھر سے خاصی دور بھی جانا پڑا تھا۔ انہیں بھی وہ رات ہی کے کسی حصے میں گولی کا نشانہ بنا سکی تھی لیکن فاضل خاں کو قتل کرنے کے لیے وہ زیادہ رات نہیں گزار سکتی تھی۔ اسے یہ کام رات کا آغاز ہوتے ہی کرنا تھا لہٰذا یہ بھی ضروری تھا کہ وہ رات ہونے سے پہلے ہی اپنے گھر سے روانہ ہوجائے۔ گوہر کے آجانے کے بعد اس کا گھر سے نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ سلطانہ اور فرزانہ کو چکمہ دینے کے لیے تو اس نے ایک ترکیب سوچ لی تھی۔

اس نے کچھ دیر بعد سلطانہ کو تو قہوہ بنانے کے لیے باورچی خانے میں اور فرزانہ کو صحن کی الگنی سے کچھ کپڑے اتار کر لانے کے لیے بھیجا۔

ان دونوں کے جاتے ہی اس نے وہ الماری کھولی جس میں وہ اپنے کپڑے اور اپنے استعمال کی متفرق چیزیں رکھتی تھی۔ نجم النسا کا اس الماری میں بالکل عمل دخل نہیں تھا۔

الماری کے ایک خانے میں دو پستول رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک پستول اور اس کی گولیاں فیضان سے لی تھیں۔ دوسرا پستول اس کے والد کا تھا۔ اسی پستول سے وہ روہیلوں کو ہلاک کر چکی تھی۔ وہ پستول اس کے والد کا تھا۔ اس پستول کے دستے پر ”تاج“ کی شکل بھی ابھری ہوئی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد جب اس نے وہ پستول دیکھا تھا تو اس تاج کے نشان کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اپنے بارے میں حقائق جاننے کے بعد اسے شبہ ہوا تھا کہ شاید وہ مغل شاہی خاندان کا نشان ہو۔ ایک مرتبہ اس نے سرسری انداز میں نجم النسا سے اس نشان کے بارے میں پوچھا تو اس کے شبہے کی تصدیق ہوگئی تھی۔ اس کا باپ چونکہ مغل شہزادہ تھا اس لیے محل چھوڑتے وقت وہ اپنے ساتھ وہ پستول لے آیا تھا۔

وہ پستول زرتاج ہمیشہ بھرا ہوا رکھتی تھی۔ ہر روہیلے کو قتل کرنے کے بعد وہ کم ہوجانے والی گولی کی جگہ دوسری گولی بھر دیتی تھی۔

فرزانہ جب صحن سے کپڑے لے کر واپس آئی تو زرتاج اپنا کام مکمل کر چکی تھی اور الماری بند کر کے اپنی جگہ واپس جا بیٹھی تھی۔

سلطانہ قہوہ بنا لائی۔ قہوہ پیتے ہوئے زرتاج ان سے باتیں تو کرتی رہی لیکن ذہنی طور پر غیر حاضر سی رہی۔ اس کا دماغ اس کام میں الجھا رہا تھا جو وہ ہر قیمت پر آج ہی کر ڈالنا چاہتی تھی۔

وقت کا اندازہ لگانے کے بعد اس نے اچانک کہا۔ ”مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی ہے سلطانہ!“

”اس کا اندازہ تو مجھے ہو رہا ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”ابھی باتیں کرتے ہوئے کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے تمہارا دھیان کہیں اور ہو۔“

”ہاں۔“ زرتاج نے فوراً کہا۔ ”مجھے گوہر کی دادی کا خیال آتا رہا ہے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ گوہر کے ساتھ مجھے بھی دادی کو دیکھنے جانا چاہیے تھا۔ کتنا خیال رکھا ہے ان لوگوں نے میرا۔ کتنی بری بات ہوگی کہ میں گوہر کی دادی کو دیکھنے نہیں گئی۔“

”ہاں یہ بری بات تو ہے مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔ گوہر کے ساتھ چلی جاتیں تو ٹھیک تھا۔“

”اب چلی جاتی ہوں میں۔“

”نہیں نہیں۔“ فرزانہ جلدی سے بول پڑی۔ ”اکیلے جانا ٹھیک نہیں رہے گا اس وقت۔“

”کیوں؟ ابھی رات تو نہیں ہوئی۔ میں ابھی پالکی منگا کر روانہ ہوجاؤں تو اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہنچ جاؤں گی گوہر کے گھر۔“

فرزانہ اور سلطانہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ متذبذب نظر آنے لگی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی پھر کچھ کہتی، زرتاج نے آواز دے کر ملازمہ کو بلایا اور اس کے ذریعے ملازم کو کہلوایا کہ وہ جلدی سے کرائے کی پالکی لے آئے۔ پھر اس نے سلطانہ اور فرزانہ سے کہا۔

”تم دونوں چاہو تو میری اور گوہر کی واپسی تک یہیں رکو یا اپنے گھر چلی جاؤ۔ میں قفل لگا جاؤں گی گھر میں!“

”ہوسکتا ہے کہ تم گوہر کے گھر پہنچو اور وہ وہاں سے روانہ ہوچکی ہو۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”یہاں انہیں قفل لگا ہوا ملے گا تو......“

”تو پھر تم دونوں یہیں رکو میری پیاری!“ زرتاج نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ ”گوہر کو بتا دینا کہ میں اسی کے گھر گئی ہوں۔ وہ فیضان کو واپس بھیج دے گی۔ مجھے لے کر اسے دوبارہ آنا پڑے گا۔“

”تو پھر ہمیں یہیں رکنا چاہیے۔“

”ہاں مناسب تو یہی ہوگا۔“

اس طرح زرتاج انہیں چکمہ دینے میں کامیاب ہوگئی اور پالکی میں بیٹھ کر افضل خاں کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اس مرتبہ اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا تھا کہ کسی خطرے میں پڑ جانے کا خاصا امکان تھا لیکن وہ افضل خاں کو قتل کرنے کے لیے اپنی جان پر کھیلنے کے لیے تیار تھی۔

پالکی میں اسے کچھ خیال آیا تو وہ آبدیدہ ہوگئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”اگر مجھے کچھ ہوجائے فیضان تو تمہیں میری محبت کی قسم، خود کو سنبھال لینا۔ تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ انسان کو حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ اس پر تم بھی عمل کرنا۔ انتہائی کوشش کرنا کہ مجھ بدنصیب کو بھلا دو۔“

اس کی آنکھوں سے دو آنسو بھی ٹپک گئے۔ اس نے وہ پونچھے اور افضل خاں کے بارے میں سوچنے لگی لیکن خیالات کی لہریں فیضان سے بھی ٹکراتی رہیں۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر اسے کچھ ہوگیا تو خود کو سنبھالنا فیضان کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ وہ اسے بہت شدت سے چاہتا تھا۔ وہ خود بھی فیضان کو اتنی ہی شدت سے چاہتی تھی لیکن انتقام کی آگ نے اس کی محبت پر ترجیح پائی تھی۔

پالکی جب اس علاقے میں پہنچی تو ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے

لگا تھا۔ اس نے پالکی سے اتر کر کرایہ ادا کیا۔ آنکھوں کے نیچے اس کے چہرے پر نقاب تھی اور جسم ایک چادر میں چھپا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ایک گلی میں داخل ہوئی۔ اسے وہاں سے ایک لمبا چکر لگا کر افضال خاں کے گھر کے سامنے پہنچنا پڑا۔ یہ چکر لگانے سے ایک بہتر صورت یہ پیدا ہوئی کہ اتنی دیر میں رات کی تاریکی پوری طرح زمین پر اتر چکی تھی۔ افضال خاں کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر زرتاج نے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔

بالکل ابتدائی رات میں شہر گہرے سناٹے میں نہیں ڈوبتا تھا۔ اکا دکا راہ گیر آتے جاتے نظر آجاتے تھے۔ کسی کے گھوڑے کی ٹاپیں بھی سنائی دے جاتی تھیں لیکن یہ زرتاج کی خوش قسمتی تھی کہ اسے آس پاس کوئی نہیں دکھائی دیا اور اگر کوئی نظر آجاتا تو بھی زرتاج کو اس کی پروا نہ ہوتی۔ وہ گھر سے سوچ کر چلی تھی کہ اسے کسی بھی صورت حال سے دوچار ہونا پڑسکتا ہے۔ اس نے اردگرد نظر دوڑانے کے بعد دروازے پر دستک دی۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے کسی روہیلے کو اس کے گھر میں گھس کر قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیے اب اس کے علاوہ راستہ نہیں بچا تھا۔ فیضان کے بیان کے مطابق افضال خاں کل یا پرسوں دہلی سے چلا جاتا اور زرتاج کو حسرت رہ جاتی کہ اس کا آخری شکار ہاتھ سے نکل گیا۔

دستک دیتے وقت اسے اندازہ تھا کہ دروازہ کھولنے والا کوئی ملازم یا ملازمہ ہوگی۔ وہ جو بھی ہوتا، زرتاج اندر گھس پڑتی اور پستول دکھا کر ملازم یا ملازمہ کو مجبور کردیتی کہ وہ اسے افضال خاں کے کمرے تک پہنچائے۔

دستک دینے کے بعد جب کچھ دیر تک اندر سے دروازہ نہیں کھلا تو زرتاج کو خیال آیا کہ افضال خاں نے کیا دہلی چھوڑنے سے پہلے ہی اپنے ملازمین کی بھی چھٹی کردی تھی؟

دوسری مرتبہ اس نے کچھ زور سے دستک دی۔ اس بار چند لمحے کے توقف سے اندرونی جانب قدموں کی آہٹ ہوئی۔ کوئی دروازے کی طرف آرہا تھا۔ آہٹ بھاری قدموں کی تھی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ دروازے کی طرف آنے والی کوئی ملازمہ نہیں تھی۔ وہ کوئی مرد ہی تھا جس نے دروازے کے قریب آکر پوچھا۔

"کون ہے؟"

زرتاج کے اعصابی تناؤ میں اضافہ ہوگیا۔ اس نے افضال خاں کی آواز پہچان لی تھی۔ بالکل ابتدا میں اس نے اپنے مطلوبہ روہیلوں کے محلوں کے چکر لگائے تھے، تو انہیں نہ صرف دیکھ لیا تھا بلکہ ان میں سے کئی کی آوازیں بھی سن لی تھیں۔

"دروازہ تو کھولیے افضال میاں جی!" زرتاج نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ "میں پڑوس میں رہتی ہوں۔ ایک مشکل میں پڑگئی ہوں۔ آپ کی مدد چاہتی ہوں۔"

زرتاج کو خیال تھا کہ نسوانی آواز سن کر افضال خاں کسی اندیشے کا شکار نہیں ہوگا۔ یہ اس کے خواب وخیال میں بھی نہیں ہونا چاہیے تھا کہ اس کے ساتھیوں کو قتل کرنے والا کوئی مرد نہیں بلکہ عورت ہوگی۔

زرتاج کا خیال درست ثابت ہوا۔ اندر سے دروازہ کھول دیا گیا۔ گھر میں جو روشنی تھی، وہ زرتاج کے چہرے پر بھی پڑی اور زرتاج نے بھی اس روشنی میں افضال خاں کا چہرہ دیکھ لیا جس پر کچھ الجھن کے تاثرات تھے۔ اسے الجھن یہی ہوسکتی تھی کہ پڑوس کی کوئی عورت رات کے وقت اس سے کس قسم کی مدد چاہتی ہوگی۔

زرتاج نے بڑی تیزی سے اوڑھی ہوئی چادر سے اپنا وہ ہاتھ نکالا جس میں وہ پستول دبائے ہوئے تھی۔

کسی گھوڑے کی ٹاپیں قریب آتی جارہی تھیں لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی زرتاج اپنا کام کرنے میں تاخیر بالکل نہیں ہونے دیتی۔

پستول دیکھ کر افضال خاں چونکا لیکن اسے کسی اور ردعمل کی مہلت نہیں ملی۔ زرتاج کے پستول نے شعلہ اگل دیا تھا۔ گولی چلنے کے دھماکے کی آواز سناٹے میں یقیناً دور تک پھیلی ہوگی لہٰذا زرتاج تیزی سے مڑ کر بھاگی۔ کسی پریشان کن صورت حال سے دوچار ہونا اس کی بے وقوفی ہی ہوتی۔ وہ اتنا بھی نہیں رکی تھی کہ افضال خاں کو گرتے اور مرتے ہوئے دیکھ سکے۔ اس نے افضال خاں کی پیشانی پر گولی چلائی تھی اور اسے ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ اس کا نشانہ خطا گیا ہوگا۔

گھوڑے کی ٹاپیں اب اتنی قریب آچکی تھیں جیسے سر پر آچکی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی تیزی سے قریب آتی جارہی تھی۔ بھاگتے ہوئے زرتاج نے دیکھا کہ گھڑ سوار اس کے بہت قریب آگیا تھا۔ زرتاج نے اپنے پستول کا رخ اس کی طرف کیا۔ اس پر خون سوار تھا، مگر اس سے پہلے کہ وہ پستول چلا دیتی، اس نے گھڑ سوار کی چیختی ہوئی آواز پہچان لی۔

"میں فیضان ہوں زرتاج!"

زرتاج ٹھٹک کر رکی۔ وہ گولی چلا کر ایک گلی میں

داخل ہوجانا چاہتی تھی۔ اس کا دماغ چکرا گیا کہ فیضان اس وقت وہاں کیسے آگیا۔

اسی وقت ایک چیختی ہوئی نسوانی آواز بھی سنائی دی۔ وہ کوئی انگریز تھی جس نے زرتاج کا نام لے کر اسے للکارا تھا کہ اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو اس پر گولی چلا دی جائے گی۔

لیکن گولی چلانے کی دھمکی سے پہلے ہی فیضان نے زرتاج کو گھوڑے پر اپنے آگے بٹھالیا تھا۔

"گھوڑے کی گردن سے لپٹ جاؤ۔" فیضان تیزی سے بولا۔

زرتاج نے پلک جھپکتے میں اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی فیضان بھی اس پر جھک گیا تھا۔ گولی چلنے کی آواز تو سنائی دی تھی لیکن وہ دونوں محفوظ رہے تھے۔

پھر دوسری گولی بھی چلی لیکن اس وقت فیضان اپنے گھوڑے کو دائیں جانب کے ایک راستے پر موڑ چکا تھا۔

"تم...... تم یہاں کیسے آگئے؟" زرتاج کے منہ سے نکلا۔ اس وقت اس کے تنفس کی رفتار خاصی بڑھ چکی تھی جس کا سبب وہ غیر معمولی صورت حال تھی۔ زرتاج کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس خطرناک موقع پر فیضان اس کی مدد کے لیے وہاں پہنچ جائے گا۔

فیضان نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں پہچان لیا گیا ہے اس لیے اب تم اپنے گھر نہیں جاسکتیں اور اگر میں تمہیں اپنے گھر لے گیا تو بھی ہم گرفتار کرلیے جائیں گے۔"

گھوڑا پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔

"کیا شہر سے ہی بھاگنا ہوگا؟" زرتاج نے پوچھا۔

"جب تمہیں پہچان لیا گیا ہے تو مجھے بھی پہچانا جاچکا ہوگا۔ شہر سے بھاگ کر بھی ہم کب تک اور کہاں تک چھپتے پھریں گے!" فیضان نے جواب دیا۔ گھوڑے کی برق رفتاری کے باعث اس کی آواز بھی جھٹکے کھا رہی تھی۔ اتنی تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے باتیں کرنا آسان نہیں تھا۔ فیضان یہ مشکل ہی بتا سکا کہ وہ زرتاج کی طرف سے متفکر تھا اس لیے گوہر کو دادی سے ملا کر وہاں ذرا دیر بھی رکے بغیر واپس لوٹا تھا۔ زرتاج اس وقت گھر سے جاچکی تھی۔

اس نے فرزانہ اور سلطانہ کو بے وقوف بنا دیا تھا لیکن فیضان کو یقین نہیں آیا تھا کہ زرتاج اس کی دادی کو دیکھنے گئی ہوگی۔ اسے فوراً صرف یہ خیال آیا تھا کہ زرتاج فاضل خاں کے گھر کی طرف گئی ہوگی چنانچہ وہ گوہر کو چھوڑ کر نہایت تیز رفتاری سے اسی طرف آیا تھا اور یہ غالباً زرتاج کی خوش قسمتی تھی کہ وہ عین وقت پر اس کی مدد کے لیے پہنچ گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زرتاج گرفتار کرلی جاتی یا ان گولیوں سے زخمی یا ہلاک ہوجاتی جو ان پر کسی انگریز عورت نے چلائی تھیں۔

فیضان کو یہ خیال بھی آیا تھا کہ گولیاں برسانے والی شاید وہی لڑکی ہو جو کچھ دن پہلے تک اس کی نگرانی کرتی رہی تھی۔ اس کا خیال زرتاج کو بھی آچکا تھا۔ اسے یہ بات فیضان ہی سے معلوم ہوئی تھی کہ انگریزوں نے ایک لڑکی کو اس کی نگرانی پر مقرر کیا تھا۔

لیکن اس وقت، سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر، زرتاج اس لڑکی کے بارے میں زیادہ نہیں سوچ رہی تھی۔ اس کے رگ وپے میں اس تجسس کی لہریں دوڑ رہی تھیں کہ فیضان اسے کہاں لے جارہا تھا۔ وہ اس وقت خاصی چونک گئی جب اس نے دیکھا کہ گھوڑا لال قلعے میں داخل ہورہا تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "یہ...... یہ...... کہاں...... فیضان!"

"اب۔" فیضان نے جواب دیا۔ "تمہیں صرف اپنے خاندان میں ہی پناہ مل سکتی ہے زرتاج!"

☆☆☆

عین اسی وقت شاہی محل میں شہزادہ جہانگیر مرزا، شہزادہ سراج الدین کے کمرے میں داخل ہورہا تھا۔ اس کے چہرے سے اس کا تکدر صاف ظاہر ہورہا تھا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی شہزادہ سراج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے طلب فرمایا برادر معظم؟ بلکہ اب تو مجھے چاہیے کہ آپ کو برادر معظم کے بجائے ولی عہد سلطنت کہہ کر مخاطب کروں۔"

شہزادہ سراج نے ٹھنڈی سانس لی اور سنجیدگی سے کہا۔ "ہم نے تمہیں طلب نہیں کیا ہے برادر عزیز! صرف بلایا ہے اور بلایا بھی خود نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرت ہی نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ ہم اپنے تمام بھائیوں کو ایک ایک کرکے سمجھائیں۔ ان کے علم میں آچکا ہے کہ ہمارے تمام بھائی ان سے اور ہم سے ناراض ہیں اور تم سب سے زیادہ مشتعل ہو۔"

"یہ سارا معاملہ ہی ایسا ہے۔" جہانگیر مرزا نے تلخ لہجے میں کہا۔ "آپ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہوچکے ہیں جبکہ میں ابھی نوجوان تو نہیں مگر جوانی کی حدود سے آگے نہیں نکلا۔ میں سلطنت کے معاملات میں جتنا متحرک رہ سکتا ہوں، آپ نہیں رہ سکتے۔ پھر ایک بہت اہم بات یہ کہ میں اعلیٰ

حضرت کی سب سے چہیتی ممتاز بیگم کا بیٹا ہوں جبکہ آپ ایک راجپوت خاتون کے بطن سے ہیں۔"

جہانگیر مرزا نے شہزادہ سراج کی بڑی دکھتی رگ پر ہاتھ مارا تھا لیکن شہزادہ سراج نے اپنے دل پر چوٹ لگنے کے باوجود تحمل مزاجی کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بس قدرے رک کر کہا۔ "یہ تم نے کس سلطنت کی بات کی ہے برادر عزیز......! اس سلطنت کی جو فردوس مکانی ظہیر الدین بابر نے قائم کی تھی؟ اس سلطنت کی جس کا جاہ وجلال عرش آشیانی جلال الدین اکبر کا مرہون منت تھا؟ میرے عزیز بھائی......! وہ سلطنت تو خلد مکانی محی الدین اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی شدت سے روبہ زوال ہو گئی تھی، اور اب......" سراج الدین کی آواز میں کسک پیدا ہو گئی۔ "اب تو وہ سلطنت صرف اس بدنصیب شہر دہلی میں بھی رسماً قائم رہ گئی ہے۔ فرنگیوں کے پیر اب اس شہر میں بھی پھیل چکے ہیں۔ اب صرف قلعہ معلیٰ ہی رہ گیا ہے جہاں مغل سلطنت قائم ہے۔ یقین کرو کہ اس سکڑی سمٹی ہوئی نام نہاد سلطنت کا ولی عہد بن کر ہمیں شمہ برابر خوشی نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ اہم بات وہ نہیں جس کی طرف تم نے ابھی اشارہ کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمیں اپنا ولی عہد اعلیٰ حضرت نے اپنی خوشی سے یا اپنی خواہش کے مطابق نہیں بنایا ہے۔ یہ فیصلہ فرنگیوں نے کیا ہے اور اب اس سلطنت کے تخت نشیں، یعنی ہمارے والد بزرگوار میں یہ ہمت اور یہ سکت نہیں رہی کہ وہ فرنگیوں کے فیصلے کی مخالفت کر سکیں۔"

"فرنگیوں نے یہ فیصلہ آپ کے حق میں کیوں کیا ہے؟" شہزادہ جہانگیر مرزا تیکھے لہجے میں بولا۔ "کیا انہوں نے محسوس کر لیا ہے کہ آپ ہی ان کے زیادہ بہی خواہ ہیں۔"

"اگر انہوں نے ایسا سمجھا ہے تو خدا گواہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں، ہم......"

جہانگیر مرزا نے تیزی سے سراج الدین کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ کی لمبی چوڑی تقریر میں نے بڑے تحمل سے سن لی۔ اب مزید کچھ نہیں سننا چاہتا۔ بس یہ فرمائیں کہ آپ نے مجھے کیوں طلب کیا ہے، یا بہ قول آپ کے بلایا ہے۔"

"ہم نے تمہیں اس لیے...... یعنی یہ سمجھانے کے لیے بلایا ہے کہ اب جبکہ مغل شہنشاہیت کا زوال انتہا کو چھو رہا ہے تو ہم بھائیوں میں کوئی رنجش نہیں ہونا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے، میں عمر کے اعتبار سے بھی اور ذہنی طور پر بھی اتنا بالغ ہو چکا ہوں کہ خود ہی سب کچھ سمجھ سکتا ہوں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ مجھے سمجھایا جائے۔"

"ہم تمہارے اس جواب پر اظہار افسوس ہی کر سکتے ہیں۔ بے شک تم عمر کے اعتبار سے بالغ ہو چکے ہو لیکن......"

جہانگیر مرزا نے پھر بڑی تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "اب میں اجازت چاہوں گا۔"

اس سے پہلے کہ شہزادہ سراج الدین مزید کچھ کہتا، جہانگیر مرزا مڑا اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

شہزادہ سراج الدین نے اپنا سر تھام لیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے باقی بھائیوں کو بھی سمجھانے کی کوشش کرے یا نہ کرے۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس کے تیرہ بھائیوں میں سے کم از کم مرزا بابر، مرزا سلیم، مرزا ناظم اور مرزا جہاں شاہ کا ردعمل تقریباً وہی ہوتا جس کا مظاہرہ جہانگیر مرزا کر گیا تھا۔ تنگ مزاج وہ بھی تھے، ان کا ردعمل جہانگیر مرزا کے ردعمل کی طرح اتنا شدید نہ ہوتا لیکن ہوتا ضرور!

جہانگیر مرزا اسے فرنگیوں کی بہی خواہی کا طعنہ دے کر جا چکا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی اصل وجوہ کیا تھیں۔ جب سے اکبر ثانی کی بیماری بڑھنا شروع ہوئی تھی، فرنگیوں نے تبھی سے سوچنا اور سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ کس شہزادے کو ولی عہد بنوانا ان کے لیے مفید ہو سکتا ہے یا مستقبل میں ان کے لیے مشکلات پیدا نہیں کر سکتا۔

فرنگیوں سے نفرت شہزادہ سراج الدین کے دل میں بھی تھی لیکن وہ نہایت تحمل مزاج تھا اور اپنے جذبات پر قابو رکھنے پر قادر تھا۔ اس کے برخلاف اس کے بھائی کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی سے ایسی باتیں کہہ جایا کرتے تھے جن سے ان کے مزاج کی سرکشی ظاہر ہو جاتی تھی۔

حتمی فیصلہ فرنگیوں نے کچھ دن پہلے اس رات کیا تھا جب نیا عیسوی سال شروع ہونے والا تھا۔ انیسویں صدی کے چھتیسویں سال کی آمد پر ریذیڈنٹ نے رات کو اپنے گھر پر جشن کیا تھا جس میں اس نے تمام مغل شہزادوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ شراب کا دور چلتا رہا تھا اور اسی دوران میں اس نے تمام شہزادوں سے الگ الگ بیٹھ کر باتیں کی تھیں، دوسرے شہزادوں نے نشے میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالی تھیں جن سے ان کا خاندانی غرور صاف ظاہر ہو گیا تھا لیکن شہزادہ سراج کی عادت نشے کے باوجود برقرار رہی تھی۔ اس کی زبان سے کوئی ایسا فقرہ تو کیا، ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلا تھا جو فرنگیوں کو گراں گزرتا۔

پھر تیسرے دن ریذیڈنٹ نے اکبر شاہ ثانی سے ملاقات کی تھی اور اس کے اگلے ہی دن اکبر ثانی نے شہزادے

سراج الدین کی ولی عہدی کا حکم نامہ جاری کر دیا تھا۔

اس کے بعد محل کی جو فضا بنی تھی، اس نے شہزادہ سراج الدین کو دلی تکلیف پہنچائی تھی اور اس وقت جہانگیر مرزا سے باتیں کرنے کے بعد وہ اور زیادہ افسردہ ہو گیا تھا۔ وہ انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ۔" وہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولا۔

دروازہ کھول کر اندر آنے والا، شاہی محل کا انتظام وانصرام سنبھالنے والا ناظم اور اکبر ثانی کا نہایت معتمد خواجہ سرا تھا۔

"شہزادۂ والا تبار!" وہ کورنش بجا لانے کے بعد بولا۔ "ابھی ذرا دیر پہلے ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہو چکا ہے جس کی اطلاع مجھے اعلیٰ حضرت ہی کو دینا چاہیے تھی مگر ان کی ناسازی طبع کے باعث میں نے مناسب سمجھا کہ آپ ہی کو اس سے آگاہ کروں۔"

"ایسا کیا واقعہ ہو گیا؟" محل کے ناظر کے لب ولہجے کے باوجود شہزادہ سراج الدین نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

"ایک گھڑسوار ایک لڑکی کو گھوڑے پر اپنے ساتھ بٹھائے قلعے میں داخل ہوا تھا۔ جب اس کا گھوڑا محل کے قریب پہنچا تو محافظ دستے کے سواروں نے اسے اپنے گھیرے میں لے کر گرفتار کر لیا۔ ان دونوں سے پوچھ گچھ کے دوران معلوم ہوا کہ اس نوجوان کا نام فیضان علی ہے اور وہ ہماری ہی سپاہ کے ایک دستے کا سالار ہے۔ محافظ دستے کے بعض سپاہیوں نے اسے شناخت بھی کر لیا۔ اس کے ساتھ جو لڑکی ہے، اس کا نام زرتاج ہے۔ ان سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے لیکن وہ اپنے ناموں کے علاوہ کچھ بتانے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ نہ یہ بتا رہے ہیں کہ وہ محل کی طرف کیوں آئے تھے۔ ان کا اور خصوصاً اس لڑکی کا کہنا ہے کہ وہ صرف اعلیٰ حضرت ہی کو اپنے بارے میں سب کچھ بتائے گی۔ محافظ دستے کے سپاہیوں نے فیضان علی کی تلاشی لی تھی اور لڑکی کی تلاشی کے لیے تاتاری کنیزوں سے کام لیا گیا تھا۔ ایک پستول فیضان علی کے پاس سے اور ایک پستول اس لڑکی کے پاس سے۔" ناظر سب کچھ تفصیل سے بتاتا چلا گیا۔ "حیرت انگیز اور تعجب خیز بات یہ ہے شہزادۂ والا تبار کہ اس لڑکی کے پستول کے دستے پر مغل شاہی خاندان کا نشان بنا ہوا ہے۔"

شہزادہ سراج الدین جو خاموشی اور سنجیدگی سے سب کچھ سن رہا تھا، یکایک چونکا۔ "شاہی نشان؟"

"جی۔"

شہزادہ کچھ مضطرب نظر آیا۔ وہ کھڑا ہوا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے ٹہلنے لگا۔ محل کا ناظر ادب سے حکم کا منتظر رہا۔

"وہ اس وقت کہاں ہیں؟" شہزادے نے پوچھا۔

"محل کے اسی کمرے میں جہاں کسی سے پوچھ گچھ کرنا ہوتی ہے۔" ناظر نے جواب دیا، پھر بولا۔ "فیضان علی کیونکہ ہماری سپاہ کے ایک دستے کا سالار ہے اس لیے ابھی تک پوچھ گچھ کے لیے ان پر کوئی سختی نہیں کی گئی۔"

"اعلیٰ حضرت کی طبیعت خاصی ناساز ہے آج......! ان دونوں کو ہمارے ہی پاس لاؤ۔ رازداری لازم ہے۔ ابھی کسی کو ان کے بارے میں علم نہیں ہونا چاہیے۔"

ناظر مودبانہ انداز میں جھکا اور چلا گیا۔

جتنی دیر میں دونوں قیدیوں کو اس کے کمرے میں لایا گیا، وہ ٹہلتا رہا تھا اور اس کے چہرے پر غور وفکر کا تاثر قائم رہا تھا۔

"ہم تخلیہ چاہتے ہیں۔" شہزادہ سراج الدین نے غور سے زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

محافظ دستے کے دونوں سپاہی، ان کا سالار اور ناظر کمرے سے رخصت ہو گئے۔

"اب ہمیں بتاؤ!" شہزادہ سراج الدین نے زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اعلیٰ حضرت کی طبیعت ناساز ہے۔ فی الحال تم ان سے نہیں مل سکتیں۔"

زرتاج نے فیضان کی طرف دیکھا۔

فیضان بولا۔ "ہم ولی عہد سلطنت کے حضور میں ہیں۔ تم انہیں بتا سکتی ہو۔ یہ شہزادہ سراج الدین ہیں۔"

زرتاج نے شہزادہ سراج الدین کی طرف دیکھا، وہ کچھ جذباتی نظر آنے لگی تھی۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بولی۔ "کیا آپ یقین کریں گے؟ میری والدہ نجم النسا آپ کی پھوپی تھیں اور آپ میرے ماموں زاد بھائی ہیں؟"

شہزادہ سراج الدین کے اضطراب میں اضافہ ہوا۔ "ثبوت؟"

"میرے پاس جو پستول، اور جو اب مجھ سے لیا جا چکا ہے، اس کے دستے پر ایک نشان ہے اور میرا خیال ہے کہ شاہی خاندان کا نشان ہے۔ وہ آنجہانی شاہ عالم ثانی نے میری والدہ کو دیا تھا۔"

شہزادہ سراج الدین نے تالی بجائی۔ دروازے کے باہر موجود ناظر فوراً اندر آیا۔

"وہ پستول کہاں ہے جس کے بارے میں تم نے ہمیں بتایا تھا کہ اس پر شاہی خاندان کا نشان ہے۔"

"وہ محافظ دستے کے سالار کے پاس ہے۔"

"فوراً لے کر آؤ۔"

ناظر چلا گیا۔

"کوئی اور ثبوت بھی ہے تمہارے پاس؟" شہزادہ سراج الدین نے زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ "جب ہمیں ولی عہد بنایا گیا تھا تو اعلیٰ حضرت نے ہمیں ایک چیز بھی دی تھی۔ اس کی وجہ سے ہمیں یقین ہے کہ اگر تم سچ بول رہی ہو تو اس پستول کے علاوہ بھی تمہارے پاس ایک اہم ثبوت ہونا چاہیے۔"

"میرے پاس آنجہانی شاہ عالم ثانی کے ایک خط کا نصف حصہ ہے لیکن وہ اس وقت میرے پاس نہیں، میرے گھر پر ہے۔"

"وہ میرے پاس ہے۔" فیضان نے جلدی سے کہا اور اپنے لباس سے نیلے رنگ کی ایک چھوٹی سی مخملی تھیلی نکالی۔

زرتاج نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ یقیناً اس کی سمجھ میں نہیں آسکا ہوگا کہ وہ تھیلی فیضان کے پاس کیسے آگئی۔

"شہزادہ حضور!" فیضان نے تھیلی میں سے ایک بوسیدہ اور پھٹا ہوا کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ میری تلاشی لی گئی تھی لیکن یہ تھیلی مجھے اس لیے واپس کر دی گئی کہ اس میں کچھ ایسے کاغذ بھی ہیں جن پر گھریلو حساب کتاب لکھا ہوا ہے۔ اس خط پر ان لوگوں کی نظر نہیں پڑی تھی جنہوں نے میری تلاشی لی تھی۔" پھر آگے بڑھ کر اس نے وہ بوسیدہ اور پھٹا ہوا کاغذ شہزادہ سراج الدین کو پیش کیا۔ "ابھی آپ فرما چکے ہیں کہ ولی عہد بننے کے بعد آپ کو اعلیٰ حضرت سے کوئی خاص چیز ملی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی خط کا نصف حصہ ہوگا۔"

شہزادہ سراج الدین کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا ایک خفیہ خانہ کھولا۔ اس میں سے اس نے ایک بوسیدہ خط ہی نکالا تھا۔ وہ اسے اور فیضان سے ملے ہوئے کاغذ کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھنے لگا۔

اسی دوران میں فیضان نے دھیمی آواز میں بتا دیا کہ یہ مخملی تھیلی فرزانہ کو زرتاج کی الماری کے پاس پڑی ہوئی ملی تھی جو اس نے گوہر کو دے دی تھی۔ گوہر نے وہ تھیلی فیضان کو دے دی تھی اور فیضان کو اس میں رکھے ہوئے کاغذات میں وہ خط نظر آگیا تھا۔

زرتاج سمجھ گئی تھی کہ جب اس نے الماری کھول کر اس میں سے پستول نکالا تھا تو وہ تھیلی الماری سے گر گئی ہوگی۔ پریشانی اور عجلت میں زرتاج اسے دیکھ نہیں سکی تھی۔

شہزادہ سراج الدین نے دونوں کاغذ خفیہ خانے میں رکھے اور لوٹا۔

"تمہاری ماں کا نام نجم النسا تھا؟" اس نے زرتاج سے پوچھا۔

"جی؟"

"اور ان کی والدہ کا نام؟"

"وہ آنجہانی شاہ عالم ثانی کی چھوٹی بہن تھیں۔ ان کا نام شہزادی مہر النسا تھا۔"

شہزادہ سراج الدین، زرتاج کے قریب پہنچا۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں دونوں ہاتھ زرتاج کے شانے پر رکھ دیے۔ "میری عزیز بہن! مبارک ہو، تم اپنے محل اور اپنے خاندان میں واپس آگئی ہو۔" زرتاج کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"اب رو نہیں۔" شہزادہ سراج الدین نے اس کی پیشانی چومی۔ "یہ تو خوشی کا مقام ہے کہ تم اپنے خاندان میں لوٹ آئی ہو۔"

"یہ خوشی کے آنسو ہیں برادر معظم!" زرتاج نے جذباتی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

اس وقت فیضان بھی خاصا جذباتی نظر آ رہا تھا۔

"ادھورے خط کی تحریر تو تم نے پڑھ ہی لی ہوگی۔" شہزادہ بولا۔

"جی نہیں۔ وہ فارسی میں ہے۔ میں فارسی نہیں جانتی۔ میری والدہ فارسی جانتی تھیں۔ انہوں نے مجھے اس خط کے بارے میں مختصراً بتایا تھا۔"

"ہم تمہیں اس کے بارے میں تفصیل سے بتائیں گے لیکن پہلے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم ہماری سپاہ کے ایک دستے کے سالار کے ساتھ یہاں کیوں آئیں؟"

"ہم مکتب میں ساتھ پڑھ چکے ہیں۔" زرتاج نے نظریں جھکا کر کہا۔ "اور اس وقت ہمارے یہاں آنے کا سبب ایک غیر معمولی صورت حال تھی۔ میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی برادر معظم!...... بدبخت غلام قادر نے آنجہانی شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال لی تھیں۔ میں اس کے گیارہ ساتھیوں سے اس کا انتقام لے چکی ہوں۔ جب میں نے گیارہویں کو گولی ماری تو......"

زرتاج نے مختصر طور پر شہزادہ سراج کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔

"خوب!" شہزادہ سراج الدین ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم نے بہادر مغل شہزادیوں کے خون کی لاج رکھ لی مگر یہ صورت حال شاہی خاندان کے لیے گمبھیر بھی ثابت ہو سکتی ہے، اگر اس سارے معاملے کو راز میں نہیں رکھا جا سکا۔"

"شہزادہ حضور!" فیضان بولا۔ "کیا اب آپ مجھے جانے کی اجازت دیں گے؟ میں اپنے گھر والوں کی طرف سے بہت فکر مند ہوں۔ انگریزوں کو شک مجھ پر بھی ہے۔ شہزادی زرتاج اس وقت ان کے ہاتھ نہیں لگ سکیں اور کیونکہ اس وقت میں بھی غائب ہوں اس لیے انگریزوں کی طرف سے نہ جانے کیا قدم اٹھایا جائے۔"

"تم پر انہیں کیا شبہ ہے......؟ اور کیوں؟"

اگرچہ فیضان کو اپنے گھر جانے کی جلدی تھی لیکن اسے اجمالی طور پر سراج الدین کو حالات سے آگاہ کرنا پڑا۔

شہزادہ سراج الدین کے چہرے پر تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ بولا۔ "جب تم ہماری عزیز بہن کو لے کر وہاں سے بھاگے تھے، تو کیا یہ امکان نہیں کہ تمہیں بھی پہچان لیا گیا ہو۔"

"اس کا خدشہ تو ہے شہزادہ حضور!"

"تو پھر تمہیں ابھی اپنے گھر کا رخ نہیں کرنا چاہیے۔ تمہیں گرفتار کیا جا سکتا ہے، ابھی تم یہیں رکو۔ ہم معلومات کرواتے ہیں کہ تمہارے گھر پر کیا صورت حال ہے۔"

"کوئی بھی صورت حال ہو، میں اپنے گھر والوں کے لیے بہت پریشان ہوں اور وہاں جانے کے لیے بہت بے چین ہوں۔"

"نہیں فیضان!" زرتاج بول پڑی۔ "برادر معظم ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پہلے معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ تم فوراً وہاں نہیں جاؤ۔"

فیضان کے چہرے پر بے چینی اور پریشانی کے تاثرات میں اضافہ ہوگیا۔

شہزادہ سراج الدین نے ناظر کو بلا کر اسے حکم دیا کہ فیضان کے غسل اور لباس کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس کے آرام کے لیے ایک کمرے کا بندوبست کیا جائے۔

جب یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا تو اپنے گھر والوں کے سلسلے میں فیضان کی بے چینی کم نہیں ہوئی تھی۔ زرتاج کو شہزادہ سراج الدین نے اپنے پاس روک لیا تھا کیونکہ وہ اسے خاندان کے دوسرے لوگوں سے متعارف کروانا چاہتا تھا۔

جب اسے آرام کرنے کے لیے ایک کمرا دیا گیا اس وقت زرتاج اکبر شاہ ثانی کے کمرے میں تھی۔

☆☆☆

بیمار اکبر شاہ ثانی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی حالت اب ایسی تھی کہ وہ نیم دراز بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے زرتاج کو اپنے اوپر جھکا کر اس کی پیشانی چومی تھی اور پھر اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ خود زرتاج بھی جذباتی ہو چکی تھی اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اکبر شاہ ثانی کے سینے کے کپڑے میں جذب ہو رہے تھے۔ وہیں شہزادہ سراج الدین بھی خاموش اور سنجیدہ ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔

ذرا دیر بعد خاندان کے خاص خاص لوگ کمرے میں جمع ہونا شروع ہوئے۔ وہاں آنے کا حکم انہیں اکبر شاہ ثانی ہی کی طرف سے ملا تھا۔ جو بھی وہاں آ رہا تھا، اس کی نظریں جب زرتاج پر پڑتی تھیں تو اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات پیدا ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا ہوگا کہ اس "اجنبی لڑکی" کا اکبر شاہ ثانی کے کمرے میں کیا کام!

جب مطلوبہ لوگ جمع ہو گئے تو سراج الدین نے وہ خط نکالا جس کے دونوں حصے اس نے ایک بڑے کاغذ پر اس طرح جوڑ لیے تھے کہ دونوں حصوں کے کٹے ہوئے الفاظ ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے۔

"یہ خط۔" شہزادہ سراج الدین نے کہا۔ "یہ خط جواب میں پڑھوں گا، یہ ہمارے دادا آنجہانی عالم شاہ ثانی کا خط ہے، اس پر ان کی مہر بھی موجود ہے۔"

سب لوگ حیرت سے شہزادہ سراج الدین کی طرف دیکھنے لگے جس نے کسی کی طرف دیکھے بغیر خط پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ "اس وقت جبکہ ہم یہ خط لکھ رہے ہیں، ہماری سلطنت زوال پذیر ہو چکی ہے۔ فرنگی تو ہمارا درد سر ہیں ہی لیکن تخت دہلی حاصل کرنے کے لیے ہمیں مرہٹوں سے مصالحت کرنا پڑی ہے لیکن ہم تخت نشیں ہونے کے باوجود خود کو حاکم نہیں سمجھتے۔ مرہٹے ہی بڑی حد تک دہلی پر قابض ہیں اور قصر شاہی بھی ان کی دسترس میں رہتا ہے۔ ہماری چھوٹی بہن شہزادی مہر النسا، جس کی شادی خاندان کے ایک شہزادے ہی سے کی گئی تھی۔"

خط فارسی میں تھا اور زرتاج فارسی نہیں جانتی تھی ورنہ سمجھ لیتی کہ یہ بات آنجہانی شاہ عالم ثانی نے جھوٹ لکھی تھی۔ غالباً وہ یہ حقیقت اپنے خاندان سے چھپانا چاہتے تھے کہ ان کی بہن روہیلوں کے سردار ضابطہ خاں کی زبردستی کا

شکار ہوئی تھی۔

شہزادہ سراج الدین نے خط کا پڑھنا جاری رکھا۔

''میری وہ عزیز بہن ایک بچی کو جنم دیتے ہوئے خدا کو پیاری ہوگئی تھی۔ اس بچی کی ہم نے بڑے پیار اور محبت سے پرورش کی۔ جب وہ پندرہ سال کی ہوگئی تو بہت ہی خوب صورت تھی۔ ایک مرہٹہ اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا تھا۔ ہماری اس بھانجی کا نام نجم النسا تھا۔ آنجہانی فرخ سیر کی نسل سے ایک شہزادہ ہماری عزیز بھانجی شہزادی نجم النسا سے محبت کرتا تھا۔ حالات بہت خراب تھے۔ ہمیں ڈر تھا کہ وہ مرہٹہ کسی وقت موقع پا کر شہزادی نجم النسا کے ساتھ زیادتی کر سکتا تھا اس لیے ہم نے شہزادی نجم النسا کی شادی بہت خفیہ طور پر اور بڑی سادگی کے ساتھ اس شہزادے سے کردی جو شہزادی نجم النسا سے محبت کرتا تھا۔ ہمیں اس کے بعد بھی مرہٹے سے خدشہ لاحق تھا اس لیے ہم نے دل پر پتھر رکھ کر شہزادی نجم النسا کو خود سے جدا کرنا گوارہ کرلیا۔ ہم نے شہزادے کو سارے حالات بتائے۔ ان حالات سے ہماری ایک بہت معتمد کنیز دایہ بیگم واقف تھیں۔ شہزادی نجم النسا کو وہ بے حد چاہتی تھیں چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آج رات ہم نہایت رازداری کے ساتھ ان تینوں کو محل سے رخصت کردیں گے۔ ہم نے انہیں ہدایت کی ہے کہ یہ کہیں دور دراز جا کر زندگی گزاریں اور اگر کبھی ہمارے خاندان کی شان وشوکت بحال ہوجائے تو یہ محل واپس آجائیں۔ ہمیں اس کی امید برائے نام ہی ہے کہ ہماری زندگی میں کبھی ایسا دور آسکے گا۔ شاید ہمارے بعد ہمارے کسی وارث یا اس کے وارث یا اس کے وارث کی زندگی میں ایسا ہو۔ اسی لیے ہم نے اس خط میں کسی کو مخاطب نہیں کیا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ خط کبھی ہمارے خاندان میں پہنچ سکے گا یا نہیں۔ ہم نے اس خط کو درمیان سے پھاڑ کر اس کے دو حصے کردیے ہیں۔ ایک حصہ ہمارے پاس ہے اور دوسرا ہم نے دایہ بیگم کو دے دیا ہے۔ ہمارے پاس جو حصہ ہے، وہ ہم مرنے سے پہلے اپنے ولی عہد کو اس ہدایت کے ساتھ دے جائیں گے کہ جب اس کا آخری وقت آئے تو وہ ہماری ہی طرح اس عمل کو جاری رکھے۔ دایہ بیگم بھی وفات سے قبل وہ خط شہزادی نجم النسا کی تحویل میں دے دیں گی اور شہزادی نجم النسا کے خاندان میں بھی یہ خط اسی طرح منتقل ہوتا رہے گا، تا آنکہ یہ خط کبھی ہمارے خاندان میں پہنچے یا شاید کبھی نہ پہنچے۔ بہرحال ایک موہوم سی امید پر ہم یہ خط لکھ رہے ہیں۔ ہم نے اپنا پستول جس پر شاہی خاندان کا نشان ہے، شہزادے کو دے دیا ہے۔ یہ پستول بھی خط کے نصف حصے کے ساتھ نسلاً بعد نسل شہزادی نجم النسا کے خاندان میں منتقل ہوتا رہے گا۔ جب بھی کوئی وہ پستول اور خط کا وہ نصف حصہ لے کر ہمارے خاندان میں آئے تو ان دونوں چیزوں کی وجہ سے کوئی بھی اس کو اپنے خاندان کا فرد سمجھنے میں تامل نہ کرے اور اسے بھی وہی عزت اور مقام دیا جائے جو دیگر شہزادگان مغلیہ کا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے وارثوں میں سے کوئی بھی ہماری اس ہدایت یا نصیحت کے خلاف عمل نہیں کرے گا۔''

شہزادہ سراج الدین نے خاموش ہو کر خاندان کے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میں یہ خط آپ سب کو بھی دوں گا۔ سب اسے باری باری پڑھ لیں لیکن اس سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس خط کا نصف حصہ اعلیٰ حضرت نے مجھے اس دن دیا تھا جب ہماری ولی عہدی کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس خط کا باقی حصہ ہمیں کچھ دیر قبل ملا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ پستول بھی۔'' شہزادہ سراج الدین نے پستول نکال کر دکھایا۔ ''ابھی آپ لوگ اس خط کے ساتھ اس پستول پر لگا ہوا شاہی نشان بھی دیکھ لیجیے گا۔ یہ بتاتے ہوئے ہمیں افسوس ہو رہا ہے کہ شہزادی نجم النسا کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی حرکت قلب اس لیے بند ہوئی تھی کہ دایہ بیگم کا انتقال ہوا تھا۔ دو سال قبل شہزادی نجم النسا کے شوہر کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ آج یہ خط اور پستول ہمارے پاس شہزادی نجم النسا کی بیٹی کے ذریعے پہنچا ہے۔ یہ ان کی بیٹی ہیں۔'' شہزادہ سراج الدین نے زرتاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔ ''شہزادی زرتاج۔''

کمرے میں چند لمحوں کے لیے بھنبھناہٹ سی ہوئی۔ زیادہ تر افراد ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے تھے اور ان کی نظریں زرتاج کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

اکبر شاہ ثانی کے سینے سے الگ ہونے کے بعد زرتاج کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ حقیقتاً اسے اس وقت بھی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی جب اسے دایہ بیگم سے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک مغل شہزادی ہے اور اب اسے شاہی محل میں آ کر بھی کوئی مسرت نہیں ہوئی تھی۔ نجم النسا اور دایہ بیگم کی موت کے بعد اسے ساری دنیا خالی خالی سی لگنے لگی تھی۔ اس کے لیے اگر اپنا کوئی رہ گیا تھا، وہ صرف فیضان تھا۔

''اب۔'' شہزادہ سراج الدین نے کہا۔ ''میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شہزادی نجم النسا کی زندگی کیسے گزری۔''

اس نے وہ سب کچھ دہرا دیا جو اسے ذرا دیر قبل

شہزادی زرتاج سے معلوم ہوا تھا۔ اس نے بس یہ نہیں بتایا کہ شہزادی زرتاج نے گیارہ روہیلوں کو قتل کیا تھا۔ وہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ”دایہ بیگم کے انتقال سے پہلے ہماری عزیز بہن شہزادی زرتاج کو ان سب باتوں کا علم نہیں تھا۔ ایک عام لڑکی سمجھا تھا ہماری شہزادی نے خود کو، اور اسی لیے اسے محبت بھی ایک عام نوجوان سے ہوئی ہے۔ فیضان ہماری سپاہ کے ایک دستے کا سالار ہے۔ خوب صورت، شجاع اور نہایت ذہین ہے۔ اگرچہ وہ کسی شاہی خاندان سے نہیں ہے لیکن ہمارا خاندان بھی تو اب محض رسماً شاہی خاندان رہ گیا ہے۔ اسی لیے ہم نے اعلیٰ حضرت کے مشورے سے فیصلہ کیا ہے کہ فیضان اور شہزادی زرتاج کی شادی کر دی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ سب ان دونوں کو بہت خوش دلی اور وسیع القلبی سے قبول کریں گے، اور اب آپ لوگ یہ خط اور یہ پستول دیکھ سکتے ہیں۔“

شہزادہ سراج الدین نے دونوں چیزیں سب سے پہلے ممتاز بیگم کی طرف بڑھائیں اس کی یہ سوتیلی والدہ اگرچہ اپنے بیٹے جہانگیر مرزا کو ولی عہد بنانے کے لیے انگریزوں سے بھی سازباز کی سعی ناکام کر چکی تھیں لیکن شہزادہ سراج سب کچھ نظرانداز کر کے اب بھی ان کا احترام کرتا تھا۔

کمرے میں موجود لوگوں میں سے سب سے پہلے شہزادہ سراج الدین کی چہیتی بیوی زینت محل آگے بڑھ کر زرتاج کے قریب گئی۔ زرتاج احتراماً کھڑی ہوگئی۔ زینت محل نے اسے بڑی محبت کے ساتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔

”تم اب میرے ساتھ چلو!“ اس نے زرتاج سے کہا۔ ”اب خاندانِ مغلیہ کی شان و شوکت پہلے جیسی تو نہیں رہی لیکن جیسی بھی رہ گئی ہے، اسی اعتبار سے اب تمہاری وضع قطع شہزادیوں ہی کی سی ہونا چاہیے۔ دو کنیزیں بھی تمہارے لیے مخصوص کی جائیں گی۔“

☆☆☆

جن لوگوں کو فیضان کے گھر کی صورت حال جاننے کے لیے بھیجا گیا تھا، انہوں نے واپس آ کر محل کے ناظر کو ان حالات سے آگاہ کیا اور ناظر نے نہایت پریشانی کے عالم میں شہزادہ سراج الدین کے پاس جا کر اسے وہ سب کچھ بتایا۔ وہ سب کچھ جان کر شہزادے کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ اسے پریشانی تو لاحق ہوئی ہی تھی لیکن صدمہ بھی پہنچا تھا۔

فیضان کے گھر پر قیامت گزر چکی تھی۔ شہزادہ سراج الدین فوری طور پر فیصلہ نہیں کر سکا کہ فیضان کو وہ سب کچھ کس طرح بتایا جائے۔ اس کے لیے فیضان اب صرف شاہی سپاہ کے ایک لشکر کا سالار نہیں، اس کی بہن کا ہونے والا شوہر بھی تھا۔ مغل خاندان کا ہونے والا داماد......!

شہزادہ سراج الدین نے یہ تو سوچ لیا تھا کہ اپنے والد سے بات کرنے کے بعد فیضان کو کوئی خاص منصب دیا جائے گا لیکن فی الحال اس کے سامنے وہ سنگین صورت حال آگئی تھی جو فیضان کے علم میں لانا آسان نہیں تھا۔

ناظر کو رخصت کر کے شہزادہ سراج الدین ٹہلتا ہوا اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ زینت محل آگئی۔ اس کے ساتھ زرتاج بھی تھی جس کا حلیہ نمایاں طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔ وضع قطع سے وہ محل کی دوسری شہزادیوں ہی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

”دیکھیں اب آپ اپنی بہن کو۔“ زینت محل نے شہزادے سے کہا۔

شہزادہ سراج الدین، زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے خفیف سا مسکرایا۔ ”تم کیسا محسوس کر رہی ہو میری عزیز بہن!“

”برادرِ معظم!“ زرتاج نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اگر میری والدہ کا انتقال نہ ہوا ہوتا اور وہ بھی میرے ساتھ ہوتیں تو میں اپنے خاندان میں آ کر یقیناً بہت زیادہ خوش ہوتی، تاہم اب بھی خوش ہی ہوں۔“

شہزادہ سراج الدین نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہمیں بھی اس کا رنج ہے کہ وہ اس محل سے ایسی گئیں کہ پھر واپس نہیں آ سکیں۔“

”میں اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیتی ہوں۔“ زینت محل نے کہا۔ ”میں نے دو کنیزیں اس کی خدمت کے لیے مامور کر دی ہیں۔“

”ابھی یہیں رکو۔“ شہزادہ سراج الدین نے سنجیدگی سے کہا اور کمرے کے باہر موجود خواجہ سراؤں میں سے ایک کو بلا کر اس کے ذریعے محل کے ناظر کو بلوایا۔

”آپ......“ زینت محل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میں محسوس کر رہی ہوں جیسے آپ اپنی کوئی پریشانی چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”بیٹھ جاؤ تم دونوں! ابھی بتاتے ہیں ہم!“

وہ دونوں فکرمندی سی بیٹھ گئیں...... ناظر کی آمد تک کمرے میں سکوت رہا۔ شہزادہ سراج الدین نے اسے حکم دیا کہ وہ فیضان کو وہاں لائے۔

ناظر بولا۔ ”انہوں نے محافظوں کو خاصا پریشان کر دیا ہے۔ آپ کے حکم کے مطابق دو محافظ ان کے کمرے پر مامور کر دیے گئے تھے۔ ایک کنیز اور ایک خواجہ سرا کو بھی ان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا گیا تھا لیکن وہ کمرے سے نکلنے کے لیے بے چین تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ آپ سے ملنے کے بعد ہی کہیں جا سکتے ہیں تو انہوں نے آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں ابھی آپ کو یہ اطلاع دینے کے لیے آنے ہی والا تھا۔“

شہزادہ سراج الدین نے اس کی باتیں نظرانداز کر دیں اور اپنا حکم دہرایا کہ وہ فیضان کو لے کر آئے۔

ناظر کے جانے کے بعد شہزادہ سراج الدین نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ”وہ اپنے گھر جانے یا اپنے گھر والوں کی خیریت جاننے کے لیے بے چین تو ہوگا ہی۔“

”برادرِ معظم!“ زرتاج نے پہلو بدل کر کہا۔ ”آپ نے کچھ لوگوں کو اس کے گھر بھیجا تھا۔“

”وہ لوگ واپس آ چکے ہیں؟“

”سب خیریت تو ہے نا؟“ زرتاج نے پوچھا، مگر اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید خیریت نہیں ہوگی۔

”فیضان کو آ جانے دو۔ اس کے سامنے ہی بتائیں گے۔“ شہزادے نے جواب دیا۔ زرتاج کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

”گھبراؤ نہیں۔“ زینت محل نے محبت سے اس کی پیٹھ تھپکی۔ ”انشاءاللہ سب خیریت ہی ہوگی۔“

لیکن خیریت نہیں تھی۔ انگریز افسران فیضان کے گھر پہنچے تھے اور رحمان دادا سے اس کے بارے میں بڑی سختی سے پوچھتے رہے کہ وہ کہاں ہے لیکن رحمان دادا کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ اسی دوران میں گوہر وہاں پہنچ گئی۔

گوہر کے وہاں پہنچنے کے بارے میں زرتاج قیاس کر سکتی تھی کہ وہ کیونکہ دیر تک گھر واپس نہیں پہنچی تھی اور فیضان بھی نہیں لوٹا تھا اس لیے وہ پریشان ہو کر اپنے گھر پہنچی ہوگی۔

اس کا وہاں پہنچنا اس کے لیے بھی اندوہناک ثابت ہوا تھا۔ اس وقت انگریزوں نے دادا رحمان کی زبان کھلوانے کے لیے ان پر تشدد شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ دادا رحمان کے علم میں کچھ نہیں ہوگا۔ جب وہ اس پر تشدد کر رہے تھے تو شور سن کر اس کی بیمار بیوی واویلا کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ قریب پہنچی تو ایک انگریز نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ بے چاری دیوار سے اس طرح ٹکرائی کہ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ انگریزوں نے اس کی پروا ہی نہیں کی اور جب گوہر وہاں پہنچی تو اسے بھی پکڑ لیا گیا۔ دادا رحمان کو دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے زبان نہیں کھولی تو اس کی پوتی کو اس کی نظروں کے سامنے بے آبرو کیا جائے گا۔ دادا رحمان چیختے ہی رہ گئے اور ایک انگریز نے اپنے افسر کے سامنے گوہر کا لباس پھاڑنا شروع کر دیا۔ گھر میں ملازمین موجود تھے مگر ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ انگریزوں کے سامنے کسی بھی قسم کا احتجاج کر سکتے۔ جب گوہر کا لباس پھاڑا جا رہا تھا تو صدمے سے دادا رحمان کی حرکتِ قلب بند ہوگئی۔ گوہر کسی طرح خود کو چھڑا کر صحن کی طرف بھاگی۔ اس کا پیچھا کیا گیا لیکن وہ ہاتھ نہیں آئی اور اس نے صحن میں بنے ہوئے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ کنواں بہت گہرا تھا۔ انگریزوں نے کسی طرح اسے کنویں سے نکال تو لیا مگر اس وقت تک گوہر کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس نے اپنی جان دے کر خود کو بے عزت ہونے سے بچا لیا تھا۔ دوسری طرف اس کی دادی جو پہلے ہی بیمار تھی۔ سر سے زیادہ خون بہہ جانے کے باعث جانبر نہ ہو سکی۔ اس کے بعد انگریز وہاں سے چلے گئے۔

یہ سب کچھ زرتاج کو پھوٹ پھوٹ کر رلانے کے لیے کافی تھا اور فیضان کی حالت ایسی نظر آتی رہی تھی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ جسم پر ایسی لرزش طاری ہوگئی تھی جیسے شدید تپ چڑھ گئی ہو۔

زینت محل نے زرتاج کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ بھی اس وقت مغموم نظر آنے لگی تھیں۔ شہزادہ سراج الدین کا چہرہ پتھرایا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ یکایک فیضان بڑے بھیانک انداز میں چیخا۔ ”میں ان کتوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ لیکن اس کی یہ للکار قطعی بے معنی تھی۔ وہ انگریزوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا مگر وہ چیختا ہوا وحشیانہ انداز میں دروازے کی طرف لپکا۔

”فیضان!“ زرتاج جیسے بلبلاتی ہوئی، فیضان کو روکنے کے لیے اٹھی مگر اس سے پہلے ہی شہزادہ سراج الدین کے اشارے پر ناظر نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اسے شہزادہ سراج الدین نے پہلے ہی رکنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اسے یقیناً توقع ہوگی کہ اس قسم کی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔

زرتاج بھول ہی گئی تھی کہ وہاں کوئی اور بھی موجود تھا۔ وہ روتی ہوئی فیضان سے لپٹ گئی تھی لیکن فیضان اس وقت

اتنا بپھرا ہوا تھا کہ ان دونوں ہی کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔

شہزادہ سراج الدین کے آواز دینے پر باہر موجود دونوں خواجہ سرا بھی اندر آگئے تھے۔ انہوں نے ناظر سے مل کر فیضان کو کسی طرح بے بس کیا۔

”تمہارا یہ غصہ، تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا بیٹے!“ شہزادہ سراج الدین نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”ہم تو بادشاہ کے ولی عہد ہیں۔“ اس کے لہجے میں تلخی آگئی۔ ”مگر ہم بھی ان فرنگیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہماری ساری سلطنت میں وہ بدبخت یہی مظالم ڈھاتے پھر رہے ہیں۔“

فیضان کو ایک جگہ بٹھا دیا گیا تھا۔ دونوں خواجہ سرا اب بھی اسے پکڑے ہوئے تھے۔ زرتاج فرش پر بیٹھ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی اور روئے جارہی تھی۔

”ہم صبر کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتے بیٹے!“ شہزادہ سراج الدین نے مزید کہا۔ ”تمہیں بھی صبر کرنا ہوگا میرے عزیز!“

ابھی تک فیضان آب دیدہ بھی نہیں ہوا تھا لیکن اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

یکایک زرتاج نے اپنے سینے پر دوہتڑ چلایا۔ ”یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔“

وہ اپنے سینے پر دوہتڑ چلاتی ہی چلی جاتی لیکن زینت محل نے اس کے قریب آکر اسے سنبھالا۔

”خود کو سنبھالو فیضان بیٹے!“ شہزادہ سراج الدین پھر بولا۔ ”اس طرح تم خود کو بھی ہلکان کرو گے اور اپنی ہونے والی بیوی کو بھی...... حاصل نہ تمہیں کچھ ہوگا، نہ ہماری اس بدنصیب بہن کو جو اپنے خاندان میں آئی تو اندوہناک حالات اس کے تعاقب میں رہے۔“

آنسو بہاتے ہوئے فیضان، زرتاج کی طرف دیکھنے لگا جو زینت محل کی آغوش میں ساکت ہوچکی تھی۔

”یہ صدمے سے صرف بے ہوش ہوئی ہے۔“ زینت محل نے جلدی سے کہا۔ اسے ڈر ہوگا کہ زرتاج کے بارے میں کچھ اور سمجھ کر فیضان پھر بے قابو نہ ہونے لگے۔

جب زرتاج کو ہوش آیا تو وہ بستر پر اور اسی کمرے میں تھی جو اس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اسے ہوش میں لانے والی محل کی ایک طبیبہ تھی۔ زرتاج کے پائنتی فیضان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ کمرے میں زینت محل کے علاوہ دو شہزادیاں بھی تھیں۔ وہ شہزادہ سراج الدین کی بیٹیاں تھیں۔ وہ زرتاج کے سرہانے دائیں بائیں جانب بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہروں پر اپنائیت اور ہمدردی تھی۔

”اب تمہارے علاوہ میرا کوئی نہیں رہا زرتاج!“ فیضان بولا تو اس کی آواز بھی جیسے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

زرتاج کے ہونٹ کپکپائے۔ ”میرا بھی تمہارے علاوہ کون ہے فیضان!“

”تم تو اپنے خاندان میں آگئی ہو۔“

”بیٹے!“ زینت محل نے فیضان کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اس خاندان کو اب تم اپنا ہی خاندان سمجھو۔“

شہزادہ سراج الدین اس وقت اپنے کمرے میں ناظر کو سمجھا رہا تھا۔ ”ان سارے معاملات کی ہوا ابھی محل کے باہر کسی کو نہیں لگنا چاہیے۔ فرنگیوں کو معلوم ہوگیا تو وہ بہت کچھ سمجھ لیں گے۔ محل کے محافظ دستے کے تمام لوگوں کو نظر بند کر دیا جائے۔ کسی کے سامنے بھی ان کی زبان سے کچھ نکل سکتا ہے۔ نظر بندی کے باوجود ان سب کا پوری طرح خیال رکھا جائے۔ انہیں یہ یقین دلانا بھی ضروری ہے کہ ان کی نظر بندی وقتی ہے۔ جب بھی ہمیں اطمینان ہوگیا کہ اب کوئی اندیشہ نہیں، ان کی نظر بندی ختم کردی جائے گی۔ محل کے محافظ دستے کے لیے دوسرے سپاہیوں کا بندوبست کیا جائے۔ محل میں کنیزوں اور خواجہ سراؤں کو بھی اس کا علم نہیں ہے کہ وہ دونوں کب اور کن حالات میں یہاں آئے ہیں اور اگر تمہارے خیال کے مطابق ان میں سے بھی کسی کو کچھ معلوم ہوگیا ہو تو اسے بھی نظر بند کردو۔“

”آپ کے ہر حکم کی تعمیل ہوگی شہزادہ والا تبار!“

”ہم تم سے ایک بات پوچھنا بھول گئے۔“ شہزادہ سراج الدین نے کہا۔ ”فیضان کے گھر والوں کی لاشوں کا کیا ہوا؟“

”انگریز محلے کے لوگوں سے کہتے ہوئے چلے گئے تھے کہ گاڑ دو ان لاشوں کو۔“ ناظر نے جواب دیا۔ ”وہ لوگ ان کی تدفین کردیں گے۔“

”اب تم جاسکتے ہو۔ ہم ایک بار پھر کہہ دیں کہ نظر بندوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔ ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ ہماری مجبوری ہے کہ انہیں نظر بند کیا جائے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں شہزادہ والا تبار!“

ناظر کے جانے کے بعد شہزادہ سراج الدین اپنے کمرے سے نکل کر اس کمرے کی طرف چل پڑا جو زرتاج کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اسے زرتاج اور فیضان، دونوں ہی کی فکر لاحق تھی۔

دونوں خواجہ سرا اس کے پیچھے چلتے رہے۔ وہ اس کے محافظ بھی تھے۔

زرتاج اور فیضان کے معاملے کو راز میں رکھنے کے لیے شہزادہ سراج الدین نے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ شاہ عالم ثانی کا خط سناتے وقت بھی اس نے خاندان کے صرف قریبی لوگوں کو اکبر شاہ ثانی کے کمرے میں بلایا تھا۔ صرف جہانگیر مرزا اور اس کی ماں ممتاز بیگم پر اسے کچھ زیادہ اعتماد نہیں تھا لیکن ان دونوں کو بلانا اس کی مجبوری تھی ورنہ اگر ان دونوں کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑ جاتی کہ کسی خاص معاملے میں ان دونوں کو نظر انداز کیا گیا تھا تو تلخی بڑھ جاتی جو جہانگیر مرزا کے ولی عہد نہ بننے کی وجہ سے پہلے ہی بڑھی ہوئی تھی۔

وہ جب زرتاج کے کمرے میں پہنچا تو زرتاج کو ہوش آچکا تھا۔ اس نے فیضان کو بتایا کہ اس کے گھر والوں کی تدفین پڑوس کے لوگ کر رہے ہیں لیکن وہ ان کی تدفین میں بھی شریک نہیں ہوسکتا۔

”فرنگیوں کو جانتے ہی ہو تم!“ شہزادہ سراج الدین نے کہا۔ ”وہ کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ اگر تم ان کی تدفین میں گئے تو تمہیں گرفتار ہوتے دیر نہیں لگے گی۔“

فیضان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسے اپنی بے بسی اور بدنصیبی کا احساس یقیناً بڑی شدت سے ہوا ہوگا۔ وہ اپنے دادا دادی اور سگی بہن کی تدفین میں بھی شرکت نہیں کرسکتا تھا۔

اسی وقت محل کا ناظر کچھ پریشان سا وہاں آیا۔

”شہزادہ والا تبار!“ اس نے کہا۔ ”اعلیٰ حضرت کی طبیعت اچانک بہت زیادہ بگڑ گئی ہے۔“

شہزادہ سراج الدین تیزی سے جانے کے لیے مڑا۔ فوراً ہی اس کے پیچھے زینت محل نے بھی قدم اٹھائے۔ دونوں شہزادیاں بھی زرتاج کے سرہانے سے اٹھی تھیں۔

”نہیں۔“ زینت محل نے ان سے کہا۔ ”تم دونوں یہیں رکو۔ اپنی پھوپی کے پاس۔“

وہ دونوں شہزادیاں نہ صرف عمر میں زرتاج سے چھوٹی تھیں بلکہ رشتے میں بھی چھوٹی تھیں۔ زرتاج شہزادہ سراج الدین کی ماموں زاد بہن تھی۔ اس رشتے سے وہ ان دونوں شہزادیوں کی پھوپی تھی۔

شہزادہ سراج الدین اور زینت محل اکبر شاہ ثانی کے کمرے میں پہنچے۔ اکبر شاہ ثانی پر غشی سی طاری تھی۔ دو طبیب اس کی طبیعت سنبھالنے کے لیے کوشاں تھے۔ جلد ہی خاندان کے کچھ اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ اکبر شاہ ثانی پر رات بھر غشی طاری رہی اور صبح ہوتے ہوتے وہ اس دارفانی سے کوچ کرچکا تھا۔

جب یہ اطلاع فیضان اور زرتاج کو ملی تو زرتاج نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ اس طرح چھپا لیا جیسے اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو ہاتھوں ہی میں جذب کرلینا چاہتی ہو۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”بدنصیبی مسلسل پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں اپنے ایک اور بزرگ کے سائے سے بھی محروم ہوگئی۔“

فیضان سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے تصور میں اس وقت صرف تین لاشیں ہوں گی۔ دادا، دادی، اور گوہر کی لاشیں!

☆☆☆

اکبر شاہ ثانی کا تیس سالہ دور بادشاہت انگریزوں ہی کی حکمرانی میں گزرا تھا۔ اس کے باپ عالم گیر ثانی کو 1803ء میں، جب مرہٹہ سردار مادھوجی سندھیا نے انگریزوں سے شکست کھائی تھی تو شاہ عالم گیر ثانی کی حکمرانی انگریزوں کو منتقل ہوگئی تھی۔ انہوں نے شاہی خاندان کے لیے وظائف مقرر کردیے تھے۔ یہ اجازت بھی دے دی گئی تھی کہ شہر دہلی میں بادشاہ ہی کے نام سے احکام جاری ہوں لیکن اصل نظام حکومت انگریز ریذیڈنٹ کے ہاتھ میں رہا تھا۔

باپ کی وفات کے بعد اکبر شاہ ثانی 1806ء میں دہلی کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کی زندگی اسی نظام حکومت کے تحت گزری تھی۔ دل ہی دل میں فرنگیوں سے نفرت کرنے کے باوجود وہ بے بسی کا شکار رہا تھا۔ خزانہ خالی ہوجانے کے باعث اس کی عسکری طاقت اتنی کم ہوچکی تھی کہ اچھی طرح قدم جما لینے والے انگریزوں سے مقابلہ کرنے کا خواب دیکھنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کے سپاہیوں کی اکثریت نے اسے چھوڑ کر انگریزی لشکر میں ملازمتیں حاصل کرلی تھیں مگر وہ بے چارے بھی اپنے بال بچوں کا پیٹ آخر کیسے پالتے۔ جن وفاداروں نے بادشاہ کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا، ان کی زندگی بہ مشکل ہی گزر رہی تھی اور اب بھی بہ مشکل گزر رہی تھی۔

اکبر شاہ ثانی کی بے بسی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج بے حسی کا شکار ہوتی چلی گئی تھی اور اس نے خود کو تعیشات میں غرق کرلیا تھا۔ متعدد بیویوں اور کنیزوں سے اس کی اولادوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو

اس کی اولادوں کی اولادیں بھی نہ صرف جوان بلکہ صاحب اولاد ہو چکی تھیں۔ اس کے انتقال کے وقت شاہی خاندان کے افراد کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی جن میں پہلے گزرے ہوئے بادشاہوں کی اولادیں بھی شامل تھیں۔

شہزادہ سراج الدین 1836ء میں بہادر شاہ ثانی کے لقب سے تخت نشیں ہوا تھا مگر کچھ ہی دن بعد اس نے اپنے لقب سے ''ثانی'' کا لاحقہ ہٹا کر اس کی جگہ اپنا تخلص ''ظفر'' لگا لیا تھا۔ اسی لیے سلطنت دہلی میں وہ بہادر شاہ ظفر کہلایا گیا۔

غلط یا صحیح، زرتاج نے سنا تھا کہ لقب میں اپنے تخلص ''ظفر'' کا لاحقہ بہادر شاہ نے اپنے استاد ابراہیم ذوق کے مشورے سے لگایا تھا۔ محل میں زرتاج بھی شہزادی کہلانے لگی۔ اس کا طرز زندگی وہی بن گیا جو دوسری شہزادیوں کا تھا مگر فیضان کے لیے وہ وہی عام لڑکی بنی رہی جو مکتب میں اس کے ساتھ پڑھی تھی۔ گزرتے ہوئے وقت کا مرہم فیضان کے دل پر لگنے والے زخم مندمل کرتا رہا۔ اس کا صدمہ بھلانے میں زرتاج نے بھی اس کے دل جوئی کی تھی۔

سال بھر بعد ان کی شادی ہوگئی۔ اس عرصے میں فیضان نے بہادر شاہ ظفر کے کہنے سے نہ صرف ڈاڑھی رکھ لی تھی بلکہ بال بھی بڑے رکھ لیے تھے۔ اس کے جسم پر لباس بھی اب دربار کے ایک منصب دار کا ہوتا تھا اس لیے اب اسے اس فیضان کی حیثیت سے شناخت کرنا بہت مشکل تھا جس کی تلاش انگریزوں کو عرصے تک رہی تھی لیکن سال بھر بعد اب امکان یہی تھا کہ انہوں نے فراموش ہی کر دیا ہوگا کہ روہیلوں کو قتل کرنے والی لڑکی کو فرار کرا کر لے جانے والا فیضان اب کہاں ہوگا۔ بہادر شاہ ظفر ہی کی ہدایت پر فیضان لال قلعے سے باہر نکلا بھی نہیں تھا کہ مبادا اسے پہچان لیا جائے۔ ایک سال بعد اسے اتنی اجازت مل گئی کہ اگر بہت ہی ضروری ہو تو وہ قلعے سے باہر نکلے۔ فیضان کو کہیں جانے کی خواہش بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا تو صرف اتنا کہ کم از کم ایک مرتبہ اپنے دادا دادی اور بہن گوہر کی قبروں پر فاتحہ پڑھ آئے لیکن اسے علم نہیں تھا کہ ان کی قبریں کہاں تھیں۔

بہادر شاہ ظفر نے اس کی خواہش جاننے کے بعد کہا تھا۔ ''تمہارے پڑوس میں رہنے والے لوگوں ہی سے ان تینوں کی قبر کا پتا لگ سکتا ہے لیکن اس قسم کی پوچھ گچھ کرنے سے لوگ مشتبہ ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ذہن میں ایک بات اور بھی ہے۔ امکان تو یہی ہے کہ انگریز اب تمہاری اور زرتاج کی طرف سے مایوس ہو چکے ہوں گے لیکن شاید ابھی مکمل مایوس نہ ہوئے ہوں۔ ممکن ہے کہ اس خیال سے ان قبروں کی نگرانی کی جا رہی ہو کہ شاید تم کبھی ان قبروں پر فاتحہ پڑھنے آؤ اور وہ تمہیں گرفتار کر لیں اور شاید زرتاج بھی اس وقت تمہارے ساتھ ہو اس لیے بہتر ہوگا کہ ابھی اور صبر کرو۔'' چنانچہ فیضان وقت گزارتا رہا۔ اس نے اپنے اس کاروبار پر بھی صبر کر لیا تھا جو اس کے دادا نے اپنے کسی عزیز کے سپرد کیا تھا۔ وہ عزیز بھی خاصا دور دراز کا تھا اس لیے فیضان کو اس سے ملنے کی بھی کوئی خواہش نہیں تھی۔ زرتاج کے بعد اب اسے کچھ اور نہیں چاہیے تھا۔

دربار میں اسے ایک اہم منصب بھی ملا تھا اور اسے ایک خطاب سے بھی نوازا جا چکا تھا۔ اسے کوئی خطاب دینا بہادر شاہ نے اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ اس کی شادی ایک مغل شہزادی سے ہونا تھی۔ اسے وہ خطاب شادی سے پہلے ہی مل گیا تھا لیکن فیضان کو اس خطاب سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس محل میں اس خطاب کے باعث اس کی عزت میں اضافہ ہوا تھا اور زرتاج سے شادی کے بعد اس کی توقیر و عزت مزید بڑھی تھی کیونکہ وہ شاہی خاندان کا داماد بن گیا تھا۔

ڈھائی سال بعد کچھ معتمد افراد کے ذریعے سے فیضان کے دادا، دادی اور گوہر کی قبروں کا سراغ مل گیا تو فیضان ان کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے اس وقت بھی یہ احتیاط برتی تھی کہ سپاہیوں کے ایک دستے کو خفیہ طور پر فیضان کی حفاظت کے لیے مقرر کر دیا تھا کہ اگر انگریز اب بھی ان قبروں کی نگرانی کروا رہے ہوں اور ان کی وجہ سے فیضان کسی خطرے میں پڑے تو وہ سپاہی اس کی حفاظت کر سکیں اور اسے بچا کر محل واپس لا سکیں۔

مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی، انگریزوں نے اس معاملے کو اب فراموش ہی کر دیا تھا۔ روہیلوں کے قتل سے انہیں کوئی دلچسپی ابتدا میں بھی نہیں ہوگی۔ وہ قتل ہو گئے تھے تو ان کی بلا سے۔ وہ تلملائے تو صرف اس وجہ سے ہوں گے کہ وہ انہیں قتل کرنے والی جس لڑکی کو گرفتار کرنا چاہتے تھے، وہ اپنے محبوب کے ساتھ ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی لیکن اب ساڑھے تین سال بعد ان کا مایوس ہو جانا فطری امر تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ جو لوگ اس معاملے کی تحقیقات کر رہے تھے، ان کا تبادلہ دہلی سے کہیں اور کیا جا چکا ہو لہٰذا اب ایسی صورت میں فیضان کے شناخت کیے جانے کے اندیشے کو بھی دل سے نکالا جا سکتا تھا۔

زرتاج اب ایک مغل شہزادی تھی لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں

تھا کہ وہ عام شہریوں کی طرح قلعے سے باہر نکلتی۔

شاہی محل میں جو لوگ زرتاج اور فیضان کے شاہی محل میں آنے کے قصے سے واقف تھے، ان میں دو ہی ہستیاں ایسی تھیں جن کی طرف سے بہادر شاہ ظفر کو یہ اندیشہ لاحق رہا تھا کہ وہ اس واقعے کی اطلاع انگریزوں کو نہ دے دیں...... وہ جہانگیر مرزا اور اس کی ماں ممتاز بیگم کی شخصیات تھیں۔

اس معاملے کو فراموش کر دینے کے باوجود انگریزوں کے پاس اس معاملے کی دستاویز تو ہونا ہی چاہیے تھیں۔ یہ اطلاع ان کے لیے خاصی معنی خیز ہوتی کہ جس روز زرتاج اور فیضان فرار ہوئے تھے، اسی رات ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان لڑکی گھوڑے پر شاہی محل پہنچے تھے۔ یہ اطلاع فرنگیوں کے دماغ میں شکوک و شبہات پیدا کر سکتی تھی اور انہیں شاہی خاندان، خصوصاً بہادر شاہ ظفر کو پریشان کرنے کے لیے جواز مل جاتا اس لیے بہادر شاہ ظفر نے جو تخت نشیں ہوتے ہی مکمل طور سے با اختیار ہو چکا تھا، کچھ معتمد لوگوں کو ان دونوں کی نگرانی پر مقرر کر دیا تھا۔

کیونکہ ممتاز بیگم اپنے بیٹے کی ولی عہدی کے سلسلے میں انگریزوں سے ساز باز کرنے کی سعی ناکام کر چکی تھی اس لیے بہادر شاہ ظفر کا خدشہ ایک فطری امر تھا۔ اب ساڑھے تین سال گزر جانے کے باوجود اس قسم کا کوئی خطرہ سامنے نہیں آیا تھا لیکن بہادر شاہ ظفر کی دانست میں یہ امکان بھی تھا کہ ان دونوں کو اپنی نگرانی کا شبہ ہو گیا ہو جس کے باعث وہ محتاط ہو گئے ہوں اور مناسب وقت اور موقع کی تلاش میں ہوں۔ وہ یہ تو سمجھ ہی سکتے ہوں گے کہ اگر بات کھل گئی تو بہادر شاہ ظفر کو اس کا جواز مل جائے گا کہ وہ ان ماں بیٹے کو زنداں میں ڈلوا دے۔ خود زرتاج اور فیضان کو بھی اندازہ تھا کہ وہ دونوں ماں بیٹے ان دونوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

''ان دونوں کی وجہ سے کبھی ہمارے لیے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔'' زرتاج نے ایک مرتبہ فیضان سے کہا تھا۔

''خطرے کا بروقت سر کچل دیا جائے گا۔'' فیضان کا جواب تھا۔ ''ان کی نگرانی ساری زندگی کی جائے گی۔ یہ مجھے اعلیٰ حضرت نے خود بتایا ہے۔''

اکبر شاہ ثانی کے بعد اب بہادر شاہ ظفر کو ''اعلیٰ حضرت'' کہا جانے لگا تھا۔

''اعلیٰ حضرت۔'' زرتاج نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔ ''ایک زمانہ تھا جب ہمارے اجداد کو ظل سبحانی، عالی جاہ اور عالم پناہ جیسے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا تھا۔''

''بھول جاؤ وہ۔ اب سب کچھ خواب ہو چکا۔''

وہ سب کچھ واقعی خواب ہو چکا تھا۔ دہلی میں بھی انگریزوں نے مغل بادشاہت صرف اس لیے گوارا کر لی تھی کہ عوام میں اب بھی کچھ طبقات ایسے تھے جن کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کے شعلے تو اب مدھم پڑ چکے تھے لیکن چنگاریاں ابھی باقی تھیں۔ انگریز مزید کچھ سال انتظار اس لیے کرنا چاہتے تھے کہ وہ چنگاریاں بھی ٹھنڈی ہو جائیں گی۔

کچھ زیادہ ہاتھ پیر انہوں نے بہر حال نکالنا شروع کر دیے تھے۔ انہوں نے شاہ عالم ثانی سے جو کچھ طے کیا تھا، اس پر وہ پوری طرح قائم نہیں رہے تھے۔ انہوں نے طے تو یہی کیا تھا کہ وہ شاہی محل کی حدود میں قطعاً مداخلت نہیں کریں گے لیکن اکبر شاہ ثانی ہی کے عہد میں ان کے ریذیڈنٹ نے محل میں آنا جانا شروع کر دیا تھا اور اب بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں تو ریذیڈنٹ اس طرح آنے لگا تھا جیسے وہ مغل بادشاہ کے مساوی ہو۔ سکوں پر سے بادشاہ کا نام بھی ہٹایا جا چکا تھا۔

سکوں پر سے نام ہٹ جانے کے بعد تو بہادر شاہ ظفر کے دل میں آگ بہت بری طرح بھڑکی تھی لیکن اپنی عادت کے مطابق اس نے حسب معمول اپنے چہرے سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔

دل میں کروٹیں لیتے ہوئے درد کے ساتھ بہادر شاہ ظفر نے تخت نشینی کے بعد بیس سال سے زیادہ کا عرصہ شراب و شعر میں گزار دیا۔ شاعری کی محفلیں تو اس کی زندگی کا لازمی حصہ بنی رہیں۔ اس کے استاد ابراہیم ذوق کے علاوہ مرزا غالب اور اس دور کے دیگر مشاہیر شعرا بھی ان محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ 1854ء میں ابراہیم ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے اپنا کلام مرزا غالب کو دکھانا شروع کر دیا تھا۔

فیضان اب تینتالیس سال کا اور زرتاج اکتالیس سال کی ہو چکی تھی لیکن ماں نہیں بن سکی تھی۔

''تو کیا ہوا!'' فیضان اس کی دل جوئی کیا کرتا۔ ''تم بھی تو اس وقت پیدا ہوئی تھیں جب تمہاری والدہ کی عمر پینتالیس سال ہو چکی تھی۔ تم بھی اسی عمر میں مجھے ایک چاند سا بیٹا دو گی۔''

یہ کہہ کر جب وہ ہنسنے لگتا تو زرتاج کے ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ آ جاتی۔

لیکن وہ ہو نہ سکا جو فیضان نے کہا تھا۔ ایک سال بعد ہی تاریخ نے خود کو ایک بار پھر دہرایا۔ نادر شاہ افشار اور احمد

شاہ ابدالی کے دہلی پر حملوں کے بعد ایک بار پھر اس شہر کے گلی کوچوں میں آگ کے شعلے لہرائے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے فضا گونجی۔ لاشوں پر لاشیں گریں۔ خون، پانی کی طرح بہا اور اس ہنگامۂ دار و گیر میں فیضان، زرتاج سے بچھڑ گیا۔

☆☆☆

بہادر شاہ ظفر کبھی کبھی فیضان سے کسی اہم معاملے میں مشاورت یا باتیں کرلیا کرتا تھا۔ ”کبھی کبھی تم سوچتے تو ہو گے عزیز من! کہ ہم نے سلطنت اور تاج و تخت، سب کچھ بھلا کر خود کو شراب و شباب میں غرق کرلیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حالات نے ہمیں بہت بے بس کردیا ہے۔ اس کے باوجود ہم پس پردہ کچھ نہ کچھ کرتے رہے ہیں۔ تم جانتے تو ہو گے کہ ہندو تو ہندو، مسلمان سپاہی بھی ہمیں چھوڑ کر فرنگی سپاہ کی ملازمت میں جا چکے ہیں۔ ہم نے خفیہ طور پر اپنے بہت سے معتمد افراد کے وفود مختلف شہروں میں بھیجے۔ ان لوگوں نے کوشش کی کہ ان سپاہیوں کے دل میں حب وطن کا جذبہ بیدار کرسکیں مگر اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوسکی۔ یہ اندازہ تو ہوا کہ ان سپاہیوں کے دلوں میں وطن کی محبت کا جذبہ ابھی یکسر ختم نہیں ہوا ہے مگر پیٹ کی آگ بھی ان کے ساتھ ہے۔ انہیں اندازہ ہے کہ مغل خزانے کا اب کوئی وجود نہیں رہا اور ہم اس کی ضمانت دینے کے قابل نہیں رہے کہ ان کے بال بچوں کی سانسیں بحال رہیں گی۔ علاوہ اس کے ان کے دلوں میں یہ بھی جاگزیں ہوچکا ہے کہ فرنگیوں کے پیر اب ہماری سرزمین پر بڑی مضبوطی سے جم چکے ہیں جنہیں اکھاڑنا اب ممکن نہیں ہوگا۔“

”حضور والا!“ فیضان نے کہا۔ ”کیا مملکت ایران سے مدد کی درخواست نہیں کی جاسکتی؟ مجھے معلوم ہے کہ ایران کے شاہ طہماسپ نے آنجہانی بابر فردوس مکانی کی مدد دل و جان سے کی تھی۔ کیا اب وہ مملکت ہماری مدد نہیں کرسکتی؟“

بہادر شاہ ظفر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کیا تمہیں اس کا علم نہیں کہ شاہ طہماسپ کے خاندان کی حکومت نادر شاہ افشار نے ختم کردی تھی۔ پھر اس کے احمق جانشینوں کے بعد وہاں کریم خاں زند کی حکومت قائم ہوئی تھی جو اس کے جانشینوں کی وجہ سے ختم ہوئی۔ اس کے بعد وہاں قاچار حکمراں رہے ہیں جن کا شاہ طہماسپ کے خاندان سے گہرا تعلق رہا ہے۔ آج کل وہاں ناصر الدین شاہ کی حکومت ہے۔ اسے برسر اقتدار آئے غالباً آٹھ نو سال گزر چکے ہیں لیکن وہاں بھی حالات اچھے نہیں ہیں۔ بابیہ تحریک کی سرگرمیاں عروج پر پہنچ رہی ہیں جو اسلامی عقائد کے خلاف ہے۔“

فیضان بولا۔ ”یہ سب میرے علم میں ہے اعلیٰ حضرت...... میں نے یہ بھی سنا ہے کہ قرۃ العین طاہرہ نامی کوئی خاتون بھی اس تحریک کی روح رواں ہے۔ وہ بہت اچھی شاعرہ بھی ہے۔“

”ہاں۔“ بہادر شاہ ظفر نے جواب دیا، پھر کہا۔ ”اس کے علاوہ وہاں خوارزم کے حکمرانوں اور روسیوں کی پیش قدمی بھی جاری ہے۔ فرنگیوں نے وہاں بھی اعلان جنگ کردیا ہے۔ ان خراب حالات میں ناصر الدین شاہ اپنی حکومت دیکھے گا یا ہماری مدد کرے گا لیکن اب تم نے یہ بات چھیڑی ہے تو ہم بتائیں کہ بڑی موہوم سی امید پر ہم نے ناصر الدین شاہ کو دو سال پہلے ایک خط لکھا تھا جس کا جواب ہمیں آج تک نہیں ملا۔“

یہ اتفاق تھا کہ جس روز ان دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔ اس کے دوسرے ہی دن دہلی کی جامع مسجد پر ایک اشتہار چسپاں دیکھا گیا۔ اس اشتہار کی تحریر کا متن تھا کہ ایرانی افواج نے ہندوستان کا رخ کرلیا ہے اور درۂ بولان عبور کرکے دہلی میں وارد ہونے والی ہے لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ایران کی فوج کے شانہ بشانہ لڑ کر فرنگیوں کو ہندوستان سے بھگادیں۔

لیکن کچھ ہی دن بعد معلوم ہوگیا کہ جو کچھ اس اشتہار میں لکھا گیا تھا، اس میں ذرا بھی حقیقت نہیں تھی۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ حرکت کس کی تھی اور کیوں کی گئی تھی لیکن اس کی وجہ سے دہلی کے لوگوں میں تھوڑا سا جوش ضرور پیدا ہوگیا۔ اسی جوش کی فضا میں ایک واقعہ ایسا ہوا کہ فرنگیوں کے خلاف نفرت کا جو لاوا، کسی نہ کسی وجہ سے دبا ہوا تھا، اچانک پھٹ پڑا جس کا سبب ایک انگریز کرنل اسمتھ کی بے وقوفی تھی۔

اپریل میں وہ واقعہ میرٹھ چھاؤنی میں پیش آیا تھا جو دہلی سے پینتیس چالیس میل کے فاصلے پر تھی۔ اس کا محیط پانچ میل کے لگ بھگ تھا۔ ٹھنڈی سڑک نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک جانب توپ خانے کی بیرکیں تھیں اور دوسری جانب رسالے کی انچ میں پیادہ فوج رہتی تھی۔

چند روز پہلے سرکار انگلینڈ نے وہاں نئے کارتوسوں کی ایک کھیپ بھیجی تھی۔ کرنل اسمتھ کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے اچانک پریڈ کا حکم صادر کردیا تاکہ سپاہیوں کو نئے کارتوسوں کے استعمال کا طریقہ سکھایا جائے۔

ان کارتوسوں میں سور کی چربی کا استعمال کیا گیا تھا، اس لیے پانچ غیر مسلم ہندوستانی سپاہیوں کے علاوہ باقی نے وہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا۔ کرنل اسمتھ سے یہ نافرمانی برداشت نہیں ہوسکی اور اس نے کارتوس استعمال نہ کرنے والے سپاہیوں کو گرفتار کرکے چھاؤنی کی جیل میں ڈلوادیا۔ اس سے چھاؤنی کے ان سپاہیوں میں غصے کی لہر دوڑ گئی جنہیں اس پریڈ میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔

فرنگیوں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ نافرمان قیدیوں پر مقدمہ چلا کر انہیں ایسی سزائیں دی جائیں جو دوسرے سپاہیوں کے لیے عبرت ناک ثابت ہوں۔

مسلمان سپاہیوں کی طرف سے اس کی اطلاع دہلی، بہادر شاہ ظفر کو بھجوائی گئی۔ اطلاع کے ساتھ خط میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اگر بادشاہ سلامت قیادت کے لیے تیار ہوجائیں تو اب وہ ان فرنگیوں سے لڑ مریں گے۔

بہادر شاہ ظفر یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کرسکا لیکن خاصے تذبذب کے بعد اس نے تنہائی میں فیضان سے کہا۔ ”تم کو یہ تو علم ہے کہ میرٹھ چھاؤنی سے کیا اطلاع اور کیا درخواست آئی تھی۔ اب ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ جو ہو، سو ہو، اب مزید ذلت برداشت نہیں کی جاسکتی۔ ہم نے بخت خاں کے نام ایک خط لکھا ہے۔ وہ اس وقت میرٹھ ہی میں ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ خط تم ہی اسے پہنچاؤ۔ ہم اس نازک معاملے میں تمہارے علاوہ کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہتے۔ تم نے بخت خاں کا نام تو سنا ہی ہوگا۔“

”ان کا چہرہ شناس نہیں مگر ان کا نام بہت سنا ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح ان تک پہنچ ہی جاؤں گا۔“

بہادر شاہ ظفر نے خط اس کے حوالے کیا اور کہا۔ ”اس پر ہماری مہر لگی ہوئی ہے۔ ہم نے لکھا ہے کہ بخت خاں قیادت کے لیے ہماری آمادگی کا اعلان کردے۔“

”آپ نے یہ فیصلہ کرنے میں دیر کیوں لگائی اعلیٰ حضرت؟“

”بس یہ اندیشہ لاحق رہا کہ اگر نتیجہ کچھ نہ نکلا تو ہمارا نام اس طرح سامنے آجانے کے باعث فرنگی ہمارے لیے عذاب بن جائیں گے۔“

”کیا یہ اندیشہ اب نہیں ہے۔“ بہادر شاہ ظفر سے اتنی حجت، فیضان کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے جواب دیا۔

”اگر کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ہم ریذیڈنٹ سے مصلحتاً یہ جھوٹ بولنے پر مجبور ہوں گے کہ ہم نے ایسا کوئی اعلان نہیں کیا اور یہ محض افواہ ہے جو کسی نے پھیلائی ہے۔ اگر صرف میرٹھ ہی میں کچھ ہوکر رہ گیا تو ہم بخت خاں کا نام بھی لے سکتے ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ فرنگیوں کو بخت خاں سے ہمارا یہ خط مل جائے جو ہمارے خلاف ناقابل تردید ثبوت ہوگا۔ ہمیں علم ہوچکا ہے کہ فرنگیوں کی فوج میں ہونے کے باوجود اب بخت خاں میں خاصی تبدیلی آچکی ہے، ہم نے سنا ہے کہ اس کے خیالات میں انقلاب کسی مولوی سرفراز علی نے پیدا کیا ہے۔ بس اب تم جلد از جلد روانہ ہوجاؤ۔“

فیضان فوراً روانگی کے لیے تیار ہوا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ زرتاج اس سے بے خبر رہ جاتی۔ اس کا چہرہ فق پڑ گیا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ کیا معلوم، جب تم وہاں پہنچو تو شعلے بھڑک چکے ہوں۔“

”میرے ساتھ تمہارا جانا مناسب نہیں ہوگا زرتاج! اس معاملے میں ضد نہ کرو۔ یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ اگر میں ان شعلوں کی نذر ہوگیا تو کیا ہوگا...... اگر میں وہاں سے غازی بن کر لوٹا تو یہ تمہارے لیے باعث فخر ہوگا اور اگر شہید ہوگیا تو بھی......“

زرتاج نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ ”تو میں بھی تمہارے ساتھ شہید ہونا چاہوں گی۔ پستول چلانا تو تم سے سیکھا تھا لیکن بیس سال محل میں گزار کر میں نے شمشیر زنی اور تیر افگنی بھی سیکھ لی ہے۔“

”یہ تم مجھے بتاچکی ہو لیکن......“

جب اس بحث و تکرار کا علم بہادر شاہ ظفر کو ہوا تو اس نے حکماً زرتاج کو فیضان کے ساتھ جانے سے روک دیا۔ زرتاج بے بسی سے آنسو بہاتی رہ گئی۔ فیضان کا گھوڑا جب سرپٹ دوڑتا ہوا قلعے سے نکلا تو زرتاج کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا چہرہ اس کے تصور میں تھا لیکن اس نے اپنی توجہ اپنے فرض کی طرف مبذول کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔ بیس سال بعد وہ خود کو ایک بار پھر سپاہی محسوس کرنے لگا تھا جس پر لازم تھا کہ وہ اپنے کمان دار، یعنی بہادر شاہ ظفر کے حکم کی تعمیل کے علاوہ کچھ نہ سوچے۔

اس نے سنا تھا کہ بخت خاں پہلے شاہی لشکر میں تھا لیکن اکبر شاہ ثانی کے انتقال سے چند ماہ قبل ہی شاہی لشکر چھوڑ کر فرنگیوں کے ”بریلی بریگیڈ“ کے آٹھویں پیدل توپ خانے میں صوبے دار کی حیثیت سے ملازم ہوگیا تھا۔ اب اس کی صلاحیتیں اسے میدانی توپ خانے کا سالار بنا چکی تھیں۔

میرٹھ چھاؤنی میں بخت خاں تک پہنچنا فیضان کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا اور بہادر شاہ ظفر کا خط پڑھ کر بخت خاں کے چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے ایسا بندوبست کیا کہ یہ خبر تمام سپاہیوں تک جلد از جلد پہنچ جائے جس میں ناکامی نہیں ہوئی۔

جن سپاہیوں نے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کیا تھا، ان پر مقدمہ چلا کر انہیں دس دس سال قید بامشقت کی سزا سنا کر جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس سے دوسرے سپاہی بہت مشتعل تھے۔ جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ بہادر شاہ ظفر ان کی قیادت کے لیے تیار ہوگیا ہے تو ان کا اشتعال، بغاوت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں تبدیل ہوگیا۔ انہوں نے سب سے پہلے جیل پر دھاوا کھول کر سزا پانے والے سپاہیوں کے علاوہ ان سات سو سے زائد قیدیوں کو بھی چھڑا لیا جو پہلے ہی سے کسی باعث قید تھے۔

اس کے بعد میرٹھ چھاؤنی میں آگ اور خون کا کھیل شروع ہوا۔ فرنگی افسران کو نہ صرف قتل کیا گیا بلکہ ان کی بیرکوں میں آگ بھی لگائی گئی۔ عام فرنگی سپاہ ہندوستانی سپاہ کے سامنے جم نہ سکی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ ان کا تعاقب کرکے ان کی اکثریت کو ہلاک کیا گیا۔ اس معرکے میں فیضان نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس کی تلوار بھی خون میں ڈوبی تھی۔ چھوٹے موٹے زخم اسے بھی آئے تھے جن کے لیے معمولی مرہم پٹی کافی تھی۔

میرٹھ سے انگریزوں کا صفایا ہو چکا تھا۔ اس معرکے کی اطلاع دھیرے دھیرے دوسرے شہروں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ جب بریلی سے اطلاع آئی کہ وہاں کی ہندوستانی سپاہ نے بھی انگریزوں سے بغاوت کا اعلان کر دیا تھا تو بخت خاں نے فوراً وہاں کا رخ کیا۔ فیضان اس کے ساتھ رہا۔ بیس سال سے اس کے اندر کا سپاہی اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔

بریلی پہنچ کر بخت خاں نے وہاں کی سپاہ کی قیادت سنبھالی اور بریلی کو بھی انگریزی تسلط سے آزاد کرا لیا۔ اس کے بعد اس نے رام پور، مراد آباد اور رجب پور سے ہوتے ہوئے دہلی کا رخ کیا۔

کچھ دوسرے شہروں سے بھی انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہونے کی اطلاعات موصول ہوتی رہی تھیں۔ ادھر ادھر سے بہت سے سپاہی آ آ کر بخت خاں کے لشکر میں شامل ہو رہے تھے۔

دہلی میں فرنگیوں کی سپاہ اتنی نہ تھی کہ وہ بخت خاں کے لشکر کا مقابلہ کر سکتی۔ دہلی میں موجود ہندوستانی سپاہ نے بھی ان کے خلاف اپنی تلواریں بے نیام کر لی تھیں اس لیے انہیں بھاگتے ہی بنی۔

بخت خاں شاہی محل میں داخل ہوا تو بہادر شاہ ظفر نے اسے سینے سے لگا لیا۔

زرتاج نے جب فیضان کے واپس آنے کی اطلاع سنی تو دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی اور فیضان سے ٹکرا گئی جو کمرے میں داخل ہونے والا تھا۔ زرتاج اس کے سینے سے لگ کر سسک پڑی۔

فیضان مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یقین تھا زرتاج کہ میں غازی بن کر لوٹوں گا۔“

زرتاج نے پوچھا۔ ”کیا اب ہمیں ان مکاروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل چکی ہے؟“

”بہت سے شہروں میں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ نتیجہ ہمارے حق میں نکلنا چاہیے۔“ فیضان نے جواب دیا۔

اس وقت بہادر شاہ کو اطلاعات مل رہی تھیں کہ اب انگریز سپاہ دہلی کے باہر ایک پہاڑی پر خیمہ زن تھی۔ جنگ آزادی کے سپاہیوں نے اپنا مستقر دہلی کو بنا لیا تھا اور ان کی کمان بخت خاں ہی کے ہاتھوں میں تھی۔ بہادر شاہ ظفر نے اسے جنگ آزادی کے لشکر کا سپہ سالار اعلیٰ اور ایک شہزادے کو اس کا نائب مقرر کر دیا تھا۔ بخت خاں نے دہلی کے باہر پہاڑی پر خیمہ زن فرنگی فوج پر اتنی زبردست گولہ باری کروائی کہ دشمن کے دانت کھٹے ہو گئے لیکن مختلف شہروں سے ان کے لیے کمک مستقل آتی رہی اور پھر ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے دہلی پر یلغار کر دی۔ دہلی کی فصیل پر شدید ترین گولہ باری کی گئی۔ وسطِ ستمبر میں انگریزوں کو فصیل کے کشمیری گیٹ کی طرف رخنہ ڈالنے میں کامیابی ہو گئی۔

پھر چار ہی دن بعد سارے شہر میں جنگ آزادی کے سپاہیوں اور انگریزی فوج کی دست بہ دست لڑائی شروع ہو گئی۔ قصر شاہی کی فضا میں اب شدید بے چینی پھیل چکی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کو پل پل کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ جنگ آزادی کے سپاہی مغلوب ہوتے جا رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے مشاورت کے لیے کچھ لوگوں کو جمع کیا۔ ان لوگوں میں بخت خاں کے علاوہ فیضان بھی تھا۔

”دہلی میں اب ہم یہ جنگ جیت نہیں سکیں گے اعلیٰ حضرت!“ بخت خاں نے بہادر شاہ ظفر کے استفسار پر کہا۔

”نتیجہ؟“ بہادر شاہ ظفر نے پوچھا۔

”میں ایک فیصلہ کر چکا ہوں اعلیٰ حضرت! اگر آپ نے مجھے طلب نہ فرمایا ہوتا تو بھی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے ہی والا تھا۔“

”کیا انگریزوں سے پناہ طلب کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟“ بہادر شاہ ظفر کے مقربینِ خاص میں سے مرزا الٰہی بخش کچھ طنزیہ انداز میں بول پڑا۔

فیضان نے اسے بڑی تیکھی نظروں سے دیکھا۔ اسے بہت دن سے شبہ تھا کہ مرزا الٰہی بخش کے علاوہ ایک مقرب شاہ، حکیم احسن اللہ بھی انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ دو درباری منشی رجب علی اور ایک ہندو، جاٹ مل ان دونوں اور انگریزوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھے۔ انہی کے ذریعے قصر شاہی کی خبریں انگریزوں کو پہنچائی جاتی تھیں۔ کچھ مواقع ایسے آئے تھے جب فیضان کو ان چاروں کے بارے میں یہ شبہ ہوا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ بہادر شاہ ظفر کو اشاروں کنایوں میں حکیم احسن اللہ اور مرزا الٰہی بخش کی غداری کے بارے میں بتایا تھا لیکن معصوم دل رکھنے والے اس مغل بادشاہ کو ان دونوں پر کامل اعتماد تھا۔ فیضان ان دونوں اور ان کے ہرکاروں کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کے لیے کچھ تدابیر پر غور کر ہی رہا تھا کہ بہادر شاہ ظفر نے اسے بخت خاں سے ملنے بھیج دیا تھا۔

مشاورت کے کمرے میں بخت خاں، مرزا الٰہی بخش کا طنزیہ جملہ پی گیا اور اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد بہادر شاہ ظفر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب یہ جنگ جاری رکھنے کے لیے مجھے اپنی سپاہ کے ساتھ کسی اور شہر کو مستقر بنانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ مکمل پسپائی اختیار کرنا پڑے، بہتر ہوگا کہ میں اپنی سپاہ کے ساتھ دہلی سے نکل جاؤں اور آپ بھی میرے ساتھ یہاں سے نکل چلیں۔“

اس وقت حکیم احسن اللہ بول پڑا۔ ”اب بزدلی دکھانے کا مشورہ اعلیٰ حضرت کو بھی دیا جائے گا؟“

”یہ بزدلی نہیں، مصلحت ہوگی۔“ بخت خاں نے کہا۔ ”خودکشی کرنے کے بجائے انسان کو زندہ رہنے کے دوسرے راستے بھی اختیار کرنے چاہئیں۔“

اس وقت فیضان نے بھی بخت خاں کی تائید کی۔

مغل بادشاہ پر اب یہ وقت آ گیا تھا کہ اس کے سامنے اس کے مقربین بول رہے تھے اور وہ بس ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔

مرزا الٰہی بخش نے شد و مد سے اصرار شروع کیا کہ بہادر شاہ ظفر کو شاہی محل نہیں چھوڑنا چاہیے۔ وہ بولا۔ ”جامع مسجد پر جو اشتہار چسپاں ملا تھا، اسے وہاں لگانے والا ایران کا کوئی قاصد ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایرانی فوج کو یہاں پہنچنے میں کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہے لیکن وہ آئے گی ضرور اور ان فرنگیوں کو خاک چاٹنا پڑے گی۔“

”ہو سکتا ہے کہ ایرانی فوج آ جائے لیکن بروقت نہ آ سکے۔“ بخت خاں نے مرزا الٰہی بخش کی طرف توجہ دیے بغیر بہادر شاہ ظفر سے کہا۔ ”اور...... خاکم بہ دہن، اگر ایرانی فوج بروقت نہ آ سکی تو یہ فرنگی آپ کو گرفتار کر لیں گے اعلیٰ حضرت، اور پھر یہ شاہی خاندان کو کسی قسم کی چھوٹ دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں گے۔“

”ایرانی فوج کے آنے تک ہم کوئی بندوبست کر لیں گے۔“ حکیم احسن اللہ بول پڑا۔

بہادر شاہ ظفر اس وقت نظریں جھکائے بیٹھا تھا، اس کے انداز سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ بخت خاں کے بجائے اپنے مقربین کے مشورے پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات بخت خاں نے بھی محسوس کر لی۔ اس کے چہرے پر مایوسی کا تاثر ابھرا اور پھر اس نے بہادر شاہ ظفر سے رخصت کی اجازت چاہی۔

بہادر شاہ ظفر نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کی تھی۔

بخت خاں کے جانے کے بعد حکیم احسن اللہ بولا۔ ”اعلیٰ حضرت! ہم شاہی محل چھوڑ کر حضرت نصیر الدین ہمایوں جنت آشیانی کے مقبرے میں بھی چھپ سکتے ہیں۔ فرنگی سمجھیں گے کہ ہم سب بھی بخت خاں کے ساتھ چلے گئے۔“

”یقیناً۔“ مرزا الٰہی بخش نے لقمہ دیا۔ ”فرنگیوں کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم وہاں جا چھپے ہیں۔ یہاں تک کہ ایرانی فوج ہماری مدد کے لیے آ جائے گی۔“

”مگر کتنے عرصے؟“ بہادر شاہ ظفر بہت دیر بعد بولا۔

”کئی مہینے بھی گزارے جا سکتے ہیں۔“ مرزا الٰہی بخش نے کہا۔ ”اب بھی آپ کے ایسے وفادار اور جاں نثار ایسے ہیں کہ بہت خفیہ طور پر کئی ماہ کا سامان رسد وہاں پہنچا سکتے ہیں۔“

”اچھا!“ بہادر شاہ ظفر نے طویل سانس لی۔ ”تو پھر ایسا ہی کیا جائے۔ اس کا بندوبست تم کرو۔“ اس نے آخری فقرہ فیضان سے کہا۔

”بہتر اعلیٰ حضرت!“ فیضان کو کہنا پڑا لیکن اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس کے خیال میں بخت خاں کی رائے بہت صائب تھی۔ ہمایوں کے مقبرے میں چند دن چھپنا بھی

ممکن نہ ہوتا۔ وہ دونوں غدار ہی اس کی اطلاع انگریزوں کو دے دیتے۔

مشاورت برخاست ہوئی۔

کچھ دیر بعد فیضان بہادر شاہ ظفر کے کمرے میں پہنچا جہاں مغل بادشاہ فکرمندی سے ٹہل رہا تھا۔

”مجھے کچھ عرض کرنا ہے اعلیٰ حضرت!“ فیضان بولا۔

”کہو!“

”بخت خاں کو اپنی سپاہ کے ساتھ یہاں سے جانے میں دو تین روز تو لگیں گے۔ اتنے دن میں سامان رسد بھی وہاں پہنچ جائے گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ ایک احتیاط اور کی جائے!“

”کہتے رہو۔“

”اگرچہ بخت خاں سپہ سالار اعلیٰ ہیں لیکن اب بھی ایسے سپاہیوں کی تعداد خاصی ہے جو صرف آپ ہی کا حکم مانیں گے۔ ان تک آپ کی یہ ہدایت پہنچائی جاسکتی ہے کہ وہ دھیرے دھیرے مقبرے کے احاطے میں جاکر چھپتے رہیں۔ اس کا علم کسی اور کو...... آپ کے مقربین کو بھی نہ ہو۔“

بہادر شاہ ظفر کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ”تمہارے دماغ سے یہ خیال جا نہیں سکا کہ حکیم احسن اللہ اور مرزا الٰہی بخش ہمارے وفادار نہیں ہیں، لیکن خیر!...... اگر تم چاہتے ہو تو اس بارے میں ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے لیکن یہ ہماری سمجھ میں نہیں آسکا کہ تم ایسا کیوں چاہتے ہو۔“

”احتیاط کے طور پر اعلیٰ حضرت! اگر ایرانی فوج کو یہاں پہنچنے میں مرزا الٰہی بخش کی توقع سے دو چار چھ دن زیادہ بھی لگ جائیں تو مقبرے کے احاطے میں موجود سپاہ اتنے دن تک شاہی خاندان کی حفاظت کرسکے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم تمام تر اختیارات تمہیں دیتے ہیں، جو چاہو کرو۔ ہمارے دماغ نے تو شاید کام کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

فیضان اجازت لے کر کمرے سے نکلا اور فوراً اپنے کمرے میں جاکر زرتاج کو ان تمام حالات سے آگاہ کیا۔

زرتاج فکرمندی سے بولی۔ ”مقبرے میں جمع ہونے والی سپاہ آخر کتنی ہوگی۔ وہ کب تک ان فرنگیوں کا مقابلہ کرسکے گی جبکہ تمہارے خیال کے مطابق ایرانی فوج کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔“

فیضان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”شاہی محل میں تو اعلیٰ حضرت بڑی بے بسی کے عالم میں گرفتار ہوجائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسا نہ ہو، اس سے پہلے فرنگیوں کو لوہے کے چنے چبوا دیے جائیں۔“

زرتاج سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

اسی رات سے منصوبے پر عمل شروع ہوگیا۔ نہ صرف تھوڑے تھوڑے سپاہی بلکہ بہادر شاہ ظفر کے قریبی اعزا بھی ہمایوں کے مقبرے میں منتقل ہونا شروع ہوگئے۔ رات کی تاریکی میں یہ عمل بہت خفیہ طریقے سے شروع کیا گیا۔ بس دو دو، چار چار افراد کی ٹولیاں مناسب وقفے سے لال قلعے سے نکلتیں اور ہمایوں کے مقبرے کی طرف بڑھتی چلی جاتیں۔

منصوبے میں یہ بات شامل تھی کہ شاہی خاندان کے سارے افراد منتقل نہیں ہوں گے۔ مقبرے میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہ کثیر تعداد وہاں چھپ سکتی۔ نیز بہادر شاہ ظفر کا خیال یہ بھی تھا کہ اس کے قریبی لوگوں کے علاوہ، خاندان کے باقی لوگوں کے ساتھ انگریزوں کا رویہ بہت زیادہ جارحانہ نہیں ہوگا۔

تیسری شب کے نصف پہر تک وہ سب افراد مقبرے میں منتقل ہوگئے جن کے علاوہ کسی کو منتقل نہیں ہونا تھا۔

احاطے میں بہادر شاہ ظفر کی جاں نثار و وفادار سپاہ موجود تھی جس کا علم فیضان، زرتاج اور بہادر شاہ ظفر کے علاوہ کسی کو نہیں تھا۔

مرزا الٰہی بخش، حکیم احسن اللہ، جاٹ مل اور منشی رجب علی کو بھی خاندان شاہی کے ساتھ مقبرے میں منتقل ہونا تھا۔ یہ فیضان ہی نے سوچا تھا کہ بادشاہ کے مقربین میں سے یہ چاروں ضرور منتقل ہوں۔ فیضان کو ان کی طرف سے خدشات لاحق تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی کی غداری کے باعث انگریزوں کو فوراً ہی معلوم ہوجائے کہ بہادر شاہ ظفر اور اس کے قریبی اعزا کہاں روپوش ہوئے تھے۔

اس طرح کچھ زیادہ دن تک خطرہ ٹلا رہتا اور ابتدائی دنوں میں فیضان ایک بار پھر بہادر شاہ ظفر کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ کم از کم وہ اور کچھ بہت ہی قریبی لوگ وہاں سے نکل کر اس طرف روانہ ہوجائیں جدھر جانے کا فیصلہ بخت خاں نے کیا تھا۔

منتقلی کے بعد فیضان کے علم میں جب یہ بات آئی کہ منشی رجب علی وہاں آیا تو تھا لیکن پھر کب اور کس طرح کہیں غائب ہوگیا، اس کا علم کسی کو نہیں تھا۔ فیضان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے یقین تھا کہ اب انگریزوں کو اس کا علم بہت جلد ہوجائے گا کہ بہادر شاہ ظفر کہاں روپوش ہوا تھا۔

فیضان نے باقی رات انگریزی سپاہ کا مقابلہ کرنے کی تیاری میں گزاری، لیکن اس کا اسے یقین تھا کہ یہ

مدافعت زیادہ عرصے تک جاری نہیں رہ سکے گی۔ بس اتنا ہوتا کہ اس کے ذہن میں آنے والی تدبیر پر عمل کرنے سے انگریزوں کو بہت زیادہ جانی نقصان اٹھانے کے بعد ہی مقبرے میں داخل ہونے کا موقع ملتا۔

ان دنوں مقبرے کے احاطے کی فصیل نہ صرف بہت اونچی بلکہ مضبوط بھی تھی۔ احاطے میں داخلے کے دو پھاٹک تھے۔ فیضان نے سپاہیوں کو فصیل کے ساتھ ساتھ پھیلایا مگر ان کی کثیر تعداد کو پھاٹکوں کے سامنے مورچہ زن کیا۔

پھاٹک سے انگریزی سپاہ اندر داخل ہوتی تو پھاٹک کی چوڑائی کے سبب بہ یک وقت تیس چالیس سے زیادہ سپاہی اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کرسکتے تھے اس لیے پھاٹک کے سامنے مورچہ زن شاہی سپاہ بہ یک وقت کئی سو گولیاں چلاتی تو وہ بھی بھون کر رکھ دیے جاتے۔ ان کے بہت کم سپاہیوں کو اندر آنے کا موقع مل سکتا تھا جن کو دست بہ دست لڑائی میں ختم کیا جاسکتا تھا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر انگریز سپاہ کا جو بھی سربراہ ہوتا، وہ جانی نقصان سے بچنے کے لیے اپنی سپاہ کو اندر جانے سے روک کر کوئی اور تدبیر سوچتا۔ دوسری تدبیر یہ ہوسکتی تھی کہ انگریزی سپاہ سیڑھیاں لگا کر فصیل پر چڑھنے کی کوشش کرتی لیکن جیسے ہی ان کے سر فصیل کے اوپر نظر آتے، شاہی سپاہ کی طرف سے ان پر گولیاں برسانے کے ساتھ ساتھ تیر اندازی اور برق اندازی شروع کردی جاتی۔

اگلی صبح کا سورج طلوع ہوا تو بخت خاں اپنی سپاہ کے ساتھ وہاں سے جاچکا تھا اور شاہ کی وفادار سپاہ جو مقبرے میں منتقل نہیں ہوئی تھی، وہ بہت کم تھی۔ ان کو فیضان یہ ہدایت کر آیا تھا کہ وہ ہتھیار ڈال کر اپنی جان بچانے کی کوشش کریں لیکن فرنگیوں کی سفاکی کے پیش نظر اس کا امکان کم ہی تھا کہ اتنی گھمسان کی جنگ اور اتنی جانوں کا نقصان اٹھانے والے فرنگی ان کی جاں بخشی کردیتے۔

دوسرے دن دوپہر ہونے سے خاصا پہلے فیضان کو اطلاع مل گئی کہ انگریز سپاہ بہت تیزی سے مقبرے کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی مگر بہت زیادہ تعداد کو اس طرف بھیجنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ فیضان کی رازداری کی وجہ سے انگریزوں کے علم میں یہ نہیں آیا ہوگا کہ بادشاہ کی وفادار سپاہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مقبرے کے احاطے میں ہوگی۔

یہی سبب تھا کہ انگریزی سپاہ کا ایک گھڑسوار دستہ بے تحاشا پھاٹک میں داخل ہوا۔ اس دستے کی کمان میجر ہڈسن کا ایک ماتحت کر رہا تھا۔ اس دستے پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ یہ ان لوگوں کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ اس دستے کے سارے آدمیوں کی لاشیں بکھر گئیں۔ ایک بھی زندہ بچ کر نہ لوٹ سکا۔ ان کا اسلحہ بھی شاہی سپاہ کے ہاتھ لگا۔

اس کے بعد ہی میجر ہڈسن کی سمجھ میں آیا ہوگا کہ مقبرے کے احاطے میں شاہی سپاہ بھی موجود تھی جس کے بارے میں منشی رجب علی کو علم نہیں تھا ورنہ وہ میجر ہڈسن کو اس بارے میں بھی بتا دیتا۔

اس کے بعد انگریزی سپاہ نے مقبرے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ مقبرے کو چاروں طرف سے محاصرے میں لینے کے باوجود کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

مقبرے میں جب مرزا الٰہی بخش کو اس صورت حال کا علم ہوا اور حکیم احسن اللہ نے بھی بہادر شاہ ظفر سے اس بارے میں بات کی تو انہیں علم ہوا کہ یہ سارا بندوبست فیضان نے کیا تھا۔ یہ معلوم ہونے پر یقیناً ان دونوں کی جان نکل گئی ہوگی کہ اس بارے میں اطلاع نہ ملنے پر وہ میجر ہڈسن کے عتاب کا نشانہ بن سکتے تھے۔

اس کے بعد شام کا اندھیرا پھیلنے سے کچھ پہلے تک سکون رہا۔ انگریزوں کی طرف سے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ فیضان نے سمجھ لیا کہ میجر ہڈسن نے کمک طلب کی ہوگی تاکہ مقبرے پر زوردار حملہ کیا جاسکے۔

فیضان نے دونوں پھاٹک بند کروا دیے۔ اسے یقین تھا کہ سپاہیوں کی کمک کے ساتھ میجر ہڈسن نے توپیں اور دوسرا سامان بھی منگوایا ہوگا۔ اس کا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ شام ہوتے ہوتے انگریزی سپاہ کا ایک لشکر جرار وہاں پہنچ گیا تھا اور توپوں کے علاوہ اونچی سیڑھیاں بھی لائی گئی تھیں۔

توپوں سے دونوں پھاٹکوں پر گولے برسنے لگے۔ سیڑھیاں لگا کر انگریزی سپاہ اوپر چڑھی تو ان پر گولیوں، تیروں اور آگ کی بارش کی گئی۔ ان کی چیخوں اور توپوں کی گھن گرج سے فضا تھرانے لگی۔

فیضان گھوڑے پر سوار تیزی سے فصیل کے ساتھ ساتھ چکر لگا رہا تھا اور سپاہیوں کے لیے ہدایات جاری کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گولہ باری سے پھاٹک منہدم ہوجائیں گے اور پھر وہاں سے احاطے میں گولہ باری کروائی جائے گی اس لیے اس نے دوبارہ مورچہ بندی اس طرح کرائی کہ کوئی مورچہ پھاٹک کے عین سامنے نہ رہے، سب آڑ میں رہیں تاکہ گولوں کی زد پر نہ آسکیں۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ گولہ باری کے ساتھ سپاہیوں کی کثیر تعداد کے ساتھ اندر داخل ہونے کی کوشش کی جائے گی اس لیے اس نے مورچوں میں

موجود سپاہیوں کے پچاس پچاس کے دستے بنائے اور انہیں ہدایت کی کہ ایک دستہ بیک وقت فائر کرے۔ اس کے بعد دوسرا دستہ فائر کرنے میں دیر نہ لگائے۔ اس کے بعد تیسرا دستہ، پھر چوتھا، پھر پانچواں اور گولیاں کیونکہ بہت زیادہ نہیں تھیں اس لیے چھٹے، ساتویں اور آٹھویں دستے کو تیر افگنی اور شعلہ افگنی کرنی تھی۔

دونوں پھاٹکوں پر یہی بندوبست کیا گیا تھا۔

سیڑھیوں سے انگریز سپاہ نے اوپر چڑھ کر احاطے میں آنا چاہا مگر ان پر اتنی آگ برسی، اتنے تیر برسے، اتنی گولیاں چلیں کہ وہ اس مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہوسکے۔

گولہ باری سے دونوں پھاٹک منہدم ہوگئے تو انگریز سپاہ نے بہت کثیر تعداد کے ساتھ حملہ کیا لیکن فیضان کی ہدایت کے مطابق جوابی کارروائی بھی بہت شدید تھی۔ مسلسل ہونے والی فائرنگ اور تیراندازی کے باعث انگریزوں کا وہ حملہ بھی ناکام رہا۔ پھاٹک کے اندر احاطے میں اور پھاٹک کے باہر بھی فرنگیوں کی لاشیں بکھر گئیں۔ دونوں پھاٹکوں پر ایسا ہی ہوا تھا۔ فیضان کے اندازے کے مطابق فرنگیوں کے کئی سو سپاہی ختم ہوگئے تھے۔

اس کے بعد دونوں ہی پھاٹکوں کی طرف سے کوئی یلغار نہیں کی گئی لیکن توپوں کے گولے وہاں سے اندر آآ کر پھٹ رہے تھے۔ گوکہ فیضان کی تدبیر کے باعث ان سے وہ نقصان نہیں ہوا جو فرنگیوں نے سوچا ہوگا لیکن پچاس ساٹھ سپاہی زخمی ضرور ہوئے تھے جن کی مرہم پٹی احاطے ہی میں کی گئی تھی۔ مقبرے میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ انہیں اندر لایا جاسکتا۔

مقبرے میں زرتاج بہت بے چین تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے حکم سے کسی عورت کو مقبرے سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔

"یہ جنگ ہم جیت تو نہیں سکتے۔" فیضان نے زرتاج سے کہا۔ "لیکن جب تک ہمارے خون کا آخری قطرہ نہ بہہ جائے، فرنگیوں کے منحوس ہاتھ اعلیٰ حضرت تک نہیں پہنچ سکتے۔"

فیضان کی یہ بات زرتاج کے دماغ میں مسلسل گونج رہی تھی۔ آخر وہ خود کو قابو میں نہیں رکھ سکی۔ اس نے بہادر شاہ ظفر کی حکم عدولی کی اور موقع پا کر مقبرے سے نکل آئی۔ اسے ایک خالی گھوڑا بھی مل گیا جس پر سوار ہو کر اس نے فیضان کی تلاش شروع کردی۔ اسے علم تھا کہ فیضان احاطے میں سپاہیوں کو ہدایات دیتا پھر رہا ہوگا۔ آخر ایک جگہ فیضان اسے مل ہی گیا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر چونک گیا تھا۔

"تم باہر کیوں نکلیں؟" وہ تیزی سے بولا۔ "اعلیٰ حضرت کا حکم تھا کہ......"

"میں اب کسی کا کوئی حکم نہیں مانوں گی۔" زرتاج نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اگر مرنا ہی ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ مروں گی۔"

اس وقت احاطے کی صورت حال اس اعتبار سے سنگین ہوچکی تھی کہ باہر سے فرنگیوں نے بھی تیر افگنی اور آتش افگنی شروع کردی تھی۔ آتش افگنی کی وجہ سے کہیں آگ لگتی تو اسے بجھانے کے لیے سپاہیوں کو حرکت میں آنا پڑتا۔ اس وقت احاطے میں آکر گرنے والے تیر ان سپاہیوں کو زخمی کر رہے تھے۔ کئی سپاہیوں کو ایسے زخم بھی لگے کہ وہ جانبر نہ ہوسکے۔ قیامت کی وہ رات نصف پہر میں داخل ہوگئی۔ اس وقت مقبرے میں ایک سازش جنم لے رہی تھی۔

"یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا ہے اعلیٰ حضرت!" مرزا الٰہی بخش نے بہادر شاہ ظفر سے کہا۔ "ابھی انہوں نے فصیل پر گولہ باری نہیں شروع کی ہے۔ غالباً وہ دن کی روشنی میں ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ فصیل میں رخنے پڑ جائیں گے تو ان لوگوں کو اندر داخل ہونے سے روکنا ممکن نہ ہوگا۔"

بہادر شاہ ظفر نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ مقبرے میں شاہی خاندان کی روپوشی کا علم انگریزوں کو اتنی جلدی کیسے ہوگیا تھا۔

"ایک خطرہ اور بھی ہوسکتا ہے۔" حکیم احسن اللہ بولا۔

بہادر شاہ ظفر نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ آپس میں پہلے ہی مشورہ کرچکے تھے۔

احسن اللہ نے کہا۔ "ممکن ہے کہ فرنگی جانی نقصان سے بچنے کے لیے فصیل کے رخنوں کے قریب لے آئیں توپیں اور پھر مقبرے ہی پر گولے برسانا شروع کردیں۔ اس طرح ہم لوگ تو مارے جائیں گے ہی لیکن مقبرہ بھی تباہ ہوجائے گا۔"

"ہم کر کیا سکتے ہیں احسن اللہ!" بہادر شاہ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"فرنگیوں سے رابطہ کرکے صلح کی بات کی جاسکتی ہے۔" مرزا الٰہی بخش نے کہا۔ "اپنے جانی نقصان سے وہ بھی بچنا چاہتے ہوں گے اس لیے ان سے یہ معاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہمیں یہاں سے اور دہلی سے نکل جانے دیں تو یہ جنگ ختم کی جاسکتی ہے۔ میں کسی طرح باہر جا کر ان لوگوں سے بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں ان سے یہ جھوٹ بھی بول سکتا ہوں کہ ایرانی فوج کا قاصد آیا تھا۔ ایرانی فوج کل دوپہر تک ہماری مدد کے لیے یہاں پہنچ جائے گی۔ خصوصاً ایرانی فوج کے حوالے سے عین ممکن ہے کہ یہ فرنگی ہم سے یہ معاہدہ کرنے ہی میں اپنی بہتری سمجھیں۔"

"ہمارا دماغ پتھرا گیا ہے احسن اللہ!" بہادر شاہ ظفر نے کہا۔ "ہم کچھ نہیں سوچ سکتے، کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔"

مرزا الٰہی بخش نے مصنوعی طور پر ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تاریخ ہمیں اس وجہ سے کبھی معاف نہیں کرے گی کہ ہم نے نصیرالدین ہمایوں جنت آشیانی کی آخری نشانی بھی تباہ کروادی۔"

"ہم نے کہا نا، ہمارا دماغ پتھرا گیا ہے۔ تم دونوں اس وقت ہمیں تنہا چھوڑ دو۔"

مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات پھیل گئے۔ انہیں اس حکم کی تعمیل کرنا ہی پڑی کہ بہادر شاہ ظفر کو تنہا چھوڑ دیں۔

احاطے میں معرکہ جاری تھا۔ انگریزوں کی توپیں برابر گرج رہی تھیں۔ تیر اور آگ احاطے میں آآ کر گر رہی تھیں۔ سپاہی زخمی بھی ہو رہے تھے، مر بھی رہے تھے، وہ سامان بھی ختم ہوگیا جس سے زخمیوں کی مرہم پٹی کی جاسکتی تھی اس لیے زخمی بھی زیادہ خون بہہ جانے کے باعث مر گئے۔

سپیدۂ سحر پھوٹ رہا تھا جب انگریزوں نے گولہ باری اور تیراندازی اچانک روک دی۔ اس کے ساتھ ہی فصیل پر سفید پھریرا بھی لہرایا گیا تھا۔ سپاہیوں کو اچانک بہادر شاہ ظفر کا یہ حکم ملا تھا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔

رات ہی کے کسی حصے میں بہادر شاہ ظفر کے دل میں یہ کسک اٹھی تھی کہ جنت آشیانی نصیرالدین ہمایوں کا مقبرہ تو محفوظ رہ جائے۔ اس نے مرزا الٰہی بخش کو اجازت دے دی تھی کہ وہ کسی طرح باہر جا کر انگریزوں سے صلح کی بات چیت کرلے۔

اور بات چیت ہوگئی تھی۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو امان دینے کا عہد کرلیا تھا لیکن یہ اور بات ہے کہ ان مکاروں نے اس عہد کی پاسداری نہیں کی۔ وہ دندناتے ہوئے مقبرے میں داخل ہوئے تھے اور بہادر شاہ سمیت سب کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔

☆☆☆

یہ بات ایک دن پہلے ہی شہر کے ہر فرد کو معلوم ہوچکی تھی کہ شاہی سپاہ شکست کھا چکی تھی اور اب دہلی پر انگریزوں کا مکمل راج تھا۔ بہت سے لوگ سہمے ہوئے اپنے گھروں میں بیٹھے تھے لیکن اس وقت راستوں پر خاصی بھیڑ لگ گئی جب پابہ جولاں بہادر شاہ ظفر اور شاہی خاندان کے دیگر افراد کو ہمایوں کے مقبرے سے شہر کی طرف لایا جارہا تھا۔ اپنے بادشاہ کی یہ حالت دیکھ کر بہت سے لوگ اشک بار ہوگئے۔

میجر ہڈسن فاتحانہ انداز میں آگے آگے چل رہا تھا۔ اچانک اس نے مڑ کر اپنے پستول سے بہادر شاہ ظفر کے دو بیٹوں اور ایک پوتے کو گولیوں کا نشانہ بنادیا۔ ملکہ زینت محل نے تڑپ کر لاشوں کی طرف جانا چاہا لیکن اسے دھکیل کر ایک بیل گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ اس مقام پر خاصی بیل گاڑیاں جمع کی گئی تھیں جن میں گرفتار شدگان کو جیل لے جایا جاتا۔

مقبرے میں جن لوگوں نے ہتھیار ڈالے تھے، انہیں جان کی امان نہیں ملی تھی۔ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور بہادر شاہ کی تین پیاری ہستیوں کو میجر ہڈسن نے اس لیے گولیاں ماری تھیں کہ ہجوم دہشت زدہ ہوجائے اور اپنے بادشاہ کی حالت سے مشتعل ہو کر کوئی شورش برپا نہ کردے۔

سارے شاہی خاندان کو زنداں میں ڈال دیا گیا اور پھر دہلی میں ایک اور قیامت برپا ہوئی۔ جو لوگ فرنگیوں سے ملے ہوئے تھے۔ ان کے مکانوں پر نشانات لگا دیے گئے تھے۔ ان نشانات زدہ مکانوں کو چھوڑ کر بے شمار گھروں میں آگ لگائی گئی اور لوگوں کا قتل عام کیا گیا۔ جن لوگوں کو زنداں میں ڈالا گیا، ان میں فیضان بھی تھا اور اس پر فوراً تشدد شروع کردیا گیا تھا۔ کئی سپاہی اس پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر رہے تھے۔ بندوقوں کی بٹیں بھی برسائی جارہی تھیں۔ وہ زنجیروں میں بندھا بے بسی سے مار کھاتا رہا اور زخمی ہوتا رہا۔

"اب بس کرو!" ایک افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "اتنا بھی نہیں کہ یہ فوراً مر جائے۔ اسے تو سسک سسک کر مرنا ہوگا۔ اسی نے مقبرے میں سپاہ جمع کی تھی۔ اسی کی وجہ سے ہمارے سیکڑوں ساتھی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس کی یہ سزا کافی نہیں کہ یہ فوراً مر جائے۔ اسے کھانا پینا دیتے رہو۔ اسے زندہ رہنا چاہیے۔ جب اس کے زخم ٹھیک ہوجائیں تو پھر اس کی درگت بناؤ۔ اس وقت کا انتظار کرو جب یہ خود موت کی خواہش کرنے لگے۔"

زنداں میں فیضان کو زخموں سے چور چھوڑا گیا لیکن

تکلیف کے اس عالم بھی اسے زرتاج یاد آتی رہی۔ نہ جانے وہ زندہ بھی ہوگی یا نہیں……

وقت گزرتا رہا۔ دن گزرتے رہے۔ اسے پہرے دار سپاہیوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا لیکن فیضان کے خیال میں یہ صرف دنیا دکھاوے کی بات تھی۔ آخرکار بہادر شاہ کو ختم کرنا ہی انگریزوں کا مطمح نظر ہو سکتا تھا۔

فیضان پر تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔

پھر ایک دن اسے معلوم ہوا کہ بہادر شاہ ظفر کو موت کی سزا دینے کے بجائے جلاوطنی کی سزا دی گئی تھی اور اسے رنگون بھیجنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ملکہ زینت محل اور کچھ شہزادوں کو بھی اس کے ساتھ بھیجا جاتا۔ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ انہیں بھی رنگون بھیج دیا جائے۔ نہ جانے کیوں انگریزوں نے ان کی یہ درخواست منظور کر لی تھی اس لیے فیضان نے بھی یہ درخواست کر ڈالی اور اس کی درخواست بھی منظور کر لی گئی۔

تشدد کے باعث فیضان کا بیشتر وقت کراہتے ہوئے گزرتا تھا۔ کبھی اسے کچھ وقت کے لیے نیند آتی تھی تو وہ خواب میں زرتاج کو ضرور دیکھتا تھا۔ اسی لیے اسے اس کا دل یقین دلاتا رہتا تھا کہ وہ زندہ ہوگی۔

مقبرے سے روانگی کے وقت بہادر شاہ ظفر کے ساتھ صرف ملکہ زینت محل تھی۔ باقی تمام گرفتار عورتوں کو مردوں سے الگ رکھا گیا تھا۔ اسی لیے فیضان کا خیال تھا کہ زرتاج انہی عورتوں میں ہوگی۔

بہادر شاہ ظفر کے ساتھ جن لوگوں کو رنگون لے جا کر قید خانے میں رکھا گیا، ان کے علاوہ باقی سب دہلی ہی کے زنداں میں قید رہے تھے۔ فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ جب حالات مکمل طور سے معمول پر آجائیں گے، تب انہیں رہا کر دیا جائے گا۔

بہادر شاہ ظفر کو صرف جلاوطنی کی سزا نہیں سنائی گئی تھی بلکہ اسے تادم مرگ قید میں بھی رہنا تھا۔ فیضان اسے پھر بھی نہیں دیکھ سکا۔ اسے علم بھی نہیں تھا کہ قید خانے میں بہادر شاہ ظفر کو کہاں رکھا گیا تھا۔ اسی لیے اسے یہ بات بھی معلوم نہیں ہو سکی کہ ایک روز بہادر شاہ کو کپڑوں سے ڈھکے ہوئے دو خوان اس طرح پیش کیے گئے تھے جیسے اس کے لیے اچھی قسم کا کھانا لایا گیا ہو۔ پھر جب کپڑے ہٹائے گئے تھے تو ان خوانوں میں کھانے کے بجائے بہادر شاہ ظفر کے دو بیٹوں کے کٹے ہوئے سر رکھے تھے۔ بہادر شاہ ظفر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کے منہ سے دھیمی سی آواز نکلی تھی۔ ”شہید بیٹوں کو سرخ رو ہو کر باپ کے سامنے آنا چاہیے۔“

صرف اسی بات سے کیا، فیضان ہر بات سے بے خبر تھا۔ اس کے علاوہ بھی بعض قیدیوں پر تشدد کیا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ بیمار پڑ جاتے تھے، ان کا علاج بھی نہیں کیا جاتا تھا یہاں تک کہ وہ مر جاتے تھے۔ کچھ قیدیوں کو اس کی اجازت دے دی جاتی تھی کہ وہ مرنے والے کو شہر کے کسی ویران علاقے میں لے جا کر دفن کر دیں۔ ان کی تدفین فرنگی سپاہیوں کے پہرے میں ہوتی تھی۔

اسی زنداں میں ملکہ زینت محل کا اور اس کے بعد 1862ء میں بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوا۔ وہ آخری مغل بادشاہ تھا۔

انہی دنوں میں رنگون کے لوگ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک عورت کو دیکھتے تھے جو ایک قبر کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ بکھرے ہوئے بالوں اور اپنی ہیئت کے باعث وہ پاگل معلوم ہوتی تھی۔ اسے نہ کھانے کا ہوش تھا، نہ پینے کا۔ اگر کوئی قریب جاتا تھا اور اسے کھانے کے لیے کچھ دیتا تھا تو وہ کھا لیتی تھی۔ کوئی پینے کے لیے کچھ دیتا تھا تو پی لیتی تھی۔ کسی سے کچھ بولتی نہیں تھی۔ جب کوئی قریب جاتا تھا تو اپنی ایک میلی سی چادر قبر پر پھیلا دیتی تھی۔

سارے شہر میں اس کا چرچا ہو گیا لیکن کوئی کسی کو نہ بتا سکا کہ وہ عورت کون تھی اور کسی کی قبر پر کیوں بیٹھی رہتی تھی۔ کبھی کبھی لوگ یہ بھی دیکھتے کہ وہ عورت اپنے داہنے ہاتھ کی ایک انگلی قبر پر پھیرتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ قبر کی مٹی پر لکیریں کھینچ رہی ہو۔ چند ماہ کے بعد اس عورت کو قبر کے پاس مردہ پایا گیا۔ لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ قبر پر کئی جگہ ”فیضان…… فیضان…… فیضان“ لکھا ہوا تھا۔ زندگی میں وہ عورت قبر پر انگلی پھیر کر یہی نام لکھا کرتی تھی۔

ماخذات

جنگ آزادی کی تلخ یادداشتیں، ایڈورڈ تھامپسن۔ آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، ڈاکٹر مبارک علی۔ ہندوستانی کے تمدنی جلوے، صباح الدین عبدالرحمن۔ شاہ عالم ثانی کے عہد کا دہلی دربار، پولیر، دولیسی۔ تاریخ ایران، مقبول بیگ بدخشانی۔ مغل دربار، ڈاکٹر مبارک علی

جارج بیل اٹلانٹا سٹی ایرینا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آسمان سے تیز ہواؤں کے ساتھ بارش کی بوندیں برس رہی تھیں۔ ایرینا کی جگمگاتی روشنیاں آنے والے ہری کین کے ابتدائی اثرات کے سامنے ماند پڑ رہی تھیں۔ ایک طرف ایک ٹی وی کی رپورٹر آنے والی فائٹ سے جاری موسم کے بارے میں رواں تبصرہ کر رہی تھی۔ جارج تقریباً چالیس برس کا طویل قامت اور اسمارٹ جسامت والا خوش شکل مرد تھا۔ آج اس کے لیے بہت خاص دن تھا اس لیے اس نے اپنا بہترین سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ ایرینا میں داخل ہوا، اس وقت وہاں ایک عام مقابلہ جاری تھا۔ دو مقامی باکسر تماشائیوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر گھونسے برسا رہے تھے مگر کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

جارج جانتا تھا اس قسم کے مقابلے اصل فائٹ سے پہلے تماشائیوں کا خون گرمانے کے لیے کیے جاتے ہیں اور ان کے نتیجے سے کسی پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ تماشائی بھی اس حقیقت سے واقف تھے اس لیے وہ اپنی دلچسپی کے لیے

بھرا گلاس لے کر چلنے کا مطلب بہت احتیاط سے قدم بڑھانے کا اشارہ ہوتا ہے مگر… یہ سب عقلمندوں کی باتیں ہیں… ورنہ اکثر جام چھلک جاتا ہے اور دامن داغدار ہو جاتا ہے… کچھ ایسا ہی حال اس کا بھی تھا جس کے پاس اتنا علم تھا کہ دامن تنگ پڑنے لگا… بہرحال جنہیں پیاس تھی اس کے تعاقب میں سرگرداں رہے اور بالآخر اپنی تشنگی رفع کرنے کے تمام ہتھکنڈے آزما ڈالے اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

طاقتور لوگوں کے درمیان دریافت اور ایجادات کی

لرزہ خیز روداد

ساتھ وقت گزاری کرتے ہوئے جانس ڈیمن کی فائٹ کا انتظار کررہے تھے۔ چوبیس سالہ جانسن ڈیمن دو سال پہلے منظر عام پر آیا پہلے اس نے اٹلانٹا سٹی کی باکسنگ چمپئن شپ جیتی اور پھر جارجیا ریاست کے ہیوی ویٹ چیمپئن ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ ایک سال پہلے اس نے امریکا ہیوی ویٹ چیمپئن کا ٹائٹل جیتا اور بالآخر وہ چار دوسرے باکسروں کو ناک آؤٹ کرتا ہوا موجودہ چیمپئن گیری گرزلی کے مدمقابل آگیا تھا۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے اور اب سے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد دونوں باکسر رنگ میں مدمقابل ہوتے۔

جانس، جارج کا پسندیدہ ترین باکسر تھا اور وہ آج خاص طور سے اس کی فائٹ دیکھنے آیا تھا۔ جارج اسے اس وقت سے جانتا تھا جب وہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں سولو اسٹریٹ سیاہ فام گینگسٹر کے ساتھ چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا تھا اور جارج نے اسے ایسی ہی ایک واردات کے دوران پکڑا بھی تھا۔ اس وقت اسے اس لڑکے سے ہمدردی ہوگئی تھی، قانونی کارروائی کرتے ہوئے اس نے جانس کو عدالت میں تو پیش کیا لیکن جب وہ دو مہینے بعد جیل سے رہا ہوا تو جارج نے اسے خود جیل سے لے کر بلی شیپ کے جمنازیم میں جمع کرادیا تھا۔ بلی شیپ سابق باکسر، سابق عادی شرابی، عادی اور سابق مجرم تھا، اب وہ اپنے جیسے بھٹکے ہوئے لوگوں کی مدد کررہا تھا۔ اس نے جانس کی ذمے داری لے لی۔ چند دن بعد جارج بھول گیا تھا۔ پھر وہ پیٹرولنگ پولیس سے ہومی سائڈ میں آگیا۔ دو سال پہلے بلی شیپ نے اسے فائٹ کا دعوت نامہ بھیجا۔ وہ خاص مہمانوں میں شامل تھا اور تب اسے پتا چلا کہ جانس ڈیمن کیا بن گیا ہے۔ اس نے اپنے پہلے پیشہ ور مقابلے میں مدمقابل کو صرف تین راؤنڈ میں دھول چٹادی اور بہ آسانی مقابلہ جیت لیا اسی وقت وہ جارج کا فیورٹ ہوگیا اور اسے یقین ہوگیا کہ اگر وہ پٹری سے نہیں اترا تو اسے عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

آج وہ وقت آگیا تھا۔ جارج نے سامنے کا ٹکٹ لیا تھا۔ یہ اگرچہ اسے خاصا مہنگا پڑا تھا مگر اس نے پروا نہیں کی۔ وہ چاہتا تو اعزازی پاس بھی لے سکتا تھا مگر اعزازی پاس لینا اسے اپنے شوق کی توہین لگی اس لیے اس نے ڈھائی ہزار ڈالرز کا ٹکٹ لیا۔ اس کی تنخواہ اچھی خاصی تھی اور اخراجات بہت کم تھے۔ ایرینا خاصا بڑا تھا، اس میں کم وبیش چالیس ہزار افراد کی گنجائش تھی لیکن یہاں اس سے کچھ زیادہ ہی افراد موجود تھے۔ سٹی ایرینا اور کیسینو مشہور صنعت کار اور اب یہ بھی جان والٹر کی ملکیت تھا۔ وہ ایرینا کے ساتھ ایک بہت بڑی اسکائی اسکریپر کی تعمیر بھی شروع کرچکا تھا جو تکمیل کے بعد اٹلانٹا سٹی کی سب سے بلند عمارت کا اعزاز حاصل کرلیتی۔ یہ بہت بڑا منصوبہ تھا جس میں کئی ہوٹلز اور دفاتر کے ساتھ رہائشی یونٹس بھی شامل تھے۔ جان والٹر صرف اس ایرینا اور کیسینو کا ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑی ہتھیار ساز کمپنی کا مالک بھی تھا۔ اس کی کمپنی کو بہت سارے دفاعی ٹھیکے ملے ہوئے تھے اور آئندہ بھی ملنے والے تھے۔ جان والٹر کا شمار ان لوگوں میں کیا جاتا تھا جنہوں نے ملک کے دفاع کو مضبوط بنانے میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔

جارج عام راستے سے اندر آیا تھا لیکن جب وہ وی آئی پی افراد کے لیے مخصوص راستے سے گزر رہا تھا تو اس نے سیکریٹری دفاع جم کرسٹن کو اپنے محافظوں کے ساتھ اندر آتے دیکھا۔ صحافی اور میڈیا مین اسے دیکھتے ہی لپکے تھے۔ وہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ جان والٹر کی کمپنی کا بنایا ہوا بیل میزائل امریکی دفاعی سسٹم کا حصہ بننے والا تھا۔ جان کے جم سے ذاتی تعلقات تھے وہ کالج کے زمانے میں دوست رہے تھے اور یہ تاثر عام تھا کہ جم کے ہوتے ہوئے بیل میزائل مسترد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دفاعی ماہرین کے مطابق بیل پانچویں نسل کا جدید ترین میزائل شکن میزائل تھا جو کسی بھی قسم کے حملہ آور میزائل کو روکنے اور نشانے پر پہنچنے سے پہلے تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا مگر ساتھ ہی اسے بہت مہنگا میزائل بھی قرار دیا جارہا تھا۔ اگر فوج اس کی منظوری دے دیتی تو یہ میزائل پروگرام کا چالیس فیصد بجٹ کھا جاتا اور اسی وجہ سے کئی حلقوں سے اس کی مخالفت کی جارہی تھی۔

جارج، جان والٹر کے ساتھ جم کرسٹن کو بھی پسند کرتا تھا اس کے خیال میں وہ اصول پسند شخص تھا جو وہی کرتا اس کے نزدیک جو صحیح ہوتا تھا۔ وہ گزشتہ سات سال سے اس عہدے پر کام کررہا تھا۔ جارج اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آگے آیا اور جارج کو دیکھ کر چونکا۔ جارج نے مسکرا کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ’’تم کو دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی مسٹر سیکریٹری۔‘‘

’’جارج بیل۔‘‘ جم نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔ ’’میں تمہیں بھولا نہیں ہوں۔‘‘

’’حالانکہ اس بات کو چار سال گزر چکے ہیں۔‘‘ جارج نے کہا۔ ’’بہرحال تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔‘‘

’’مسٹر بیل اس وقت تم نے جو کیا تھا وہ بھولنے والی چیز نہیں ہے۔‘‘

چار سال پہلے جم کرسٹن کی اکلوتی بیٹی ٹینا کرسٹن کار حادثے میں دریا میں جا گری تھی اور جارج بیل نے جان پر کھیل کر اسے دریا میں گری کار سے نکالا تھا۔ اگر اسے دریا سے نکالنے میں چند لمحے کی اور تاخیر ہوتی تو اس کا بچنا ممکن نہیں تھا۔ جم مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے کسی نے جارج کے شانے پر ہاتھ رکھا اور جب اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے چہرے پر بے یقینی کا تاثر در آیا۔ ’’ولسن... یہ تم ہو ولسن ٹیلر... میرے خدا! آج مجھے کتنے پرانے پرانے لوگ مل رہے ہیں۔‘‘

پولیس آفیسر کی وردی میں ملبوس ولسن ٹیلر مسکرا رہا تھا۔ وہ جارج کا اکیڈمی کے زمانے کا ساتھی اور بہترین دوست تھا۔ دو سال پہلے وہ واشنگٹن چلا گیا تھا۔ تب سے جارج اسے آج دیکھ رہا تھا۔ اس کے سینے پر لگے بیج پر واشنگٹن پولیس کے الفاظ درج تھے۔ جارج نے غور کیا۔ ’’میں تو سمجھا کہ تم واپس آگئے ہو؟‘‘

’’صرف اس ڈیوٹی کے لیے آیا ہوں۔‘‘ اس نے جم کرسٹن کی طرف دیکھا۔ ’’اس کی جنرل سیکورٹی میرے سپرد ہے۔ یوں سمجھ لو میں اس وقت یہاں کا سیکورٹی انچارج ہوں۔‘‘

’’دوست تم سے اتنے عرصے بعد مل کر خوشی ہوئی ہے۔‘‘

فون اور نیٹ پر دونوں کا کبھی کبھی آپس میں رابطہ رہتا تھا مگر اتفاق سے ولسن کا دوبارہ اٹلانٹا آنا نہیں ہوا اور نہ ہی جارج کا واشنگٹن جانا ہوا۔ ولسن نے سر ہلایا۔ ’’جولی کیسی ہے اور مائلو کیسا ہے؟‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ جارج نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ’’میری اور اس کی طلاق ہوگئی ہے۔ مائلو اسی کے ساتھ ہوتا ہے۔‘‘

ولسن کو جھٹکا لگا۔ اس نے بے یقینی سے جارج کو دیکھا۔ ’’طلاق مگر کیوں؟‘‘

جارج نے شانے اچکائے۔ ’’اسے ایک دولت مند مل گیا اور جو اسے وہ سب دے سکتا تھا جس کی اسے خواہش تھی۔ اس لیے اس نے مجھ سے کہا کہ ہم الگ ہوجاتے ہیں۔‘‘

’’اور تم مان گئے؟‘‘ ولسن کو اب تک یقین نہیں آرہا تھا۔ ’’کالج کے زمانے میں تم اس کے لیے پاگل تھے۔‘‘

’’کالج میں انسان بہت سی چیزوں کے لیے پاگل ہوتا ہے۔ بہرحال میں ناخوش نہیں ہوں۔ اب میں تنہائی کو انجوائے کررہا ہوں۔ جاب کرتا ہوں اور کچھ اسپورٹس سے دلچسپی ہے۔ میرا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔‘‘

ولسن کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے جارج کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ’’ٹھیک ہے تم انجوائے کرو میں ذرا اپنا کام دیکھ لوں۔‘‘

وی آئی پی راستے سے آگے جاتے ہوئے جارج نے دیکھا۔ جان والٹر بھی آگیا تھا اور وہ ولسن کے ساتھ جم کرسٹن کی طرف جارہا تھا۔ جارج جانتا تھا کہ ولسن ٹیلر بہت اچھا پولیس آفیسر ہے۔ اسی وجہ سے اس کی تبدیلی فیڈرل میں ہوئی تھی اور وی آئی پی سیکورٹی سے ظاہر تھا کہ اسے فیڈرل والوں کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔ جارج ایرینا کے ریزرو حصے میں آیا۔ یہاں ڈریسنگ روم اور میٹنگ روم تھے یہیں کلینک تھا اور سیکورٹی کنٹرول سینٹر بھی یہیں تھا۔ اس سے متصل کیسینو تھا جس میں کئی منزلہ ہوٹل بھی تھا۔ جہاں ایرینا اور کیسینو میں آنے والے بیرون شہر کے لوگ ٹھہرتے تھے۔ ایرینا کا سیکورٹی انچارج پال اسے اسی فلور پر مل گیا۔ وہ جانس کے ڈریسنگ روم کے باہر تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور جانس نظر آیا۔ جارج اس کی طرف بڑھا تھا کہ باہر موجود ایک تنومند سیاہ فام نے اسے روک لیا، اس کے گلے میں سونے کی کم سے کم ایک کلوگرام وزنی زنجیر پڑی تھی اور اس نے شوخ پیلے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا وہ جانس کا باڈی گارڈ تھا۔ اسی جیسے چند نمونے اور بھی باہر موجود تھے۔ اس نے غرا کر کہا۔

’’اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔‘‘

جارج پلٹ کر پال کی طرف آیا، وہ سابق پولیس آفیسر تھا اور جارج کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ’’یہ کیا ہے؟ مجھے اپنے بیٹے کے لیے جانس کا آٹوگراف چاہیے میں اس سے وعدہ کرکے آیا ہوں۔‘‘ جارج نے پوچھا۔

پال نے بے بسی سے شانے ہلائے۔ ’’میں صرف اسی وقت بااختیار سیکورٹی انچارج ہوتا ہوں جب ایرینا میں کسی کو سیکورٹی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔‘‘

’’آج کی کیا رپورٹ ہے؟‘‘

’’کوئی خاص نہیں سب معمول کے مطابق ہے۔‘‘

پال نے کہا۔ اسے واکی ٹاکی پر کال آئی تو وہ معذرت کرتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے چلا گیا، شاید ایرینا میں اس کی طلبی ہوئی تھی۔ اسی لمحے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا اور اسے روڈی کی صورت دکھائی دی۔ جارج اس کی طرف بڑھا تو وہ پلٹ کر بھاگا۔ اس بار پیلے کوٹ والا جارج کو نہیں روک سکا تھا۔ وہ اندر گھسا تو روڈی اسے کیسینو کی طرف جانے والی سیڑھیوں سے اترتا نظر آیا مگر اس کی بدقسمتی کہ تعمیراتی کام جاری ہونے سے یہ راستہ بند کردیا گیا تھا اور وہ گھر گیا

تھا۔ روڈی دوسرے درجے کا بدمعاش اور ایک نمبر کا لفنگا تھا۔ موقع ملنے پر وہ اپنی ماں کو دھوکا دینے سے بھی نہ چوکتا۔ وہ ملاٹو تھا، اس کی رگوں میں سیاہ فام اور اسپینش خون تھا۔ جارج نیچے آیا تو وہ گھگیانے لگا۔

”پلیز میری بات سنو... دیکھو میں نے دھوکا نہیں کیا... مجھے خود بھی معلومات نہیں ملی تھیں، میں تمہیں کہاں سے بتاتا۔“

”ہاں تم بہت ایمان دار شخص ہو۔ تم نے معلومات حاصل کر لی تھیں لیکن مجھے دینے کے بجائے درست آدمی سے ان کا سودا کر لیا۔“ جارج نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے اس کے کوٹ کا کالر درست کیا اور پوچھا۔ ”تم نے اس سے کیا لیا دوست؟“ کہتے ہوئے جارج نے اچانک ہی پوری قوت سے اس کے پیٹ میں مکا مارا۔ روڈی کے حلق سے اوک کی آواز نکلی اور وہ نیچے گر گیا۔ جارج نے اسے چند ٹھوکریں ماریں اور پھر جھک کر اس کی تلاشی لی تو اس کے پاس سے نوٹوں کا ایک بنڈل برآمد ہوا یہ تقریباً دو ہزار ڈالرز کی رقم تھی۔ روڈی نے بہ مشکل کہا۔

”پلیز یہ بیج کو دینی ہے۔“

”کیوں نہیں... اسے یہ رقم میں پہنچا دوں گا۔“ جارج نے اسے ٹھوکر اور رسید کی تو وہ کراہنے لگا تھا۔ روڈی پولیس کا مخبر بھی تھا۔ اس نے ایک کیس کے سلسلے میں جارج کو دھوکا دیا اور اس کے بعد سے غائب تھا۔ جارج سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور پھر باہر نکل آیا۔ بیج کیسینو میں سپروائزر تھا۔ اس کی کوئی خاص جاب نہیں تھی۔ اس کا کام کیسینو میں گھوم پھر کر یہ دیکھنا تھا کہ سب ٹھیک چل رہا ہے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ اتفاق سے وہ جارج کو ڈریسنگ روم کے باہر مل گیا۔ وہ گول چہرے اور سامنے سے صاف سر والا ویل ڈریسڈ شخص تھا۔ جارج نے اسے نوٹوں کا بنڈل تھمایا تو وہ چونکا۔

”یہ کیا؟“

”روڈی نے کہا تھا تمہیں دیدوں۔“

بیج گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اتنا تو جارج بھی سمجھتا تھا روڈی جیسے بدمعاش کی طرف سے بیج کو یہ ادائیگی کسی شریفانہ معاملے میں نہیں ہوگی۔ لیکن یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ واپسی میں اسے جانس کے ذاتی سوٹ کا دروازہ بند ملا تھا۔ اب وہ اس سے فائٹ کے بعد ہی آٹوگراف لے سکتا تھا بہ شرط کہ وہ آٹوگراف دینے کی پوزیشن میں ہوا تو۔ گیری کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک بار اپنے حریف پر حاوی ہو جاتا تو جان بوجھ کر اسے ناک آؤٹ کرنے کے بجائے اس کی مرمت لگاتا تھا۔ جانس کا لومڑی جیسی صورت والا منیجر کیلون بہت فکر مندانہ انداز میں ٹہل رہا تھا لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی جانس کی ہر فائٹ پر اس کی یہی حالت ہوتی تھی۔ جارج ایرینا میں آیا تو فائٹ ختم ہو چکی تھی اور اب لوگ رِنگ کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ جارج سے آگے ایک خوش بدن ماڈل کارڈز اٹھائے جا رہی تھی۔ اس کا کام ہر راؤنڈ کے آغاز سے پہلے اس کے نمبر کا کارڈ اٹھا کر رنگ میں چاروں طرف دکھانا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی البتہ راؤنڈ کے وقفے میں تماشائی بور نہیں ہوتے تھے انہیں دیکھنے کو کچھ اچھال جاتا تھا۔ مستقل نشستوں سے آگے خالی جگہ پر متعدد فولڈنگ چیئرز لگائی ہوئی تھیں اور سب سے مہنگا ٹکٹ لینے والے ان پر ہی براجمان تھے۔ جارج کو ولسن کے ساتھ والی سیٹ خالی ملی اور وہ اسی پر بیٹھ گیا۔

جم کرسٹن اور اس کا تنومند گارڈ پیچھے بیٹھے تھے۔

اچانک ایرینا میں شور بلند ہوا۔ گیری گرزلی اپنے حامیوں کے جھرمٹ میں ہوا میں مکے چلاتا اور لوگوں کے نعروں اور آوازوں کا جواب دیتا ہوا رنگ کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے نیلا گاؤن پہن رکھا تھا جب کہ جانس کو سرخ گاؤن ملا تھا۔ جارج گیری کو پسند کرتا تھا لیکن اس کا ہیرو جانس تھا اس لیے اس نے صرف تالیاں بجائیں۔ جیسے ہی گیری رنگ میں داخل ہوا اوپر سے جانس اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نمودار ہوا اور ایرینا میں اس سے منسوب گانا گونجنے لگا۔ اس بار شور واضح طور پر کہیں زیادہ تھا مگر گیری کے برعکس جانس بے تاثر انداز میں آ رہا تھا۔ اس کے بازو سائڈوں میں لٹک رہے تھے اور وہ سر جھکائے تیز قدموں سے رنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جارج کے قریب آیا تو وہ بھی اس کا استقبال کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے چلا کر کہا۔

”جانس آج تمہیں چیمپئن بننا ہے۔“

جانس اس کے سامنے سے گھومتا ہوا اپنے حصے کی طرف گیا اور وہاں سے رنگ میں داخل ہو گیا۔ اسی لمحے ولسن اپنی کرسی سے اٹھا اور ایک طرف بڑھا۔ جارج نے چند لمحے کے لیے اتنا دیکھا کہ وہ سرخ بالوں والی ایک عورت سے بات کر رہا تھا اور عورت اچانک اٹھ کر اوپر کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ ولسن اسے روکتا ہوا اس کے پیچھے گیا تھا۔

پھر جارج کی توجہ ولسن کی خالی کرسی پر آ کر بیٹھ جانے والی ایک خوب صورت لڑکی کی طرف ہوئی۔ اس کے سنہری بال شانوں تک آ رہے تھے۔ اس کی دور کی نظر یقیناً کمزور تھی کیونکہ اس کی نازک آئی فریم میں لگے شیشے دور کی نظر کے

لیے تھے۔ اس نے مسکرا کر جارج کی طرف دیکھا اور بولی۔

”سوری میں کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ جارج نے کہا اور رنگ کی طرف متوجہ ہوا جہاں مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ گیری نے آغاز میں ہی جانس پر تابڑتوڑ مکے برسائے تھے۔ ریفری نے جانس کو الگ کر دیا اور مقابلہ روکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ جارج بے اختیار کھڑا ہوا اور چلانے لگا وہ جانس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا نہیں کہ سنہری بالوں والی لڑکی اچانک مڑ کر جم کرسٹن سے کچھ کہہ رہی تھی پھر اس نے ایک لفافہ جم کی طرف بڑھایا اور جم نے لے کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ جانس دوبارہ گیری کی طرف بڑھا تھا اور دونوں ایک دوسرے پر مکے چلانے لگے اسی لمحے کوئی چیز زن سے جارج کے پاس سے گزری اور کسی مائع کے چھینٹے اڑ کر جارج کے چہرے تک آئے تھے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ جم کرسٹن نیم کھڑی پوزیشن میں پیچھے گر رہا تھا اور اس کی گردن سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔

سنہری بالوں والی لڑکی کی سفید شرٹ پر بہت زیادہ خون آیا تھا۔ اسی لمحے دوسری زن کی آواز آئی اور لڑکی چیخ مار کر نیچے گری تھی۔ جارج اپنی جبلت کے زیر اثر خود کار انداز میں گرا۔ اس نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ ایرینا میں شور بے پناہ تھا، اس لیے کسی نے فائر کی آواز نہیں سنی۔ جھکی پوزیشن میں جارج کی توجہ رنگ کی طرف گئی اور اس نے جانس کو گرتے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ تھی اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ گیری دونوں ہاتھ بلند کیے فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت جم کرسٹن کے آس پاس افراتفری پھیلنا شروع ہو گئی تھی لوگوں نے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ جارج اٹھا تو اس نے سنہری بالوں والی لڑکی کو غائب پایا۔ اس نے پلٹ کر جم کرسٹن کی طرف دیکھا۔ اس کا گارڈ اور کچھ دوسرے لوگ اسے ابتدائی طبی امداد دے رہے تھے۔ گولی نے اس کا حلق چھید دیا تھا۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے دہشت زدہ ہو کر بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ جارج چاروں طرف ولسن کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ لوگوں کو دھکیلتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ جارج نے محسوس کیا وہ جس طرف سے آ رہا تھا وہاں کچھ ہوا تھا کیونکہ وہاں الگ سے بھگدڑ مچی ہوئی تھی اور لوگ بھاگ رہے تھے۔ جارج ولسن کی طرف بڑھا وہ شاک کی کیفیت میں تھا۔

”دروازے بند کراؤ۔“ جارج نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

”یہ ساری میری غلطی ہے۔“ وہ بولا۔

”ہوش میں آؤ دروازے بند کراؤ ورنہ سارے گواہ اور ممکنہ طور پر قاتل بھی نکل جائے گا۔“

”قاتل کو میں نے شوٹ کر دیا ہے۔“ ولسن نے کہا اور اپنے واکی ٹاکی پر ایرینا کے دروازے بند کرنے کا حکم دینے لگا۔ جارج کو سنہری بالوں والی لڑکی کا خیال آیا مگر وہ اب وہاں نہیں تھی۔ جارج نے آس پاس دیکھتے ہوئے ولسن کو اس کے بارے میں بتایا اور اس نے اپنے آدمیوں کو اس کے بارے میں بھی خبردار کر دیا۔ اس دوران میں ایرینا سے نوے فیصد افراد جا چکے تھے اور باقی جا رہے تھے وہ یقیناً بال نکلنے والے ہال میں جمع ہو رہے تھے جہاں درجنوں دروازے تھے۔ ولسن نے واضح حکم دیا تھا کہ کسی بھی فرد کو چیک کیے بغیر باہر جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ جم کرسٹن کے لیے ایرینا کا طبی عملہ اور ڈاکٹر آ گیا تھا۔ وہ اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جارج نے رومال سے خون صاف کرتے ہوئے کہا۔

”مشکل ہے گولی نے عین حلق میں سوراخ کیا ہے۔“

”یہ سارا میرا قصور ہے۔“ ولسن نے سر تھام لیا تھا۔

جارج اسے کھینچ کر ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”احمقانہ باتیں مت کرو... تم نے کچھ نہیں کیا ہے... ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور ذمے داروں کا تعین کرنا اوپر والوں کا کام ہے تم کس لیے ذمے داری لے کر ان کا کام آسان کر رہے ہو۔ تم کوئی احمقانہ بیان نہیں دو گے۔“

”میں نے قاتل کو شوٹ کر دیا تھا۔“ ولسن نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ ”حالانکہ اسے زندہ گرفتار کرنا چاہیے تھا۔“

”یہ تمہاری ڈیوٹی کا حصہ تھا تم اسے گولیاں چلانے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ سکتے تھے۔“

اسی لمحے نیچے دو اوورکوٹ والے حضرات پہنچے اور انہوں نے پولیس اور انتظامیہ سے بات شروع کر دی۔ ایک پولیس والے نے ولسن کی طرف اشارہ کیا اور وہ اوپر آئے۔ انہوں نے اپنے کارڈز دکھائے۔ ایک بولا۔ ”میں فیڈرل ایجنٹ کرس ولیم ہوں اور یہ میرا ساتھی جان سین ہے۔“

”تم لوگ کوئی بھی ہو۔“ جارج نے خراب لہجے میں کہا۔ ”یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”ہم اس کیس کی تفتیش کرنے آئے ہیں۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے تفتیش کے لیے پولیس یہاں موجود ہے اور فی الحال کسی فیڈرل ایجنٹ کی ضرورت نہیں ہے۔“

کرس نے ولسن کی طرف دیکھا۔ ”یہ واشنگٹن سے آیا ہے اور صرف سیکیورٹی انچارج ہے۔“

”میں ولسن کی نہیں اپنی بات کر رہا ہوں۔“ جارج نے اسے اپنا بیج دکھایا۔ ”میرا تعلق ہومی سائڈ سے ہے اور یہ میرا کیس ہے۔ اس لیے تم جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔“

دونوں فیڈرل ایجنٹس نے برا سا منہ بنایا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ولسن ابھی تک مضطرب تھا۔ اس نے دوبارہ اپنے آدمیوں سے رابطہ کر کے رپورٹ لی۔ کوئی فرد ایرینا سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا پولیس نے سارے راستے بند کر دیے تھے۔ ایرینا کے باہر بھی پولیس آچکی تھی اور اسے چاروں طرف سے گھیرا جا رہا تھا۔ جارج پلٹ کر آیا اور اس نے جم کرسٹن کا معائنہ کیا طبی عملے نے اسے اسٹریچر پر جکڑ دیا تھا اور اب اسے اسپتال لے جانے کے لیے ایرینا کی چھت پر لے جایا جا رہا تھا جہاں ہیلی کاپٹر آ گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ولسن نے جارج سے کہا۔ ”تم نے غلط بیانی سے کیوں کام لیا؟“

”فی الحال یہ پولیس کیس ہی ہے۔ ان فیڈرل والوں کو ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کا شوق ہے۔“ جارج نے کہا۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے!“

”بائیں طرف ایک سرخ بالوں والی لڑکی مجھے مشکوک لگی تھی میں نے اس کے پاس جا کر ٹکٹ مانگا تو وہ پرس ٹٹولنے لگی اور اچانک تماشائی کھڑے ہوئے تو وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر اوپر بھاگی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ میں نے اسے اوپر جا لیا۔“ ولسن نے ایک کنٹری بوتھ کی طرف اشارہ کیا وہاں ایک خلا سے آنکھ نما غبارہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ایرینا کے باہر کھلی جگہ تھا اور طوفانی ہوا کی وجہ سے مسلسل ڈول رہا تھا۔ اس طرف گیلری کے ساتھ جگہ جگہ شیشے کے منقش ڈیزائن والے بوتھ تھے۔ لڑکی نے تسلیم کیا کہ اس کے پاس ایرینا کے اس حصے کا ٹکٹ نہیں تھا اور ابھی میں اس سے بات کر رہا تھا کہ قریبی بوتھ سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر دو فائر ہوئے میں نے خود کار انداز میں اپنا پستول نکالا اور بوتھ پر کم سے کم چھ فائر کیے فوراً ہی ایک رائفل بردار شخص کی لاش باہر گری تھی۔ وہ اپنی صورت سے مشرقی یورپ کا باشندہ لگ رہا تھا۔“

”ایک لڑکی اور...“ جارج نے خود سے کہا۔ ولسن نے اسے دیکھا۔

”تمہیں یقین ہے سنہرے بالوں والی لڑکی جم کرسٹن سے بات کر رہی تھی؟“

”ہاں مجھے یقین ہے وہ صرف جم کے لیے یہاں آئی تھی اور اسے گولی لگتے ہی وہ غائب ہو گئی۔ دوسری گولی شاید اسے لگی تھی۔ دوسرے جم کرسٹن کا خون اس پر بھی آیا ہو گا جب میرے چہرے تک خون آیا تھا تو وہ بالکل سامنے تھی۔“

”میرے آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں۔“ ولسن نے کہا تھا۔

☆☆☆

اسی وقت داخلی گیلری میں ایک سرخی مائل سیاہ بالوں والی لڑکی نے ڈسٹ بن کے پاس سے گزرتے ہوئے سنہری بالوں کی وگ اس میں ڈال دی مگر اس کی سفید لینن کی شرٹ پر خون کی سرخی نمایاں تھی۔ وہاں باہر جانے والوں کا بے پناہ ہجوم تھا ہر دروازے پر پولیس والے ان لوگوں سے بحث کر رہے تھے۔ لڑکی چاروں طرف دیکھ رہی تھی اور اسے سب دھندلا نظر آ رہا تھا کیونکہ ایرینا میں گرتے ہوئے اس کی عینک گر گئی تھی اور پھر اس کے ہاتھ نہیں آئی اچانک اس کی نظر ایک طرف میز پر رکھی سیاہ لیڈیز جیکٹ پر گئی اس نے آس پاس دیکھا اور کسی کو متوجہ نہ پا کر اس نے جیکٹ اٹھائی اور جلدی سے لیڈیز ٹائلٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اندر آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور اپنی شرٹ اتار کر سب سے پہلے اسے دھویا خون دھل گیا مگر اس کی سرخی نہیں گئی تھی۔ پھر اس نے اپنے بازو کا زخم دیکھا۔ گولی بس چھو کر گئی تھی ایک لمبا سا زخم بن گیا تھا جس پر خون جم رہا تھا۔ اس نے پرس سے رومال نکال کر اسے زخم پر باندھ لیا پھر ٹشو سے چہرے اور گردن پر آنے والا خون صاف کیا۔ آخر میں اس نے اپنا منہ دھویا تھا۔

وہ سسکیاں لے رہی تھی اور بہت ڈری ہوئی تھی۔ جسم صاف کر کے اس نے ہینڈ ڈرائیر سے شرٹ خشک کی اور اسے پہن کر اوپر سے سیاہ جیکٹ پہن لی۔ پھر اس نے بال پونی ٹیل کی صورت میں باندھ لیے۔ اب اسے دیکھ کر کہنا مشکل تھا کہ وہی کچھ دیر پہلے جم کرسٹن کے پاس تھی۔ لیکن ایک بات یقینی تھی، وہ چھپ نہیں سکتی تھی۔ متعدد کیمروں نے اسے جم کرسٹن کے ساتھ ریکارڈ کیا ہو گا اور جلد اس کے نقوش سے اسے پہچان لیا جاتا۔ اس کی بچت اسی میں تھی کہ کسی طرح پولیس کے ہاتھ آنے سے پہلے یہاں سے نکل جائے۔ یہاں سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ کسی طرح ایرینا کے دوسری طرف پہنچ جائے جہاں کیسینو میں جانے کا راستہ تھا اور اس کے لیے ایرینا سے گزرنا لازمی تھا۔ وہ ہمت کر کے واپس ایرینا میں آگئی جہاں اب سوائے پولیس

والوں، پیرامیڈک اور لیب کے عملے کے کوئی نہیں تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اور رنگ کے ایک طرف سے ہوتی ہوئی کیسینو کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی۔ ایک پولیس والے نے اسے دیکھا اور آواز دی۔

”اے مس رکو...“

اس نے رفتار تیز کی اور سیڑھیاں چڑھ کر کیسینو جانے والی راہداری میں آگئی۔ جتنی دیر میں پولیس والا اس کے پیچھے آتا وہ کیسینو میں داخل ہو چکی تھی۔ وہاں عوام کا بے تحاشا ہجوم تھا۔ پولیس والا اب واکی ٹاکی پر ولسن کو بتا رہا تھا۔ لڑکی کیسینو میں داخل ہوئی اور سلاٹ مشینوں والی لائن میں آگئی۔ اسے پناہ کی ضرورت تھی۔ اسے لگا کہ اس نے غلطی کی ہے اور اب پولیس صرف اسی کے لیے یہاں آئے گی۔ وہ ہراساں انداز میں چاروں طرف دیکھ رہی تھی کہ اچانک کسی نے اس کے پاس آ کر کہا۔ ”مس! میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

وہ بیج تھا۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”پلیز میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں کچھ دیر آرام کر سکوں۔“ اس نے کہتے ہوئے جیکٹ کی زپ نیچے کی، شرٹ کے اوپری بٹن پہلے ہی کھلے ہوئے تھے۔ بیج نے غور سے دیکھا اور مسکرانے لگا۔ ”کیوں نہیں یہاں میرے پاس ایک کمرا ہے تم وہاں آرام کر سکتی ہو۔“

☆☆☆

ولسن ٹیلر اس وقت ایرینا کے تہ خانے میں تھا، یہ پارکنگ کے ساتھ تھا۔ وہاں ایک مرد اور ایک عورت موجود تھے۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے آیا تو وہ چونک گئے۔ مرد نے اضطراب سے کہا۔ ”کیا ہوا؟ ہم یہاں پھنس گئے ہیں۔“

”ایک پولیس والے نے مسئلہ کر دیا۔“ ولسن نے کہا۔ ”اس نے قبل از وقت دروازے بند کرا دیے۔“

”تب کیا ہو گا؟“ لڑکی بولی اس کے اصل بال سرمئی رنگ کے تھے اور اس نے کچھ دیر پہلے بالوں کی وگ لگا رکھی تھی۔

”فکر مت کرو ایک راستہ ہے تم دونوں کو یہاں سے نکالنے کا۔“ ولسن نے کہا۔ ”اس طرف چلو۔“

مرد اور لڑکی اس طرف جانے لگے۔ ولسن ان سے ذرا پیچھے تھا اس لیے وہ اسے سائلنسر لگا ہوا پستول نکالتے دیکھ نہیں سکے تھے۔ اس نے پہلا فائر لڑکی پر کیا اور وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ نیچے گری۔ مرد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا کہ دوسری گولی نے اسے بھی گرا دیا۔ دونوں گولیاں نشانے پر لگی تھیں اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ دونوں مر چکے تھے۔ اپنا اطمینان کر کے ولسن اوپر جا رہا تھا کہ اسے واکی ٹاکی پر رپورٹ ملی کہ مشکوک لڑکی ایرینا سے کیسینو میں داخل ہو چکی تھی۔ ولسن درمیان سے ہی کیسینو کی طرف مڑ گیا تھا۔ اسے ہر قیمت پر اس لڑکی کو اپنے قبضے میں لے کر دنیا سے رخصت کرنا تھا۔

☆☆☆

جارج ایرینا کے کنٹرول روم میں تھا، یہاں بیک وقت ایرینا اور کیسینو پر نظر رکھنے والے کیمروں کو مانیٹر کیا جاتا تھا۔ پال اسے ایک کیمرے کی ویڈیو دکھا رہا تھا جس میں جم کرسٹن کو گولی لگی تھی اور سنہری بالوں والی لڑکی وہاں موجود تھی۔ جارج نے اس کے نقوش دیکھے اور بولا۔ ”اس نے وگ لگائی ہے دیکھو اس کے رخسار پر جو چند بال نظر آ رہے ہیں وہ گہرے رنگ کے ہیں۔“

پال کا واکی ٹاکی پولیس کے واکی ٹاکی سے ملا ہوا تھا اس لیے ایک سیاہ کوٹ والی لڑکی کے ایرینا سے کیسینو میں گھسنے کی خبر اسے بھی مل گئی۔ جارج نے کیسینو کے کیمرے دیکھنے کو کہا۔ پال مختلف کیمروں کی ویڈیو دکھانے لگا جلد ایک کیمرے نے سیاہ کوٹ والی لڑکی کو کیسینو اٹینڈنٹ کے ساتھ دکھایا۔ پال نے اسے زوم کیا اٹینڈنٹ کی پشت تھی لیکن لڑکی کی صورت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جارج نے سر ہلایا۔ ”یہی لڑکی ہے۔ مجھے ایک واکی ٹاکی دو اور مجھے گائڈ کرتے رہو۔“

پال نے اسے ایک واکی ٹاکی دیا اور جارج کنٹرول روم سے نکل آیا۔ کیسینو کے اندر آتے ہی اس نے سلاٹ مشینوں کا رخ کیا جہاں لڑکی اٹینڈنٹ کے ساتھ تھی۔ پال نے اسے واکی ٹاکی پر بتایا۔ ”لڑکی اٹینڈنٹ کے ساتھ لفٹس کی طرف جا رہی ہے۔“

جارج تیزی سے لپکا تھا لیکن جب تک وہ لفٹوں والی لابی تک پہنچا سیاہ جیکٹ والی لڑکی بیج کے ساتھ لفٹ میں جا چکی تھی اور اس کا دروازہ بند ہو رہا تھا۔ جارج لڑکی کی صرف ایک جھلک دیکھ سکا تھا۔ اس نے پال سے کہا۔ ”وہ نکل گئی ہے۔“

”لفٹ میں ولسن ٹیلر بھی ہے۔“ پال نے انکشاف کیا۔ ”میں نے اسے واکی ٹاکی پر پیغام دیا ہے لیکن اس کی طرف سے جواب نہیں آ رہا ہے۔“

”تم دیکھتے رہو وہ کس فلور پر اتر رہے ہیں۔“ جارج نے برابر والی لفٹ میں گھستے ہوئے کہا۔ ہوٹل سترہ منزلہ تھا۔ پال دیکھ رہا تھا اس نے بتایا۔

"لڑکی اور اٹینڈنٹ ساتویں فلور پر اتر گئے ہیں۔"

"پال کہاں ہے؟"

"وہ لفٹ میں ہے۔"

"اس فلور کے کیمرے دیکھو۔" جارج نے حکم دیا۔ "پتا لگاؤ کہ وہ کہاں جاتے ہیں۔"

جارج والی لفٹ ساتویں فلور پر رکی تو پال دیکھ رہا تھا۔ اس نے جارج سے کہا۔ "یہ فلور کیسینو اور ایرینا کے ملازمین کے لیے مخصوص ہے۔ وہ کمرا نمبر سات سو بارہ یا تیرہ میں گئے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہاں کیمرا راہداری کے کونے میں ہے۔"

"میں تلاش کر لوں گا، تمہاری مدد کا شکریہ۔" جارج نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

بیج کا کمرا تھا اور وہ لڑکی سے فری ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر اب وہ اس سے گریزاں تھی جب کہ یہاں آنے کے لیے اس نے خود کو تقریباً پیش کر دیا تھا۔ بیج نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

لڑکی نے بوکھلا کر کہا۔ "وہ میں چاہتی ہوں کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔"

بیج نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ناممکن ہے۔ یہ میرا کمرا ہے اور میں تمہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔" لڑکی نے کہا اور اپنا پرس اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی۔ لیکن بیج نے اس کا راستہ روک لیا۔

"تم ایسے نہیں جا سکتیں... کیا میں پاگل ہوں جو اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر تمہارے ساتھ یہاں آیا ہوں۔" اس نے لڑکی کا زخمی بازو پکڑا تو وہ چلا اٹھی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔"

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ بیج نے اس کا بازو چھوڑ کر جیسے ہی لاک کھولا جارج اندر گھس آیا۔ بیج نے کہا۔ "ہے... یہ میرا کمرا ہے۔"

"ضرور ہوگا۔" جارج نے اسے گریبان سے پکڑا اور باہر کی طرف دھکا دیا۔ "مگر ابھی تم اپنے... سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

بیج کو باہر دھکیلتے ہی جارج نے دروازہ بند کر کے اندر سے لاک کر دیا لڑکی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ جارج نے اس کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں بولا۔ "تم جم کرسٹن سے ملی تھیں جب اسے شوٹ کیا گیا؟"

"ہاں؟" لڑکی نے اعتراف کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" جارج بولا۔

"میرا نام این بورنے ہے۔ میں محکمۂ دفاع میں ڈیفنس اینالسٹ کے طور پر جاب کرتی ہوں۔"

"تو مس بورنے... تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟"

"میں بتا دوں گی لیکن پلیز یہاں سے چلو تم پولیس والے ہو نا؟"

"تم نے کیسے اندازہ لگایا؟"

"تمہاری زبان سے..."

☆☆☆

ولسن ٹیلر اگلے فلور پر لفٹ سے اترا تھا۔ وہ لفٹ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہاں کیمرا لگا ہوا تھا، ورنہ لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ وہ سیڑھیوں سے واپس نچلے فلور پر آیا۔ یہاں بے شمار راہداریاں تھیں۔ وہ یہاں گھومنے لگا اس کے کان آوازوں پر لگے ہوئے تھے اور مختلف کمروں سے الگ الگ آوازیں آ رہی تھیں۔ راہداریاں سنسان تھیں کہیں کہیں کوئی ویٹر یا مہمان آ جا رہا تھا مگر لڑکی اور اس کے ساتھ آنے والا اٹینڈنٹ غائب تھے۔ ولسن جانتا تھا یہ فلور ملازمین کے لیے مخصوص تھا اس لیے وہ لازمی کسی کمرے میں موجود تھے۔ وہ راہداریوں میں سن گن لیتا ہوا چل رہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے بیج نمودار ہوا وہ غصے میں تھا۔ ولسن اسے دیکھ کر تیزی سے آگے آیا اور اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"وہ نام نہاد پولیس آفیسر میرے کمرے میں گھس آیا ہے۔" بیج نے ولسن کو دیکھ کر شکایتی انداز میں کہا۔

"لڑکی کہاں ہے؟"

"وہ بھی وہیں ہے۔" بیج نے کہا۔ "یہ میرا کمرا ہے اسے کیا اختیار ہے کہ وہ مجھے وہاں سے نکال دے۔"

"تم نے کسی کو بتایا تو نہیں ہے؟"

"ابھی تو نہیں بتایا لیکن میں اسے..."

"میرے ساتھ آؤ۔" ولسن اسے لے کر اس کے کمرے تک آیا۔ کارڈ کی مدد سے دروازہ کھول کر بیج آگے آیا، ولسن اس کے پیچھے تھا۔ اس نے سائلنسر والا پستول نکال لیا اور اندر آتے ہی واش روم کا دروازہ... کھول کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا جب کہ کمرے میں پہلے ہی کوئی نہیں تھا۔ بیج کہہ رہا تھا۔

"وہ یہیں تھے۔" کہتے ہوئے وہ گھوما اور اس کی نظر سائلنسر لگے پستول پر گئی اور وہ رک گیا۔ "یہ سائلنسر ہے نا؟"

"ہاں۔" کہتے ہوئے ولسن نے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

☆☆☆

جارج اور این زیر تعمیر اسکائی اسکر یپر کے آخری فلور کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ این جارج کو بتا رہی تھی۔ ”پچھلے ایک سال سے ہمارے پاس بیل میزائل کی ٹیسٹنگ کی رپورٹس چیک ہو رہی ہیں۔ مجھے شبہ تھا کہ اس میزائل کے بارے میں جو بتایا جا رہا ہے اس میں صداقت نہیں ہے۔ خاص طور سے اس کے آخری دو ٹیسٹ ناکام رہے لیکن جان والٹر کی کمپنی کی طرف سے دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ دونوں ٹیسٹ کامیاب رہے۔ میں نے اس ٹیسٹ کی ویڈیوز کا جب الٹرا وائلٹ چیک کیا تو اس میں صاف پتا چل رہا ہے کہ میزائل نشانے کو ہٹ کرنے سے پہلے تباہ ہو گیا تھا اور نشانہ خود بھی بلاسٹ ہوا تھا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”سمجھ رہا ہوں۔“ جارج نے بدمزگی سے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ جان والٹر بے ایمان شخص ہے۔“

”لیکن حالات ثابت کر رہے ہیں کہ اس کی کمپنی ایک بہت بڑے دفاعی معاہدے میں دھوکے سے کام لے رہی ہے۔ تم اس بارے میں کیا کہو گے۔ میں یہاں جم کرسٹن کو اسی دھوکے کے ثبوت دینے آئی تھی اور اسے قتل کر دیا گیا۔“

جارج نے گہری سانس لی۔ ”تم میرا دماغ خراب کر رہی ہو۔“

”ایک بات اور ہے، میں نے پولیس سیکیورٹی انچارج ولسن ٹیلر کو جان والٹر کے ساتھ دیکھا تھا۔“

”یہ کوئی اہم بات نہیں ہے جان والٹر اس جگہ کا مالک ہے اور ولسن سیکیورٹی انچارج ہے۔“

”میں نے ان دونوں کو اس جگہ دیکھا تھا جہاں سے قاتل نے چھپ کر جم پر گولیاں چلائی تھیں۔ میں نے خود قاتل کو بوتھ کا شیشہ توڑ کر باہر گرتے دیکھا تھا۔“

”اسے ولسن نے شوٹ کر دیا تھا۔“ جارج نے کہا۔

”سنو میں کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتی مجھے یقین ہے قاتل اب میری تلاش میں ہوں گے جب انہیں یہ پتا تھا کہ میں جم کرسٹن سے ملنے آ رہی ہوں تو انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ انہوں نے امریکا کے ڈیفنس سیکریٹری کو قتل کر دیا اور اب وہ یقیناً مجھے بھی مارنا چاہتے ہوں گے پلیز کسی طریقے سے مجھے یہاں سے نکال دو۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا تم عینی گواہ ہو۔“ جارج نے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ میں تمہیں ایک جگہ محفوظ کر دیتا ہوں۔“

جارج این کو ایک زیر تعمیر کمرے تک لایا اور دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا۔ ”اسے اندر سے بند کر لو میری آواز سنے بغیر مت کھولنا۔“

”میری بات سنو...“ این نے کہنا چاہا لیکن جارج نے دروازہ بند کر کے اسے باہر سے بند کر دیا اور ایرینا کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

کچھ ہی دور جان والٹر کے دفتر میں جان کے ساتھ ولسن موجود تھا۔ جان والٹر غصے میں تھا، اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”یہ تھا تمہارا فول پروف پلان... اس میں دو غیر متعلقہ افراد مر چکے ہیں اور تم مزید ایک لڑکی کے قتل کی بات کر رہے ہو جو محکمۂ دفاع کی ملازم ہے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ ولسن نے کہا۔ ”اصل کام ہو گیا ہے۔ ایرینا اور کیسینو سے باہر جانے کے تمام راستے بند ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ لڑکی کس کے ساتھ ہے بس یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں ہے؟“

”لڑکی کس کے ساتھ ہے؟“

”ہومی سائڈ پولیس آفیسر جارج بیل کے ساتھ... وہ میرا اکیڈمی کے زمانے کا دوست ہے۔“

جان والٹر نے سر تھام لیا۔ ”ایک قتل اور وہ بھی پولیس آفیسر کا... تم مجھے کس دلدل میں پھنسا رہے ہو۔ تم جانتے ہو اگر بیل میزائل کا ٹھیکا مجھے نہ ملا تو یہ اسکائی اسکر یپر کبھی تعمیر نہیں ہو سکے گا اور اس میں جو تمہارے شیئرز ہیں وہ بھی کار آمد نہیں ہوں گے۔“

”ایسا نہیں ہو گا میں یہ سب اسی لیے تو کر رہا ہوں۔“ ولسن نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف تمہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنے آیا تھا۔“

☆☆☆

جارج ایک بار پھر کنٹرول روم میں تھا، اس نے پال سے مطالبہ کیا کہ کسی کیمرے میں اگر گولی چلانے کا منظر ریکارڈ ہوا تو وہ اسے چلا کر دکھائے مگر بدقسمتی سے کسی کیمرے نے یہ منظر ریکارڈ نہیں کیا تھا البتہ وہ کیمرا جو جم کرسٹن والی طرف سے فائٹ شوٹ کر رہا تھا اس نے کچھ سین ریکارڈ کیے تھے۔ لیکن اس میں درمیان میں جانس اور گیری بھی تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر مکے چلا رہے تھے۔ یہ گولی چلنے سے کچھ دیر پہلے کا واقعہ تھا۔ پھر گیری نے ایک زوردار مکا جانس کو رسید کیا اور وہ گر گیا۔ جارج اچھل پڑا تھا۔ اس نے پال سے کہا۔ ”ایک منٹ اس منظر کو پھر سلو موشن میں دکھاؤ۔“

پال نے سلو موشن میں چلایا اور اس بار صاف دکھائی دیا۔ جس مکے نے جانس کو ناک آؤٹ کیا تھا وہ اس کے منہ پر لگا ہی نہیں تھا بلکہ پاس سے گزر گیا تھا۔ پال نے بھی نوٹ کیا۔ ”یہ مکا تو اسے لگا ہی نہیں۔“

”اور یہ ناک آؤٹ ہو گیا۔“ جارج دم بہ خود تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جانس ایسی حرکت کرے گا۔ یہ تو صاف بے ایمانی اور دھوکے بازی تھی وہ جان بوجھ کر ہارا تھا۔ پال نے رِنگ کے عین اوپر لگے کیمرے کی ویڈیو چلائی اور اس سے مزید صاف ہو گیا کہ گیری کا ہاتھ جانس کے چہرے سے کم سے کم دو انچ کے فاصلے سے گزرا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور بہ ظاہر بے ہوش ہو گیا۔ جب کہ وہ بھوں پھاڑنے والے مکے پر بھی بے ہوش نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

جارج تیز قدموں سے ڈریسنگ روم ایریا میں داخل ہوا۔ گیری کے ڈریسنگ روم سے ہاؤ ہو کی آوازیں آ رہی تھیں نیم وا دروازے سے جارج نے دیکھا کم سے کم نصف درجن حسیناؤں نے گیری کو گھیر رکھا تھا اور اس کے ساتھی پینے اور رقص کرنے میں مصروف تھے۔ یہ فاتح کا ڈریسنگ روم تھا۔ اس کے برعکس جانس کے ڈریسنگ روم میں قبرستان کا سا سناٹا تھا۔ اس بار بھی پیلے کوٹ والے نے اسے روکنا چاہا تو جارج نے اسے کاٹ دار نظروں سے دیکھا اور اپنا بیج دکھاتے ہوئے بولا۔ ”ہاتھ ہٹا لو یہ پولیس کا معاملہ ہے۔“

پیلے کوٹ والا شرافت سے پیچھے ہو گیا۔ اندر جانس بار کے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا پی رہا تھا گویا غم غلط کر رہا تھا۔ منیجر کیلون حسب معمول پریشان انداز میں ٹہل رہا تھا۔ چار پانچ ساتھی ادھر ادھر پڑے تھے۔ جانس نے اسے دیکھا اور گہری سانس لی۔ ”جارج تم کس لیے آئے ہو؟“

”میں تمہاری ہمت اور بہادری کی داد دینے آیا ہوں۔“ وہ اس کے برابر والے اسٹول پر آ گیا۔ اس نے دوسرا گلاس کھینچا اور اس میں برانڈی انڈیلی۔ ”تم نے بہت خوبی سے گیری کا مقابلہ کیا... اس نے تمہاری بھوں پھاڑ دی لیکن تم نہیں گرے اور جانس تم اس وقت گر گئے جب اس کا گھونسا تمہیں لگا ہی نہیں تھا... نہیں... نہیں میری طرف ایسے مت دیکھو مجھے نشہ نہیں ہوا ہے... چلو میں نشے میں ہوں لیکن یہ منظر ریکارڈ کرنے والے کئی کیمرے تو نشے میں نہیں تھے۔“

کیلون تیزی سے آگے آیا۔ ”جانس تم خاموش رہو گے... اگر یہ معاملہ اٹھا تو ہم دیکھ لیں گے۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ کون یہ معاملہ دیکھے گا اور جانس کے خلاف کیا ایکشن لیا جائے گا۔“ جارج نے کہا۔ ”بات اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے... سیکریٹری دفاع پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔“

”وہ مر گیا ہے؟“ جانس نے سوال کیا۔

”اگر وہ نہیں مرا ہے تب بھی اس سے معاملے کی سنگینی میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔“

”میرے سوال کا جواب دو کیا وہ مر گیا ہے؟“

جارج نے سر ہلایا۔ ”اسے تقریباً پکا سمجھو... قاتل نے بالکل درست جگہ گولی ماری تھی۔“

”جانس تم چپ رہو گے ہمارا وکیل بات کرے گا۔“ کیلون نے پھر ٹانگ اڑائی۔

”مجھے بات کرنے دو۔“ جانس نے دہاڑ کر کہا۔ ”تم سب یہاں سے دفع ہو جاؤ... سب کے سب اور فوراً۔“

کیلون اور دوسرے جانتے تھے کہ جانس کس لہجے میں بات کرے تو اس کی بات پر فوراً عمل کرنا چاہیے۔ سب ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے۔ جارج نے جانس کی طرف دیکھا۔ ”اب تم کھل جاؤ... یہ کیا چکر ہے؟“

”چکر میں نہیں جانتا۔“ جانس نے اپنا زخم چھوا۔ ”لیکن مجھے کہا گیا کہ میں پہلے راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہو جاؤں۔“

”تم یہ بات ماننے پر کیوں آمادہ ہوئے؟“

جانس ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ”مجھے دس ملین ڈالرز، اگلی چیلنجنگ فائٹ اور اس میں ٹائٹل ملے گا۔“

”ایسے ہی جیسے تم ہارے ہو؟“ جارج کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کھیل میں اتنے اونچے پیمانے پر دھاندلی ہوتی ہے۔

”بالکل... اور کیسے یقین دلایا جا سکتا ہے۔“

”یہ پیشکش کس نے کی؟“

جانس نے بدمزگی سے اسے دیکھا۔ ”تم بچوں کی سی بات کر رہے ہو اس فائٹ کا پروموٹر کون ہے؟“

”جان والٹر۔“ جارج نے کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم تھا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش آنے والا ہے؟“

”تم پھر احمقانہ باتیں کر رہے ہو بھلا مجھے کون بتائے گا اور کیوں بتائے گا۔“

جارج ڈریسنگ روم سے باہر نکل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج وہ مسلسل بے وقوف بن رہا ہے۔ اس کے تمام

ہیروز اور پسندیدہ افراد بالآخر ولن ثابت ہو رہے تھے۔ وہ ایرینا کی سیڑھیوں پر آیا تب اس نے دوسری طرف اسی آنکھ نما غبارے کو دیکھا۔ وہ دوبارہ کنٹرول روم میں آیا۔ اس نے پال سے آنکھ نما غبارے کے بارے میں پوچھا۔ ”یہ کیا بلا ہے؟“

”یہ ٹی وی چینل کا کیمرا ہے۔ اس میں ہیلیم گیس بھری ہے اور اس کی آنکھ کی پتلی میں ایک وائڈ اینگل کیمرا نصب ہے۔ کبھی کبھی پورا ایرینا دکھانا ہوتا ہے تو اس کیمرے کی مدد لی جاتی ہے۔“

”اس کی ویڈیو کہاں ہوگی؟“

”وہ کوریج کرنے والے ٹی وی چینل کے آفس میں ہوگی مگر تمہیں شاید ہی کوئی مدد مل سکے کیونکہ باہر طوفان آیا ہوا تھا اور اس کیمرے نے مشکل سے ہی کوئی کام کی چیز ریکارڈ کی ہوگی۔“

”اس کا دفتر کہاں ہے؟“

”زیرِ تعمیر اسکائی اسکریپر میں ہے۔ شاید دوسرے فلور پر ہے۔“

جارج زیرِ تعمیر اسکائی اسکریپر کے دوسرے فلور پر آیا۔ یہاں ٹی وی چینل کا دفتر کچھ اس طرح تھا کہ وہ تھا تو پہلے فلور پر مگر اس کا راستہ دوسرے فلور سے تھا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آنا پڑتا تھا۔ اس وقت وہاں ایک لمبے بالوں والا نوجوان مشینوں کے ساتھ مصروفِ عمل تھا۔ جارج نے اسے اپنا بیج دکھایا اور بولا۔ ”مجھے تمہارے آنکھ نما کیمرے کی ریکارڈنگ درکار ہے۔ اس وقت کی جب ایرینا میں شوٹنگ کا واقعہ پیش آیا۔“

نوجوان نے بھی وہی بات کی۔ ”اس کی ریکارڈنگ استعمال ہی نہیں کی گئی کیونکہ تمام وقت کیمرا ڈولتا رہا تھا۔ بہر حال ریکارڈنگ موجود ہے۔“

اس وقت اسی ٹی وی چینل سے لائیو جان والٹر کا اظہارِ دکھ آ رہا تھا جو وہ اپنے بہترین دوست جم کرسٹن کی موت پر کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ قتل امریکا کے دفاعی پروگرام کے خلاف ایک سازش تھی۔ اس کا مقصد بل میزائل کو دفاعی نظام میں شامل ہونے سے روکنا تھا۔ کیونکہ جم کرسٹن اس میزائل کا زبردست حامی تھا، اس لیے اسے قتل کر دیا گیا۔ جان والٹر نے عزم ظاہر کیا کہ جم کرسٹن کی قربانی رائگاں نہیں جائے گی اور یہ میزائل ضرور دفاعی نظام کا حصہ بنے گا۔ جارج ٹی وی دیکھ رہا تھا اتنی دیر میں نوجوان نے ویڈیو کا مذکورہ حصہ نکال لیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹی وی سسٹم تھا جس پر ویڈیو دکھائی جاسکتی تھی۔ اس نے ویڈیو چلا کر جارج کو متوجہ کیا اور اسے ریموٹ تھما دیا۔ جارج نے ریموٹ سے ویڈیو روک دی اور نوجوان سے کہا۔

”میں اسے اکیلے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

نوجوان نے شانے اچکائے اور سیڑھیاں چڑھ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جارج نے ویڈیو دوبارہ چلائی۔ یہ ذرا مشکل ویڈیو تھی کیونکہ وائڈ اینگل کی وجہ سے منظر واضح نہیں تھا۔ مگر وہ سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں جن کے ذرا اوپر چڑھنے سے شیشے کے بوتھ آ جاتے تھے۔ کیمرا مستقل حرکت میں تھا۔ کنکریٹ کی دو پتلی دیواروں کے درمیان خلا تھا جس کے آخری حصے کو رنگین شیشے لگا کر بند کیا گیا تھا مگر نیچے سے یہ کھلے ہوئے تھے۔ قاتل نیچے سے اندر گھسا اور اس نے ایک شیشہ توڑ کر دو فائر کیے۔ ایک بار کیمرا جھوم کر اس طرف آیا تو ویڈیو میں ولسن ایک سرخ بالوں والی عورت کے ساتھ نظر آ رہا تھا مگر عورت کا چہرہ واضح نہیں تھا پھر اچانک ولسن پستول نکال کر اوپر بڑھا اور اس نے بوتھ پر فائرنگ کی، آگے سے سارے شیشے چھناکے سے ٹوٹے اور مردہ حملہ آور رائفل سمیت سامنے گرا۔ یہ بس اتنا سین تھا اس کے بعد آئی کیمرا وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ جارج نے ویڈیو کو ریوائنڈ کیا وہ اس منظر کو پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ اچانک اسے لگا کوئی عقب میں ہے اس نے مڑ کر دیکھا۔ سیڑھیوں کے ساتھ ولسن کھڑا تھا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم اتنے تیز نکلو گے۔“

”وِل یہ سب کیا ہے؟“

”جو تم دیکھ رہے ہو اور جو تم سمجھ رہے ہو۔“ وہ آگے آیا اور اس نے ریموٹ سے ٹی وی آن کر دیا جس پر ایک بار پھر جان والٹر کا تعزیتی بیان آ رہا تھا۔ جارج نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے تم جم کرسٹن کے قتل میں ملوث ہو۔“

”میرے دوست یہ ضروری تھا کیونکہ وہ بل میزائل پروجیکٹ میں رکاوٹ بننے والا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ بھی درست ہے بل میزائل اتنا باصلاحیت نہیں ہے جتنا ظاہر کیا جا تا رہا ہے۔“

”لازمی بات ہے۔“ ولسن نے شانے اچکائے۔ ”لیکن مسئلہ یہ ہے اس پر جان والٹر کی کمپنی بہت بھاری سرمایہ کاری کر چکی ہے اور اگر یہ میزائل فروخت نہیں ہوا تو جان والٹر دیوالیا ہو جائے گا۔“

”تم اس کے ساتھ کیوں...؟“

”دولت کے لیے۔“ ولسن نے کہا۔ ”میں تیس چالیس سال ملازمت کروں اور اس کے بعد مجھے کیا ملے گا بس چند لاکھ ڈالرز اور میں گھر بھیج دیا جاؤں گا اس وقت یہ چند لاکھ ڈالرز میرے کس کام کے ہوں گے۔ مجھے ابھی دولت چاہیے اور چند لاکھ ڈالرز سے کہیں زیادہ چاہیے۔“ ولسن بولنے کے ساتھ ریکارڈنگ بھی ضائع کر رہا تھا۔ جارج نے اسے روکنا چاہا تو اس نے پستول اس پر تان لیا۔ ”نہیں دوست، مجھے مجبور نہ کرو کہ میں دوستی بھول جاؤں۔“

جارج رک گیا ولسن نے ساری ریکارڈنگ ضائع کر دی اور پھر اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ زیرِ تعمیر اسکائی اسکریپر کے ایک حصے میں تھے۔ ولسن نے کہا۔ ”جارج یہ بہت اونچے درجے کا معاملہ ہے اس میں، میں اور تم چھوٹے لوگ ہیں۔ ہم ان کے خلاف نہیں جاسکتے ہیں۔“

”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں تمہارا دوست ہوں اور میں چاہتا ہوں تم زندہ رہو۔ اس کی صرف ایک صورت ہے کہ تم ہم سے مل جاؤ۔ اس کے بدلے تم جو چاہو گے وہ تمہیں ملے گا۔“

”مثلاً؟“

”لاکھ ڈالرز... پانچ لاکھ ڈالرز... دس لاکھ ڈالرز... جو تم مانگو۔“

”اور اس کے بدلے مجھے کیا کرنا ہوگا منہ بند رکھنا ہوگا؟“

”وہ لڑکی ایک خطرہ ہے اسے ختم کرنا ہے۔“

جارج نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔“

”تمہیں قتل نہیں کرنا ہے تم صرف اتنا بتا دو کہ وہ کہاں ہے؟“

جارج نے چونک کر اسے دیکھا، اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئی تھیں، اس نے کہا۔ ”وِل اگر تمہیں اس لڑکی کی تلاش نہ ہوتی تو کیا تم تب بھی مجھے لالچ دے کر اپنے ساتھ شامل کرنے کی بات کرتے؟“

ولسن کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ ”جارج تم سچ مچ بہت ذہین ہو۔ اوکے میں ایسی پیشکش نہیں کرتا لیکن اس وقت میں سنجیدہ ہوں۔ اگر تم ہمارا ساتھ دو گے تو زندہ رہو گے اور دولت مند بھی بن جاؤ گے۔ تمہاری بیوی صرف اس لیے تمہیں چھوڑ گئی کہ تمہارے پاس دولت نہیں تھی۔“

جارج کے چہرے پر پرچھائیاں آئی تھیں۔ مگر وہ خاموش رہا۔ ولسن نے اسے دیکھا اور گہری سانس لی۔ ”تو تم اس طرح نہیں مانو گے۔“

ولسن کے واکی ٹاکی سے آواز آئی۔ ”سر یہاں بیس منٹ میں دو لاشیں موجود ہیں۔ ایک مرد اور ایک عورت ہے۔“

”لعنت ہو۔“ ولسن نے زیرِ لب کہا اور واکی ٹاکی کا بٹن دبا کر بولا۔ ”میں آ رہا ہوں۔“

”دو لاشیں۔“ جارج نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”ایک مرد اور ایک عورت... میرا خیال ہے عورت وہی سرخ بالوں والی ہوگی۔“

ولسن نے دانت پیسے۔ ”تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

چند منٹ بعد وہاں جانس اور ولسن کے کچھ ساتھی آ گئے جو اس کھیل میں شامل تھے۔ ولسن نے جارج کو جانس کے سپرد کیا۔ ”جب تک میں واپس آؤں اس سے لڑکی کا پتا اگلواؤ۔ میں ناکامی کا سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

ولسن نیچے تہ خانے میں آیا جہاں اس کے دونوں شکاروں کی لاشیں دریافت ہوگئی تھیں مگر وہ مطمئن تھا کوئی ان لاشوں سے اس کا تعلق ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جو پستول استعمال کیا تھا اس کا کہیں ریکارڈ نہیں تھا۔ اس نے ضروری کارروائی کے بعد لاشیں اٹھوانے کی ہدایت کی اور خود ایرینا میں آیا۔ یہ بھی اس کی ذمے داری تھی۔ جارج کے ایک نائب نے اس سے جارج کے بارے میں پوچھا تو ولسن نے درشت لہجے میں کہا۔ ”میں نہیں جانتا۔“

وہ واپس جارج کی طرف آیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک جارج زبان کھول چکا ہوگا۔ جب وہ اندر آیا جانس اسے پیٹ میں مکے رسید کر رہا تھا اور جارج کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ اس کی ایک آنکھ سوج کر بند ہوگئی تھی۔ دائیں طرف سے شاید جبڑا بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اس لیے جارج سے ٹھیک

سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ولسن کو دیکھ کر جانس نے جارج کو آخری مکا مار کر چھوڑ دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے رکھی سیمنٹ کی بوریوں پر جا گرا۔ جانس نے ولسن سے کہا۔ ”یہ مجھ سے کیا کرا رہے ہو؟ میں اسپورٹس مین ہوں جلاد نہیں ہوں۔“

”بکواس مت کرو۔“ ولسن نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اس وقت جان والٹر کی ساکھ اور زندگی، میری ملازمت اور تمہاری اسپورٹ سب داؤ پر لگی ہوئی ہے اگر وہ لڑکی نہ ملی تو ہم سب مارے جائیں گے۔ تم اب تک اس کی زبان نہیں کھلوا سکے ہو۔“

جانس نے جھنا کر کہا۔ ”اس کا حال دیکھ رہے ہو؟ اس کا جبڑہ اور تین پسلیاں ٹوٹ چکی ہیں۔“

جارج بڑی مشکل سے لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اس نے عجیب سی آواز میں ہنستے ہوئے جانس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ اسپورٹس مین... جیسے تم پولیس مین...“

”خدا کے لیے میں پہلے ہی بہت مشکل میں ہوں۔“ جانس نے کہا اور ایک گھونسا اور مارا تو جارج پلٹ کر گرا اور ساکت ہو گیا۔ ولسن نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”یہ اس طرح زبان نہیں کھولے گا چاہے تم اس کی ساری ہڈیاں کیوں نہ توڑ دو... مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔“

☆☆☆

جارج کو ہوش آیا تو وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا تھا۔ منہ پیٹ اور پسلیاں ایسی دکھ رہی تھیں کہ اس کے لیے سانس لینا بھی عذاب سے کم نہیں تھا۔ اس نے کھلنے والی واحد آنکھ کھولی اور آس پاس دیکھا۔ وہ وہیں پڑا تھا جہاں آخری بار گرا تھا لیکن اس وقت یہاں کوئی نہیں تھا البتہ کچھ دور ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ولسن کے گرگے رسیوں کی مدد سے کوئی چیز اوپر کھینچ رہے تھے۔ جارج بڑی مشکل سے اٹھا اور اس کے منہ سے بے ساختہ کراہیں نکلی تھیں مگر باہر شور تھا اس لیے وہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے تھے۔ وہ سیدھا ہوا تو اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ وہ جھکے جھکے ہی چل پڑا۔ اس کا رخ اسکائی اسکریپر کے اس حصے کی طرف تھا جہاں اس نے این کو چھوڑا تھا۔ اس کے خیال میں یہ موقع اچھا تھا، اگر وہ این کو آزاد کر دیتا تو وہ پولیس سے رابطہ کر سکتی تھی۔ وہ اس ہال سے باہر آیا تو ایک طرف پردے کے پیچھے موجود ولسن باہر آ گیا اور وہ اب جارج کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اس طرح نہیں بتائے گا۔ جارج بہت مشکل سے رک رک کر چل رہا تھا اور اس کے منہ سے بے ساختہ کراہیں اور چیخیں نکل رہی تھیں۔

جارج ایک راہداری میں آیا۔ چند لمحے تک وہ سوچتا رہا۔ کیا یہی وہ راہداری تھی جو اس حصے تک جاتی تھی۔ شاید تکلیف نے اس کی یادداشت کو بھی متاثر کیا تھا، کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ پھر آگے بڑھنے لگا۔ زیر تعمیر ہونے کی وجہ سے اور کوئی نشان دہی نہ ہونے کی وجہ سے سب حصے ایک جیسے لگ رہے تھے۔ ویسے بھی وہ این کے ساتھ ہوٹل سے نکل کر عقبی سیڑھیوں سے نیچے آئے تھے، اس لیے اسے براہ راست وہاں تک پہنچنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دیواروں کا سہارا لے رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ اس حصے میں آ نکلا جس کے ایک کمرے میں این قید تھی۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور عقب میں کھلی جگہ تھی جہاں سے رات کی تاریکی جھلک رہی تھی۔ موسم خراب تھا۔ ہری کین کی آمد آمد تھی اور بہت تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ اچانک بجلی چمکی اور راہداری روشن ہو گئی اور تب جارج نے دیکھا سامنے دیوار پر اس کے ساتھ ایک سایا اور بنا تھا۔ ابھی تک وہ این کو آوازیں دے رہا تھا۔ مگر دوسرا سایا دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ولسن کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں سائلنسر والا پستول تھا۔ وہ مسکرایا۔

”جارج لڑکی یہیں ہے؟“

”لیکن تم اس تک نہیں پہنچ سکتے۔“ جارج نے بلند آواز اور بگڑے لہجے میں کہا۔

”میں پہنچ گیا ہوں وہ یقیناً یہیں ہے۔“

جارج الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا اور اس دروازے کے قریب ہو رہا تھا جس کے پیچھے این موجود تھی مگر وہ ولسن کو تاثر دے رہا تھا جیسے وہ اس سے ڈر کر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ ”اگر وہ... ہے تو اسے... تلاش کر لو۔“

”جارج اب بھی وقت ہے تم مان جاؤ... میں جان سے منہ مانگی قیمت منظور کروا لوں گا۔“

”اب بہت دیر ہو گئی ہے دوست۔“ جارج پیچھے ہٹتا رہا۔ ”ہمارے راستے اسی وقت الگ ہو گئے تھے جب تم نے اپنے پیشے کو فروخت کیا تھا۔“

”تب خدا حافظ جارج۔“ ولسن نے پستول سیدھا کیا۔ ”لڑکی کو میں خود تلاش کر لوں گا۔“

”وہ یہاں نہیں ہے وہ اس طرف ہے۔“ جارج نے سر سے دائیں طرف پیچھے اشارہ کیا تو ولسن نے بے ساختہ عقب میں دیکھا اور جارج نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازے کے ساتھ ہی وہ اندر گیا تھا اور جب تک ولسن اس کی طرف متوجہ ہوتا وہ اندر سے بند کر کے اسے لاک کر چکا

تھا۔ ولسن نے لگاتار کئی فائر کیے اور گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی جارج کے آس پاس سے گزری تھیں۔ این جو ایک کونے میں دبکی ہوئی تھی اس نے چیخ ماری۔ پھر وہ تیزی سے جارج کی طرف آئی۔

”تمہیں کیا ہوا؟“

”یہاں سے نکلو وہ آ گیا تو ہم دونوں مارے جائیں گے۔“ جارج نے بہ مشکل کہا۔

”ہم کہاں جائیں؟“ این ہراساں تھی۔ وہ کبھی ایسے حالات سے نہیں گزری تھی۔ یہ بہت بڑا کمرا تھا۔ اس کے ایک طرف دیوار کے ساتھ پلاسٹک پائپس کھڑے تھے۔ بجلی چمکی تو ان کے عقب سے چمک زیادہ ہی آئی تھی۔ جارج اس طرف بڑھا اس نے دھکے دے کر پائپ گرانا شروع کر دیے۔ ذرا دیر میں پائپوں کے پیچھے چھپا ہوا دروازہ نمودار ہوا اس کے اوپری حصے میں جالی لگی تھی۔ اس دوران میں ولسن دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جارج کی حالت دیکھتے ہوئے این نے خود دروازہ کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ عرصے سے بند پڑے رہنے کی وجہ سے وہ جام ہو رہا تھا۔ ولسن لاک کھولنے میں ناکامی کے بعد اب اسے فائر کر کے توڑ رہا تھا۔ این سسکیاں لے رہی تھی اور اپنی پوری جسمانی توانائی لگا رہی تھی۔ جارج نے بھی اس کا ساتھ دیا اور ایک دھماکے سے دروازہ کھلا۔ تیز ہوا کے ساتھ پانی کی بوچھاڑ بھی اندر آئی تھی۔ اسی لمحے ولسن لاک توڑنے میں کامیاب رہا۔

جیسے ہی ولسن اندر داخل ہوا جارج این کو دھکیلتا ہوا باہر نکل گیا اور ولسن کی چلائی گولی دروازے پر لگی تھی۔ جارج اور این باہر سڑک پر گرے تھے۔ یہ اصل میں اسکائی اسکریپر کا حصہ تھا لیکن فی الحال اسے سڑک کی صورت دی گئی تھی تاکہ تعمیراتی سامان لایا جا سکے اور وہاں ایک پولیس ٹرک موجود تھا۔ اس کے ڈرائیونگ کے خانے میں دو پولیس والے موجود تھے اور کھا پی رہے تھے۔ ایک مرد اور عورت کو اس طرح باہر آتے دیکھ کر وہ مستعد ہو گئے اور جیسے ہی ولسن ہتھیار بدست باہر آیا تو ان دونوں نے اپنے پستول نکال لیے تھے اور چلا چلا کر ولسن کو پستول پھینکنے کا کہنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”اپنا ہتھیار پھینک دو ورنہ ہم شوٹ کر دیں گے؟“

ولسن نے بے ساختہ ہاتھ بلند کر لیے مگر اس نے پستول نہیں پھینکا تھا۔ اس نے اعتماد سے کہا۔ ”تم سرکاری کام میں مداخلت کر رہے ہو... یہ دونوں مجرم ہیں... یہ لڑکی... یہ قاتل ہے اور بہت بڑا خطرہ ہے۔“

”تم پستول پھینک دو۔“ ٹرک والے نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ جارج زمین پر پڑا ہوا تھا اس نے این کو کور کر لیا تھا جو اس کے سینے میں خود کو چھپائے چڑیا کی طرح کانپ رہی تھی۔ اچانک جارج نے عقب میں دیکھا اسے آئی کیمرا سڑک پر گرا نظر آیا۔ تیز ہواؤں نے اسے گرا دیا تھا اور اس کی آنکھ یعنی کیمرے کا رخ ان کی طرف تھا۔ اس نے ولسن سے کہا۔

”اب کوئی فائدہ نہیں ہے سب ریکارڈ ہو گیا ذرا پلٹ کر دیکھو۔“

ولسن نے پلٹ کر آئی کیمرے کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پولیس والے بہ دستور چلا رہے تھے کہ وہ ہتھیار پھینک دے مگر وہ دروازے کی طرف پلٹ گیا جیسے واپس اندر جانا چاہ رہا ہو مگر اچانک اس نے خود کو شوٹ کر لیا۔ گولی اس کے سینے میں سوراخ کرتی اس کی پشت سے نکل گئی تھی اور وہ زمین پر گر کر ساکت ہو گیا تھا۔ دونوں پولیس والے ٹرک سے باہر آ گئے تھے۔ انہوں نے ولسن کو چیک کیا مگر اس نے دم توڑ دیا تھا۔ جارج نے اپنا بیج دکھایا تو وہ تیزی سے حرکت میں آئے تھے۔ آدھے گھنٹے میں پولیس نے جان والٹر کو جم کرسٹن کو قتل کرنے کی سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ ولسن مر گیا تھا مگر اس کے ساتھی اور جانس بھی مع اپنے منیجر کیلون کے گرفتار ہوا تھا۔ وہ دونوں اس سازش میں پوری طرح شامل تھے۔ وہ فوری طور پر وعدہ معاف گواہ بن گئے تھے اور انہوں نے پوری کہانی اگل دی تھی۔

اگلے روز میڈیا نے پوری کہانی شائع کی تھی۔ جم کرسٹن مشکوک ہو گیا تھا اور وہ اپنے طور پر بھی ببل میزائل کے خلاف تحقیق کر رہا تھا۔ اگر این اسے رابطہ کر کے ثبوت نہ دیتی تب بھی وہ معاملے کی تہ تک پہنچ جاتا مگر اس سے پہلے اسے قتل کر دیا گیا۔ جان والٹر کے ببل میزائل کے پروجیکٹ کو بلیک لسٹ کرتے ہوئے وفاقی حکومت نے وسیع پیمانے پر اس کی تحقیقات شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ جارج کو دو دن اسپتال میں گزارنا پڑے اور پھر اسے گھر جانے کی اجازت ملی تھی۔ اس کا جبڑا اور زخم ٹھیک ہونے میں ایک ہفتے سے زیادہ لگا تھا۔ ایک مہینے بعد جب جان والٹر اور دوسرے مجرم عدالت میں پیش کیے جا چکے تھے تو جارج کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد ہوا جس میں اسے خصوصی شیلڈ سے نوازا گیا تھا۔

پسِ زنداں

طاہر جاوید مغل

دوسرا حصہ

عکس منظر کا ہو یا پس منظر کا، بعض اوقات اتنا پُرکشش ہوتا ہے کہ سوچ کے انداز بدل جاتے ہیں مگر... یہ بھی حقیقت ہے کہ عکس بن کر تعاقب کرنے والے کبھی سائے کی ٹھنڈک نہیں دیتے۔ ان سے تنہائی دور ہوتی ہے اور نہ ہی اذیتوں میں کمی آتی ہے۔ ایسے میں جب ہجر کا موسم طاری ہو اور پل پل دل پر بھاری ہو تو ان بھید بھرے لمحات میں کوئی دریافت کرتا ہے یا کسی کو برباد کرتا ہے۔ لیکن اس کا شمار دریافت کرنے اور تسخیر کرنے والوں میں ہوتا تھا کیونکہ اسے کٹھن کام کا جنون تھا جبکہ کسی انسان کو سمجھنا شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور اگر وہ انسان عورت ہو جو پہیلی بن کر جستجو بھڑکاتی ہے اور جو لفظوں میں بند ہو کر کتاب کی صورت کسی کے من میں گھر کر جائے تو کیسے ورق ورق کر کے لفظ بہ لفظ اسے کھوجنے کی لگن اس میں پیدا نہ ہو... مگر ایسا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب آپ کی سوچ کے زنداں میں کوئی قید ہو جائے... وہ بھی منظر اور پس منظر کے درمیان الجھ گیا تھا... جو کچھ اس نے دیکھا اس کی تہ میں اترنا چاہتا تھا مگر... حدود و قیود کا حامی آگے بڑھنے سے قاصر تھا۔ ایسے میں بے بسی نے اسے آنسوؤں کے سمندر میں دھکیل دیا جہاں وہ تنکا تنکا بہتا رہا اور وحشتوں کے طوفان اسے اپنے گھیرے میں لیتے رہے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ چڑھنے والا سورج اپنے دامن میں کیا کچھ سمیٹ لایا ہے۔ بالآخر پتھر سے ٹکراتے ٹکراتے اسے یہ ادراک ہوا کہ جہاں عمل ہے وہاں کہیں ردِ عمل بھی چھپا ہوا ہے... بس اسی فراست نے اسے مطمئن کر دیا... یہ اور بات کہ اس اطمینان نے بہت سوں کا چین برباد کر ڈالا تھا۔

دیارِ غیر میں اپنوں سے دور کسی اپنے کی
تلاش میں سرگرداں محبتوں کی کرم
فرمائیاں اور رقیبوں کی
عنایتوں کی
داستان

فیاض صاحب اپنے موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگے، لیکن پھر کرتے کرتے رک گئے۔ سامنے تپائی پر مٹھائی کا ڈبا پڑا تھا۔ اب یہ بات ہادی کی سمجھ میں آرہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے کھائی جانے والی مٹھائی اسی ”خوشی“ کے سلسلے میں تھی جس کا ذکر ابھی فیاض صاحب نے کیا تھا۔

دو چار منٹ بعد خالہ صوفیہ اور فیصل کمرے میں واپس آگئے۔ دونوں ابھی تک پریشان تھے۔ خالہ صوفیہ نے کہا۔

”حجاب کی سہیلی عمیرہ کا فون تھا۔ بتا رہی تھی کہ حجاب کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تھی۔ بی پی بہت کم ہو گیا تھا۔“

فیاض صاحب بولے۔ ”ان لوگوں کو کم از کم بتانا تو چاہیے تھا ہمیں۔ ایک فون ہی کر دیتے۔“

”جلال خود تو شہر سے باہر ہے اور واجدہ کا آپ کو پتا ہی ہے۔“ خالہ صوفیہ نے کہا۔

فیصل گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولا۔ ”نا ڈو اسپتال لے کر گئے تھے۔ وہاں کے اسٹینڈرڈ کا تو پتا ہی ہے سب کو، میرا تو مشورہ ہے کہ باجی کو چند دن کے لیے یہاں لے آئیں، ڈاکٹر انکل بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں ہم سب کی طبیعت کو۔ باجی کو تو ہمیشہ آرام ہی ان سے آتا ہے۔“

”لیکن جلال کی ماں مان جائے گی؟“ فیاض صاحب بولے۔

”آ...... آپ فون کر کے دیکھ لیں۔“

”نہیں بھئی، میں تو نہیں کروں گا۔ ایویں کوئی سخت بات نہ ہو جائے اس سے یا مجھ سے۔“

”میں کر لیتا ہوں۔“ فیصل نے کہا۔

”نہیں، تم تو بالکل نہیں کرو گے۔“ خالہ صوفیہ بولیں۔

”تو پھر کون کرے گا امی؟“

”چلیں، میں کر کے دیکھتی ہوں۔“ خالہ صوفیہ نے کہا۔

”کیا کہو گی؟“ فیاض صاحب نے پوچھا۔

”آپ بتائیں۔“ خالہ صوفیہ نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”اس سے کہو کہ دو تین دن کے لیے بھیج دیں حجاب کو...... عطا ہمارا فیملی ڈاکٹر ہے، ذرا جنرل چیک اپ کر لے گا حجاب کا۔“

”اچھا میں کرتی ہوں بات۔“ خالہ صوفیہ نے کہا اور پھر ڈگمگاتی ہوئی سی فون کرنے چلی گئیں۔

ہادی بہ ظاہر لاتعلقی سے ایک انگلش میگزین دیکھ رہا تھا مگر اس کی توجہ گفتگو کی طرف ہی تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ لوگ حجاب کے سسرالیوں سے کتنے سہمے رہتے ہیں۔ ایک دن پہلے وہ اپنی آنکھوں سے بھی خالہ صوفیہ کی بے چارگی کا منظر دیکھ چکا تھا۔ گھر میں حجاب کی ساس کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد خالہ صوفیہ گھبرائی ہوئی سی گھر سے نکل گئی تھیں۔ ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد کسی نے وہ پھل بھی باہر پھینک دیا تھا جو وہ بڑی چاہت سے بیٹی کے لیے لے کر گئی ہوں گی۔

دوسرے کمرے میں خالہ صوفیہ، حجاب کی ساس کو فون کر رہی تھیں۔ یہاں کمرے میں فیاض صاحب اور فیصل چہروں پر تناؤ لیے بیٹھے تھے۔ خالہ صوفیہ بڑی منمناتی ہوئی عاجزانہ آواز میں بول رہی تھیں۔ الفاظ ہادی تک نہیں پہنچ رہے تھے۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئیں۔ ان کے چہرے پر مایوسی کا سایا تھا۔ ”کیا کہا واجدہ نے؟“ فیاض صاحب نے پوچھا۔

”واجدہ سے نہیں، جلال سے بات ہوئی ہے۔ وہ آ گیا ہے واپس۔“

”کیا کہتا ہے؟“

”کہتا ہے، اب وہ ٹھیک ہے۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں اور کہتا ہے کہ ہم بھی کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے حجاب شش و پنج میں پڑے۔“

”حجاب نے بات کی؟“

”نہیں، جلال بتا رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔“

”وہ تو جب بھی فون کریں، یہی بتاتے ہیں کہ سو رہی ہیں، باتھ روم میں ہیں۔ دس دفعہ فون کریں تو ایک دفعہ بات ہوتی ہے۔“ فیصل نے برا سا منہ بنا کر کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

”ہمیں جانا چاہیے؟“ فیاض صاحب نے بیوی سے پوچھا۔

”جانا تو چاہیے، لیکن پتا نہیں، وہ برا نہ مانیں۔ یا پھر...... پہلے ایک بار فون پر حجاب سے بات ہو جائے......“

”چلو، انتظار کر لو۔“ فیاض صاحب نے کہا۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہے تھے۔ مگر ہادی کی موجودگی کا خیال کر کے موضوع بدل دیا۔ گفتگو کا رخ مسلسل برسنے والی بارش کی طرف مڑ گیا۔

ہادی اس گھر کی صورت حال دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ یہ لوگ حجاب کے سسرالیوں کے حوالے سے بہت دباؤ میں تھے۔ ہادی کا دھیان بار بار اس دیوار گیر

تصویر کی طرف بھی جا رہا تھا جو یہاں ایک کمرے میں آویزاں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی ایسی لڑکی کی تصویر ہے جو اب اس دنیا میں نہیں یا پھر اتنی دور ہے کہ اس سے ملاقات ممکن نہیں۔ وہ حجاب کی بہن تو ہرگز نہیں لگتی تھی۔ بہرحال ہادی نے اس سلسلے میں فیاض صاحب سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

شام کے وقت بارش میں وقفہ آیا اور ہادی ان لوگوں سے رخصت ہو کر اپنی قیام گاہ پر واپس آگیا۔ راستے میں اس نے ایک جگہ سے اپنی کلائی کی مرہم پٹی بھی کروائی اور ڈاکٹری نسخے پر دوا بھی لے لی۔

ظہیر بھی اپنے کام سے واپس آچکا تھا۔ اس کا موڈ آج کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ بہرحال وہ دیر تک ہادی کے پاس بیٹھا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ ہادی نے اسے بتایا کہ اس نے کلائی کی بینڈیج کروائی ہے۔ اسپتال کی بدانتظامی کا نقشہ بھی اس نے ظہیر کے سامنے کھینچا۔ ظہیر نے اقرار کیا کہ یہاں کے کئی سرکاری اسپتالوں کی صورت حال مایوس کن ہے۔

گفتگو کے دوران میں ہادی نے بار بار کوشش کی کہ کسی طرح علیزا کا کوئی کھوج ہاتھ آسکے۔ اس گھر میں کل چھ افراد رہتے تھے۔ ظہیر، اس کی بیوی فوزیہ، اس کے بڑے بھائی جلال، بھابی حجاب، والدہ واجدہ بیگم اور ظہیر کی ایک سالی ارم۔ ارم بھی آج کل ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔

ہادی نے دخل در معقولات کرتے ہوئے ظہیر سے پوچھا۔ ”آپ کی سسٹران لا (ارم) آپ کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟“

”وہ اکاؤنٹینسی کر رہی ہے۔ اسے ونیس کی یونیورسٹی میں داخلہ ملا تھا، اس لیے وہیں رہنا پڑ رہا ہے۔“

ونیس کے نام پر ہادی کا دل دھڑکا۔ کہیں علیزا دراصل ارم ہی تو نہیں تھی؟ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنا نام غلط بتایا ہو۔ ہادی نے صاف دیکھا تھا کہ جلال کے مقابلے میں اس کا چھوٹا بھائی ظہیر زیادہ کٹر ذہن کا نہیں ہے۔ وہ مذہبی معاملات پر زیادہ سخت رائے نہیں رکھتا تھا۔ اس کی بیوی فوزیہ بھی یوں تو پردہ کرتی تھی مگر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلال کی فیملی کی بہ نسبت قدرے روشن خیال ہے۔ علیزا کو بھی ہادی نے خاصے ایڈوانس روپ میں دیکھا تھا۔ تو کیا علیزا ہی دراصل ارم ہے؟

”بڑی خوش مزاج ہے۔“ ظہیر نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”سیر سپاٹے کی بھی شوقین ہے۔ دو تین بار پاکستان جا چکی ہے۔ پاکستان کے بارے میں جتنا جانتی ہے شاید ہم بھی نہیں جانتے۔ یہاں ہوتی تو آپ کو لاہور کی گلیوں کے نام بھی بتا دیتی اور یہ بھی بتا دیتی کہ کون سی گلی میں کون سی چٹخارے دار شے بکتی ہے۔“

”پھر تو ان سے ملنا چاہیے تھا۔ مجھے بھی کبھی کبھی چٹ پٹی چیزوں کا شوق چراتا ہے۔“ ہادی نے بات بنائی۔

”ویسے چار پانچ دن میں اسے آنا تو ہے۔ اگر آپ تب تک ہیں تو پھر ملاقات ہو سکتی ہے۔“ ظہیر نے عام سے لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں ملازمہ شریفاں تیزی سے اندر آئی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے ظہیر سے کہا۔ ”بھائی جان آپ کو بلا رہے ہیں۔“

ظہیر تیزی سے شریفاں کے ساتھ چلا گیا۔ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے رہائشی حصے کی باڑ کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ دو تین منٹ بعد ہادی نے دیکھا کہ ایک بڑی کار تیزی سے پورچ کی طرف سے آئی اور مین گیٹ سے باہر نکل گئی۔ اندھیرے میں ہادی صرف اتنا ہی دیکھ سکا کہ فرنٹ سیٹ پر ظہیر موجود تھا۔

”کہیں حجاب کی طبیعت پھر تو خراب نہیں ہو گئی۔“ ہادی نے سوچا۔

اس بات کا جواب اسے قریباً پندرہ منٹ بعد ملا جب شریفاں واپس انیکسی میں آئی۔ ”کیا بات تھی شریفاں؟“ ہادی نے پوچھا۔

”بڑی باجی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔ انہیں پھر اسپتال لے کر گئے ہیں۔“ وہ روہانسی آواز میں بولی۔

”کیا ہوا ہے؟“

”کچھ پتا نہیں جی۔ بس دعا کریں۔ اس ویلے تو بے ہوش ہیں وہ۔“ شریفاں نے گول مول بات کی۔ وہ باقاعدہ آنسو بہا رہی تھی۔

یہ موقع اچھا تھا۔ ہادی، حجاب کے بارے میں اس سے مزید پوچھ سکتا تھا۔ اس نے ایک دو سوال کیے جن کے جواب میں شریفاں نے بتایا۔ ”وڈی باجی بہت چنگی ہیں جی۔ اتنی چنگی جتنا کوئی سوچ سکتا ہے۔ پر اس گھر میں ان سے سلوک چنگا نہیں ہے۔ خاص طور سے وڈے بھائی جان تو ان پر ہر ویلے بہت غصے میں رہتے ہیں۔“

”وڈے بھائی جان یعنی حجاب کے میاں؟“

”آہو جی...... دراصل......“ وہ کہتے کہتے جھجک کر خاموش ہو گئی۔

"کہو کہو شریفاں۔ جو کہو گی صرف میرے تک ہی رہے گا۔"

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ "کسی سے گل نہ کرنا جی آپ۔ پہلے ہی سارے کہتے ہیں شریفاں بڑا بولتی ہے۔"

ہادی نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔ وہ بولی۔ "دراصل وڈے بھائی جان اور وڈی باجی میں شادی سے پہلے ہی ناچاقی ہوگئی تھی۔ وڈی باجی کمپیوٹر پڑھی ہوئی ہیں۔ کافی لائق ہیں۔ وڈے بھائی جان کاروباری ٹائپ کے ہیں۔ منگنی کے بعد وڈی باجی نے کہیں وڈے بھائی جان سے کہہ دیا کہ میرا دل چاھندا ہے کہ میں اپنے چاچا جی کے دفتر میں تین چار گھنٹے کی نوکری کرلوں۔ بس اسی گل کا بہت بڑا جھگڑ بن گیا۔ منگنی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ بعد میں وڈی باجی مان بھی گئیں کہ وہ نوکری نہیں کریں گی۔ شادی بھی ہوگئی۔ وہ اس گھر میں بھی آگئیں۔ پر وہ نوکری والی گل وڈے بھائی جان کے دل میں ہی رہی۔ شادی کے مہینے ڈیڑھ مہینے بعد ہی دونوں میں جھگڑے شروع ہوگئے تھے۔ ساری دنیا جانتی ہے، شادی کے بعد تو کڑی وچاری لاچار ہی ہوجاتی ہے۔ بندے کا پلا ایک دم بھارا ہوجاتا ہے۔ باجی وچاری نے جھگڑا کیا کرنا تھا...... بھائی جان کی طرف سے ہی ہوتا تھا۔ بھائی جان ویسے بھی عمروج باجی سے چھ ست سال وڈے ہیں ان کا رعب بھی کافی ہے۔ بس وہ ہر ویلے باجی کو تنگ کر کے رکھتے ہیں۔"

"باجی کے میکے والے کوئی عمل دخل نہیں دیتے؟" ہادی نے پوچھا۔

"نہیں جی، بڑے شریف لوک ہیں۔ ان کے تو ہر ویلے ساہ (سانس) سوکھے رہتے ہیں۔ باجی سے ملنے بھی آتے ہیں تو ڈر ڈر کر کہ کہیں بھائی جان ناراض نہ ہوجائیں۔ باجی کی طبیعت پرسوں سے خراب تھی۔ پر ان وچاروں کی ہمت نہیں ہوئی آنے کی۔ کل رات نو بجے آئے تھے بس تھوڑی دیر کے لیے۔ کسی نے چائے تک نہیں پوچھی ان کو۔ بعد میں وڈے بھائی جان آئے تو میں نے ان سے پوچھ کر چائے بنائی۔"

شریفاں جو کچھ بتا رہی تھی: اس کی تصدیق ہادی کے سامنے ہوچکی تھی۔ آج انکل فیاض کے گھر میں اس نے وہ سارا تناؤ اور خوف اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جو بیٹی کے سسرال کے حوالے سے ان لوگوں کے دل میں موجود تھا۔

ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "سیانے کہتے ہیں، ظلم سہنا اور مسلسل سہتے رہنا بھی ظلم ہے۔ تمہاری وڈی باجی احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔"

"وہ تو بالکل اللہ میاں کی گائے ہیں جی۔ اگر ان میں تھوڑی بہت ہمت تھی بھی تو اب ختم ہوچکی ہے۔ شروع شروع وچ دو چار مہینے وہ شاید وڈے بھائی جان کے سامنے بولی ہوں گی لیکن اب تو انہوں نے اپنی زبان بالکل بند کرلی ہے۔ "جی جی" کے سوا کچھ کہتی ہی نہیں۔ پھر بھی ان کی شامت آتی رہتی ہے۔ پڑھی لکھی ہیں، سمجھدار ہیں، پر وڈے بھائی جان کے سامنے ایسے ہوتی ہیں جیسے کوئی تھر تھر کانپتی، اسکول کی کڑی ہو۔ خدا واسطے کی گل کی جائے تو انہوں نے اپنے بندے کے لیے خود کو بالکل مار لیا ہوا ہے۔ اپنی کوئی مرضی رکھی ہی نہیں ہے۔ وڈے بھائی جان کے کہنے پر گھر میں بھی پورا پردہ کرتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ چھوٹے بھائی جان ظہیر وغیرہ کے سامنے بھی نہیں آتیں۔ اپنی کسی سکھی سہیلی سے تعلق واسطہ نہیں رکھا ہوا، اپنا ٹیلی فون نہیں رکھا ہوا۔ ماں پیو کے گھر آنا جانا نہ ہونے کے برابر کردیا ہوا ہے مطلب یہ کہ کوئی ایسا کام نہ ہو جو وڈے بھائی جان کو برا لگتا ہو۔ پھر بھی پتا نہیں کیا بات ہے، وڈے بھائی جان کو بولنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے کہ بھائی صاحب ہاتھ وغیرہ بھی اٹھاتے ہوں اس پر؟" ہادی نے خیال ظاہر کیا۔

"ابھی تک تو نہیں جی۔ لیکن جس قسم کے معاملے چل رہے ہیں، کسی دن یہ بھی ہوسکتا ہے۔ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے جی۔ اب دیکھیں یہ بیماری والی گل بھی بھلا کسی کے بس کی ہوتی ہے۔ آپا خانم (جلال کی والدہ) کہتی ہیں کہ وہ بیمار اس لیے ہوئی ہیں کہ انہوں نے اپنی ماں کے گھر سے آئی ہوئی انجیریں کھائی ہیں۔ میں قسم کھا سکتی ہوں کہ وڈی باجی نے انجیر چکھی بھی نہیں تھی۔ بس ایسے ہی بے کار باتیں بناتے ہیں۔" ہادی کو وہ پھل یاد آیا جو باڑ سے باہر پھینک دیا گیا تھا۔

"ظہیر اور جلال صاحب کی والدہ کا سلوک کیا ہے تمہاری وڈی باجی کے ساتھ؟" ہادی نے پوچھا۔

"آپا خانم زیادہ تر بیٹے کا ساتھ ہی دیتی ہیں جی۔ پر وڈے بھائی جان غصے کے تیز ہیں۔ کبھی کبھار آپا خانم سے بھی لڑ پڑتے ہیں۔ جب بھی ایسا ہوتا ہے، ان دنوں باجی سے آپا خانم کا سلوک کچھ چنگا ہوجاتا ہے۔ پر یہ وقتی بات ہی ہوتی ہے جی۔"

"میرے خیال میں ظہیر صاحب تو تھوڑی بہت بھابی کی حمایت کرتے ہوں گے؟"

"آہو جی، ظہیر بھائی جان اور ان کی بیوی بھی سمجھتے ہیں کہ اس گھر وچ وڈی باجی کے ساتھ برا سلوک ہورہا ہے۔ پر میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ وڈے بھائی جان کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔"

...... ہادی اس گھر میں علیزا کی ٹوہ لگانے آیا تھا لیکن اب اسے اس دوسرے کردار میں بھی دلچسپی محسوس ہورہی تھی۔

شریفاں کے ساتھ گفتگو کے دوران میں ہادی نے باتوں کا رخ ایک بار پھر اپنے من پسند موضوع کی طرف موڑ دیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ علیزا وہی ارم نامی لڑکی ہے جو رشتے میں ظہیر کی سالی ہے اور جو اکاؤنٹینسی پڑھنے کے لیے آج کل وینس میں مقیم ہے۔ کاش وہ کسی طرح ارم کی تصویر دیکھ سکتا۔ لیکن تصویر والی بات شریفاں سے کرنے کی ہمت اسے نہیں ہوئی۔

کوئی ایک گھنٹے بعد اسپتال ہی سے ظہیر کا فون آیا۔ وہ گمبھیر آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے ہادی سے پوچھا کہ ہادی نے کھانا وغیرہ کھالیا ہے اور اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔

ہادی نے پوچھا۔ "ظہیر بھائی! تمہاری بھابی کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ اگلے ایک دو گھنٹے کافی اہم ہیں۔" ظہیر نے مختصراً جواب دیا۔ ہادی نے بھی زیادہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔

صبح ہادی جلدی بیدار ہوگیا۔ یہی کوئی سات ساڑھے سات کا وقت ہوگا۔ وہ کھٹ پٹ کی آوازوں سے جاگا تھا۔ اس نے دیکھا۔ ظہیر بڑی پریشان صورت کے ساتھ کامن روم میں موجود تھا۔ وہ کسی کو فون کررہا تھا۔ ملازم لڑکا مقصود بھی فکرمندی کے تاثرات لیے اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ ظہیر اپنے کسی رشتے دار سے باتیں کررہا تھا۔ اس کی گفتگو سے ہادی پر یہ انکشاف ہوا کہ ظہیر کی بھابی حجاب تشویش ناک حالت میں ہے۔ اس کا ابارشن ہوگیا ہے اور ابارشن کے دوران میں ہی کوئی پیچیدہ صورت حال پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے حجاب کے لیے خون کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ ظہیر اسی سلسلے میں بات کررہا تھا۔ اس نے جب بلڈ گروپ کا نام لیا تو ہادی چونک گیا۔ یہ گروپ عام طور سے مشکل سے ملتا ہے۔ ہادی اٹھ کر باتھ روم میں گیا اور منہ ہاتھ دھو کر باہر آگیا۔ ظہیر پریشانی کے عالم میں گھبر رہا تھا۔ "بلڈ بینک میں مل جاتا تو پھر اتنی بھاگ دوڑ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ایک بوتل مقصود نے دی ہے، ایک یا دو کی ضرورت مزید پڑ سکتی ہے۔"

ہادی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ظہیر بھائی! میرا گروپ بھی اے بی نگیٹو ہے، آپ مجھے ساتھ لے چلیں، اللہ نے چاہا تو میچنگ بھی ہوجائے گی۔"

ظہیر کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ فون بند کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بڑا اچھا ہوا۔ بھابی اس وقت مشکل میں ہیں۔ ان کا بچہ تو نہیں بچ سکا، اب اللہ کرے وہ صحیح سلامت گھر آجائیں۔"

وہ گاڑی میں بیٹھے اور روم کی سڑکوں پر فراٹے بھرتے تیزی سے ناڈو اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ سفید "لان سیا" گاڑی ظہیر خود ڈرائیو کررہا تھا...... حجاب کی ابارشن کا سن کر ہادی کو دلی افسوس ہوا تھا۔ اب تک ہادی کو جو معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ان کے مطابق وہ کافی تکلیفیں سہہ رہی تھی۔ اب ایک اور بپتا اس پر آن پڑی تھی۔ اسپتال پہنچتے ہی ہادی کے خون کا نمونہ لیا گیا۔ کراس میچنگ ہوگئی اور ہادی نے خون کا ایک بیگ دے دیا۔ جب وہ بیگ دے کر باہر نکل رہا تھا اس کی نگاہ اچانک حجاب کی والدہ اور بھائی فیصل پر پڑی۔ وہ تیزی سے آئی سی یو کی طرف جارہے تھے۔ ہادی ایک ستون کی اوٹ میں ہوگیا۔ اس نے خالہ صوفیہ اور فیصل وغیرہ کو ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ وہ یہاں جلال صاحب کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے اور وہ ابھی اس تعلق کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ جلال آئی سی یو سے کچھ فاصلے پر برآمدے میں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر ویسے بھی ہر وقت گہری سنجیدگی رہتی تھی اور اب تو صورت حال بھی گمبھیر تھی۔ خالہ صوفیہ ڈرے ڈرے انداز میں داماد کے پاس پہنچیں۔ اس سے دو چار باتیں کیں۔ دور سے بھی ہادی کو اندازہ ہورہا تھا کہ خالہ صوفیہ اور فیصل کو سرد مہری سے جواب دیے گئے ہیں۔ پھر جلال اپنی سیاہ ڈاڑھی میں انگلیاں چلاتا ایک ڈاکٹر کے ساتھ ایک کوریڈور میں اوجھل ہوگیا۔ خالہ صوفیہ وہاں موجود ایک پردہ پوش خاتون سے باتیں کرنے لگیں۔ یہ خاتون یقیناً ظہیر کی وائف فوزیہ ہی تھی۔ شریفاں بھی متفکر چہرے کے ساتھ یہیں موجود تھی۔

اتنے میں ہادی نے ظہیر اور جلال کی والدہ آپا خانم کو تیزی سے آتے دیکھا۔ وہ آئی سی یو کی طرف سے آرہی تھیں۔ خالہ صوفیہ سے آپا خانم کی سلام دعا ہوئی...... چند باتیں ہوئیں، پھر ایک دم نجانے کیا ہوا کہ سنجیدہ صورت آپا خانم بھڑک اٹھیں۔ بلند آواز میں بولیں۔ "یہ سب تمہارا ہی

کیا دھرا ہے، اچھی بھلی سیانی ہو تم۔ بال بچے پیدا کیے ہوئے ہیں تم نے۔ تمہیں پتا نہیں تھا کہ اس حالت میں بیٹی کو کیا کھلانا ہے اور کیا نہیں۔"

"کل...... لیکن واجدہ! وہ تو تمہارے سامنے ہی بتا رہی تھی کہ اس نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"واہ، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کے میکے گھر سے کوئی چیز آئے اور وہ اسے کھائے نہ۔ وہاں سے تو سڑے ہوئے آلو بھی آجائیں گے تو وہ انہیں تبرک سمجھے گی۔ بے حیا بنا کر پیٹ میں ٹھونس لے گی ان کو۔"

خالہ صوفیہ روہانسی آواز میں بولیں۔ "لیکن واجدہ! تم کسی بھی ڈاکٹر حکیم سے پوچھ لو...... انجیر کا پھل تو کسی طرح بھی نقصان دہ نہیں ہوتا......"

"ہاں، سب سے زیادہ ڈاکٹری اور حکمت تو تمہارے ہی خاندان میں ہے۔ لوگ پوچھ پوچھ کر چلتے ہیں تم سے۔" واجدہ نے جلی کٹی آواز میں کہا۔ وہ اتنے بلند آہنگ میں بات کر رہی تھی کہ پچاس ساٹھ فٹ دور ہادی کے کانوں تک صاف پہنچ رہی تھی۔

خالہ صوفیہ نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن پھر کہتے کہتے رہ گئیں۔ تنومند واجدہ بڑبڑاتی ہوئی واپس اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ ماں بیٹا وہیں کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد جلال ان کے پاس سے گزرا لیکن ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ پھر فیصل نے ماں کو کندھوں سے تھاما اور اپنے ساتھ لے کر بیرونی برآمدے کے چوبی بینچوں پر جا بیٹھا۔ ہادی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ خالہ صوفیہ، بیٹی کی اس مصیبت پر مسلسل رو رہی تھیں۔

ہادی نے ریفریشمنٹ کے بہانے ظہیر سے اجازت لی اور باہر چلا گیا۔ وہ خالہ صوفیہ اور فیصل کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں ہادی اپنے سینے میں گھٹن سی محسوس کر رہا تھا۔ اسے حجاب کی والدہ پر بے تحاشا ترس آ رہا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک باوقار اور قابل احترام خاتون تھیں لیکن بیٹی کے لیے خوار ہو رہی تھیں۔ خود بیٹی بھی جیسے ایک پنجرے میں پھڑپھڑا رہی تھی۔

ہادی یہاں سیر و تفریح کے لیے آیا تھا۔ کسی فیملی کے اندرونی مسائل کے لیے دل جلانے کی خاطر نہیں۔ اب وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ بس ایک چیز اسے روکے ہوئے تھی۔ ظہیر کے بیان کے مطابق پرسوں ارم وینس سے یہاں آ رہی تھی۔ اسے دیکھے بغیر ہادی کے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے ارم کے حوالے سے اب تک جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان سے یہی شک پڑتا تھا کہ یہی وہ سیلانی لڑکی ہے جس نے وینس میں اسے علیزا کے نام سے بے وقوف بنایا اور پھر گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو گئی۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ سوال ایک گرہ کی طرح ہادی کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اگر وہ اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی تو صاف کہہ دیتی۔ ہادی بھی اس کے لیے اصرار نہ کرتا مگر یوں اچانک بیٹھے بٹھائے اٹھ کر اوجھل ہو جانا...... بلاشبہ بداخلاقی بلکہ سنگدلی کے زمرے میں آتا تھا۔ وہ جاتے جاتے پارکر قلم کا سیٹ بھی ہادی کو دے گئی تھی۔ وہ اسی طرح ہادی کے بیگ میں پڑا تھا۔ اس کی دید ہادی کے دل میں خوامخواہ کی کسک جگاتی تھی۔

☆☆☆

تیسرے روز جلال کی بیوی حجاب اسپتال سے گھر آ گئی۔ گھر کا ماحول جو پہلے ہی سنجیدہ تھا اب اور بھی سنجیدہ اور تناؤ بھرا ہو گیا تھا۔ اسی سہ پہر ظہیر اپنے ایک دوست کو ملانے لے آیا۔ یہ وہی گلوکار تھا جسے ہادی سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ نوجوان ہی تھا مگر بال پیشانی سے اڑے ہوئے تھے۔ وہ ہادی کے لیے کچھ کتابیں اور چاکلیٹس وغیرہ لے کر آیا تھا۔ ہادی کو ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھنا پڑا اور "ستائش باہمی" کے دور سے گزرنا پڑا۔ امان شیروانی نامی یہ نوجوان گیا تو ظہیر نے ہادی کو بتایا کہ ارم نو بجے کی فلائٹ سے یہاں پہنچ رہی ہے۔ وہ اسے لینے کے لیے ائرپورٹ جا رہے ہیں۔ واپسی پر ملاقات ہو گی۔

اس خبر کا ہادی صبح سے ہی منتظر تھا۔ بہرحال اس نے چہرے کے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ بے تابی سے ظہیر کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ جو گاڑیاں گھر میں آتی تھیں وہ گارڈینیا کی باڑ کی دوسری جانب پورچ میں جا کر رکتی تھیں، لہٰذا ہادی کو امید نہیں تھی کہ وہ ارم کو فوراً دیکھ سکے گا۔ بلکہ ابھی تک تو اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ ارم گھر کی دیگر خواتین کی طرح مکمل پردے میں ہو گی یا نہیں۔

خدا خدا کر کے ساڑھے دس بجے اور ظہیر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ہادی کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کو کھڑکی کے سامنے سے گزرنا تھا۔ وہاں روشنی بھی تھی، عین ممکن تھا کہ "گارڈن لائٹ" کی اس دودھیا روشنی میں وہ ارم کی ایک جھلک دیکھ سکتا۔ اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کی جھلک ہی نہیں، اس کو بڑی وضاحت سے دیکھ سکے گا اور اس کی آواز بھی سن سکے گا۔

سفید "لان سیا" گاڑی اندر داخل ہوئی لیکن رہائشی

حصے کی طرف جانے کے بجائے انیکسی کے سامنے رک گئی۔ دراصل ظہیر یہاں اتر کر ہادی کی طرف آنا چاہتا تھا۔ ہادی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی نگاہیں گاڑی کے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گاڑی کو ڈرائیور چلا کر لایا تھا۔ اس کے ساتھ والی نشست پر دو خواتین موجود تھیں۔ ایک کو تو اس کی سرمئی چادر سے ہادی نے فوراً پہچان لیا۔ یہ ظہیر کی بیوی فوزیہ تھی۔ دوسری نے پردہ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس کے سر پر فقط دوپٹا تھا۔ ہادی کی حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ وہ یقیناً ارم ہی تھی جسے وہ لوگ ائرپورٹ سے لے کر آئے تھے۔ ہادی اس کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ درمیان میں دوپٹا حائل تھا۔ پھر صورت حال بدل گئی۔ دوپٹے والی لڑکی نے رخ پھیرا، کھڑکی کھولی اور ظہیر کی طرف ہاتھ ہلا کر چہکی "جلدی آیئے گا جیجا جی۔" اس کا پورا چہرہ ہادی کے سامنے تھا۔

ہادی دیکھتا رہ گیا۔ یہ علیزا نہیں تھی۔ بھرے بھرے گالوں اور چھلے دار بالوں والی یہ کوئی اور لڑکی تھی۔ ہادی کے اندر جیسے کوئی تیز روشنی بجھ گئی۔ وہ گہری سانس لے کر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ آیا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر سوچنے لگا۔ وہ کن چکروں میں پھنس گیا ہے۔

اسی دوران میں دروازہ کھلا اور ظہیر جھومتا ہوا سا اندر آگیا۔ "دیکھو، ٹائم پر پہنچ گیا نا۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"کس چیز کا ٹائم؟" ہادی مسکرایا۔

"ہادی بھائی! تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی کچھ شاعری Live سناؤ گے۔ میرا مطلب ہے کہ منہ زبانی۔ یار! ویسے یہ اپنا سنگر شیروانی بڑا متاثر ہوا ہے تم سے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر تم یہاں قیام کے دوران میں ایک دو گیت اس کے نئے البم کے لیے لکھ دو تو اس کا البم ہٹ ہو جائے۔ بڑا ہیرا لڑکا ہے لیکن آج کل ذرا کرائسس میں آیا ہوا ہے۔"

"ظہیر بھائی! میں کچھ لکھنے لکھانے کے قابل ہوتا تو اس وقت لاہور میں بیٹھا ہوتا۔ فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بلکہ ارادے کی بھی بات نہیں۔ مجھ سے فی الحال لکھا جا ہی نہیں سکتا۔" آخر میں ہادی کا لہجہ ذرا سا تلخ ہو گیا تھا۔

ظہیر جلدی سے بولا۔ "نہیں نہیں، میں نے تو یونہی بات کی تھی یار! یہ شاعری کا کام ہی موڈ کا ہے، میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"مسٹر ان لا آگئیں؟" ہادی نے پوچھا۔

"ہاں، ابھی نیچے ہیں۔"

ہادی نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "اچھا ظہیر بھائی! جس دن میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تھا...... وہیں ریستوران میں آئس کریم کھاتے ہوئے، اس دن آپ لوگوں کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھیں۔ انہوں نے نقاب نہیں کیا ہوا تھا۔ ذرا اونچی لمبی ناک تھی ان کی۔ کتابی سا چہرہ تھا......" ہادی نے ہاتھوں کو حرکت دے کر باقاعدہ کتابی چہرے کا اشارہ دیا۔

ظہیر کی پیشانی پر دو تین سلوٹیں ابھریں۔ وہ جیسے کچھ سوچ رہا تھا، پھر چونک کر بولا۔ "...... ہاں...... وہ ماریہ تھی۔ بھابی حجاب کی فرینڈ ہے۔ وہ بھی وینس میں رہتی ہے بھابی سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ اسی دن واپس چلی گئی تھی شام کو۔"

"اچھا، میں حیران ہو رہا تھا کہ باقی خواتین تو باپردہ ہیں، وہ کھلے منہ تھیں۔" ہادی نے بات بنائی۔

"ہاں، وہ فیملی سے باہر کی تھی۔ ویسے بڑی اچھی لڑکی ہے۔ بھابی کی دو تین قریبی دوستوں میں سے ہے۔ اب صرف وہی ہے جس سے بھابی کبھی کبھار مل لیتی ہیں۔ بھائی جان نے اس کی اجازت دی ہوئی ہے۔"

ہادی کے ذہن میں شک کا بیج پڑ چکا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار ایک انوکھا خیال آنے لگا۔ کہیں حجاب ہی تو وہ لڑکی نہیں تھی......؟

لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ تو شادی شدہ تھی۔ پردے کی پابند اور غالباً نہایت سنجیدہ اطوار والی۔ ہادی نے ظہیر سے تھوڑی سی مزید گفتگو کی جس سے اسے پتا چلا کہ حجاب پچھلے ہفتے روم سے آگے دوسرے کسی شہر میں گئی ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ وینس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

وہ سوچنے لگا، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی طرح حجاب یعنی مسز جلال کو دیکھ سکے؟ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ وہ چار دیواری سے باہر پردے میں نظر آتی تھیں۔ ایک موقع پیدا ہو سکتا تھا انہیں دیکھنے کا، جب وہ اسپتال میں تھیں اور ہادی نے خون دیا تھا، لیکن اس وقت بھی اچانک وہاں حجاب کی والدہ اور بھائی کی آمد ہو گئی تھی اور ہادی کو دائیں بائیں ہونا پڑا تھا۔

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ سوچ رہا ہوتا ہے اس کا ہو جانا کافی دشوار محسوس ہوتا ہے لیکن پھر وہ اتنا دشوار نہیں ہوتا۔ مسز جلال یعنی حجاب کے حوالے سے بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ تیسرے روز ناشتے کے بعد نو بجے کے لگ

بھگ ہادی اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف آیا۔ یہ چھٹی کا روز تھا۔ باہر مکمل خاموشی تھی مکین شاید سوئے پڑے تھے۔ ہادی کی نگاہ رہائشی حصے کی طرف گئی۔ اس نے ایک چادر پوش لڑکی کو انیکسی کی جانب آتے دیکھا۔ ہادی فوراً سمجھ گیا کہ یہ حجاب ہے۔ اس کی چادر کا رنگ کالا تھا اور اس پر تین چار چوڑی چمکیلی دھاریاں تھیں۔ یہ چادر ہادی پہلے بھی دو تین بار دیکھ چکا تھا۔ چادر کے نقاب میں سے حجاب کی فقط آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کے کندھے سے شولڈر بیگ جھول رہا تھا۔ بیماری کے بعد کی نقاہت اب بھی اس کی چال سے عیاں تھی۔ وہ مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اسے ہادی کے کمرے کی کھڑکی کے نزدیک سے گزرنا تھا۔ ابھی وہ کھڑکی سے پندرہ بیس قدم دور ہی تھی کہ ہادی کو ایک دوسری صورت نظر آئی۔ یہ سیاہ داڑھی اور سخت چہرے والا جلال تھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا تیزی سے حجاب کے پیچھے آیا۔ اس نے شلوار کے اوپر ایک نائٹ گون پہن رکھا تھا۔ کھڑکی سے کچھ ہی فاصلے پر اس نے آواز دے کر حجاب کو روک لیا۔ وہ بت بنی رہ گئی۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ سسکیاں لے رہی ہے۔ کمرے کے اندر چونکہ نیم تاریکی تھی اس لیے ان دونوں میں سے کوئی بھی ہادی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

جلال الدین، حجاب کے پاس پہنچا۔ اس نے تیز سرگوشی میں اس سے کچھ کہا۔ انداز ڈانٹنے والا ہی تھا۔

حجاب سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کا سینہ ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ دوسری بار جلال قدرے زور سے بولا۔ اس مرتبہ مدھم آواز ہادی کے کانوں تک بھی پہنچی۔ "یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟" جلال نے پھنکار کر کہا تھا۔

حجاب نے سہمے ہوئے انداز میں اپنی پلکیں اٹھائیں۔ کھڑکی سے ان دونوں کا فاصلہ بہ مشکل تین چار میٹر رہا ہوگا۔ سورج کی روپہلی کرنیں سیدھی حجاب کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ چہرے کا رخ ہادی کی طرف تھا۔ مگر اس کے چہرے میں سے صرف اس کی آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک ایک بار پھر مایوسی کی لہر ہادی کے سینے میں دوڑ گئی۔ یہ علیزا کی آنکھیں نہیں تھیں۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں ابھی تک ہادی کے حافظے پر نقش تھیں۔ حجاب کی آنکھیں ہلکی براؤن تھیں۔ اس نے اپنی اشک بار آنکھوں سے شوہر کو دیکھ کر کچھ کہا۔ یہ منمنائی ہوئی سی آواز ہادی تک نہیں پہنچ سکی۔

"چلو واپس۔ مجھے ایسے تماشے پسند نہیں۔" ایک بار پھر جلال کی تیز سرگوشی ہادی کے کانوں تک پہنچی۔ "اگر جانا ہوا تو میں خود چھوڑ کر آؤں گا تمہیں۔"

حجاب "صم بکم" تھی۔ اس کے جسم میں شاید اس کے آنسو ہی متحرک ہوں گے جو سرکتے ہوئے سیاہ چادر کے نقاب میں جذب ہو رہے ہوں گے۔ اس نقاب پر دو چمکیلی دھاریاں بڑی نمایاں نظر آتی تھیں۔

"چلو۔" جلال نے انگلی سے واپس رہائشی حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر حجاب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کی کلائی تھامی اور اسے لیتا ہوا واپس چل دیا۔ وہ جیسے اس کے ساتھ کھنچتی ہوئی چلی گئی۔ پندرہ بیس قدم آگے جا کر اس کی ایک جوتی اس کے پاؤں سے نکل گئی لیکن جلال کو پتا نہیں چلا۔ حجاب نے بھی رکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسی طرح ذرا لنگڑاتی ہوئی سی شوہر کے ساتھ گارڈینا کی باڑ کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ قریباً ایک منٹ بعد گارڈینا کے عقب سے شریفاں نمودار ہوئی اور حجاب کی جوتی اٹھا کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔

ہادی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ ارم ہی علیزا ہوگی لیکن وہ نہیں تھی۔ پھر اس نے حجاب کے بارے میں ایسا سوچا۔ حجاب قد و قامت میں علیزا جیسی ہی تھی لیکن اب ثابت ہو رہا تھا کہ وہ بھی علیزا نہیں۔ ابھی تک شریفاں اور ظہیر وغیرہ سے ہادی کی جو گفتگو ہوئی تھی اس میں بھی علیزا نامی لڑکی کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔

وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ وہ کیوں خوامخواہ ایک بے کار چکر میں الجھ گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی، اسے غچا دے کر نکل گئی تھی۔ کوئی نام و نشان نہیں چھوڑا تھا اس نے۔ تو پھر اس کا پیچھا کرنے کا فائدہ؟

بیٹھے بیٹھے ایک بات اس کے ذہن میں آئی۔ ظہیر نے بتایا تھا کہ ماریہ نامی وہ اونچی ناک والی لڑکی حجاب کی قریبی سہیلیوں میں سے ہے۔ دوسری طرف وہی لڑکی علیزا کی قریبی دوست بھی معلوم ہوتی تھی۔ تو کیا کسی طرح حجاب سے علیزا کے بارے میں کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا؟ مگر حجاب سے بات کرنا کیونکر ممکن تھا؟ جلال الدین اس کا موقع ہرگز نہیں دے سکتا تھا اور عین ممکن تھا کہ حجاب خود بھی بات کرنا پسند نہ کرتی۔ تو کیا وہ ظہیر سے اس سلسلے میں مدد لے؟ مگر...... یہ بھی کسی طرح مناسب بات نہیں لگتی تھی۔ کیا وہ اس خاندان کی لڑکیوں کی ٹوہ لگانے کے لیے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ پرسوں اس نے شریفاں سے تھوڑی سی بات کی تھی...... اور باتوں باتوں میں پوچھا تھا کہ علیزا کون ہے؟

شریفاں نے اس نام سے لاعلمی ظاہر کی تھی مگر اس کے ساتھ ذرا چونکی بھی تھی کہ ہادی اس طرح کے سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔ اس کا چونکنا ہادی کے لیے شرمندگی کا باعث بنا تھا۔ دوپہر تک ہادی نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک دن مزید یہاں ٹھہر کر ظہیر سے اجازت لے گا اور کسی ہوٹل میں جا ٹھہرے گا۔ اس کے لیے کوئی معقول سا بہانہ بھی اس نے ڈھونڈنا شروع کردیا۔ اس روز وہ تین چار گھنٹے ظہیر کے ساتھ روم میں گھومتا رہا۔ انہوں نے ایک دو علاقائی ڈشز کھائیں۔ تین چار جگہوں کی سیر کی اور معروف ''پونڈ آف وشز'' بھی دیکھا، جہاں دنیا بھر کے سیاح پانی میں سکے اچھالتے ہیں اور دل میں دبی ہوئی خواہشوں کو بڑی خاموشی سے دعاؤں کی شکل دیتے ہیں۔ پتا نہیں کہ یہاں کیا کیا دعائیں مانگی گئی ہوں گی۔ ان میں سے کئی دعائیں ایسی بھی ہوں گی جو اگر منظرِ عام پر آجائیں تو بے شمار افراد کی خانگی زندگی میں تہلکہ مچ جائے۔ شاید ماضی میں مانگی گئی کچھ دعائیں ایسی بھی ہوں جنہیں مانگنے والے اب خود اپنی دعاؤں پر شرمندہ ہوں۔ کچھ دعائیں ناکام حسرتوں کا روپ دھار چکی ہوں۔ کچھ دعائیں زندگیوں میں بہار لا چکی ہوں اور کچھ دعائیں ابھی تک ان فضاؤں میں بھٹک رہی ہوں۔ پونڈ آف وشز کے مدار میں چکر لگا رہی ہوں۔ تالاب میں گرنے والی آبشاروں کے شور میں ان دعاؤں کی سرسراہٹ ہو۔

شام سے ذرا پہلے ظہیر کو اپنے اسٹور پر جانا تھا۔ ہادی کی خواہش پر ظہیر نے اسے ''کولیسیئم'' کے قریب ایک چوراہے پر اتار دیا۔ نجانے کیوں ہادی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس فیملی اور اس کے معاملات کو خیرآباد کہنے سے پہلے ایک بار پھر خالہ صوفیہ اور انکل فیاض سے مل لے۔ خاص طور سے خالہ صوفیہ کی طرف اس کا دل کھنچتا تھا۔ وہ مہربان چہرے والی خاتون اپنی شفیق مسکراہٹ سے اس کے دل کو چھو لیتی تھیں۔ ہادی کے اندازے کے مطابق انکل فیاض کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پیدل ہی چل پڑا۔ ایک دو جگہوں سے پوچھ کر وہ منزل تک پہنچ گیا۔

گیٹ کی بیل بجانے پر مسکراتے چہرے والا نوجوان چوکیدار نمودار ہوا اور ہادی کو پہچان کر اندر لے گیا۔ ہادی پورچ میں کھڑا ہوگیا۔ ملازم نے اندر جا کر اطلاع دی۔ چند سیکنڈ بعد نوجوان فیصل باہر نکلا اور اس نے ہادی کو خوش آمدید کہا۔ ہادی فیصل کے ساتھ گھر کے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ خالہ صوفیہ بھی وہیں موجود تھیں۔ انکل فیاض کسی اور کمرے میں تھے۔ پاس ہی کہیں ٹی وی چلنے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ خالہ صوفیہ اس سے بڑی محبت سے پیش آئیں۔ ان کے بے ہوش ہونے والا واقعہ ابھی ان دونوں تک ہی محدود تھا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''فیصل...... فیصل یہ دیکھو۔'' پھر ایک لڑکی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا اخبار تھا۔ وہ اچانک ہی اندر آگئی تھی۔ ہادی اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا...... وہ علیزا تھی۔ بے شک وہ علیزا تھی۔ علیزا نے بھی اسے دیکھ لیا اور بری طرح ٹھٹک گئی۔ اس نے جلدی سے دوپٹا سر پر لے لیا۔ آنکھیں حیرت سے وا تھیں۔ چہرہ قدرے زرد نظر آرہا تھا۔ ایک دو سیکنڈ سکتہ زدہ رہنے کے بعد وہ تیزی سے مڑی اور دروازے سے نکل کر اوجھل ہوگئی۔

''یہ میری بیٹی حجاب ہے۔'' خالہ صوفیہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''آج ہی سسرال سے آئی ہے۔''

ہادی نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور بولا۔ ''اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اللہ کا شکر ہے۔ پہلے سے کافی بہتر ہے۔ ہفتہ دس دن یہاں رہے گی تو بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔''

''آ...... آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ سسرال میں کتنا بھی پیار مل رہا ہو لیکن جس طرح ماں، بیٹی کی دیکھ بھال کرسکتی ہے کوئی اور نہیں۔''

''بیمار بھی تو کافی ہوئی تھی۔'' خالہ صوفیہ نے سرد آہ بھر کر کہا (ابارشن والی بات وہ ہادی کو نہیں بتاسکتی تھیں)

اتنے میں انکل فیاض بھی آگئے۔ ان کے ہاتھ میں وہی اخبار تھا جو کچھ دیر پہلے علیزا کے ہاتھ میں نظر آیا تھا۔ وہ یہی اخبار اپنے بھائی فیصل کو دکھانے کے لیے اندر آئی تھی اور اچانک ہادی کے سامنے آگئی تھی۔ وہ اخبار دیکھنے لگے۔ ہادی نے بھی سرسری سی نظر دوڑائی۔ انکل فیاض صاحب کی توجہ ایک جواں سال، کلین شیو شخص کی تصویر پر تھی۔ تصویر کے نیچے ایک خبر کا متن تھا۔ یا شاید یہ کوئی آرٹیکل تھا۔ اس میں اسلامی طرز کی بینکنگ کے کچھ نکتے بیان کیے گئے تھے۔ اخبار دیکھ کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔

انکل فیاض بھی گھل مل کر ہادی سے باتیں کرتے رہے، ان میں سے ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہادی بہ طور مہمان ان کی بیٹی کے سسرال میں ٹھہرا ہوا ہے اور چند دن پہلے ان کی بیٹی کو اس نے خون بھی دیا ہے۔ اس دوران میں ہادی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ حجاب کو گھر میں پیار سے صرف ''حجب'' بھی کہا جاتا ہے۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد ہادی زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہر سکا۔ اس کا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ وہ یوں تو انکل فیاض اور خالہ صوفیہ وغیرہ سے باتیں کررہا تھا مگر دھیان مسلسل اس ''معما لڑکی'' کی طرف لگا ہوا تھا جو کہیں علیزا تھی، کہیں حجاب تھی اور کہیں صرف ایک نقاب تھی۔ یہ بڑی ڈرامائی صورت حال لگتی تھی۔ ہادی قریباً ایک گھنٹا وہاں بیٹھا۔ وہ دوبارہ نظر آئی اور نہ اس کی صورت دکھائی دی۔ گھر والوں سے رخصت ہوکر ہادی واپس اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ یہی چھوئی موئی لڑکی حجاب تھی جو علیزا ابن کر وینس میں ہادی سے ملی۔ لیکن اس کی آنکھیں اور اس کے بالوں کا رنگ؟ علیزا کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں اور بالوں کا رنگ بھی قدرے مختلف تھا۔ لیکن جو لڑکی ابھی ہادی نے انکل فیاض کے ڈرائنگ روم میں دیکھی، اس کی آنکھوں کا رنگ سیاہ نہیں تھا اور بال بھی شہد رنگ تھے۔ کسی فلم، ڈرامے کی سچویشن ہوتی تو ہادی ضرور سوچتا کہ یہ حجاب اس کی جڑواں بہن یا ہم شکل وغیرہ ہوگی۔ لیکن یہ جیتی جاگتی زندگی تھی۔ ہادی نے ڈرائنگ روم میں اسے صرف آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے دیکھا تھا۔ وہ ننانوے فیصد علیزا تھی اور پھر اس کی آنکھوں میں امڈنے والی شناسائی، تو پھر کیا معاملہ تھا؟

جب وہ وینس میں اس سے ملی تو شاید اس نے بالوں کو رنگ کیا ہوا تھا اور آنکھیں؟ آنکھوں پر لینز لگائے گئے ہوں گے۔ بالوں کو رنگنا اور مختلف رنگوں کے لینس لگانا ''فی زمانہ'' اکثر خواتین کو بہت بھاتا ہے۔

یہاں ایک اور سوال بھی تھا۔ حجاب کو وینس میں جب ہادی نے علیزا کے روپ میں دیکھا تو وہ ایک الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ اس نے پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی، بال پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے مگر یہاں وہ سرتاپا چادروں اور نقابوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ان دو روپ میں کس قدر تضاد تھا۔ کیا یہ کسی عمل کا ردعمل تھا؟ یا اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی۔ ہادی جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ اب پتا نہیں کیا بات تھی کہ علیزا یعنی حجاب کا شادی شدہ ہونا بھی ہادی کے لیے ایک عجیب سی بے نام چبھن کا باعث بنا تھا۔

ایک بات تو طے تھی۔ علیزا یا حجاب اس کی یہاں موجودگی سے سو فیصد آگاہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ان کے گھر کی انیکسی میں بطور مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں اس نے مکمل خاموشی اختیار کی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ہادی نقابوں اور چار دیواریوں کے پیچھے جھانکنے میں ناکام رہے گا اور دو چار دن میں یہاں سے چلا جائے گا اور یقیناً ہونا بھی ایسا ہی تھا۔ اگر آج اچانک علیزا کے سامنے آنے والا واقعہ نہ ہوتا تو ہادی اس تناؤ بھرے ماحول سے نکل جاتا۔

وہ گھر پہنچا۔ اب ظہیر بھی آنے ہی والا تھا لیکن ہادی اس قدر ''اپ سیٹ'' تھا کہ کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے شریفاں سے کہا کہ اس کے سر میں ہلکا درد ہے اور وہ سونے کے لیے جارہا ہے۔ اپنے کمرے میں بند ہوکر وہ دیر تک اس ''معما لڑکی'' کے بارے میں غور کرتا رہا۔ وہ علیزا نہیں تھی۔ وہ حجاب تھی اور جلال جیسے سخت گیر شوہر کی بیوی تھی۔ آج صبح سویرے بھی میاں بیوی کے درمیان کوئی گڑبڑ ہوئی تھی، روتی سسکتی بیوی کہیں جارہی تھی جب جلال نے اسے روکا تھا اور سخت رویہ اختیار کرکے اسے واپس لے گیا تھا۔ یقیناً اس وقت حجاب نے اپنے باپ کے گھر آنے کا ارادہ ہی کیا تھا۔ تب جلال نے کہا تھا کہ اگر اس نے جانا ہی ہے تو وہ خود اسے چھوڑ کر آئے گا اور اب علیزا یعنی حجاب اپنے والدین کے گھر میں تھی۔ وینس میں اپنی گفتگو کے دوران میں اس نے ہادی سے عورتوں کی مجبوریوں اور ان کے مصائب کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ ہادی کے ذہن میں تازہ تھیں۔ تو کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ باتیں جگ بیتی نہیں آپ بیتی کے زمرے میں آتی تھیں۔

خبر نہیں کہ ہادی کتنی دیر ان سوچوں میں غلطاں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ آج شب روم کی فضا میں تھوڑی سی گرمی تھی۔ شریفاں نے اس کے آنے سے پہلے ہی کمرے کا اے سی آن کردیا تھا۔ ٹھنڈک محسوس ہوئی تو ہادی نے اٹھ کر اے سی آف کردیا اور ہلکا سا پنکھا چلادیا۔ اب رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کوٹھی میں سکوت تھا، مکین سو رہے تھے۔ بس کبھی چوکیدار کی وسل کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اتنے میں ہادی کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کوئی نامعلوم نمبر تھا...... مگر اٹلی کا ہی تھا۔ ہادی نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ایک دھیمی نسوانی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

''کون بول رہا ہے؟'' ہادی نے پوچھا۔

''آ...... آپ ہادی ہی ہیں نا؟'' دوسری طرف سے دریافت کیا گیا۔

ہادی کا دل سینے میں اچھل کر رہ گیا۔ وہ پہچان گیا...... یہ علیزا ہی کی آواز تھی۔ علیزا یعنی حجاب۔ وہ خود کو سنبھالتے

ہوئے بولا۔ ”جی، میں ہادی ہوں اور آپ کو کیا کہوں؟“
”میں سمجھی نہیں؟“
”آپ کو علیزا کہوں یا حجاب؟“
دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ پھر حجاب کی مدھم آواز آئی...... ”آپ کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے ایسی کون سی غلطی کردی ہے؟“
”یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے کیا غلطی کردی لیکن...... پہلے آپ بتائیں کہ آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟“
”فیصل کے سیل فون سے لیا ہے۔“ دوسری طرف سے سپاٹ لہجے میں جواب ملا۔
”مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا کہ میں آپ کی آواز سن رہا ہوں۔“
وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”دیکھیے ہادی صاحب۔ میں نے آپ کو ایک شریف ہم وطن سمجھا اور آپ کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارا۔ ہم اکٹھے گھومے پھرے اور پھر خوش دلی سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے۔ میں آپ کے حوالے سے کچھ اچھے تاثرات لے کر لوٹی...... اور میرے خیال میں آپ کی کیفیت بھی یہی ہونی چاہیے تھی۔ یہ ایک بڑا اچھا اختتام تھا۔ مجھے آپ سے ہرگز ایسی توقع نہیں تھی......“
”کیسی توقع؟“
”یہی جو آپ کر رہے ہیں۔“ اس کا لہجہ قدرے تلخ ہوگیا۔ ”میری ٹوہ لگاتے ہوئے آپ میرے گھر پہنچے اور پھر یہاں امی کے گھر بھی پہنچ گئے۔ مم...... میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کیا چاہ رہے ہیں۔“ اس کی آواز میں خوف کی لرزش بھی شامل ہوگئی۔
”یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوا ہے۔ شاید آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ میں وہاں آئس کریم بار میں گیا تھا۔ وہاں آپ کے دیور ظہیر صاحب نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے ایک دن پہلے اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی۔ وہ اٹھ کر میری میز پر آگئے...... اور بعد میں زبردستی اپنے گھر بھی لے آئے۔“
”میں یہ بات نہیں مان سکتی۔“
”کون سی بات؟“
”یہی کہ آپ اتفاقاً آئس کریم شاپ پر آگئے تھے۔ آپ یقیناً پہلے سے میرے پیچھے تھے۔“ وینس میں اس کی آواز بھرائی ہوئی رہی تھی لیکن اب بالکل صاف اور کھنک دار تھی۔
ہادی چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوگیا۔ وہ بات تو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ وہ اتفاقاً آئس کریم بار میں نہیں گھسا تھا۔ اس نے پہلے اونچی ناک والی ماریہ کو دیکھا تھا اور پھر بار میں ”انٹری“ دی تھی۔
”میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں؟“ وہ سنبھل کر بولا۔
”آپ کو یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پلیز میری چھوٹی سی غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس کا نتیجہ میرے لیے کتنا برا نکل سکتا ہے۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے گھر والوں کو پتا چل گیا تو قیامت برپا ہوجائے گی۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔
”علیزا...... میرا مطلب ہے حجاب! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ میری وجہ سے آپ کے لیے کوئی مشکل کھڑی ہو۔ مجھے تو صرف یہ تجسس تھا کہ آپ وینس کے اس ریستوران میں بیٹھے بٹھائے اچانک کہاں چلی گئیں۔ کہیں خدانخواستہ آپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آگیا ہو۔ میں سوچتا تھا کہ اگر آپ خود گئی ہیں تو اس طرح اچانک کیوں گئی ہیں؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی جس کی وجہ سے آپ ناراض ہوئیں، یا پھر ایسی ہی کوئی اور وجہ؟“
”کوئی وجہ نہیں تھی ہادی صاحب۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ بس مجھے لگا کہ ہمیں اب الگ ہوجانا چاہیے...... اور میں آگئی۔“
”آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ میں وہاں آپ کا انتظار کرتا رہوں گا اور دیوانوں کی طرح منہ اٹھا کر گھومتا رہوں گا۔ دکانوں میں جھانکوں گا، راہ گیروں سے پوچھوں گا......“
”یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اتنی سی غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔ پلیز آپ چلے جائیں یہاں سے۔ میں ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی......“
ہادی مسکرایا اور ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔ ”اور ان سوالوں کا کیا ہوگا جو میرے ذہن میں پیدا ہوگئے ہیں۔ کچھ وہاں وینس میں اور کچھ یہاں روم میں، آپ کے گھر کو اور وہاں کے ماحول کو دیکھ کر۔“
وہ نمناک آواز میں بولی۔ ”ضروری نہیں ہوتا کہ ہر سوال کا جواب ڈھونڈا جائے اور وہ مل بھی جائے اور یہاں کوئی ایسا اہم سوال ہے بھی نہیں۔ میں ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ شادی شدہ زندگی کے جو تھوڑے بہت مسائل ہوتے ہیں وہ میرے ساتھ بھی ہیں۔ ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہاں کچھ بھی ایسا نہیں ہے ہادی صاحب! جس کی آپ جستجو کرسکیں اور جس میں

آپ کی دلچسپی کا کوئی سامان ہو۔“
ہادی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے حجاب صاحبہ! میں مانتا ہوں کہ آپ ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہیں۔ شادی شدہ اور باپردہ ہیں لیکن اسی لڑکی کو میں نے وینس میں ایک اور ہی چنچل روپ میں دیکھا ہے۔ جینز اور جوگرز کے ساتھ بھاگتے دوڑتے، جھولے جھولتے اور پیڈل بوٹ چلاتے۔ اس لڑکی میں اور آپ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“
”بب...... بس سمجھیں کہ وہ ایک...... ڈراما تھا، جو مجھے کسی مجبوری کی وجہ سے کرنا پڑا، کسی کی خاطر۔ آپ اس کے لیے مجھے معاف کردیں۔ میں ساری زندگی آپ کی شکر گزار رہوں گی۔“ وہ پھر روہانسی ہوگئی۔
اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ بات کو لپیٹ رہی ہے۔ سچائی کے قریب بھی جانا نہیں چاہتی۔ ہادی بھی اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ ایک تخلیق کار تھا۔ انسانی نفسیات کی گتھیوں کو سمجھنا اور سلجھانا اسے پسند تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا چل رہا ہے۔ وہ کیا خوف ہے جس نے اسے اور اس کے ماں باپ کو اس بری طرح جکڑ رکھا ہے۔ لڑکی والوں کا لڑکے والوں سے دب کر رہنا کوئی انوکھی بات نہیں ہوتی لیکن یہاں یہ صورت حال کچھ زیادہ گمبھیر تھی بلکہ اسے ترس ناک کہنا مناسب تھا۔
پھر ہادی کے ذہن میں وہ تصویر والی بات آئی۔ وہاں حجاب کے میکے میں ایک کمرے کے اندر ایک لڑکی کی دیوار گیر تصویر لگی تھی۔ اس کے نیچے غالباً حجاب کے ہاتھ سے لکھا گیا تھا۔ ”میں تمہیں کبھی بھول نہ پاؤں گی۔“
حجاب فیاض۔
وہ کون لڑکی تھی؟ کیا اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آچکا تھا یا وہ کسی وجہ سے علیزا یعنی حجاب سے جدا ہوگئی تھی۔ بہت سے سوال ہادی کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔
”آپ کی ایک چیز میرے پاس پڑی ہے۔ وہ میں آپ کو واپس دینا چاہتا ہوں۔“ ہادی نے بات بنائی۔
”آپ پارکر پین سیٹ کی بات کر رہے ہیں۔ وہ آپ کا...... حق بنتا تھا۔ آپ نے زبردستی کرکے ہر جگہ اپنا پرس کھولا تھا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا...... آپ ویسے تو ہرگز پیسے نہ لیتے۔ میں نے قلم آپ کے بیگ میں رکھ دیے۔“
”اگر آپ نے اتنی ہی باریکی سے حساب کتاب کرنا تھا تو پھر پورا کرلیتیں۔ میرے پاس سب لکھا ہوا ہے۔ ڈائری میں حساب لکھنا میری Habit ہے۔“
”کیا...... کچھ اور نکلتے ہیں میری طرف سے؟“
”نہیں آپ کے نکلتے ہیں...... کم از کم 60 یورو۔“
”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ رکھی لہجے میں بولی۔ ”آپ نے کچھ اور بھی تو کیا ہے میرے لیے۔ مجھے پتا ہے جب میں اسپتال میں تھی تو آپ نے مجھے خون دیا۔ اس کی قیمت تو میں چکا ہی نہیں سکتی۔ بس آپ کے احسان کا شکریہ ادا کرسکتی ہوں۔“
”تو پھر آپ نے مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع کیوں نہیں دیا؟“
”چلیں غلطی ہوگئی۔ اب اس کے لیے بھی مجھے معاف کردیں...... اور پھر، صرف ایک درخواست ہے آپ سے۔ پلیز آپ چلے جائیں۔ ایک اچھے دوست کی حیثیت سے میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ اس کے لہجے میں عجلت اور بیگانگی تھی۔
یہ عجلت اور بیگانگی ہادی کو بری لگ رہی تھی۔ وہ اس سے کم از کم ایک بار تو ضرور ملنا چاہتا تھا اور وہ اس پوزیشن میں تھا بھی کہ علیزا کو اس کے لیے مجبور کرسکتا۔ ویسے بھی وہ آٹھ دس دن کے لیے میکے آئی ہوئی تھی۔ تھوڑا بہت وقت نکال سکتی تھی۔
اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے علیزا...... میرا مطلب ہے حجاب صاحبہ! آپ کہتی ہیں تو میں چلا جاتا ہوں بلکہ شاید دو چار دن میں اٹلی سے ہی چلا جاؤں لیکن ایک چھوٹی سی بے ضرر شرط ہے۔ امید ہے آپ قبول کریں گی۔“
”کیا؟“ وہ ڈری ڈری آواز میں بولی۔
”آپ نے مجھے دوست کہا ہے...... اور میں حقیقتاً ایک مخلص دوست ہی ہوں۔ کم از کم ایک بار مجھ سے کہیں مل لیں، بس تھوڑی دیر کے لیے۔ ہم ایک دوسرے کو اچھے طریقے سے خدا حافظ کہہ دیں گے۔“
وہ چپ رہی...... ہادی نے سمجھا شاید سوچ رہی ہے لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ مزید بیگانہ ہوچکا تھا۔ ”معاف کیجیے ہادی صاحب! یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔“
”لیکن میں تو آپ کی بات مان رہا ہوں۔“
”تو اس کا کیا مطلب ہے؟...... میں یہ سمجھوں کہ...... آپ مجھے بلیک میل کرنا چاہ رہے ہیں؟“
”یہ کیسی بات کررہی ہیں آپ؟“
”وہی جو آپ سمجھا رہے ہیں مجھے۔“ اس کا لہجہ مزید تلخ ہوگیا۔ ”افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ ہم نے ایک بڑے اچھے موڑ پر بات ختم کی

تھی لیکن آپ پھر دندناتے ہوئے آگئے ہیں میرے گھر تک۔ آپ...... آپ وہی کچھ کر رہے ہیں جو آپ جیسے مرد کرتے ہیں...... آپ میں اور ان مردوں میں شاید کوئی فرق نہیں جو عورت کو بس ایک ہی روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس کو بس گھیرنا چاہتے ہیں۔" اس کا لہجہ آتشیں ہو گیا۔

"یہ کیسی بات کر رہی ہیں آپ؟"

"پلیز شٹ اپ...... پلیز شٹ اپ!" وہ پھنکاری "مجھے نہیں بلیک میل ہونا ہے آپ سے۔ میں نہیں مل سکتی...... نہیں مل سکتی۔ مجھے شرم آرہی ہے کہ میں نے آپ کو دوست کہا۔ آپ کے ساتھ وقت گزارا۔ مجھے شرم آرہی ہے......" اس کی آواز غصے سے بھرا گئی۔

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں......"

لیکن دوسری طرف سے رابطہ کٹ چکا تھا۔ ہادی نے کچھ دیر فون کان سے لگائے رکھا پھر مرے مرے انداز میں نیچے رکھ دیا۔ اسے حجاب سے اتنے شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی۔

اسے غلطی کا احساس ہونے لگا۔ شاید اسے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ یہاں سے جانے کے لیے اس سے ملنے کی شرط نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ یقیناً اس نے محسوس کیا تھا کہ ہادی اس پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ اپنے حالات کی وجہ سے وہ پہلے ہی ڈپریشن میں تھی، اب مزید ڈپریسڈ ہو گئی تھی۔

ہادی کو افسوس ہونے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد اسی نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ خاموش ہو چکا تھا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر اس نمبر پر کال کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اب نمبر تو آن ہو گیا تھا لیکن کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ وہ قریباً ایک گھنٹے تک وقفے وقفے سے کوشش کرتا رہا۔ آخر ایک جوابی ایس ایم ایس آیا۔ یہ اسی نمبر سے تھا۔ حجاب نے بس اتنا لکھا تھا۔ "پلیز پلیز پلیز۔ میرے حال پر رحم کر دیں۔"

حجاب کی شکل ہادی کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ وہی تابندہ پیشانی، وہی جاذب نقوش جن میں معصومیت کا عنصر نمایاں تھا۔ اس کے ساتھ ہی خالہ صوفیہ کا مہربان چہرہ بھی نگاہوں میں گھوما۔ یہ ماں بیٹی مشکلات کا شکار تھیں بلکہ پورا گھرانا ہی شکار تھا۔ ہادی ان کی مشکلات میں اضافے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر گم صم رہنے کے بعد اس نے موبائل فون اٹھایا...... اور ایس ایم ایس لکھ دیا۔ "او کے حجاب! میں وہی کروں گا جو آپ چاہتی ہیں۔ گڈ بائے۔"

ایس ایم ایس لکھ کر جیسے اس کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ وہ کچھ دیر تک حجاب کے کسی جوابی میسج کا انتظار کرتا رہا۔ جب نہیں آیا تو وہ تھوڑی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد سو گیا۔

اگلے روز ہادی صبح اٹھا تو طبیعت میں کچھ بھاری پن تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ شریفاں کو آواز دے اور بیڈ ٹی کے لیے کہے لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ وہ انیکسی میں نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو کہیں نہ کہیں سے کھٹ پٹ کی آوازیں ضرور آرہی ہوتیں۔ وہ شاید رہائشی حصے کی طرف گئی ہوئی تھی۔ وہ یونہی لیٹا رہا۔ رات والی فون کال کی ساری تفصیل ذہن میں تازہ ہونے لگی۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ آج سہ پہر تک یہاں سے چلا جائے گا۔

کچھ دیر بعد شریفاں خود ہی کمرے میں نمودار ہو گئی۔ "سلاماں لیکم صاحب جی۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"کہاں چلی گئی تھیں؟" ہادی نے پوچھا۔

وہ ذرا منہ بنا کر بولی۔ "وہی بی بی ارم کے لیے نیو والا قہوہ بنانے کے لیے۔ وہ صبح سویرے پیتی ہیں۔ کافی نخرے شخرے ہیں ان کے۔ بس اب آگئی ہیں نا۔ میری جان کو مصیبت پڑی رہے گی۔"

"کیوں تمہیں ان کا آنا اچھا نہیں لگا؟"

"کسی کو بھی نہیں لگتا جی، بلکہ میرا تو اندازہ ہے کہ خود فوزیہ باجی کو بھی چنگا نہیں لگتا۔ پر وہ پھر بھی آجاتی ہیں بلکہ...... اب تو...... سنا ہے کہ پکا ہی آگئی ہیں۔ ان کا داخلہ یہاں کے ایک کالج وچ ہو گیا ہے۔ اب ادھر ہی رہیں گی۔ مان نہ مان، میں تیرا مہمان۔" شریفاں نے بیزاری سے سر ہلایا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسے زیادہ پسند نہیں کرتی۔

اتنے میں ظہیر بھی آگیا۔ ہادی نے کل رات ہی ظہیر کو ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ وہ اب ذرا چینج چاہ رہا ہے۔ اس کے دوست نے یہاں کے ایک ہوٹل واسکوڈے میں قیام کیا تھا۔ اب وہ بھی دو چار روز وہاں رہنا چاہتا ہے ورنہ اسے روم کی سیر ادھوری لگے گی۔

ظہیر نے ہادی کو روکنے کی کوشش تو کی تھی لیکن زیادہ جوش سے نہیں، ہادی کو اندازہ ہوا تھا کہ شاید ظہیر کے بھائی جان جلال، یہاں مہمان خانے میں ہادی کے طویل قیام کو زیادہ پسند نہیں کر رہے۔ پچھلے سات آٹھ روز

میں وہ صرف ایک بار یہاں آکر ہادی سے ملے تھے اور وہ بھی کھڑے کھڑے اس دوران میں بھی جناب کا فون مسلسل بجتا رہا تھا۔

ظہیر کے آتے ہی شریفاں باہر چلی گئی۔ ظہیر نے مایوس لہجے میں کہا۔ "یار! اب تو تمہارے ساتھ دل لگنا شروع ہوا تھا۔ اب تم اڑن چھو ہو رہے ہو۔ ابھی تو ارم کسی ہوٹل میں تمہیں ڈنر دینا چاہ رہی تھی۔"

"اس نے کہہ دیا ظہیر بھائی تو سمجھیں ڈنر ہو گیا۔ میری بہن سے میری طرف سے معذرت کر دینا۔"

"یہ معذرت تو تمہیں خود ہی کرنا پڑے گی۔ ابھی بھائی جلال جاتے ہیں تو وہ تم سے ملنے آتی ہے۔"

ظہیر کے فقرے سے ہی ظاہر تھا کہ اس گھر میں کوئی بھی کام کرنے سے پہلے جلال الدین کی خوشی یا ناراضی کا سوچا جاتا ہے۔ جن کاموں میں اس کی ناراضی کا ڈر ہو وہ اس کی غیر موجودگی میں کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ارم اس سے ملنا چاہ رہی تھی لیکن ابھی تک نہیں ملی تھی۔

سہ پہر تک ہادی جانے کے لیے سامان پیک کر چکا تھا۔ ان چند دنوں میں شریفاں کے ساتھ اس کی کافی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ وہ آزردہ نظر آرہی تھی۔ اپنی گلابی اردو میں بولی۔ "ایتھے تے سب ہی ٹھیٹ اردو میں گل کرتے ہیں۔ میری تو زبان کو ول پے گیا ہے اردو بول بول کے۔ آپ نے اک دو واری میرے نال پنجابی چے گل کیتی ہے تو مجھے اپنے پنڈ کے کھیتوں اور باغوں کی خوشبو آئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں شریفاں! میں تمہیں کبھی کبھی فون کیا کروں گا۔" ہادی نے کہا۔

اس دوران میں ارم بھی آگئی۔ اس نے چادر کا رسمی سا نقاب کر رکھا تھا۔ اس نقاب نے صرف اس کے ہونٹ اور ناک کا مختصر سا حصہ چھپایا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ پردے کی عادی نہیں مگر یہاں جلال الدین کی مرضی پر چلنا پڑتا تھا۔ ارم قبول صورت تھی، ہو سکتا ہے کہ وہ عمر میں حجاب سے کچھ چھوٹی ہو لیکن اپنے خدوخال کی وجہ سے حجاب کی ہم عمر ہی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور ایک خاص طرح کی ہوشیاری تھی۔ اس نے ہادی کو بھائی جان کہہ کر مخاطب کیا اور کہا کہ وہ ہادی کو بطور گیت نگار جانتی ہے اور ٹی وی سے نشر ہونے والے اس کے ایک دو گیت اسے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس نے چار پانچ منٹ ہادی سے بات کی۔ وہ گفتگو کا فن جانتی تھی اور ان لوگوں میں سے تھی جو بات چیت کے دوران میں اپنے بارے میں کم بتاتے ہیں اور دوسرے کے متعلق زیادہ سے زیادہ جان لیتے ہیں۔

ظہیر نے اطلاع دیتے ہوئے بتایا۔ "بھائی جلال کی کوشش سے ارم کو یہاں روم کی ہی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ہے۔ اب اسے وینس کی دال روٹی نہیں کھانا پڑے گی۔"

وہ شوخی سے بولی۔ "جیجا جی! دال روٹی تو خیر میں وہاں بھی نہیں کھاتی تھی...... بہترین Cook بن گئی ہوں ان دو چار مہینوں میں۔ اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ آپ مجھے مستقل کام پر لگا دیں گے تو آپ کو اپنی کوکنگ کے ایک دو نمونے ضرور دکھاتی۔"

"بہت دور کی سوچتی ہو بھئی تم۔ تمہیں تو اقوام متحدہ کے پلاننگ سیکشن میں ہونا چاہیے۔" ظہیر نے کہا اور ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے اس کی توند علیحدہ سے ہنستی تھی۔

شریفاں برا سا منہ بناتے ہوئے باہر چلی گئی تھی۔ ہادی کو ارم کا کردار کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس گھر میں اس کی موجودگی کو اس کی سگی بہن بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی تھی، پھر بھی وہ یہاں موجود تھی۔

شام سات بجے کے لگ بھگ ہادی اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ یوں تو وہ ظہیر، شریفاں اور ارم وغیرہ سے کہہ کر آیا تھا کہ ان سے فون پر رابطہ رکھے گا، تاہم وہ اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس نے حجاب سے جو کمٹمنٹ کی ہے اس پر پورا اترے اور اب ان لوگوں کی زندگی میں کسی طرح کا کوئی دخل نہ دے۔ خاک ڈال دے سارے معاملے پر۔ غالباً حجاب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ان دونوں کے اس بے ضرر تعلق کے بارے میں کسی کو پتا چل گیا تو قیامت آجائے گی۔ وہ اس گھر کا گھٹن سے پر ماحول دیکھ چکا تھا اور خاص طور سے جلال الدین کا رویہ بھی ملاحظہ کر چکا تھا۔ اسے معلوم تھا جلال جیسے لوگ ایسے معاملوں میں بے حد "کچے" اور جذباتی ہوتے ہیں۔

☆☆☆

اگلے پانچ چھ روز ہادی نے روم میں گھومتے ہوئے ہی گزارے۔ اسے تاریخ میں بہت دلچسپی تو نہیں تھی لیکن وہ جن جگہوں کی سیاحت کرنا چاہ رہا تھا ان کے بارے میں اس نے کچھ نہ کچھ پڑھا تھا۔ روم میں جو چند جگہیں اسے لازمی دیکھنا تھیں۔ ان میں پونڈ آف وشز یعنی خواہشوں کا تالاب۔ کولیسیئم یعنی وہ قدیم جنگی اکھاڑا جہاں انسان بھوکے شیروں سے لڑتے تھے...... گلیڈی ایٹر اسکول جہاں سیاحوں کو بتایا جاتا ہے کہ گلیڈی ایٹر کیسے بنا جاتا ہے...... اور

پھر روم سے ذرا آگے پومپائی کے کھنڈرات جہاں انسان لاوے میں منجمد ہیں، اور روم کی بڑی مسجد جو یورپ کی سب سے بڑی مسجد بھی ہے اور ''ویٹی کن'' یعنی عیسائیوں کا مقدس شہر وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے پونڈ آف وشز وہ دیکھ چکا تھا باقی لاتعداد جگہیں ابھی دیکھنے والی تھیں۔ وہ صبح سویرے نکل جاتا اور شام کو تھکن سے چور ہو کر واپس آجاتا۔ یہ مصروفیت اس کے لیے ایک طرح سے سودمند بھی تھی۔ وہ علیزا یعنی حجاب کی طرف سے اپنی توجہ ہٹانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اس کی تابندہ پیشانی، اس کے جاذب نقوش اور نقوش کے پیچھے چھپے ہوئے مسائل دھیرے دھیرے اس کی سوچ میں دھندلانے لگے۔ اٹلی کے پیزے کے بارے میں اس نے بہت سنا تھا بلکہ اسے معلوم ہوا تھا کہ پیزا ایجاد ہی اٹلی سے ہوا تھا۔ یہاں اسے بیسیوں قسم کے پیزے دیکھنے کو ملے۔ کھانے کے وقت جہاں کوئی اچھی پیزا شاپ نظر آتی وہ اس میں گھس جاتا۔ اس نے مقامی دوستوں میں سے صرف دو بندوں کو بتایا تھا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے اور ساتھ ہی ان کو تاکید بھی کردی تھی کہ وہ اس قیام کو راز میں رکھیں۔ وہ کاغذ اور قلم سے دور ہونے کے لیے یہاں آیا تھا لیکن یہ دوست احباب اسے پھر ان چیزوں کی طرف گھسیٹ لاتے تھے۔ وہ چند ہفتے آزادی کے چاہتا تھا، مکمل آزادی کے۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ اسے اپنے اردگرد کوئی شناسا چہرہ نظر ہی نہ آئے۔ بس وہ اجنبی لوگوں کے درمیان، اجنبی جگہوں پر گھومتا رہے اور اس کے کانوں میں اجنبی، ناقابل فہم الفاظ ہی پڑتے رہیں۔ اگلے تین چار دن میں دوبار ظہیر کا فون آیا۔ ہادی نے اس سے بھی مختصر بات ہی کی۔ اس کے دل میں کوئی کھدبد پیدا ہو چکی تھی۔ وہ اس کھدبد کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ کسی ایسی کیفیت کا اسے پہلے کبھی کوئی تجربہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ اس کے سینے میں کوئی پتھریلی جگہ اچانک نرم گداز شکل اختیار کر گئی ہے۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹتا تو اس کی سماعت کو وہی الفاظ مجروح کرنے لگتے جو اپنی فون کال میں حجاب نے کہے تھے...... ''آپ سب مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ عورت کو بس ایک ہی روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس کو کسی طرح گھیرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ مجھے شرم آرہی ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ وقت گزارا۔''

چند دن تو ان جملوں کی تلخی کافی شدید رہی، پھر ان کی کاٹ کا اثر کم ہونے لگا۔ بالکل جیسے حادثات اور ناپسندیدہ واقعات کے برے اثرات بتدریج معدوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن سینے کے اندر کا وہ بے نام گداز جوں کا توں رہا۔

یہ تویں دسویں روز کا واقعہ ہے۔ ہادی اپنے ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ یہ بالکونی یہاں کی اکثر بالکونیوں کی طرح پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ یہ ہوٹل کا سیکنڈ فلور تھا اور یہاں سے نیچے سڑک کا منظر واضح نظر آتا تھا۔ ٹریفک رواں دواں تھی۔ اس ٹریفک میں کھلی چھت کی لگژری کاریں اور ہر طرح کے اسکوٹر بھی نظر آتے تھے۔ شام کا جھٹپٹا دھیرے دھیرے رات کی سیاہی میں ڈھل رہا تھا اور روم کی ہزار ہا روشنیاں نمایاں ہوتی جارہی تھیں۔ سڑک کی دوسری جانب ایک کشادہ گلی میں ایک کار پارک تھی۔ اس میں ایک مخمور جوڑا رومانی موڈ میں موجود تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بازوؤں میں لیا ہوا تھا، لپٹ رہے تھے، چوم رہے تھے اور اس طرح کی دیگر حرکات میں مصروف تھے۔ ہادی کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ چھوٹی سی کار اب اس بپھرے ہوئے جوڑے کے لیے ناکافی ہے اور اب وہ کہیں اور جانا چاہیں گے۔ شاید کسی ہوٹل میں یا پھر کسی گھر کے بیڈروم میں اور پھر یہی ہوا۔ کار وہاں سے روانہ ہوگئی۔ ہادی نے اپنی توجہ دیگر مناظر کی طرف مبذول کردی۔ مناظر کی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ ہر مزاج کے شخص کے لیے ہر طرح کا سنجیدہ اور غیر سنجیدہ منظر یہاں موجود تھا۔

اچانک ہادی کے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے اسکرین دیکھی۔ مقامی نمبر تھا۔ وہ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر ایک دم اس کی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہوگئی۔ اس نمبر سے ایک بار حجاب نے اسے فون کیا تھا۔ تو کیا یہ حجاب تھی؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس نے لرزتی انگلیوں سے کال ریسیو کی۔

دو سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کھنک دار نسوانی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو کون؟'' ہادی نے جانتے بوجھتے سوال کیا۔

''میں حجاب بول رہی ہوں، کیسے ہیں آپ؟''

''بس ٹھیک ہوں۔'' ہادی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''کہاں پر ہیں اس وقت؟''

''یہیں روم سینٹرم میں واسکوڈے ہوٹل ہے۔ آپ نے کیسے یاد کیا؟''

''بس یونہی، دل چاہ رہا تھا بات کرنے کو۔ آپ اس وقت مصروف تو نہیں؟''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''یہ ہوٹل واسکوڈے یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میٹرو ٹرین کے ذریعے دس منٹ کا راستہ ہے...... آپ کا روم نمبر کیا ہے؟''

ہادی کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ ''118، سیکنڈ فلور...... لیکن...... کیا آپ آنا چاہ رہی ہیں؟''

''شاید۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''مجھے آپ ناراض لگ رہے ہیں۔ ہماری جو آخری بات چیت ہوئی وہ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مجھے آپ سے اس طرح نہیں بولنا چاہیے تھا......''

ہادی کو ڈر محسوس ہوا کہ وہ کہیں فون پر ہی معافی تلافی نہ کرلے۔ وہ ذرا زور سے بولا۔ ''آپ کی آواز صاف نہیں آرہی۔ شور آ گیا ہے لائن میں......''

''اچھا چلیں...... میں آتی ہوں آپ کے پاس۔'' وہ بھی ذرا زور سے بولی۔ ''قریباً آدھ گھنٹا لگے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں ہوٹل میں ہی ہوں۔'' ہادی نے بلند آواز میں کہا۔

فون بند کر کے وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ سیل فون اس کی ٹھوڑی کو چھو رہا تھا۔ یہ کیسی کایا کلپ ہوئی تھی۔ ہادی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح حجاب کا فون آئے گا۔ نہ صرف فون آئے گا بلکہ وہ خود بھی ہوٹل آنے کو تیار ہوگی۔

اس نے جلدی جلدی کمرے میں بکھری ہوئی اشیا سمیٹیں۔ بیڈ شیٹ درست کی۔ لباس چینج کیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد وہ وہاں پہنچ گئی۔ وہ چمکیلی دھاریوں والی اسی سیاہ چادر میں تھی جس میں پہلے بھی یہاں نظر آتی رہی تھی۔ نقاب میں سے بس اس کی دلکش آنکھیں اور ناک کا تھوڑا سا حصہ نظر آرہا تھا۔ کندھے سے بیگ جھول رہا تھا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے چادر میں لگی ہوئی Pins کھولیں اور اسے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اسٹائلش شلوار قمیص میں تھی۔ یہ ہاف سلیو قمیص تھی جو اس کے چمکیلے بازوؤں کو نمایاں کررہی تھی اور متناسب جسم پر بہت جچ رہی تھی۔ ''آپ کیا پئیں گی؟''

''کچھ نہیں، بس بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہیے۔''

''گرین ٹی منگوا لیجیے۔'' اس نے کہا۔

اس میں آج پھر اسی علیزا کی جھلک نظر آرہی تھی جس سے وینس میں ملاقات ہوئی تھی۔ تاہم وہ کچھ افسردہ بھی دکھائی دیتی تھی۔ نجانے کیوں اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں دیکھ کر ہادی کو احساس ہوا کہ ان پلکوں کے پیچھے کوئی گمبھیر غم کروٹیں لیتا رہا ہے اور شاید چند گھنٹے پہلے تک وہ روتی بھی رہی ہے۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' وہ مسکرائی۔

''یہی کہ آپ کی آنکھوں کا یہ رنگ اصلی ہے یا وہ اصلی تھا جو وینس میں دیکھا۔''

''اس وقت میں نے لینس لگا رکھے تھے...... اور بال بھی ڈائی کیے ہوئے تھے۔ اصلی وہی ہے جو آپ کو اس وقت نظر آرہا ہے۔'' وہ پھر مسکرائی اور اس کی پیشانی کا چاند چمک اٹھا۔

''آپ نے کہا تھا کہ کوئی مجبوری تھی اس وقت...... جس کے سبب آپ کو وہ رنگ روپ اختیار کرنا پڑا۔''

''مجبوری ہی کہہ لیں۔ لیکن...... کیا آپ کو صرف پرانی باتیں ہی کرتے رہنا ہے۔ کوئی نئی بات کریں بھئی۔ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں کہاں گھوم رہے ہیں؟ اور آج کل موڈ کیا ہے آپ کا وغیرہ وغیرہ؟ کہیں مجھے آپ کے کان کے پاس پھر تو کوئی غبارہ نہیں پھوڑنا پڑے گا؟'' اس نے کہا اور خود ہی ہنس دی۔

''صورتِ حال تو آپ نے کچھ ایسی ہی بنا دی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ سنبھال لیا خود کو۔'' ہادی نے بوجھل آواز میں کہا۔

وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ یہ بڑا پیارا انداز تھا اس کا۔ چند سیکنڈ بعد بولی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ سے اس طرح کا رویہ اختیار کیا۔ میں واقعی معافی چاہتی ہوں آپ سے۔ دیکھیے چل کر آپ کے پاس آگئی ہوں، گھر آنے والے تو جانی دشمن کو بھی معاف کر دیا جاتا ہے۔''

''چلیں، آپ کو احساس ہو گیا، میرے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔ یقیناً مجھ سے بھی بے وقوفی ہوئی کہ میں نے آپ پر دباؤ ڈال کر آپ سے ملاقات کرنا چاہی۔ اس کے لیے میں بھی بہت معذرت چاہتا ہوں۔''

''نو مینشن ہادی صاحب۔ اٹ از اوکے۔ اب بتائیے کیا پروگرام ہے آپ کا؟''

''وہی جو آپ نے حکم دیا تھا۔ کل سویرے جا رہا ہوں اٹلی سے۔ آسٹریا کا پروگرام ہے۔'' ہادی نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

''لگتا ہے کہ واقعی آپ کے کان کے پاس کوئی بڑا سا

غبارہ پھوڑنا پڑے گا۔" ہادی ہنسنے لگا۔ وہ بھی ہنس دی۔ لوگ دانتوں کو موتیوں سے تشبیہہ دیتے ہیں، وہ واقعی موتی تھے اور ان کی چمک پیشانی سے ہم آہنگ ہو کر اس کی مسکراہٹ کو ایک بے مثال دلکشی دے دیتی تھی۔

ہادی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "مذاق کر رہا تھا، فی الحال تو کہیں نہیں جا رہا...... اور جی تو یہی چاہتا ہے کہ جتنے دن یہاں روم میں ہوں، آپ میرے ساتھ گھومیں پھریں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ آپ کے لیے ناممکن ہے۔ آپ کے گھر والے خاص طور سے سسرال والے تو کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتے۔"

وہ عجیب نظروں سے ہادی کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسا ہو...... اور میرے ایسا کرنے سے آپ تہ دل سے میری معذرت قبول کر سکتے ہیں تو میں ایسا کر سکتی ہوں۔"

اب ایک بار پھر ہادی کے لیے شدید حیرت کا موقع تھا۔ وہ روم میں اس کے ساتھ کیسے گھوم پھر سکتی تھی۔ جلال جیسا شخص یہ کیونکر برداشت کر سکتا تھا؟ وہ تو شاید خون پی جاتا اس کا۔ ہادی کی اب تک کی معلومات کے مطابق وہ دولت مند ہی نہیں کافی بااثر شخص بھی تھا۔ مقامی انتظامیہ میں بھی اس کے رابطے تھے۔ میلانو جیسے شہر میں شاپنگ سینٹر تعمیر کرنا کوئی معمولی کام تو نہیں تھا۔ غرض، وہ ہر لحاظ سے ایک دبنگ بندہ تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ ادا سے بولی۔

"یہی کہ آپ مذاق کر رہی ہیں یا واقعی ایسا کر سکتی ہیں۔"

"میں کر سکتی ہوں لیکن ایک شرط کے ساتھ۔"

"وہ کیا؟"

"میں چادر میں رہوں گی۔"

ایک دم بات ہادی کی سمجھ میں آگئی۔ بڑا سادہ اور آسان حل تھا۔ اگر وہ حسب معمول پردے میں ہوتی اور اس کے ساتھ گھومتی پھرتی...... تو اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو نہ دیکھ پاتا۔ یہ تو سلیمانی ٹوپی جیسا معاملہ تھا۔ ٹوپی پہنی اور منظر سے غائب۔ صرف آنکھوں کو دیکھ کر تو اس کے گھر والے بھی اسے نہیں پہچان سکتے تھے۔ اسے صرف ایک نئی چادر اور نئی جوتی کی ضرورت ہوتی۔

"زبردست!" ہادی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ یہ حجاب کا وہی خاص موڈ ہے جو وینس میں نظر آیا تھا۔

دروازے پر شائستہ دستک ہوئی اور روم سروس والا چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آگیا۔ حجاب خود ہی کھڑی ہو کر چائے بنانے لگی۔ ہادی نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ ٹرالی پر جھکی ہوئی تھی۔ شہد رنگ بالوں کی دو لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ کمان کی طرح خم کھایا ہوا جسم دلکش نظر آ رہا تھا۔ اس کا حسین سراپا کسی بھی دیدہ ور کو اس کے عشق میں مبتلا کر سکتا تھا...... اور جلال نے اس کی ناقدری کی انتہا کر دی تھی۔ ہادی نے سوچا، ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو چیز آسانی سے حاصل ہو جائیں وہ اپنی قدر کھو دیتی ہیں۔

انہوں نے بڑے اچھے موڈ میں چائے پی۔ ہادی نے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ صرف چوبیس پچیس دن پہلے وہ اسپتال میں تھی لیکن اب بیماری کے آثار اس پر نہ ہونے کے برابر تھے۔ غالباً وہ سخت جان بھی تھی۔ کسی ایسے ساز کے تار کی طرح جو رات بھر بجتا رہتا ہے لیکن صبح پھر تنا ہوا نظر آتا ہے۔ ہادی نے اس سے انکل فیاض اور خالہ صوفیہ کا حال احوال پوچھا۔ خاص طور سے خالہ صوفیہ کا۔ ان کا اسپتال میں بے ہوش ہو جانا اور پھر گھر والوں سے یہ بات چھپانا ابھی تک ہادی کے ذہن میں تازہ تھا۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر اگلے روز دس بجے آنے کا وعدہ کر کے وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد بھی ہادی ہکا بکا بیٹھا رہا۔ وہ کیا شے تھی؟ اس کی کوئی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ نجانے کیوں ہادی کو لگ رہا تھا کہ وہاں حجاب کے میکے یا سسرال میں کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کے ردعمل میں اس کے مزاج میں یہ اچانک تبدیلی آئی ہے۔

وہ کل سے شریفاں کو فون کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا تھا کہ وہ اس سے گاہے بگاہے بات کرتا رہے۔ یہ اچھا موقع تھا۔ اس وقت وہ انیکسی میں ہی ہوتی تھی۔ ہادی نے نمبر ملایا۔ چند ہی سیکنڈ بعد شریفاں کی پاٹ دار آواز سنائی دی "ہیلو، کون بول رہا ہے؟" وہ پنجابی لہجے میں بولی۔

"تمہارا لاہوری بھائی ہادی۔"

"او ہو لہوری بھائی جان! تسی تے کمال کر دتا۔ بڑی لمبی حیاتی ہے آپ کی۔ یقین کرو میں آپ کے بارے وچ ای سوچ رہی تھی۔ کیسے ہیں آپ؟ کہاں ہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے؟ مجھے تو فکر پڑی ہوئی ہے کہ آپ کو بازاری کھانے...... کھانے پے رہے ہوں گے۔ کتنا چنگا ہوتا کہ آپ یہاں سے جاتے ہی نہ۔ کیا آپ واپس نہیں

آسکدے؟" وہ اوپر تلے سوال کرتی چلی گئی۔

ہادی نے اس کے سوالوں کے جواب دیے۔ رسمی باتیں کیں۔ حال احوال پوچھا۔ پھر باتوں ہی باتوں میں دریافت کیا۔ "تمہاری وڈی باجی میکے سے آگئی ہیں کہ نہیں؟"

وڈی باجی یعنی حجاب کے ذکر پر وہ ایک دم اداس سی ہوگئی۔ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ "وہ تو وچاری حکم کی بندی ہیں جی۔ جب وڈے بھائی جان کا آرڈر ہوگا وہ آجائیں گی۔ کتنی بھی دکھی ہوں گی بس دوڑی چلی آئیں گی۔ وہ بڑے مصروف ہیں، خود تو لینے کم ہی جاتے ہیں۔ بس چھوٹے بھائی جان ظہیر کو بھیج دیتے ہیں یا ڈرائیور وغیرہ کو۔"

"وڈی باجی کے دکھی ہونے کی بات کیوں کی تم نے؟ کیا کوئی مسئلہ ہوا ہے؟"

"کوئی اک مسئلہ ہو تو پھر ہے ناجی۔ یہاں تو مسئلے ہی مسئلے ہیں...... سب سے وڈا مسئلہ تو...... بس...... کچھ نہ پچھیں جی۔" وہ کہتے کہتے بات بدل گئی۔

"شریفاں! تم بات بھی کرتی ہو اور ڈرتی بھی رہتی ہو۔ اچھی بہن ہو تم؟ میں نے تم سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ تم اگر کچھ کہو گی تو وہ صرف اور صرف میرے تک رہے گا...... یا تو بات شروع نہ کیا کرو یا پھر پوری کردیا کرو۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ "صیب جی! آج کل سب سے وڈا مسئلہ تو یہ بی بی ارم ہی بنی ہوئی ہے۔ پتا نہیں کہ اس نے کیا چن چڑھانا ہے۔ چنگی بھلی چلی گئی تھی دوجے شہر میں۔ اب پھر آگئی ہے۔ پہلے وڈے بھائی جان کہتے تھے کہ آٹھ دس دن ایتھے رہے گی پھر ہوسٹل شوسٹل میں چلی جائے گی۔ پر اب ایتھے ای ٹک گئی ہے، اس کا سامان شامان بھی آگیا ہے گھر وچ۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" ہادی نے پوچھا۔

"سب نوں پتا ہے جی کہ باجی حجاب اس ارم بی بی سے چڑ کھاتی ہیں، وہ بڑی چاپلوسیاں کرتی ہے وڈے بھائی جان کی۔ آگے پیچھے گھومتی رہتی ہے۔ اس کو یہاں کی یونیورسٹی وچ داخل کرانے والے بھی وڈے بھائی جان ہی ہیں۔ یوں لگدا ہے کہ وہ ہولی ہولی اس گھر وچ اپنا رستہ بنا رہی ہے۔ اندر وڑ رہی ہے اس گھر کے۔ اب پرسوں سے اک ہور کم شروع ہوگیا ہے۔ پتا نہیں کہ باجی حجاب کو اس کا پتا چلا ہے کہ نہیں۔ اج نہیں تو کل چل جائے گا۔ ان کو بڑا دکھ ہونا ہے اس کا۔ وہ ابھی ابھی تو بستر سے اٹھی ہیں وچاری۔"

"کون سا کام شروع ہوا ہے؟" ہادی نے عام سے انداز میں پوچھا۔

"اب جناب وڈے بھائی جان اپنی کار وچ بی بی ارم کو یونیورسٹی چھڈ کے آتے ہیں۔ یونیورسٹی، اسٹور کے رستے میں آتی ہے۔ اسٹور جانے کے لیے نکلتے ہیں تو اس بی بی کو بھی اپنے نال بٹھا لیتے ہیں۔ اب تو صاف پتا چلنے لگا ہے جی کہ یہ بی بی ڈورے ڈال رہی ہے وڈے بھائی جان پر...... بلکہ شاید ڈال ہی چکی ہے، اس گھر وچ بڑی مصیبتیں سہی ہیں باجی حجاب نے۔ اب پتا نہیں یہ آخری کسر رہ گئی تھی۔" ذرا توقف سے شریفاں بولی۔ "عورت بہت کچھ سہہ لیتی ہے صیب جی! پر یہ جو آخری ظلم ہوتا ہے نا۔ اس پر چپ رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے...... بڑا مشکل۔" شریفاں کی آواز رندھ گئی۔

کچھ آہٹ سنائی دی۔ شریفاں جلدی سے بولی۔ "اچھا، مجھے لگدا ہے کہ بی بی ارم آوازیں دے رہی ہیں مجھے۔ شاید کوئی کم ہوگا۔ میں چلتی ہوں۔ ہم فیر گل کریں گے۔ آپ ٹیلی فون ضرور کرنا۔"

"ٹھیک ہے شریفاں۔" ہادی نے کہا اور فون بند ہوگیا۔

یہ عجیب انکشاف ہو رہا تھا ہادی پر۔ اس کے دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ شریفاں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ "اس گھر میں بڑی مصیبتیں سہی ہیں باجی حجاب نے۔ پتا نہیں یہ آخری کسر رہ گئی تھی۔" وہ لکڑی کے نفیس فرش پر ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس کی اب تک کی معلومات کے مطابق حجاب نے واقعی اپنے شوہر کے گھر میں بہت کچھ سہا تھا۔ اسے ایک سخت گیر ساس اور سخت گیر شوہر ملا تھا۔ پچھلے ڈھائی تین سال میں یقیناً بے شمار موقعوں پر اس کی اور اس کے والدین کی سخت توہین ہوئی تھی۔ توہین کا ایک واقعہ تو تازہ تازہ تھا اور ہادی کی یہاں موجودگی میں ہی ہوا تھا۔ حجاب کا ڈیڑھ دو ماہ کا حمل ضائع ہوگیا تھا۔ اس کا الزام بھی حجاب کی والدہ پر لگایا جا رہا تھا کہ اس نے بیٹی کو انجیریں کھلا دیں جس سے یہ نقصان ہوگیا۔ یہ بالکل بے وزن سی بات تھی لیکن جلال کی والدہ اس پر مصر تھیں۔

جلال نے حجاب کو ایک باندی کی طرح اپنے حکم کی زنجیروں سے باندھ رکھا تھا اور وہ شاید ماں باپ کی عزت کے لیے بندھ بھی چکی تھی لیکن وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اپنی حاکمیت مسلم کرنے کے لیے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا...... اور وہ یہ سب کچھ بھی برداشت کرتی تھی۔ مگر اب اس گھر میں کچھ ایسا ہو رہا تھا جو ایک بیوی کی حیثیت سے حجاب کو قبول نہیں تھا۔ تو کیا یہی وہ عمل تھا جس کے ردعمل میں وہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھا رہی تھی۔ جیسے پرسکون سمندروں کی تہ میں چھپا ہوا کوئی طوفان دھیرے دھیرے سطح آب کی طرف بڑھ رہا ہو۔ جیسے کوئی قیدی اپنی زنجیروں کو ہلا رہا ہو۔ انہیں جھنجوڑنے اور توڑنے کا سوچ رہا ہو۔ مدتوں سے زنداں کے اندھیروں میں رہنے والا شخص زنداں کی سلاخوں سے ٹکرانے کا ارادہ کر رہا تھا شاید...... ہاں یہاں کچھ انوکھا ہو رہا تھا اور اگر انوکھا ہو رہا تھا تو اس کا کوئی طویل پس منظر تھا۔ ہادی ابھی اس پس منظر سے آگاہ نہیں تھا لیکن اس کی سنگینی کو محسوس کرسکتا تھا۔ اگر یہ پس منظر سنگین نہ ہوتا تو حجاب جیسی ناتواں لڑکی میں اتنی جرأت کیسے پیدا ہوتی۔

ہادی ہوٹل واسکوڈے کے کمرے میں ٹہل رہا تھا اور کھڑکیوں سے باہر روم کی ہزارہا روشنیاں جیسے اس کے اضطراب کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ان روشنیوں کے علاوہ بھی یہاں کچھ موجود تھا۔ یہ ایک سایہ تھا۔ یہ سایہ ہادی کے کمرے سے باہر کوریڈور میں موجود تھا۔ وہ کوریڈور میں دھیرے دھیرے چلتا کمروں کے سامنے سے گزر رہا تھا...... وہ جیسے کچھ تلاش کر رہا تھا۔

☆☆☆

ارم اپنے کمرے میں موجود تھی۔ جلال کی کوشش سے اسے روم ہی کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا۔ وہ خوش تھی کہ اسے پھر سے روم میں اور خاص طور سے اسی گھر میں رہنے کا موقع مل رہا ہے۔ وہ قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اپنے بھرے بھرے جسم پر قمیص کو کھینچ کر نیچے کیا۔ بالوں کو کندھوں کے پیچھے پھینک کر ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی صورت میں باندھا اور دوپٹا ایک خاص انداز سے سر پر اور سینے پر پھیلا کر دیکھنے لگی۔ وہ دوپٹا وغیرہ کم ہی استعمال کیا کرتی تھی مگر جب سے اس گھر میں زیادہ آنا جانا ہوا تھا اسے دوپٹا اور کبھی کبھی اوڑھنی بھی استعمال کرنا پڑ رہی تھی۔ اس گھر میں کچھ بھی جلال کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا تھا اور جلال کی مرضی ارم کو بھی عزیز تھی۔

وہ جانتی تھی جلال بہت آہستہ آہستہ لیکن مسلسل اس کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ رفتار بہت سست تھی لیکن نہ ہونے سے تو بہتر تھی۔ جلال کے یوں اس کی طرف متوجہ ہونے میں کچھ عمل دخل میاں بیوی یعنی جلال اور حجاب کی باہمی چپقلش کا بھی تھا۔ اس چپقلش میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا اور یہ صورت حال ارم کے لیے خوش آئند تھی۔ وہ کسی کی مصیبت پر بغلیں بجانے والی تو نہیں تھی لیکن بے وقوف بھی نہیں تھی...... زندگی میں اسے جو بھی موقع ملتا تھا وہ اسے حاصل کرنا چاہتی تھی...... اور یہ تو ایسا موقع تھا کہ اگر حاصل ہوجاتا تو زندگی ہی بدل کر رہ جاتی۔ جلال جیسے باحیثیت اور بلند اقبال شخص کا التفات حاصل ہوجانا اور پھر اس کی زندگی میں آجانا کوئی معمولی بات نہ ہوتی اور اپنی باجی فوزیہ...... جیجا جی ظہیر اور دیگر لوگوں کی پروا کیے بغیر وہ دل جمعی سے اس کام میں لگی ہوئی تھی۔

جو کچھ بھی تھا، وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، حجاب پچھلے ڈھائی تین سال سے اس گھر میں ہے۔ اس گھر میں اس کی جڑیں ہیں اور کسی حد تک جلال کے دل میں بھی۔ ان جڑوں کا آناً فاناً ختم ہوجانا ممکن نہیں تھا۔ ارم کی بڑی بہن فوزیہ، جیجا جی ظہیر اور گھر کے نوکر حجاب کا دم بھرتے تھے۔ اب ابارشن والے واقعے کے بعد سے حجاب میکے میں تھی۔ ارم کے لیے یہ صورت حال، فائدہ مند تھی۔ وہ آج کل یونیورسٹی بھی، جلال کے ساتھ اس کی گاڑی میں ہی جارہی تھی۔

وہ سوچوں سے چونک گئی۔ جلال کی والدہ آپا خانم کی آواز آئی۔ "ارم بیٹا! ذرا شریفاں کو دیکھ کہاں مرگئی ہے۔ بیٹھے بیٹھے ایک دم غائب ہوجاتی ہے۔ جلال کی شیروانی پریس ہونے والی ہے۔ اس نے گیارہ بجے فنکشن میں پہنچنا ہے۔"

"اچھا امی جی۔" ارم نے شہد بھرے لہجے میں کہا۔ "میں دیکھتی ہوں اسے۔"

اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی وہ باہر نکلی اور گارڈنیا کی باڑ پار کرکے انیکسی کی طرف آگئی۔ دروازے پر کھڑے ہوکر اس نے آواز دی۔ "شریفاں...... او...... شریفاں۔"

اس کی دوسری تیسری آواز پر شریفاں بوکھلائی ہوئی سی انیکسی کے برآمدے میں آگئی۔ "جی بی بی جی۔"

ارم کو اندازہ ہوا کہ وہ کسی کو فون کر رہی تھی۔

"کہاں دفع ہوجاتی ہے تو بیٹھے بیٹھے، کسی کو فون کر رہی تھی؟"

"وہ جی...... جی وہ...... اپنی وڈی بھین کو گجرات میں۔ وہ نانی بنی ہے نا پچھلے اتوار کو۔"

"بس ٹھیک ہے۔ جب تک وہ پڑنانی نہ بن جائے اس کو فون کرتی جا اور ہم وہاں بیٹھے تیری جان کو روتے رہیں گے۔ کچھ ہم پر بھی نظر کرم فرمالیا کر۔"

"آپ حکم کریں بی بی جی۔"

ارم اسے لے کر گھر میں آئی اور اسے بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے...... اور اس کے بعد کیا کیا کرنا ہے۔

وہ خود اپنے کمرے میں آئی اور نیل پالش کے لیے

کوئی مناسب ساشیڈ منتخب کرنے میں مصروف ہوگئی۔ ابھی وہ اس انتخاب میں مصروف تھی کہ اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر مین گیٹ کی طرف اٹھ گئی۔ چوکیدار بٹن دبا کر آٹومیٹک گیٹ کھول رہا تھا اور جلال کی شاندار سرخ ''ہمر'' جیپ اندر داخل ہو رہی تھی۔ غیر متوقع طور پر جلال وقت سے پہلے ہی آگیا تھا۔ ارم نے جلدی جلدی ڈریسنگ کی درازیں بند کیں۔ آئینے میں خود کو دیکھا۔ بال درست کیے۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں شریفاں جلال کی شیروانی پریس کر رہی تھی۔

اس نے تنقیدی نظروں سے شریفاں کے کام کو دیکھا اور بولی۔ ''دیکھو، کالر کا ستیاناس نہ کر دینا۔ اچھا تم جاؤ ادھر کچن میں کلثوم کو دیکھو، میں یہ کر لیتی ہوں۔''

شریفاں ''جی بی بی'' کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ بڑے انہماک سے شیروانی پریس کرنے میں لگ گئی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا دوپٹا ڈھلک گیا۔ اس نے اسے ڈھلکا ہی رہنے دیا۔ گریبان سے اس کا چمکیلا جسم جھانک رہا تھا۔ بالوں کی دو لٹیں پیشانی پر آگئی تھیں۔ جلال کے قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی، مگر وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ جب اسے اندازہ ہو گیا کہ جلال اندر آگیا ہے تو اس نے چونک کر اسے دیکھا اور جیسے گڑبڑا کر سر پر دوپٹا درست کر لیا۔ ''السلام علیکم۔ آپ جلدی آگئے۔''

''ہاں، ذرا جلدی نکلنا ہے۔'' جلال نے بھاری آواز میں کہا۔ اس کے سراپے کی طرح اس کی آواز میں بھی رعب تھا۔

''بس، یہ دو چار منٹ کا کام رہ گیا ہے۔'' ارم نے توجہ سے شیروانی کی سلوٹیں نکالتے ہوئے کہا۔

''کسی ملازمہ سے کہہ دینا تھا۔''

''کیوں کہہ دیتی؟ مجھے آپ کا کام کرنا اچھا لگتا ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ادا سے بولی۔

جلال گہری سانس لیتے ہوئے آگے نکل گیا۔

وہ جتنی جلدی آیا تھا، اتنی ہی جلدی روانہ بھی ہو گیا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ارم اپنے کمرے میں واپس آگئی۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے کھڑکیاں چیک کیں اور پردے بھی برابر کر دیے۔ بستر پر نیم دراز ہو کر اس نے اپنے تکیے کے نیچے سے سیل فون نکالا اور ایک نمبر ملایا۔

کال مل گئی۔ دوسری طرف سے باریک سی مردانہ ''ہیلو'' سنائی دی۔ ارم غصے سے بولی۔ ''کیا بات ہے گلزار۔ کیوں بار بار فون کر رہے تھے؟''

''گلزار جب بار بار فون کرتا ہے تو اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔''

''مقصد یہی ہوتا ہے، کسی لڑکی کو پھنسانا۔ اس کے ساتھ چکر چلانا، چند دن اس کے ساتھ گھومنا پھرنا اور پھر کسی اور کے پیچھے پڑ جانا، ہاتھ دھو کر۔''

وہ ہنسا۔ ''یہ سب کچھ تو دوسروں کے لیے ہے۔ تم تو اپنی سسٹر ہو ارم...... اور ہمیشہ رہو گی۔ اللہ نے تمہیں بڑی خوبیاں دی ہیں۔ بس تھوڑی سی کنجوس ہو تم۔''

''میں تھوڑی سی کنجوس ہوں اور تم کافی سارے کمینے ہو۔ اچھا بکواس بند کرو۔ فون کیوں کیا تھا تم نے؟''

''ایک خوش خبری ہے سسٹر! تھوڑا سا کھرا ہاتھ آیا ہے تمہارے دشمن جاں کا۔''

''اچھا اگر کوئی بات ہے تو بتاؤ ورنہ وقت برباد مت کرو۔''

''وقت برباد نہیں ہوگا۔ گارنٹی دیتا ہوں، لیکن سسٹر! تمہیں بھی تھوڑی سی مٹھی ڈھیلی کرنی ہوگی۔ سچ کہتا ہوں ایک دم کڑک کی چل رہی ہے۔''

ارم اسے ڈانٹنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن پھر اس کے لہجے میں اسے کچھ ایسی ہلچل محسوس ہوئی کہ وہ ڈانٹ نہ سکی۔ شاید واقعی اس کے پاس کوئی خبر تھی۔ وہ اپنا لہجہ بدل کر بولی۔ ''کہا ہے نا، تم ایک نمبر کے کمینے ہو گلزاری۔ میرا خیال ہے کہ پیدا ہوتے ہی تم نے سب سے پہلے اپنی دائی سے پیسے طلب کیے ہوں گے، پیدا ہونے کے بدلے میں۔ اچھا، بکواس کرو، کوئی کام کی بات ہو گی تو دوں گی ہڈی تمہارے منہ میں۔''

''سسٹر! ہڈی نہیں۔ اس بار تو گوشت ہونا چاہیے اور مجھے پتا ہے تم دو گی بھی۔ تمہیں مزہ آتا ہے میری بات کا۔''

''اچھا، کچھ پھوٹو منہ سے۔''

''حجاب کا پیچھا کیا ہے میں نے۔ وہ بڑے مشکوک انداز میں گھر سے نکلی ہے...... اور ہوٹل واسکوڈے میں کسی سے ملنے گئی ہے۔''

''مشکوک انداز کیوں کہہ رہے ہو تم۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی سہیلی یا عزیز وغیرہ سے ملنے گئی ہو۔''

''سسٹر! آپ کا یہ بھائی اڑتی چڑیا کے پر گنتا ہے اور یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس کے پیٹ میں انڈا ہے یا نہیں۔''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''آپ کو پتا ہی ہے کہ یوں تو وہ گھر سے نکلتی ہی نہیں۔ اگر نکلے تو اس کا وہ لمبو بھائی ساتھ ہوتا ہے یا والدہ ہوتی ہے۔ وہ گاڑی پر نکلتے ہیں۔ پر آج یہ حجاب بی بی میٹرو پر نکلی تھی۔ چادر میں لپٹی لپٹائی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ دال

میں کچھ کالا ہے۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی میٹرو میں چڑھا۔ مین اسکوائر سے اگلے اسٹاپ پر وہ اتر گئی۔ وہ فٹ پاتھ پر سیدھی جا رہی تھی پھر ایک دم ہوٹل واسکوڈے میں چلی گئی۔ میں اس وقت سڑک کی دوسری طرف تھا، سگنل لال تھا۔ مجھے سڑک پار کرتے تھوڑی سی دیر ہوئی۔ پھر بھی مجھے اتنا اندازہ ہو گیا کہ وہ سیڑھیوں سے سیکنڈ فلور پر گئی ہے۔ میں بھاگم بھاگ سیکنڈ فلور تک پہنچا تو وہ غائب تھی۔ یہاں اس فلور پر چالیس پچاس رہائشی کمرے اور سویٹ ہیں۔ فیملیاں یہاں کم ہی ہوتی ہیں۔ زیادہ تر ٹورسٹ ہوتے ہیں یا پھر کاروباری لوگ...... میں اسے ڈھونڈتا رہا لیکن وہ ملی نہیں۔ وہ کم از کم ڈیڑھ گھنٹا کسی کمرے میں رہی ہے۔''

''جب تم کہہ رہے ہو کہ وہ ملی ہی نہیں تو پھر یہ کیسے پتا چلا کہ وہ ڈیڑھ گھنٹا کمرے میں رہی۔''

''قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے ایک بالکونی سے نیچے دیکھا تو وہ مین انٹرنس سے باہر نکل رہی تھی۔ اسی طرح لپٹی لپٹائی۔ میں پھر پیچھے لگ گیا۔ بہرحال اس دفعہ وہ سیدھی گھر گئی۔''

ارم نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''خیر...... یہ خبر تو تم نے کارآمد خبر ہی سنائی ہے لیکن آدھی خبر ہے، پتا تو یہ چلنا چاہیے کہ وہ ملی کس سے اور کیوں؟ اور کیا اس نے جلال صاحب سے کہیں جانے کی اجازت لی تھی؟''

''اجازت لینے یا نہ لینے کی بات کا پتا تو تم خود کرو نا سسٹر! میں یہ پتا کروں گا کہ وہ ملی کس سے ہے؟''

''کس طرح کرو گے؟''

''پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو دن کے اندر ہی جائے۔''

''چلو ٹھیک ہے، جیسے ہی کچھ پتا چلے مجھے بتاؤ اور تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے کہ فون کرنے سے پہلے میسج کر دیا کرو، مجھے کسی خوامخواہ کی مصیبت میں نہ ڈالنا۔''

''ٹھیک ہے سسٹر! لیکن کب تک ہو جائے گا؟''

''کیا کب تک ہو جائے گا؟''

''رقم سسٹر، میں سچ کہہ رہا ہوں، بڑی سخت ضرورت ہے۔ فلیٹ خالی کرنا پڑ جائے گا یا پھر لینڈ لارڈ مکا مار کر میری ناک کی ہڈی کڑک کر دے گا۔''

''تمہاری ہڈی کڑک ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ تم بہت ہی کمینے ہو گلزاری۔ آدھی خبر دے کر پیسوں کے لیے بھاڑ جیسا منہ کھول رہے ہو۔''

''چلو آدھی خبر ہے تو آدھے پیسے ہی دے دیں، یعنی کوئی 500 یورو۔''

''مجھ سے کچھ سنتا نہ۔'' ارم نے دبے لہجے میں غصے سے کہا۔ ''کل 200 یورو ٹرانسفر کر دوں گی اکاؤنٹ میں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا...... اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

گلزاری کالج میں اس کا کلاس فیلو رہا تھا۔ قد بہ مشکل پانچ فٹ تین انچ تھا لیکن جسم خوب گٹھا ہوا تھا۔ ایک نمبر کا حریص اور لالچی تھا۔ لڑکیوں میں مکڑی کے نام سے مشہور تھا۔ ان کے گرد اپنی باتوں کا ایسا تانا بانا بنتا تھا کہ وہ جانتے بوجھتے اس میں پھنس کر رہ جاتی تھیں۔ اس میں ہوشیاری اور عیاری کی صفت کو ارم نے بڑی گہرائی سے محسوس کیا تھا۔ وہ ہوشیار لوگوں کو پسند کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود گلزاری اس کے قریب تھا۔ وہ بڑی روانی سے اسے سسٹر کہتا تھا۔ وہ بھی اسے ایک کارآمد دوست سمجھتی تھی۔ گلزاری کو یہاں جلال اور ارم کے درمیان چلنے والے معاملے کا پتا تھا...... اور اس کی خواہش تھی کہ ارم یہاں اپنا مقصد حاصل کرے (تاکہ اس کے ثمرات اس تک بھی پہنچیں) ایک اچھا اتفاق یہ ہوا تھا کہ آج کل گلزاری جس بلڈنگ کے اپارٹمنٹ میں مقیم تھا وہ اسی سڑک پر تھی جہاں حجاب کے والدین رہائش پذیر تھے۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ بلکہ اپارٹمنٹ میں سے اس کوٹھی کے لان اور برآمدے کا کچھ حصہ بھی نظر آتا تھا۔ ارم نے دو تین مہینے سے گلزاری کو یہ کام سونپ رکھا تھا کہ جب جب حجاب اپنے میکے آئے تو وہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کی کوشش کرے۔ آج کافی دنوں بعد گلزاری نے اس حوالے سے کوئی توجہ طلب خبر دی تھی۔ وہ بیٹھی رہی اور اس بارے میں سوچتی رہی۔

☆☆☆

ہادی ہوٹل واسکوڈے کے سیکنڈ فلور پر اپنے آرام دہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ وال کلاک کی ٹک ٹک کے ساتھ اس کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ حجاب آج پھر اس سے ملنے آرہی تھی۔ انہیں روم میں گھومنے پھرنے کے لیے نکلنا تھا۔ دو دن پہلے تک ہادی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہو گا لیکن یہ ہو چکا تھا۔ وہ سیلانی لڑکی یہ سب کر کے دکھا رہی تھی۔ اس نے دوپہر بارہ بجے کا وعدہ کیا تھا اور ہادی اب تک جان چکا تھا کہ وہ وقت کی پابند ہے۔ اس نے ہوٹل کی بالکونی میں سے دیکھا۔ ٹھیک بارہ بجے وہ سڑک کراس کر کے ہوٹل کے مین گیٹ کی طرف آتی دکھائی دی۔ اسی طرح ایک براؤن

چادر میں لپٹی لپٹائی، چہرہ مکمل طور پر نقاب میں تھا۔ فقط آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ ہادی نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ آج اس کا شولڈر بیگ نیا تھا اور غالباً سینڈل بھی نئی ہی تھی۔ چادر سے باہر بس یہ دو چیزیں ہی دکھائی دیتی تھیں اور یہ دونوں اس نے بدل دی تھیں۔ براؤن چادر بھی آج پہلی دفعہ ہی اس کے جسم پر نظر آ رہی تھی۔

پروگرام کے مطابق حجاب کو نیچے ہوٹل کی لابی میں ہی رکنا تھا۔ ہادی نے لفٹ کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آگیا۔ وہ آج اپنے بہترین لباس میں تھا۔ وہ اس جذبے کو کیا نام دے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن یہ جذبہ اپنی جگہ موجود تھا۔ حجاب کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی تھیں۔ اسے اپنے قریب پاکر اس کی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔ آج بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ہوٹل واسکوڈے سے نکلے اور فٹ پاتھ پر پیدل ہی چلتے ہوئے میٹرو ٹرین کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ روم میں یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ ٹھنڈی ہوا نے موسم کو خوشگوار بنا رکھا تھا۔ ''کیا خیال ہے، کولیسیئم چلیں؟'' ہادی نے پوچھا۔

''نہیں...... آج سمندر دیکھنے کا موڈ ہو رہا ہے۔'' وہ چنچل انداز میں بولی۔

''تو پھر ویسٹ روم؟''

''یس...... ویسٹ روم۔''

وہ دونوں دو منزلہ سیڑھیاں اتر کر میٹرو ٹرین میں بیٹھے اور بھرے پرے روم کے نیچے ہی نیچے طوفانی رفتار سے سفر کرتے مغربی روم میں پہنچ گئے۔ انہوں نے پندرہ بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا اور کیسل پلو کو جیسے گنجان علاقوں کے نیچے سے گزرے۔ یہ سفر وہ سڑک کے ذریعے کرتے تو شاید گھنٹوں لگ جاتے۔ اس بات کا امکان بہت ہی کم تھا کہ کوئی جان پہچان والا ہادی کو ملے گا۔ اگر کوئی مل بھی جاتا تو اسے یہ جرأت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی کہ ہادی سے اس کی ''ساتھی لڑکی'' کے بارے میں کچھ پوچھتا۔ اور اب سمندر ان کے سامنے تھا۔ بحیرۂ روم کا لہریں لیتا ہوا نیلگوں پانی جس پر سیکڑوں تفریحی کشتیاں رواں تھیں اور جس کے ساحل پر دلفریب نظارے تاحد نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ قلقاریاں مارتے ہوئے بچے، حسیناؤں کے جھرمٹ، چلتی پھرتی دکانیں اور رنگ برنگی چھتریاں جن کے نیچے نیم عریاں مرد و زن ایک دوسرے کو ''تلاش'' کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دونوں اس گہما گہمی سے ذرا ہٹ کر لکڑی کے ایک سبز بینچ پر بیٹھ گئے۔ حجاب محویت سے سمندر کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں کسی بچے کی سی خواہشیں مچل رہی تھیں...... وہ جیسے چادر اتار کر اور سینڈل پھینک کر ان کپڑوں سمیت سمندر میں کود جانا چاہتی تھی۔ اس کے پانیوں سے کھیلنا چاہتی تھی، اس کی لہروں سے بغل گیر ہونا چاہتی تھی۔

''گھر میں کیا بتایا آپ نے؟'' ہادی نے پوچھا۔

''بس کالج کی ایک دوست یہاں روما آئی ہوئی ہے۔ اس کے ہاں جا رہی ہوں۔ ویسے امی ابو مجھ سے زیادہ پوچھ پچھ نہیں کرتے۔ انہیں معلوم ہے ان کی بیٹی کس مزاج کی ہے۔''

''یعنی میں اس وقت آپ کی کالج کی دوست ہوں۔'' ہادی نے کہا۔

حجاب کی آنکھوں سے پتا چلا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ یقیناً اس کی پیشانی پر چاند چمک اٹھا تھا اور سچے موتیوں جیسے دانت بہار دکھا رہے تھے، لیکن یہ سب کچھ براؤن چادر کے نقاب کے پیچھے اوجھل تھا۔

وہ بولی۔ ''ہاں جی...... دوست کی حد تک تو بات صحیح ہے، لیکن آپ کالج کے نہیں ہیں...... بلکہ کالج کی نہیں ہیں۔ اچھا آپ مجھ سے سوال پوچھتے جا رہے ہیں، مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ آپ مجھ تک پہنچے کیسے؟ لیکن پہلے والی اسٹوری نہیں۔ سچ بتایئے گا۔''

ہادی نے گہری سانس لی۔ ''تین چار دن تو میں روم سینٹرم میں گھومتا رہا۔ پھر سوچا کہ اگر گھومنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ وہاں گھوما جائے جہاں آپ جناب کے ملنے کا امکان ہو۔ لہٰذا ''کاسیا'' کے علاقے میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ وہاں سے بھی مایوس ہونے والا تھا جب آئس کریم بار میں آپ کی دوست ماریہ پر نظر پڑ گئی۔ باقی کا کام آپ کے دیور ظہیر صاحب نے آسان فرما دیا۔ وہ میرے گیتوں کے پرستار نکل آئے اور آپ کے گھر لے گئے۔''

''لیکن آپ ڈھونڈ کیوں رہے تھے مجھے؟'' حجاب نے اچانک سوال کیا اور ہادی گڑبڑا گیا۔

ذرا سنبھل کر بولا۔ ''اس لیے ڈھونڈ رہا تھا کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے، ہمیں یہاں سمندر کے کنارے بیٹھ کر مکئی کے دانے کھانے تھے اور ضرور کھانے تھے...... اس لیے میں آپ کو ڈھونڈتا رہا۔''

''مکئی کے دانے؟ یہ کہاں سے آگئے جی۔''

''وہ سامنے سے۔'' ہادی نے بائیں جانب اشارہ

کیا۔ ایک جینز شرٹ والا اسمارٹ سا خوانچا فروش گلے میں اپنی دکان لٹکائے ان کی طرف آرہا تھا۔ وہ بھنے اور ابلے ہوئے بھٹے بیچ رہا تھا۔ ساتھ میں دوتین طرح کی چٹنی تھی۔

انہوں نے بھٹے لیے اور کھانے لگے۔ ہادی کو یہ اچھا لگا کیونکہ بھٹا کھانے کے لیے حجاب کو اپنا نقاب تھوڑا سا نیچے کھسکانا پڑا۔ اس کے ہونٹوں کے پیچھے اس کے خوش نما دانتوں کی تھوڑی سی جھلک نظر آنے لگی۔

وہ بھٹا کھا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے پاؤں کو حرکت دے رہی تھی۔ یہ ایک چنچل انداز تھا۔ اس کی عمر کے بارے میں ابھی ہادی درست اندازہ نہیں لگا سکا تھا، تاہم وہ بائیس چوبیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ جلال اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے بھی قدرے بڑا نظر آتا تھا۔ یوں میاں بیوی کی عمروں میں فرق مزید نمایاں ہوجاتا تھا۔

حجاب کی نگاہ سامنے سے گزرتے ہوئے ایک جوڑے پر پڑی۔ یہ اپنے لباس اور حلیے سے خلیجی علاقے کا جوڑا لگتا تھا۔ شاید کویتی یا اماراتی، مرد درمیانی شکل وصورت کا تھا لیکن لڑکی خوب صورت تھی۔ حجاب کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ”ہادی صاحب! سنا ہے یہاں لوگ اکثر دوتین شادیاں کرلیتے ہیں، کیا یہ لوگ اپنی بیویوں سے انصاف کرلیتے ہیں؟“

”میں سمجھا نہیں۔“

”دیکھیں نا اپنی تین بیویوں کو ایک جیسے فریج یا ایل سی ڈی لے دینا...... ایک جیسے کپڑے سلوا دینا یا ایک جتنے نوکر رکھ دینا...... یہ تو انصاف یا مساوی سلوک نہیں کہلا سکتا نا۔ بلکہ......“ وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

ہادی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ذرا توقف سے بولی۔ ”بلکہ ہادی صاحب اگر ایک شوہر ان تین بیویوں کو برابر وقت بھی دیتا ہو یعنی ایک ایک ہفتہ ہر بیوی کے پاس رہتا ہو تو بھی یہ مساوی سلوک تو نہیں کہلا سکتا نا۔ عورت، فریج، ایل سی ڈی یا ہفتہ تو نہیں مانگتی نا۔ وہ تو محبت مانگتی ہے اور محبت دل کے اندر سے نکلتی ہے، جیب میں سے نہیں نکل سکتی اور نہ بٹوے میں سے نکل سکتی ہے چاہے وہ کتنا بھاری ہو۔ ہمارا اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے؟“

”اسلام یہی کہتا ہے جناب کہ مرد تب ہی ایک سے زائد شادیاں کرے جب وہ بیویوں کے ساتھ مساوی سلوک کرسکے۔“

”اور ہم نے مساوی سلوک سے مراد فریج، کار اور ایل سی ڈی وغیرہ لے رکھے ہیں۔ اس حکم کی اصل روح تو محبت اور چاہت میں پوشیدہ ہے جس کو ہم یکسر فراموش کر دیتے ہیں اور اپنے لیے آسانیاں ڈھونڈ لیتے ہیں...... حالانکہ یہ کام اللہ نے اتنا آسان نہیں بنایا ہے۔“

وہ باتیں کررہی تھی اور ہادی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں ہادی کی سمجھ میں آرہی تھیں اور وہ وجہ بھی سمجھ میں آرہی تھی جس کے سبب وہ یہ باتیں کررہی تھی۔ شریفاں نے جو کچھ فون پر ہادی کو بتایا تھا وہ ظاہر ہے کہ حجاب کے علم میں بھی تھا اور اس نے حجاب کی ہستی کو اندر سے درہم برہم کررکھا تھا۔ اس نے اس گھر میں بہت کچھ سہا تھا لیکن اب ایک سوکن کا عذاب سہنے کے لیے وہ خود کو تیار نہیں کرپا رہی تھی۔ وہ جوان تھی، خوب صورت تھی۔ اس کے دل میں ایک باوفا شوہر اور ایک پھولوں بھرے آنگن کی خواہشیں تھیں۔ ان خواہشوں کو روندا جارہا تھا۔ شادی کے صرف ڈھائی تین سال بعد اس سے اس کی نصف ازدواجی زندگی چھیننے کے پروگرام بن رہے تھے۔ کیا کوئی ناقابل معافی غلطی کردی تھی اس نے؟

وہ باتیں کرتی رہی۔ ہادی نے بھی کہیں کہیں جواب دیا۔ وہ زیادہ سنتا ہی رہا۔ پھر لاہور سے شیخو جی کی کال آگئی۔ ہادی ہنسنے لگا۔ فون پر بات کرتے ہوئے بھی اس کی نظریں حجاب کی طرف ہی تھیں۔ وہ سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ سمندر میں تلاطم تھا۔ موجیں اٹھ رہی تھیں، بلند ہورہی تھیں اور ساحل سے ٹکرا رہی تھیں...... شاید ایسا ہی کچھ حجاب کے اندر بھی تھا۔

فون پر بات کرتے ہوئے اور شیخو جی سے گیتوں کے لیے چند دنوں کی مزید مہلت مانگتے ہوئے ہادی کی نگاہ حجاب کے عقب میں ایک سرخ چھتری کی طرف اٹھ گئی۔ گہرے سرخ رنگ کی یہ چھ سات فٹ اونچی چھتری تھی۔ اس کے قریب جو درمیانے قد کا بندہ کھڑا تھا اسے ہادی دوسری تیسری بار دیکھ رہا تھا۔ ہادی نے پہلی بار اسے کوئی ڈیڑھ گھنٹا پہلے میٹرو ٹرین میں دیکھا تھا۔ پھر جب وہ خوانچا فروش سے بھٹے لے رہے تھے، یہی شخص ان کے سامنے سے گزر کر پانی کی طرف گیا تھا۔ اب وہ چھتری کے قریب موجود تھا۔ پتا نہیں کیوں یہ شخص ہادی کو مشکوک لگا۔ وہ مسلسل ان کے آس پاس تھا...... کیا وہ کسی چکر میں تھا؟ کوئی جیب کترا، اٹھائی گیرا، یا کوئی مزید خطرناک شخص۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں بھی وہ شخص ہادی اور حجاب کے آس پاس ہی رہا...... ہادی کو یقین ہونے لگا کہ وہ کسی چکر میں ہے۔ بہرحال اس بارے میں ہادی نے حجاب کو کچھ

نہیں بتایا۔ وہ خوفزدہ ہوجاتی...... اور یہ تفریحی ”ٹرپ“ شاید اسی جگہ ختم ہوجاتا۔ تھوڑی دیر بعد ہادی کولڈ ڈرنک لینے کے بہانے اس سرخ چھتری کی طرف گیا۔ چھتری کے ساتھ ہی ایک سائبان کے نیچے کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس وغیرہ کا اسٹال تھا۔ ہادی نے کچھ چپس لیے اور چار ٹن پیک ڈرنکس۔ درمیانے قد کا دھاری دار شرٹ والا شخص اس سے فقط دس بارہ فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ اس کا جسم کسی گینڈے کی طرح مضبوط اور گھٹا ہوا تھا۔ وہ بہ ظاہر بڑے انہماک کے ساتھ ایک اٹالین خاتون سے اطالوی میں باتیں کررہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی اور ہوشیاری کی چمک تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں کچھ اور بھی ظاہر کرتی تھیں۔ نجانے کیوں ان آنکھوں کو دیکھ کر ہادی کو لگا کہ یہ ناٹے قد کا شخص عورتوں کا زبردست رسیا ہے۔ صرف ایک لمحے کے لیے ہادی کی نظریں اس سے چار ہوئی تھیں۔ ہادی کو اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے اور ایک طرح کی بھوک دکھائی دی تھی۔ اٹالین خاتون قد میں اس سے تھوڑی سی لمبی ہی ہوگی۔ وہ غالباً اس کے لباس اور اس کی خوب صورتی کی تعریف کرنے میں مصروف تھا۔ خاتون ہنستی جارہی تھی۔

ہادی اشیائے خورونوش لے کر واپس آگیا۔ دونوں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے رہے، باتیں کرتے رہے۔ حجاب بڑے ”لائٹ“ موڈ میں تھی۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اپنے بچپن کی، لڑکپن کی، کالج کے دور کی۔ اس نے روم ہی کی ایک یونیورسٹی سے اے سی ایس کیا تھا۔ ماسٹر کرنا چاہتی تھی اور یہ آسانی کربھی سکتی تھی لیکن پھر ارادہ ترک کردیا۔ کیونکہ اس کی منگنی ہوچکی تھی اور سسرال والوں کو شادی کی جلدی تھی...... حجاب کی باتوں سے ہرگز اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی مشکلات کا شکار ہے۔ اس نے ہادی کے سامنے جلال کو ایک اچھا اور دیکھ بھال کرنے والا شوہر قرار دیا۔ باتوں باتوں میں ہادی کو اچانک ایک بات یاد آئی۔ اس نے حجاب سے پوچھا۔ ”آپ کے گھر کے ایک کمرے میں غالباً آپ کی کسی فرینڈ کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ نیچے لکھا ہوا ہے...... میں تمہیں کبھی بھول نہ پاؤں گی۔“

ہادی نے دیکھا، حجاب کی آنکھوں میں ایک دم ایک سایہ سا لہرا گیا۔ وہ جیسے ٹھٹک سی گئی تھی۔ شاید کوئی کہانی تھی اس تصویر کے پیچھے...... یقیناً ایسا ہی تھا۔

حجاب نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”ہاں...... بڑی پیاری دوست تھی میری۔ اب جاچکی ہے۔“

”کہاں؟“

”جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔“ اس کی آواز میں درد لہریں لینے لگا۔

”اوہ...... آئی ایم ساری، کیا ہوا تھا انہیں؟“

”بس...... ایک حادثہ، جس میں جان چلی گئی اس کی۔ اپنے گھر کی سیڑھیوں سے گری تھی۔ سر پر گہری چوٹیں آئیں، اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔“

”ویری سیڈ۔ شادی شدہ تھی؟“

”ہاں۔“ حجاب نے مختصر جواب دیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی۔ ہادی بھی اس کا موڈ برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔

دوتین منٹ بعد ہادی نے بڑی صفائی سے موضوع بدل دیا۔ وہ دونوں پاکستان کی باتیں کرنے لگے۔ حجاب اپنے والدین کے ساتھ بہت چھوٹی عمر میں اٹلی آگئی تھی لیکن اس کی مٹی کو پاکستان سے نسبت تھی۔ اسے پاکستان کے بارے میں جاننا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ کئی بار وہاں جا بھی چکی تھی۔ ہادی نے اسے پاکستان میں اپنی مصروفیات اور والدہ اور بھائی کے بارے میں بتایا۔

اس گفتگو کے دوران میں اس کا دھیان دھاری دار شرٹ والے شخص کی طرف بھی رہا۔ وہ مسلسل ان کے آس پاس نظر آرہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے ایسے کاموں کا کافی تجربہ ہے۔ ہادی کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو شاید اس کی سرگرمی سے آگاہ نہ ہوسکتا۔

حجاب نے کہا۔ ”چلیں...... اب کولیسیئم (قدیم اسٹیڈیم) کی سیر ہوجائے۔“

کوئی اور موقع ہوتا تو ہادی اس پیشکش کو سر آنکھوں پر رکھتا لیکن اس وقت دھاری دار شرٹ والے کی وجہ سے صورتِ حال مختلف تھی۔ اس نے کہا۔ ”کیوں نہ کل چلیں...... تازہ دم ہوکر۔“

”لیکن...... کل تو میں نہیں آسکوں گی...... بلکہ...... شاید دوبارہ آ ہی نہ سکوں۔“

ہادی کے سینے میں مایوسی کی لہر سی دوڑ گئی۔ ”یہ تو پھر کوئی بات نہ ہوئی۔“ وہ بولا۔

”کیا اتنا کافی نہیں ہے؟“ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔

”آپ نے جتنا ستایا ہے، اس لحاظ سے تو آپ کو کم ازکم چھ سات دن مجھے کمپنی دینی چاہیے۔“

"جتنا قصور کیا ہے، اتنی ہی سزا دیجیے۔"

"یعنی یہ آپ سزا بھگت رہی ہیں؟"

وہ ہنس ہنس کر سرخ ہونے لگی۔ لیکن یہ سرخی ہادی کو نقاب کی وجہ سے نظر نہیں آرہی تھی اور نہ ہی وہ پیشانی جو حجاب کے ہنستے ہی تمتماتی تھی اور چاند بن جاتی تھی۔ "مذاق کر رہی تھی۔ یقین کریں، آپ کے ساتھ گھومنا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بیماری کے بعد کوئی ٹانک سا مل گیا ہے، ایک دو ہفتے تو سخت ڈپریشن میں رہی ہوں۔"

"ٹانک جب شروع کریں تو اسے چند دن تو استعمال کرنا چاہیے۔" ہادی نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب، لیکن اگلی ڈوز اگر پرسوں ہو جائے تو کوئی حرج تو نہیں؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔" ہادی نے کہا۔

اسی دوران میں حجاب کو ساحل کی ریت پر قلقاریاں مارتا ایک جاپانی بچہ نظر آیا۔ اس نے اسے گود میں اٹھا کر چوما چاٹا۔ وہ اس کی بانہوں میں کھیلنے لگا۔ اس کی جاپانی ماں اور والد خوش ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد ہادی اور حجاب ایک ساحلی ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔ یہاں انہوں نے کھانا کھایا۔ کولڈ کافی پی اور باتیں کرتے ہوئے واپس روانہ ہو گئے۔

میٹرو ٹرین میں بیٹھنے تک دھاری دار شرٹ والا شخص ہادی کو کہیں نظر نہیں آیا۔ لیکن جب وہ ہوٹل واسکوڈے کے قریب ٹرین سے اتر رہے تھے، اس نے دوبارہ اپنی منحوس جھلک دکھا دی۔ ابھی تک حجاب کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ حجاب کو یہاں سے دوسری ٹرین پکڑنا تھی۔ جب تک حجاب ٹرین میں سوار نہیں ہو گئی۔ ہادی وہیں کھڑا رہا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر دھاری دار شرٹ والا حجاب کے پیچھے گیا تو وہ خود بھی ٹرین میں سوار ہو جائے گا اور اسے بحفاظت گھر تک چھوڑ کر آئے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ شخص وہیں پلیٹ فارم کے ایک گوشے میں موجود رہا۔

ہادی پیدل اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ شخص آس پاس موجود ہے۔ اس کی موجودگی ہادی کے اندر طیش اور پریشانی کی لہر ابھار رہی تھی۔

☆☆☆

حجاب گھر کے باغیچے میں ٹہل رہی تھی۔ پھر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ امی، فیصل کے ساتھ اپنے "چیک اپ" کے لیے اسپتال گئی ہوئی تھیں۔ ابو کمرے میں سو رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی...... وعدے کے مطابق کل اسے ہادی کی طرف جانا تھا۔ ان کا پروگرام حسب سابق روم میں گھومنے پھرنے کا تھا۔ وہ تا حال تذبذب میں تھی، جائے کہ نہ جائے۔ پتا نہیں کیوں ہادی اس کو بہت اپنا سا لگ تھا۔ جیسے وہ اسے بہت پہلے سے جانتی ہو۔ اس کی ہر ادا پہچانتی ہو۔ اس کے لہجے کی شائستگی سیدھی حجاب کے دل میں اتر تی تھی۔ بہر حال اس جذبے میں کسی طرح کی رومانیت کو دخل نہیں تھا۔ یہ ویسی ہی اپنایت تھی جیسی کسی قریبی عزیز یا گہری سہیلی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ لیکن...... حجاب نے بارہا یہ بھی سن رکھا تھا کہ مرد اور عورت کے درمیان "دوستی" نام کی چیز تا دیر برقرار نہیں رہتی۔ یہ گھٹتے گھٹتے ختم ہو جاتی ہے یا بڑھتے بڑھتے محبت بن جاتی ہے۔ بہر حال حجاب اس بات کی قائل نہیں تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ انسان اندر سے مضبوط ہو تو وہ ہر قسم کی صورت حال کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے، ہر طرح کی رواجی اور معاشرتی پیش گوئیوں کو غلط ثابت کر سکتا ہے۔

ایک بات غور طلب تھی اور یہ خود حجاب کی سمجھ میں بھی نہیں آرہی تھی۔ وہ بے شمار زنجیروں میں بندھی ہوئی عورت تھی۔ انہیں توڑ نہیں سکتی تھی۔ پھر وہ انہیں کیوں ہلا رہی تھی۔ اس نے اپنے سسرال میں بہت سی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ کئی کڑی آزمائشوں سے گزری تھی۔ شادی کے چند دن بعد ہی اس کے والدین کی بے وجہ توہین شروع ہو گئی تھی۔ شادی کے دو مہینے بعد ہی جلال نے اسے برا بھلا کہنا اور دھکے دینے شروع کر دیے تھے۔ اس کی ناراضی کی جڑیں حجاب کی اس "جرأت" کے اندر تھیں جو حجاب نے شادی سے پہلے کی تھی۔ اس نے جاب کرنے کی بات کی تھی۔ بے شک بعد میں جاب کا ارادہ ترک کر دیا تھا، جلال سے معافی بھی مانگ لی تھی لیکن جلال کے دل میں یہ بات اٹک کر رہ گئی تھی کہ شادی سے پہلے حجاب نے "اپنے جاب کرنے کو" ایک شرط کے طور پر پیش کیا تھا۔

ساس آپا خانم کا رویہ پہلے روز سے ہی حجاب کے ساتھ مناسب نہیں تھا۔ حجاب کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ خراب سے خراب تر ہی ہوتا گیا تھا۔ وہ حجاب کے خلاف جلال کو بھڑکانے میں اکثر کامیاب رہتی تھیں۔ یہ بات حجاب کے سوا، حجاب کے سسرال اور میکے میں کسی کو معلوم نہیں تھی کہ جلال اس پر ہاتھ بھی اٹھاتا تھا۔ یہ سلسلہ شادی کے ایک سال بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ اب تو حجاب ان تھپڑوں کی تعداد بھی بھول چکی تھی جو اس نے گاہے بگاہے کھائے تھے...... ہاں پہلا تھپڑ اسے آج تک نہیں بھولا تھا۔ حجاب کے ایک خالہ زاد کی شادی تھی۔ جلال نے اسے وہاں جانے سے منع کر دیا تھا...... کیونکہ مردوں اور عورتوں کے لیے بیٹھنے کا علیحدہ انتظام نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں بے ہودگی ہو گی۔ اس کے علاوہ ڈھولک، مہندی کے گیت اور اس طرح کی دیگر رسوم بھی جلال کو بالکل پسند نہیں تھیں۔ وہ ایسی شادیوں پر جانے سے گریز کرتا تھا۔ حجاب نے بہت کہا کہ وہ پردے میں رہے گی، کسی کونے میں بیٹھی رہے گی لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عورت جب کسی شادی بیاہ میں جانے کے لیے کپڑے بنواتی ہے، تیار ہوتی ہے تو پھر وہ اپنا آپ دکھائے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ کسی نہ کسی طور وہ خود نمائی کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ حجاب کا جرم یہ نہیں تھا کہ وہ خدانخواستہ پھر بھی شادی پر گئی تھی۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ نہ جانے کی وجہ سے چپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں رونے کے سبب لالی تھی۔ جلال نے اس روز کہا تھا کہ باہر کھانا کھائیں گے۔ عشا کی نماز کے فوراً بعد حجاب تیار بھی ہو گئی تھی۔ جانے سے ذرا پہلے جلال کی نگاہ حجاب کے چہرے پر پڑ گئی اور اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔

"تم کھانے پر جا رہی ہو یا کسی کے سوگ پر؟"

"کیا ہوا جلال؟" وہ لرز کر بولی۔

"کون مر گیا ہے تمہارا جو ایسی صورت بنائی ہوئی ہے؟" وہ مزید بھڑک کر بولا۔

وہ سکتے میں رہ گئی۔ "جلال! میں نے کیا کہا ہے، آپ کیوں بولتے ہیں اس طرح۔ ایسے تو لوگ نوکرانیوں سے بھی......"

اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ جلال کا تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔ وہ جیسے چکرا کر بستر پر گر گئی۔ جلال کار کی چابی فرش پر پٹختا ہوا باہر چلا گیا تھا...... ہاں اس کے بعد بھی بند کمرے میں کئی تھپڑ حجاب کے حصے میں آئے تھے لیکن وہ تھپڑ آج بھی اسے یاد تھا۔

حجاب نے سب کچھ سہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سسرال والوں کے دل جیتنے کی بھرپور کوشش بھی کی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو جلال کی مرضی میں فنا کر لیا تھا۔ وہ دن کو رات کہتا تو وہ بھی بڑے خلوص سے اسے رات کہنے اور سمجھنے لگی تھی...... لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، جلال کی چاہت کو حجاب کی خود سپردگیوں اور عاجزیوں سے ہمیشہ بیر رہا تھا۔

بہر حال حجاب کو کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اگر وہ کچھ جھیل رہی تھی تو اپنے گھر کے لیے جھیل رہی تھی۔ یہ اس کا آنگن

لطائف

بوڑھا سردار۔ "ڈاکٹر صاحب میری سیدھی ٹانگ میں درد ہے۔"
ڈاکٹر۔ "یہ تو بڑھاپے کی وجہ سے ہے۔"
سردار۔ "مگر ڈاکٹر صاحب میری الٹی ٹانگ بھی تو اسی عمر کی ہے۔"

***

☆ اُلو اور شوہر میں کیا فرق ہوتا ہے۔
O شوہر کو آسانی سے اُلو بنایا جا سکتا ہے، جبکہ اُلو اتنا اُلو بھی نہیں ہوتا کہ شوہر بن جائے۔

***

فقیر۔ "صاحب 50 روپے دے دو چائے پیوں گا۔"
آدمی۔ "چائے تو 25 روپے میں آتی ہے۔"
فقیر۔ "صاحب گرل فرینڈ بھی پیے گی۔"
آدمی۔ "گرل فرینڈ بھی بنا لی؟"
فقیر۔ "نہیں صاحب گرل فرینڈ نے فقیر بنا دیا۔"

***

دو سردار بینک لوٹنے گئے، گن گھر بھول گئے، پھر بھی بینک لوٹ لیا، کیسے؟
بینک منیجر بھی سردار تھا، بولا۔ "گن کل دکھا دینا ہم کو زبان پر اعتبار ہے۔"

***

ایک میمن بادام بیچ رہا تھا، سردار نے پوچھا "یہ کھانے سے کیا ہوتا ہے۔"
میمن۔ "دماغ تیز ہوتا ہے۔"
سردار۔ "کیسے؟"
میمن۔ "اچھا یہ بتاؤ ایک کلو چاول میں کتنے دانے ہوتے ہیں؟"
سردار۔ "پتا نہیں۔"
میمن نے سردار کو ایک بادام کھلایا اور بولا۔ "بتاؤ ایک درجن میں کتنے کیلے ہوتے ہیں؟"
سردار۔ "12"
میمن۔ "دیکھا دماغ تیز ہوا کہ نہیں؟"
سردار۔ "2 کلو دے دو یار بہت کام کی چیز ہے۔"
مرسلہ: رضوان تنولی گریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

تھا۔ اسے سنوارنے کے لیے وہ ہر آزمائش سے گزر سکتی تھی لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کے دل میں عجیب اندیشے سر اٹھانے لگے تھے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے آنگن میں کسی اور کے قدم بھی پڑنا شروع ہوگئے ہیں۔ یہ قدم بہت آہستہ آہستہ لیکن بتدریج آگے بڑھ رہے تھے۔ پہلے پہل ارم صرف پندرہ بیس روز کے لیے ان کے گھر ٹھہری تھی۔ ان دنوں وہ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے کوشش کر رہی تھی۔ بعدازاں اس نے اپنا قیام بڑھا دیا اور گھر میں اپنے لیے ایک الگ پورشن کھلوا لیا۔ اپنی بڑی بہن فوزیہ کی مخالفت کے باوجود وہ اس گھر میں رہ رہی تھی اور روز بروز جلال کے ساتھ بے تکلف بھی ہو رہی تھی۔ ان دنوں جلال نے حجاب کو طفل تسلیاں دی تھیں اور کہا تھا کہ وہ یہاں بس دو چار ہفتوں کی مہمان ہے۔ لیکن اس مہمان کے سائے دھیرے دھیرے اس گھر پر بڑھتے ہی گئے تھے۔ آخر ایک موقع پر حجاب نے جلال سے اس ضمن میں پرزور احتجاج کیا تھا۔ وہ کئی دن روتی رہی اور اس نے کھانا بھی شاذونادر ہی کھایا۔ تب جلال نے اسے تسلی دی تھی کہ ارم کا داخلہ وینس کی یونیورسٹی میں ہوگیا ہے اور وہ یہاں سے جا رہی ہے۔

یہ چند دن حجاب کے لیے قدرے سکھ کے تھے لیکن تب ایک بار پھر اندیشوں کے دیو چنگھاڑتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں گھس آئے تھے۔ وہ دن حجاب کے لیے بڑا اندوہناک تھا اور آج بھی اسے یاد تھا۔ گھر گرہستی کی ہزار ہا تکلیفیں ایک طرف اور یہ جانکاہ انکشاف ایک طرف۔ اس رات اس نے جلال کو فون پر ارم سے بات کرتے سنا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ پوری کوشش کر رہا ہے۔ امید ہے کہ چند روز تک روم کی یونیورسٹی میں اس کا داخلہ ہوجائے گا۔ تب حجاب پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ ارم اس لیے وینس نہیں گئی تھی کہ جلال نے اپنی شریک حیات کے آنسوؤں کا خیال کرتے ہوئے اس کو وینس جانے کی صلاح دی تھی بلکہ وہ اس لیے گئی تھی کہ اسے کوشش کے باوجود روم کی یونیورسٹی میں ”ایڈمیشن“ نہیں مل رہا تھا۔ وینس والا انتظام عارضی تھا۔

اور یہ وہی رات تھی جب حجاب کے سینے میں پہلی بار ایک عجیب سی بے باکی کی چنگاری چٹخی تھی۔ اس چنگاری کو بغاوت تو نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کو اپنے ماحول سے شدید بیزاری کا نام ضرور دیا جاسکتا ہے۔ اگلے روز جلال اپنے کام سے میلانو چلا گیا تھا اور حجاب اس کی اجازت سے اپنی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے وینس چلی گئی تھی...... اور پھر وینس میں اس کے قدم ایک شب اسی گلی میں پڑے تھے جہاں ایک رہزن ہادی کا بیگ اٹھا کر بھاگا تھا اور حجاب نے اسے روکنے کے لیے اس کے راستے میں ایک چھتری گرائی تھی...... حجاب کے لیے وہ عجب اتھل پتھل کے دن تھے اس نے اپنے مزاج سے بالکل ہٹ کر کام کیا تھا۔ خود کو سیر سپاٹے اور موج مستی میں گم کرنے کی کوشش کی تھی۔

حجاب کو دوسرا بڑا جھٹکا کب لگا تھا؟ اسے دوسرا بڑا جھٹکا صرف تین چار دن پہلے لگا تھا۔ حجاب نے جلال کی امی (آپا خانم) کو فون کرکے ان کی خیر خیریت پوچھنا چاہی تھی، وہ تو سو رہی تھیں (یا شاید ویسے ہی بات کرنا نہیں چاہتی تھیں) حجاب کی بات شریفاں سے ہوگئی تھی۔ شریفاں کی زبانی یہ اطلاع حجاب تک پہنچی تھی کہ ارم نے پیش قدمی کرتے ہوئے ایک اور بڑا قدم آگے بڑھایا ہے...... اور اب وہ سویرے جلال کے ساتھ اس کی کار میں یونیورسٹی جاتی ہے۔ حجاب بچی نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ جلال کے راؤ خاندان میں مردوں کے اندر دوسری شادی کا رجحان پایا جاتا تھا۔ یہ رجحان بہت زیادہ تو نہیں تھا بہرحال موجود تھا۔ اس روز شریفاں سے بات کرنے کے بعد حجاب کے اندر دوسری چنگاری چٹخی تھی۔ اس بار اس چنگاری کی چمک پہلے سے زیادہ تھی اور اس کی تپش بھی۔ پھر اس روز نجانے کیوں حجاب نے ہادی سے فون پر بات کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے سابقہ رویے پر معذرت چاہتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے جائے گی...... بے شک ہادی سے اس کی بات ایک مخلص دوست کی حیثیت سے ہوئی تھی پھر بھی پتا نہیں حجاب میں یہ جرأت کہاں سے آئی تھی کہ اس نے فون اٹھایا اور ایسی بات کر ڈالی۔ اسے خود اپنی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس نے کیا کیا ہے۔ کل کئی گھنٹے تک وہ ہادی کے ساتھ رہی تھی اور انہوں نے سمندر دیکھا تھا...... اور اب وہ پھر سوچ رہی تھی۔ گہرے تذبذب میں تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی چھٹی حس اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ بے شک حجاب اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ ایک بے ضرر مصروفیت ہے اور ہادی ہر طرح سے ایک شریف النفس شخص ہے لیکن پھر بھی دل کے اندر خوف کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے نیم وا آنکھوں سے سوچتی رہی۔ اس دوران میں اطالوی ملازمہ ڈورتھی نے صفائی کرتے ہوئے کامن روم کے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر بلب کی دودھیا روشنی تھی۔ حجاب کی نگاہ سب سے پہلے دیوار گیر تصویر پر پڑی۔ یہ اس کی عزیز ترین دوست بینش کی تصویر تھی۔ شدید تذبذب کے ان لمحوں میں یہ تصویر عجیب

سا تاثر لے کر آئی۔ حجاب کو لگا کہ یہ تصویر فیصلہ کرنے میں اس کی مدد کرنے کو آئی ہے۔

حجاب کی رگوں میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ اس تصویر نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ”حب! کیا مجھے بھول گئی؟ میرے انجام کو بھول گئی۔ یہ مردوں کی دنیا ہے میری پیاری حب! یہاں ہماری چھوٹی سی جرأت کو سرکشی کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک ذرا سی ”مرضی“ کو بغاوت کہہ کر قابل سزا ٹھہرایا جاتا ہے۔ نہیں حب! یہ ٹھیک نہیں۔ کیا تم بھی میری طرح ایک چھوٹے سے پنجرے میں پھڑپھڑاتے ہوئے جان دینا چاہتی ہو؟“

حجاب کو ایک جھرجھری سی آئی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ امی ابو اور بھائی کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھومے۔ وہ ایک نہیں ان گنت زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اپنی چھوٹی سی خوشی پر ایک معمولی سی مرضی پر بھی اس کا اختیار نہیں تھا اور شاید اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اس صورت حال کی مزاحمت کرسکتی۔ وہ والدین کی پریشانیوں میں اضافے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ دو سال پہلے والدہ کی بیماری پر بہت زیادہ اخراجات اٹھے تھے۔ ان اخراجات نے اس فیملی کو قرضے کے بھاری بوجھ تلے دبا رکھا تھا۔ یہ گھر بھی جس میں اس کے والدین رہ رہے تھے، ایک طرح سے رہن تھا۔ کسی بھی وقت چھت ان کے سروں سے سرک سکتی تھی۔ کچھ قرضہ بھائی فیصل کی وجہ سے بھی سر چڑھا تھا۔ فیصل نے اپنے کسی ڈاکٹر دوست کے ساتھ مل کر گفٹ شاپ کھولی تھی۔ وہاں ڈکیتی کی واردات ہوگئی اور بہت زیادہ نقصان ہوا۔ شکر تھا کہ اللہ نے جانی نقصان سے بچا لیا۔

اپنے حالات اور مجبوریوں کا سوچ کر ایک عجیب سی ناتوانی حجاب کے رگ و پے میں اتر گئی۔ وہ جو...... ہادی کو کال کرنے کا سوچ رہی تھی، ارادہ بدل کر کمرے میں چلی گئی۔ اسے لگا، اس کے اردگرد دیواریں اونچی ہوتی جا رہی ہیں، اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ گھٹتا جا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر بعد نقاہت کے سبب اسے نیند سی آنے لگی۔

یکایک فون کی بیل ہوئی۔ وہ ٹھٹک گئی۔ کہیں ہادی ہی کی کال نہ ہو۔ اس نے اسکرین دیکھی اور اطمینان کی سانس لی۔ یہ اس کی سسرال کی ملازمہ شریفاں کا فون تھا۔ ”ہیلو وڈی باجی! میں شریفاں بول رہی آں۔“

”ہاں شریفاں! کیا حال چال ہے تیرا؟“ حجاب نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں باجی! تسی سناؤ کی کر رہے ہو؟“

سزا

ایک کار سے چوزا ٹکرا کے بے ہوش ہوگیا۔ آدمی چوزے کو گھر لے آیا اور پنجرے میں بند کردیا۔

چوزے کو ہوش آیا تو بولا۔ ”لے بھائی جیل ہوگئی ہے، لگتا ہے کہ ڈرائیور مر گیا ہے۔“

سوالاً جواباً

بیوی۔ ”کھانا کھا لیا تم نے؟“
شوہر۔ ”کھانا کھا لیا تم نے؟“
بیوی۔ ”بتاؤ ناں۔“
شوہر۔ ”بتاؤ ناں۔“
بیوی۔ ”میری نقل۔“
شوہر۔ ”میری نقل۔“
بیوی۔ ”I Love you“
شوہر۔ ”ہاں کھا لیا۔“

مرسلہ: رضوان تنولی گریڈ وی، اورنگی ٹاؤن کراچی

”کچھ نہیں، لیٹی ہوئی تھی۔“

شریفاں کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ”باجی! آپ گھر واپس کیوں نئیں آجاتیں، دل بڑا اداس ہے۔“

”خیریت تو ہے شریفاں؟“

”باجی...... یہاں پر...... چنگا نئیں ہو رہا۔ سچ پچھو تو میرا دل رو رہا ہے اس ویلے......“ وہ جیسے بے ساختہ کہہ گئی۔

”کیا ارم بی بی کی طرف سے کوئی بات ہوئی ہے؟ کوئی جھگڑا کیا ہے، اس نے تم سے؟“

”مجھ سے کرتی تو کوئی گل نئیں تھی۔ وہ تو آپ سے کر رہی ہے، پورا ویر لے رہی ہے تہاڈے سے۔“

حجاب کا دل زور سے دھڑکا۔ ”شریفاں کھل کر بتاؤ۔“

وہ ٹھہری سی آواز میں بولی۔ ”وہ اوپر والے کمرے وچ چلی گئی ہے جی۔ وڈے بھائی جان کے نال والے کمرے وچ۔ کہتی ہے کہ تھلے (نیچے) والا کمرا ہوادار نئیں ہے۔ مینوں چنگی طرح پتا ہے کہ اس کو کس طرح کی ہوا چاہیے۔ میں سارا کج سمجھ رہی ہوں وڈی باجی۔“

”فوزیہ نے کچھ نہیں کہا اسے؟“

"وہ کسی کی سنتی ہی کب ہے جی۔ وہ کیا کہتے ہیں جی، ساری خدائی ایک پاسے...... میرا ڈھولن ماہی اک پاسے۔ اسے آج کل وڈے بھائی جان کے سوا کسی کی پروا نہیں ہے جی۔" شریفاں کی آواز میں دکھ لہریں لے رہا تھا۔

حجاب کے دل پر بھی اس خبر نے غیر معمولی اثر کیا۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ اس اوپر والے کمرے میں ارم نے ایک بار پہلے بھی آنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت حجاب نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے جلال سے کہا تھا کہ ان کی "پرائیویسی" متاثر ہوگی۔ جلال کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی لیکن اب ارم نے پھر وہ کمرا منتخب کر کے اور جلال نے اس کی اجازت دے کر حجاب کو بتایا تھا کہ بات کتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ یقیناً ارم کا حوصلہ بڑھانے میں آپا خانم کا بھی عمل دخل تھا۔

وہ سب کچھ سہنے کو تیار تھی۔ جلال سے ہر طرح کی جسمانی اور ذہنی توہین برداشت کر کے بھی اس کے آگے پیچھے پھر سکتی تھی۔ جی حضوری کر سکتی تھی لیکن دوسری عورت سے بچنے کے لیے کسی کے سامنے کسی طرح کی عاجزی، مستعدی کا اظہار اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایسا کرے گی تو عورت کے درجے سے نیچے گر جائے گی۔ ایک مفاد پرست منافق مخلوق بن جائے گی۔ کوئی ایسی جنس جو دانے پانی اور زندگی کی دیگر سہولتوں کی خاطر عورت اور بیوی کا روپ دھارے گی۔

شریفاں سے بات کر کے وہ دیر تک بستر پر لیٹی رہی۔ سینے میں کچھ جدا سی ہلچل تھی...... چنگاری...... پھر ایک چنگاری۔ زیادہ روشن...... زیادہ حرارت والی۔

ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ اس کا جواب نہیں تھا...... لیکن ایسا ہو رہا تھا۔ درختوں کے سائے مختصر ہونے کے بعد پھر بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ شام دبے پاؤں روم کے در و دیوار پر اتر رہی تھی۔ نیلے آسمان پر جہازوں کی چھوڑی ہوئی لاتعداد سفید لکیریں تھیں اور ان لکیروں سے نیچے پرندے محو پرواز تھے۔ ایک گہری سانس لے کر حجاب نے فون اٹھایا۔ ہادی کا نمبر پریس کیا۔ "ہیلو کون؟" دوسری طرف سے ہادی کی شائستہ آواز ابھری۔

"حجاب بول رہی ہوں۔"

"جی جی، بولیے، کب سے آپ کے بولنے کا منتظر تھا۔"

"تو کیا پروگرام ہے کل کا؟"

"وہی جو آپ نے کہا تھا۔ ٹھیک دس بجے ہوٹل کی لابی میں۔ اگر اس میں کوئی ردوبدل ہوا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔"

"ردوبدل کا امکان بھی ہے؟" اس نے کہا اور نچلا ہونٹ آہستہ سے دانتوں تلے دبا لیا۔

"نہیں۔ ویسے ہی بات کر رہا تھا۔" ہادی نے گھبرا کر کہا۔

وہ مسکرائی۔ "اگر ردوبدل کا امکان ہے تو میں بھی شاپنگ وغیرہ کی شکل میں کوئی سیکنڈ آپشن رکھ لوں کل کے لیے۔"

"خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔ میں کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ چند رسمی باتوں کے بعد یہ ٹیلی فونک گفتگو اختتام پذیر ہوگئی۔

☆☆☆

حجاب کے فون کے بعد ہادی بے چینی سے ہوٹل کے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پروگرام کے مطابق حجاب کو کل دس سوا دس بجے آنا تھا...... اور یہاں صورت حال یہ تھی کہ وہ منحوس شخص ابھی تک ہادی کے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ اب بھی وہ سیکنڈ فلور کی لابی میں موجود تھا اور صوفے پر آرام سے بیٹھا سہ پہر کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ کون تھا؟ کیا چاہ رہا تھا؟ ہادی کے ذہن میں ان گنت سوال منڈلا رہے تھے۔ ابھی ڈھائی تین گھنٹے پہلے ہادی نے لاہور میں اپنے پروڈیوسر شیخو صاحب سے بات کی تھی اور صورت حال سے تھوڑا بہت آگاہ کیا تھا۔ شیخو صاحب نے تین نمبرز لکھوائے تھے۔ ان میں سے ایک نمبر بڑا کارآمد تھا۔ یہ نمبر ایک ایسے پاکستانی نژاد اطالوی کا تھا جو روم کی پولیس میں حاضر سروس ڈپٹی انسپکٹر تھا۔ اس کا نام شیخو صاحب نے ہاشم ایرک بتایا تھا...... ایرک کی سمجھ تو ہادی کو نہیں آئی تھی لیکن ہاشم کی اچھی طرح آگئی تھی۔ اب یہ ہاشم ایرک تھوڑی دیر میں ہوٹل پہنچنے والا تھا۔ پروگرام کے مطابق وہ سادہ لباس میں تھا۔ اس نے سرخ شرٹ پہن رکھی تھی ہادی نے بھی اسے اپنے لباس کا رنگ بتا دیا تھا اور سیل نمبر بھی دے دیا تھا۔

پروگرام کے مطابق ٹھیک پانچ بجے ہادی اٹھا اور ٹہلتا ہوا لابی میں پہنچ گیا۔ ایل سی ڈی پر ایک رومانٹک کامیڈی فلم چل رہی تھی۔ آٹھ دس مرد و زن محو تماشا تھے۔ ان میں ہی وہ دھاری دار شرٹ والا ناٹا شخص بھی تھا لیکن وہ فلم نہیں دیکھ رہا تھا۔ بہ ظاہر وہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔

ہادی نے دیکھا گہری سرخ شرٹ والا دراز قد پولیس آفیسر لابی میں پہنچ چکا تھا اور اب سگریٹ سلگا کر ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھا۔ دو لمحے کے لیے اس کے ساتھ ہادی کی نگاہیں ملیں اور آنکھوں آنکھوں میں علیک سلیک ہوگئی۔ ہادی پولیس آفیسر ہاشم ایرک کے پاس سے گزرتا ہوا سیدھا ناٹے قد والے کے پاس پہنچ گیا۔

"ہیلو...... السلام علیکم!" ہادی نے اس کے پاس جھک کر کہا۔

اس نے ہادی کو دیکھا اور اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جلدی سے سنبھل کر بولا۔ "وعلیکم السلام۔"

"آپ پاکستانی ہیں؟" ہادی نے پوچھا۔

"نن...... نہیں۔ لیکن اردو بول سکتا ہوں۔ آپ فرمائیں کیا بات ہے؟"

"یہاں زبان کا بہت مسئلہ ہے۔ "ہم زبان" سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ میرا نام ہادی ہے۔ میں یہاں کمرا نمبر 118 میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ویسے آپ اطالوی پڑھ لیتے ہیں؟"

"کافی حد تک...... آپ فرمائیے۔"

"میرے کمرے میں دیوار پر روم کا ایک نقشہ لگا ہے۔ لیکن جگہوں اور راستوں کے نام وغیرہ اطالوی میں ہیں۔ کیا آپ اس کو سمجھنے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟"

وہ جیسے چند لمحوں کے لیے تذبذب میں رہا۔ پھر بولا۔ "چلیے...... میں دیکھ لیتا ہوں۔"

دونوں لابی سے اٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ ہادی نے دروازہ بند کر دیا لیکن لاک نہیں کیا۔ دیوار پر قریباً تین فٹ ضرب چار فٹ کا ایک اسٹائلش نقشہ موجود تھا۔ اسے دیکھ کر وہ شخص مسکرانے لگا۔ "جی ہاں، یہ نقشہ تو اطالوی میں ہے لیکن اس کو انگلش اور عربی وغیرہ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ دیکھیے۔"

اس نے نقشے کو ہاتھ سے حرکت دی وہ سلائڈ کر کے ایک طرف چلا گیا۔ اس کے نیچے ویسا ہی ایک دوسرا نقشہ موجود تھا، یہ انگلش میں تھا۔ "اوہو! تو یہ بات ہے۔" ہادی نے ہونٹ سکیڑے۔

وہ صرف اداکاری کر رہا تھا، ورنہ اسے بھی معلوم تھا کہ نقشے کے نیچے دو تین اور نقشے بھی موجود ہیں۔

"کہاں گھومنا چاہتے ہیں آپ؟" نوجوان شخص نے قدرے باریک آواز میں پوچھا۔ مضبوط جسم کے مقابلے میں یہ آواز ایک طرح کا تضاد پیش کرتی تھی۔

اہلیت

استاد۔ "وہ کون سا ڈیپارٹمنٹ ہے جس میں عورت کام نہیں کر سکتی۔"
شاگرد۔ "فائر بریگیڈ۔"
استاد۔ "کیوں؟"
شاگرد۔ "عورت کا، کام آگ لگانا ہے بجھانا نہیں۔"

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

"روم سینٹرم۔" ہادی نے جواب دیا۔

وہ دونوں نقشے پر جھک گئے۔ وہ شخص ہادی کو انگلی کی مدد سے بتانے لگا کہ فلاں رستہ کہاں سے نکلتا ہے اور کدھر کو جاتا ہے اور میٹرو ٹرین یا بس کہاں سے بہ آسانی مل سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے ہادی اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ ہادی نے جان بوجھ کر اپنی بائیں کہنی کو اس کے جسم سے قریب تر کر دیا اور یوں اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اس کی کہنی اس نامعقول شخص کی بیلٹ سے ٹچ ہوئی۔ یہاں ہادی کو کسی ابھری ہوئی سخت چیز کا احساس ہوا۔ یہ یقیناً پستول یا ریوالور وغیرہ کا دستہ ہی تھا۔ ہادی کے جسم میں دوڑتی ہوئی سنسناہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔

اب وہ ہادی کو اندرونی گلیوں کے کچھ شارٹ کٹس بتا رہا تھا۔ یقیناً وہ اس شہر کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔ ہادی نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بتائیں کہ اگر کوئی بندہ یہاں...... میٹرو کے اس اسٹیشن سے آپ کے پیچھے لگ جاتا ہے اور آپ اس سے بچ بچا کر یہاں...... اس ساحل تک جانا چاہتے ہیں تو آپ کو کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

اس نے ذرا چونک کر ہادی کو دیکھا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

ہادی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے یہ روم ہے، یہاں ہر طرح کے برے بھلے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی کسی غلط نیت سے آپ کے پیچھے لگ جائے تو پھر...... کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

وہ اب ہادی کے لب و لہجے سے ٹھٹک گیا تھا۔ ذرا سنبھل کر بولا۔ ''کیوں جناب! کہیں آپ کو کوئی برا تجربہ ہوا ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لیجیے۔'' ہادی نے کہا۔ اس دوران میں وہ چپکے سے اپنے سیل فون کا بٹن پش کر چکا تھا۔ اس بٹن کے پش ہوتے ہی ڈپٹی ہاشم ایرک کو کال چلی گئی تھی۔ یہ کال اس بات کا اشارہ تھی کہ اب وہ دروازہ کھول کر کمرے کے اندر آجائے۔ بہ مشکل آٹھ دس سیکنڈ بعد لمبا چوڑا ہاشم ایرک کمرے کے اندر تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور سوالیہ نظروں سے ہادی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ شخص اب بری طرح ٹھٹکا ہوا تھا۔ اسے گڑبڑ کا احساس ہو چکا تھا یا بس ہونے ہی والا تھا۔ ہادی نے جھک کر اس کے پستول نما ہتھیار کو شرٹ کے اوپر سے ہی دبوچ لیا۔ ہاشم بھی لپکا...... چند سیکنڈ بعد یہ ہتھیار اس شخص کی شرٹ کے نیچے سے نکل کر ہاشم کے چوڑے چکلے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ یہ چھوٹے سائز کا ایک بریٹا پستول تھا۔ ہاشم نے دھکا دے کر اس شخص کو صوفے پر گرا دیا۔

''کون ہو تم؟ ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' نوجوان شخص لرزاں آواز میں بولا۔ اس کے چہرے پر رنگ آجا رہے تھے۔

ہاشم نے اپنا آئی ڈی کارڈ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ ''پولیس، ڈپٹی انسپکٹر ہاشم ایرک۔'' اس نے کہا۔

اس شخص کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا۔ دو سیکنڈ کے لیے لگا کہ وہ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرے گا مگر پھر جہاں کا تہاں پڑا رہ گیا۔ ''کھڑے ہو جاؤ اور دیوار کی طرف منہ کرو۔'' ہاشم انگلش میں پھنکار کر بولا۔

''میرا جرم کیا ہے؟'' وہ ہکلایا۔

ہاشم کے تھپڑ کی گونج پورے کمرے میں سنائی دی۔ ''اٹھو اور دیوار کی طرف منہ کرو۔'' ہاشم نے سرسراتی آواز میں کہا۔

اس شخص کے ہونٹوں سے اب خون رس رہا تھا۔ چار و ناچار وہ اٹھا اور اس نے منہ پھیر کر دونوں ہاتھ دیوار پر ٹیک دیے۔ ہاشم نے اچھی طرح اس کی تلاشی لی اور اس کی جیبوں میں موجود ساری اشیا نکال کر میز پر ڈھیر کر دیں۔ ان میں سیل فون اور پرس وغیرہ بھی شامل تھے۔ ''چلو، اب سامنے اس کرسی پر بیٹھو۔'' ہاشم نے تحکم سے کہا۔

وہ اپنے ہونٹ کا خون پونچھتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''کوئی چالاکی دکھائی تو بری طرح پچھتانا پڑے گا۔'' ہاشم نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے تمہارے پاس اس پستول کا لائسنس بھی نہیں ہوگا۔ ناجائز اسلحے کے چارج میں ڈھائی تین سال کی جیل تو کہیں بھی نہیں گئی تمہارے لیے۔''

وہ شخص کرسی پر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے ہاشم اور ہادی کو دیکھنے لگا۔ ہاشم نے اس کی جیبوں سے نکلنے والی اشیا دیکھیں۔ ان میں اس شخص کا کوئی شناختی کاغذ موجود نہیں تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' ہاشم نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''گلزار...... گلزار احمد۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''ڈوب یونیورسٹی سے اکاؤنٹنگ کورس کیا ہے۔ اب جاب ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''رہائش کہاں ہے؟''

اس گلزار نامی شخص نے اپنا ایڈریس آفیسر کو لکھوا دیا۔

''مسٹر ہادی کا پیچھا کیوں کر رہے ہو مسلسل؟'' ہاشم نے پولیس والوں کے انداز میں اچانک سوال کیا۔

اس کا رنگ کچھ اور پھیکا پڑ گیا۔ ''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم مسٹر ہادی کا پیچھا کیوں کر رہے ہو پچھلے دو دن سے؟ یہ جہاں جاتے ہیں تم ان کے پیچھے ہوتے ہو۔''

''اگر ایسا ہے تو میرے لیے حیران کن بات ہے۔ یہ ایک...... اتفاق ہی ہوگا۔''

''میں اگر تمہیں دوسرا تھپڑ رسید کروں گا تو یہ بھی ایک اتفاق ہی ہوگا...... اور پھر میں اتفاقاً ہی تمہیں تھانے لے جا کر اتفاقاً ہی تمہیں آڑے ہاتھوں لوں گا...... دیکھو مسٹر گلزار...... تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ جو کچھ بھی ہے صاف صاف بتا دو۔ بالفرض محال تمہارے خلاف کچھ اور نہ بھی سامنے آیا تو یہ پستول ہی تمہیں جیل بھیجنے کے لیے کافی ہے۔''

''میں قسم کھاتا ہوں کہ......''

ابھی اس کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ہاشم کا ایک اور زوردار تھپڑ گلزار کے منہ پر پڑا۔ وہ کرسی سمیت الٹتے الٹتے بچا۔ ہاشم نے اس کے بال مٹھی میں جکڑے اور دانت پیس کر کہا۔ ''آسانی سے نہیں بتاؤ گے تو سخت مشکل میں پڑو گے۔ تمہارے خلاف ثبوت ہیں۔''

کھینچا تانی میں گلزار کی دھاری دار شرٹ کندھے پر سے پھٹ گئی تھی۔ وہاں ایک عورت کا نازیبا ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ نیچے انگریزی میں ایک فقرہ لکھا تھا...... مجھے ایک اچھا بستر اور ایک اچھی عورت دے دو۔ اس کے بعد مجھے کچھ نہیں چاہیے...... (یہ دراصل ایک یورپی دانشور کے معروف قول کی نقل تھی، اس نے کہا تھا...... مجھے ایک اچھا بستر اور ایک اچھی کتاب دے دو اس کے بعد مجھے کچھ نہیں چاہیے)

گلزار ہکلایا۔ ''مم...... میں اپنے وکیل سے بات کرنا چاہوں گا۔''

''لیکن اس سے پہلے تمہارے خلاف ایف آئی آر درج ہوگی۔'' ہاشم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ ذرا ڈھیلا پڑ گیا۔ ہاشم نے اس کی جیب میں سے نکلنے والی چیزوں کی جانچ شروع کی۔ اس کے پرس میں سے 270 یورو نکلے...... کچھ رسیدیں تھیں۔ ایک نیم عریاں اطالوی حسینہ کی تصویر تھی۔ ایک رسید سے اندازہ ہوا کہ اس نے اپنا ایڈریس درست بتایا ہے۔ وہ ''ایون ٹینو'' کے علاقے میں ایک بلڈنگ کے اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر تھا۔ تین چار گھنٹے پہلے اس نے ایک ''اے ٹی ایم'' مشین سے کیش نکلوایا تھا۔ ''اے ٹی ایم'' کی رسید پر اس کے اکاؤنٹ کی تفصیل درج تھی۔ ہاشم نے اس کا سیل فون چیک کیا۔ اس فون سے آخری تین کالیں گلزار نے ''آئی ایم'' نامی کسی فرد کو کی تھیں۔ آئی ایم کی اور کئی کالیں بھی فون کی ''کال ہسٹری'' میں موجود تھیں۔ ''یہ آئی ایم کون ہے؟'' ہاشم نے پوچھا۔

''میرا دوست ہے...... اور میں آپ سے پھر گزارش کرتا ہوں کہ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔''

''اگر یہ غلط فہمی ہے بھی تو، ہم اس کو ابھی دور کر لیتے ہیں۔'' ہاشم نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

سیل فون پر ایک نمبر پریس کرتے ہوئے ہاشم کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا۔ وہاں ایک کرسی پر بیٹھ کر وہ اطالوی میں کسی ساتھی افسر سے باتیں کرنے لگا۔ دو چار منٹ بعد اس نے ایک اور نمبر ملایا اور وہاں بھی اطالوی میں بات کی۔ اس گفتگو میں اس نے گلزار کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیل بھی دوسرے شخص کو بتائی۔ باہر کے ملکوں میں شہریوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا نظام کتنا منظم ہے اور اس تک رسائی کتنی تیزی سے ہوتی ہے اس کا اندازہ ہادی کو اگلے چند منٹ میں ہوا۔

قریباً دس منٹ بعد ہاشم ایرک اپنے فون کی اسکرین پر کچھ تلاش کرتا ہوا ہادی کی طرف آیا اور پھر فون سے نگاہیں ہٹا کر بولا۔ ''مسٹر ہادی...... یہ مس ارم چودھری کون ہیں؟''

ہادی کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ظہیر کی سالی ارم چودھری کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما...... ''کیوں کیا بات ہے ہاشم صاحب۔'' ہادی نے پوچھا۔

''یہ جو آئی ایم لکھا ہوا ہے...... اس سے مراد مس ارم ہے...... اس فون سے مس ارم کے ساتھ بار بار رابطہ کیا جاتا رہا ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ مس ارم کے اکاؤنٹ سے گاہے بگاہے رقم بھی گلزار کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتی رہی ہے۔ آخری ٹرانسیکشن صرف دو دن پہلے ہوئی ہے......''

ہادی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا...... ارم ہی وہ لڑکی تھی جو حجاب کے گھر میں تیزی سے اپنا رستہ بنا رہی تھی...... حجاب اور اس کے شوہر جلال میں دوریاں پیدا کرنے کے حوالے سے ارم کا اہم کردار تھا اور اب ثابت ہو رہا تھا کہ یہی ارم اس گلزار نامی شخص کے ساتھ مستقل رابطے میں ہے، اسے کسی نامعلوم مد میں رقم دے رہی ہے...... اور یہ گلزار، ہادی کے پیچھے لگا ہوا تھا...... یا شاید حجاب کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اگر وہ حجاب کے پیچھے لگا ہوا تھا تو یقیناً جان چکا تھا کہ ہادی اور حجاب روم میں اکٹھے گھوم پھر رہے ہیں۔ یہ خطرناک صورت حال تھی...... حجاب جو پہلے ہی مشکلات کا شکار تھی شدید ترین مشکلات میں پھنس سکتی تھی۔

ہادی کی ہتھیلیوں پر پسینا آ گیا۔ وہ ہاشم کو ایک طرف گوشے میں لے گیا اور سرگوشیوں میں اس سے بات کرنے لگا۔ اس نے ہاشم کو بتایا کہ اس بندے سے کچھ نہ کچھ اگلوانا ضروری ہے ورنہ وہ اس کی دوست کو بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران میں ان دونوں نے اپنی نگاہ گلزار کی طرف ہی رکھی تھی...... کہ وہ کہیں کوئی چالاکی نہ دکھا جائے۔

ہاشم نے کہا۔ ''آپ گھبرائیں مت...... یہ ضرور بکے گا۔ میں نے اس کا ریکارڈ ڈھونڈ لیا ہے۔ اس پر پہلے ہی ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام میں کیس چل چکا ہے۔ تب یہ ناکافی ثبوت کی بنا پر صرف بیس دن جیل میں رہ کر باہر آ گیا تھا۔ اب بڑا پکا کیس بن سکتا ہے اس پر۔ لیکن یہ مس ارم کون ہے؟''

''یہی لڑکی سارا چکر چلا رہی ہے۔ یہ میری دوست کو سخت نقصان پہنچانا چاہ رہی ہے اور اس میں اس کا مفاد چھپا ہوا ہے۔''

ہادی نے مختصر الفاظ میں ہاشم ایرک کو صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ اس کی دوست کا نام حجاب ہے اور وہ صرف مخلص دوست کی حیثیت سے ملتے جلتے ہیں۔ حجاب کے بارے میں اس سے پہلے بھی وہ ہاشم کو تھوڑا بہت بتا چکا تھا (شیخو صاحب نے ہادی کو بتایا تھا کہ ہاشم ایرک پر ہر طرح کا بھروسا کیا جا سکتا ہے)

ہاشم نے گلزار کے پاس جا کر دوٹوک لہجے میں بات کی

اور اسے بتایا کہ اسے پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا اور اس کے خلاف کیس رجسٹرڈ ہوگا۔ اس کے علاوہ اس نے اسے یہ بھی بتادیا کہ وہ بہت سخت طریقے سے پھنسنے والا ہے۔

گلزار اب بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ وہ ہاشم کی سخت مزاجی سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا اور مزید تھپڑ کھانے کے خوف سے سہا ہوا تھا۔ اپنی پیشہ وارانہ مہارت سے، دس پندرہ منٹ کے اندر اندر ہاشم ایرک نے گلزار کو بالکل گھٹنوں پر کردیا۔ وہ وکیل دلیل والی ساری باتیں بھول کر منت سماجت پر اتر آیا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس کے پاس اس بریٹا پستول کا لائسنس نہیں ہے اور یہ پستول اس نے کسی اٹھائی گیرے سے 800 یورو میں خریدا تھا۔ تاہم ارم کے حوالے سے وہ کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے رہا تھا۔ بس یہی کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی کلاس فیلو رہی ہے اور ان کا آپس میں لین دین چلتا رہتا ہے۔

بہرحال ہاشم نے اس پر اپنا دباؤ برقرار رکھا، بلکہ اسے بڑھاتا چلا گیا۔ وہ اسے ہتھکڑی لگا کر پولیس اسٹیشن لے جانا چاہ رہا تھا۔ ہتھکڑی منگوانے اور اپنے معاون اہلکار کو بلانے کے لیے اس نے اپنا واکی ٹاکی ہاتھ میں لیا تو گلزار کی رہی سہی برداشت بھی ختم ہوگئی۔ اس نے ڈپٹی انسپکٹر ہاشم کے واکی ٹاکی پر ہاتھ رکھ دیا اور منت سماجت کرنے لگا۔

اس موقع پر ہادی نے مداخلت کی اور ہاشم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”آفیسر اگر یہ تعاون کر رہا ہے تو پھر اسے ہتھکڑی نہ لگائی جائے اور کیا اس کے وکیل سے اس کی بات کرانا بھی ہمارے لیے ممکن ہوگا؟“

ہاشم ایرک نے ہادی کو گھورا۔ ”مسٹر ہادی! کیا آپ مجھے سکھائیں گے کہ مجھے اپنا کام کس طرح کرنا چاہیے؟“

”نہیں، میرا مطلب تھا کہ اگر......“

”پلیز، مسٹر ہادی! آپ خاموش رہیں۔ یہ بہت سیریس کیس ہوگیا ہے...... اور جناب! مجھے بھی اپنے بڑوں کو جواب دینا ہے۔“

وہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ہادی جانتا تھا کہ وہ یہ سب دکھاوے کے لیے کر رہا ہے۔ اس کا مقصد گلزار پر دباؤ بڑھانا ہے۔ اگر یہ بندہ پولیس اسٹیشن چلا جاتا تو پھر ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ رہتا اور یہ سلسلہ حجاب اور اس کے اہل خانہ کی رسوائی کی طرف چل نکلتا۔ ہادی نے آواز دے کر ہاشم کو روک لیا اور پھر کمرے کے ایک گوشے میں جا کر دوبارہ اس سے کھسر پھسر شروع کردی۔ کسی حد تک ہادی بھی جان چکا تھا کہ اب گلزار عرف گلزاری بے طرح پھنس چکا ہے اور اسے چند سال کی جیل آنکھوں کے سامنے نظر آرہی ہے۔ اس موقع پر اس سے بارگیننگ کی جاسکتی تھی۔ اب اس سے کوئی ایسا خطرہ بھی نہیں تھا۔ اس کی مکمل تلاشی ہو چکی تھی اور اس کا ناجائز پستول ہاشم کے قبضے میں تھا۔

ہادی نے یہی تاثر دیا جیسے اس نے سمجھا بجھا کر کسی طرح ہاشم کو وقتی طور پر کمرے سے باہر بھیج دیا ہے۔

گلزار کے ہونٹ سے گاہے بگاہے خون رسنے لگتا تھا۔ ہادی نے اسے جراثیم کش ٹشو پیپر دیا تاکہ وہ ہونٹ پر رکھ سکے۔ ایک کولڈ ڈرنک کھول کر اس کے پاس شیشے کی تپائی پر رکھا اور اس سے قدرے نرم لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ اس نے گلزار کو باور کرایا کہ وہ بری طرح گھر چکا ہے لیکن اگر وہ تعاون کرے تو ہاشم ایرک کو سخت ایکشن سے روکا جاسکتا ہے۔

اس نے گلزار سے کہا۔ ”دیکھو نوّے فیصد معلومات تو تمہارے بتائے بغیر ہی ہمیں مل چکی ہیں...... باقی دس فیصد بھی دے دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں قانونی کارروائی والی مصیبت سے بچالوں گا۔ بلکہ...... ہوسکتا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی ایسا لنک بھی بن جائے جس سے تم مالی فائدہ حاصل کرسکو۔“

”دیکھیں، میرے پاس بتانے کو زیادہ کچھ نہیں ہے اور اگر میں آپ کو بتاتا بھی ہوں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ مکر نہیں جائیں گے...... اور ڈپٹی کو منالیں گے؟“ وہ دونوں اردو میں بات کر رہے تھے۔

ہادی نے ذرا روکھے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے پاس سودے بازی کے لیے کچھ نہیں ہے گلزار...... میں بس تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں کہ ارم چودھری نے جلال کی وائف حجاب کو مشکل میں ڈالنے کے لیے تمہیں اس کے پیچھے لگا رکھا ہے...... اور تم اس کے کہنے پر عمل کر رہے ہو۔“

گلزار کچھ دیر سوچتا رہا، اس کے گورے چٹے چہرے پر تذبذب کے گہرے سائے تھے، پھٹی ہوئی شرٹ میں سے بے ہودہ ٹیٹو کا کچھ حصہ جھانک رہا تھا...... آخر طویل سانس لے کر بولا۔ ”بے شک ایسا ہوا ہے لیکن مجھے کسی اندر کی کہانی کا پتا نہیں۔ ارم نے بس اتنا کہا تھا کہ حجاب اس کی فیملی ممبر ہے اور میں اس کے آنے جانے پر ذرا نظر رکھوں۔“

زندگی کے نشیب و فراز گھٹن زدہ ماحول اور حدود قیود سے نبرد آزما باہمت حسینہ کی داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

غلطی

تنویر ریاض

وہ ایک ایسا جادوگر تھا جسے خود کو چھپانے کا ہنر آتا تھا... وہ جو بہت بڑا بازی گر تھا... جسے دنیا کو انگلی پر نچانے کا زعم تھا جانے کیسی غلطی سرزد ہوئی کہ انگلی کٹا کر خود کو ظاہر کر بیٹھا مگر... اس کے قافلے سے بچھڑنے والے پھر بھی اس کی گرد تک نہ پاسکے... یہ اور بات کہ وہ اس ماہر سراغ رساں کی نظروں سے نہ بچ سکا۔

لباس کے مانند شریک سفر بدلنے والے شعبدہ باز کی مستقل مزاجی

پرائیویٹ سراغ رساں کولن اسمتھ نے سامنے بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھا اور نوٹ پیڈ اپنی جانب کھسکاتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

دائیں جانب بیٹھی ہوئی عورت نے مسکراتے ہوئے تھوڑا سا سر خم کیا اور بولی۔ ”میرا نام ایتھل ہے اور یہ میری سوکن سارہ ہے۔“

کولن نے چونک کر دیکھا جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا ہو۔ وہ عورت کولن کی پریشانی کو بھانپ گئی۔ اس

نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہماری شادی ایک ہی مردسے ہوئی ہے۔“

کولن نے ایک طویل سانس لے کر اپنی کمر کرسی کی پشت سے لگالی اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ ایک میان میں دو تلواریں...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اینتھل نے اپنے پرس میں سے ایک تصویر نکالی اور کولن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ تم اس شخص کو تلاش کرو۔“

کولن نے اس تصویر پر ایک نظر ڈالی۔ اس شخص کے چہرے میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس کی بنا پر اسے مجمع میں شناخت کیا جاسکتا۔ کولن نے جیب سے قلم نکالا اور بولا۔ ”کیا میں اس شخص کا نام جان سکتا ہوں؟“

”ہیریسن جونز۔“ اینتھل نے بولنا شروع کیا۔ ”عمر تیس سال، قد پانچ فٹ چھ انچ۔ وزن ایک سو چالیس پونڈ، سرخ بال، سبز آنکھیں، وہ کسی بھی بیس سالہ لڑکی کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔“

یہ سن کر کولن کو شدت سے محرومی کا احساس ہونے لگا۔ اس کی عمر بھی بتیس کے لگ بھگ تھی۔ قد چھ فٹ، وزن ایک سو نوے پونڈ، بادامی آنکھیں، گھنے سیاہ بال، اس کے باوجود کسی لڑکی نے اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ اس شخص میں ضرور کوئی ایسی صلاحیت ہوگی جس کا اینتھل کو بھی علم نہیں۔

اینتھل نے اپنا پورا نام اینتھل فلوریڈا جونز بتایا تھا۔ عمر پینتیس سال، قد پانچ فٹ دو انچ، وزن ایک سو چالیس پونڈ، بھورے بال۔ وہ نیو اورلینز میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی۔ اس نے کیتھولک اسکول سے گریجویشن کر رکھا تھا۔ سرخ لباس میں وہ خاصی دلکش نظر آرہی تھی جبکہ سارہ نے زرد رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔

”کیا تم نے اس بارے میں پولیس کو بتایا؟“ کولن نے دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

اینتھل بولی۔ ”ہاں اور نہیں۔“

”پولیس کے اسی رویہ کے وجہ سے ہم ڈسٹرکٹ اٹارنی کے دفتر بھی نہیں جاسکتے۔“ سارہ نے کہا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“ کولن بولا۔ ”ہاں اور نہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”ہم نے ایک پولیس آفیسر کرسٹو سے بات کی تھی لیکن وہ بڑی بدتمیزی سے پیش آیا۔“ اینتھل نے جواب دیا۔

سارہ بولی۔ ”صرف یہی نہیں بلکہ اس نے ہمارا مذاق بھی اڑایا۔“

”اس نے کہا کہ پولیس کسی کے نجی معاملات میں مداخلت نہیں کرسکتی۔ ہمیں خود ہی اسے تلاش کرنا ہوگا۔“

کولن اس پولیس آفیسر کرسٹو کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کسی زمانے میں دونوں ایک ہی شفٹ میں کام کیا کرتے تھے پھر کولن نے پولیس کی ملازمت چھوڑ کر سراغ رسانی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ کرسٹو عموماً لوگوں کے ذاتی معاملات سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

”قانوناً بیک وقت دو بیویاں رکھنا جرم ہے۔“ کولن نے کہا۔

”میرے پاس اس کا ثبوت ہے۔“ اینتھل نے اپنے پرس سے کچھ کاغذات نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

ان میں سے ایک سرٹیفکیٹ کے مطابق ہیریسن جونز کی شادی دو سال قبل اینتھل فلوریڈا جونز سے ہوئی تھی جبکہ دوسرے سرٹیفکیٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ہیریسن جونز نے گزشتہ جنوری میں سارہ سے شادی رچائی تھی اور یہ دونوں سرٹیفکیٹس اورلینز کے گرجا سے جاری ہوئے تھے۔

”کیا گرجا میں ہونے والی شادیوں کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا جس سے معلوم ہوسکے کہ ہیریسن جونز ایک سے زیادہ شادیاں کرچکا ہے۔ دوسری شادی صرف پہلی بیوی کے انتقال یا طلاق کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔“ کولن نے کاغذات دیکھنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ممکن ہے کہ اس نے اپنے آپ کو رنڈوا ظاہر کیا ہو۔“ اینتھل بولی۔

”اس مقصد کے لیے وہ جھوٹا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرسکتا ہے۔ گرجا گھروں میں پیدائش اور اموات کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا اور نہ ہی ان کے پاس اسے چیک کرنے کا کوئی بندوبست ہے۔“

”وہ دوسری شادی کرنے کے لیے جھوٹا طلاق نامہ بھی پیش کرسکتا ہے۔“ سارہ نے کہا۔

”سمجھ گیا۔“ کولن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”فطری طور پر وہ مجرمانہ ذہنیت کا مالک ہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔“

”اس کی اور بھی بیویاں تھیں۔“ سارہ نے انکشاف کیا۔

کولن نے ایک گہری سانس لی اور پوچھا۔ ”کتنی؟“

”اب تک ہم چار کا پتا لگانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔“ سارہ نے اپنے پرس سے ایک کاغذ نکال کر کولن کو دیتے ہوئے کہا۔

”میرے والد ریٹائرڈ ملٹری آفیسر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسے تلاش کرنے کے لیے ہمیں کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں۔ وہ مختلف نام استعمال کرتا ہے۔“ اینتھل نے کہا۔

”مثلاً فیلکس، انتھونی، پیٹرک اور جیمس وغیرہ وغیرہ۔“ سارہ بولی۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ ہیریسن جونز اس کا اصلی نام ہے۔“ کولن نے پوچھا۔

اینتھل نے اس کی پیدائش کا سرٹیفکیٹ نکالا۔ وہ کولن کی پیدائش سے تین ماہ پہلے پیدا ہوا تھا۔ کولن نے حساب لگایا۔ اس کی عمر واقعی تیس سال تھی۔

”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ مختلف نام استعمال کرتا رہا ہے؟“

”دراصل ان ناموں کا تعلق اس کے ماضی سے ہے۔“ اینتھل نے کہا۔ ”اس نے سینٹ انتھونی گرامر اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے باپ کی تدفین سینٹ پیٹرک کے قبرستان میں ہوئی اور وہ کچھ عرصہ جیمس ہائی اسکول میں بھی زیر تعلیم رہا۔“

”اور فیلکس کے بارے میں کیا کہو گی؟“

”یہ اس کا پسندیدہ کارٹون کیریکٹر ہے۔“ سارہ نے جواب دیا۔

کولن نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم میں سے کس نے اسے آخری بار کب دیکھا تھا؟“

”تقریباً ایک ماہ پہلے۔ اٹھارہ جون اور اتوار کا دن تھا۔“ سارہ بولی۔ ”اس نے مجھے گرجا کے باہر اتارا اور گاڑی پارک کرنے چلا گیا۔ میں اس کا انتظار ہی کرتی رہی لیکن وہ پلٹ کر نہیں آیا۔ اس کے بعد سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔“

”وہ ہمارے بینک اکاؤنٹ بھی خالی کرگیا۔“ اینتھل تقریباً رو دینے کے انداز میں بولی۔

”وہ کہاں کام کرتا تھا؟“

دونوں عورتوں نے کندھے اچکا دیے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کولن ان سے آدھا گھنٹا تک مزید تفصیلات معلوم کرتا رہا۔ جس میں دوسری چار بیویوں کے نام اور پتے کے علاوہ سارہ اور اینتھل کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیل بھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ خاصا دردسری کا کام ہے لیکن دو سو ڈالرز ملنے کے بعد وہ اس کے لیے تیار ہوگیا۔

ان دونوں عورتوں کے جاتے ہی بارش شروع ہوگئی۔

وہ دفتر کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں مزید پھیلا دیے اور آنکھیں بند کرلیں۔ باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی اور چند ہی منٹوں میں جل تھل ایک ہوگیا۔ یہ مون سون کا موسم تھا اور کچھ پتا نہیں ہوتا کہ موسم کے تیور کب بدل جائیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس کے سر درد میں کمی واقع ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ آج جمعہ ہے اور اسے وقت ضائع کیے بغیر ہیریسن جونز کے کیس پر کام شروع کردینا چاہیے۔

اس نے فون اٹھا کر پہلا نمبر ملایا۔ اگر ہیریسن نے مکان تبدیل کیا تھا تو یقیناً وہ بجلی، گیس اور فون کا بل بھی ادا کرتا ہوگا لیکن پبلک سروس والوں نے بتایا کہ ان کے ریکارڈ کے مطابق ہیریسن جونز... نامی کسی شخص کے نام پر کوئی بل جاری نہیں ہوا۔ اسی طرح مردہ خانے اور قبرستان سے بھی اس نام کے کسی شخص کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق اس نام کا کوئی شخص کبھی گرفتار نہیں ہوا۔ نہ ہی اس کا کبھی کوئی چالان ہوا۔ البتہ اس کے ڈرائیونگ لائسنس پر سارہ کے گھر کا پتا درج تھا لیکن اس سے ہیریسن کا کوئی سراغ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

کولن نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پانچ بج رہے تھے۔ آج اس نے لنچ بھی کیا۔ وہ دفتر بند کرکے نیچے آیا اور ایک ریستوران میں بیٹھ کر برگر اور کافی سے دل بہلانے لگا۔ بارش رک چکی تھی۔ اس نے کافی ختم کرکے سگریٹ سلگایا اور ہیریسن کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسی شہر میں کسی دوسرے نام سے اپنی حرکتوں میں مصروف ہوگا۔

سارہ نے ہیریسن کی بیویوں کے ناموں کی فہرست حروف تہجی کے لحاظ سے بنائی تھی لہٰذا کولن نے سب سے پہلے ایلما ہیریسن جونز سے ملنے کا فیصلہ کیا جو گارفیلڈ اسٹریٹ کے ایک منزلہ مکان میں رہتی تھی۔ بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا البتہ جالی والے دروازے کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ کولن نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو اسے چوبی فرش پر اونچی ایڑی کے سینڈل کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ چند لمحوں بعد ہی ایک لمبے قد کی دبلی عورت دروازے پر نمودار ہوئی، اس نے زرد رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی۔

”کون ہے؟“ اس نے اندر سے ہی پوچھا۔

کولن نے اپنی جیب سے تعارفی کارڈ نکالا اور بولا۔ ”میں پرائیویٹ سراغ رساں کولن اسمتھ ہوں اور ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہوں جس کے بارے میں شاید تم کچھ

بتاسکو۔"

"اچھا، کون ہے وہ شخص؟" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

کولن نے ہیریسن کی تصویر اس کے سامنے کردی جسے دیکھتے ہی اس عورت کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں اپنا فون نمبر دے سکتی ہوں اگر یہ شخص تمہیں مل جائے تو فون کردینا۔"

کولن نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور اس عورت کا فون نمبر لکھنے کے بعد بولا۔ "تم نے آخری بار اسے کب دیکھا تھا؟"

"1946ء میں نئے سال کی آمد پر وہ میری بیوک کار لے کر کسی کام سے گیا تھا اور پلٹ کر نہیں آیا۔ میری کار پولیس کو دوسرے دن ریلوے اسٹیشن کے پارکنگ لاٹ سے ملی۔ اس سے بھی بڑا ستم اس وقت ہوا جب بینک منیجر نے مجھے فون پر بتایا کہ میرا اکاؤنٹ خالی ہوچکا ہے۔"

اس نے اپنی بات ختم کی اور چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے بولی۔ "تم کافی لوگے یا اسکاچ؟"

کولن نے کافی کا انتخاب کیا اور ایلما کے ساتھ چلتا ہوا کچن تک آگیا۔

"میرا پہلا شوہر ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔" وہ کولن کے سامنے کافی کا کپ رکھتے ہوئے بولی۔ اپنے لیے اس نے اسکاچ کا انتخاب کیا تھا پھر وہ اسے حادثے کی تفصیل بتانے لگی۔ کولن پوری توجہ سے اس کی بات سنتا رہا۔ وہ تعریفی انداز میں بولی۔ "تم ایک اچھے سامع ہو۔ پیٹرک میں بھی یہ خوبی تھی۔ میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر گھنٹوں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی اور وہ تسلی دینے والے انداز میں میرا شانہ تھپکتا رہتا۔ مجھے لگا کہ اس دنیا میں اس سے زیادہ غم گسار اور ہمدرد کوئی نہیں ہوسکتا۔"

"اس کا اصلی نام ہیریسن جونز ہے۔"

اس نے حیرت سے اپنی پلکیں جھپکائیں اور ہنستے ہوئے بولی۔ "مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔"

"پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اس کی اور بھی بیویاں تھیں۔"

"مجھے یہ سن کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ جو شخص اپنا نام بدل کر مجھے دھوکا دے سکتا ہے۔ مجھے قلاش کرکے جاسکتا ہے۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

کولن نے اس کا تفصیلی بیان لیا اور کچھ سوالات پوچھے لیکن ہیریسن کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہ ہوسکی۔ سوائے اس کے کہ وہ کیری گرانٹ کا بہت بڑا پرستار تھا اور اس کی ہر فلم کئی بار دیکھا کرتا تھا۔ البتہ وہ یہ نہ بتاسکی کہ وہ کن جگہوں پر زیادہ جایا کرتا تھا۔ اس کے پسندیدہ بار یا ریستوران کون سے تھے اور وہ کن مشاغل میں دلچسپی لیتا تھا۔

ایلما نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکائیں اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "تم بھی کیری گرانٹ سے کم نہیں ہو۔ اسی کی طرح سیاہ بال، لمبا قد اور ہینڈسم۔"

کولن نے گھڑی دیکھی اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب مجھے چلنا چاہیے، کوئی میرا انتظار کررہا ہوگا۔"

وہ مایوس ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا تم شادی شدہ ہو؟"

کولن نے جواب دینے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر آگیا۔

☆☆☆

کیسی ملر جونز نے دروازہ کھولنے کے بجائے انٹرکام کے ذریعے بات کرنے کو ترجیح دی۔ اس نے بتایا کہ انتھونی جونز سے اس کی شادی جنگ کے زمانے میں ہوئی تھی اور وہ اس سے یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ اسے محاذ پر جانے کا حکم ملا ہے۔ کیسی کو بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ ایک سال بعد ان دونوں کا ٹکراؤ ایک ڈانس ہال میں ہوا لیکن وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ گیا۔

"کیا تم اس ڈانس ہال کا نام بتاسکتی ہو؟"

"دافورپورٹ، ویسٹ اینڈ لیکن اب وہ بند ہوچکا ہے۔"

"اس کے بعد تم نے اسے کبھی دیکھا یا اس کے بارے میں سنا؟"

"نہیں، تم اسے تلاش کرو۔ وہ میرے گیارہ سو ڈالرز بھی لے گیا ہے جو اس نے مجھ سے ادھار لیے تھے۔"

☆☆☆

ہیریسن کی بیویوں میں تیسرا نمبر میری جونز کا تھا۔ وہ جب اس کے اپارٹمنٹ پہنچا تو عمارت کی مالکن نے بتایا کہ میری سات ماہ قبل وہاں سے جاچکی ہے اور وہ اس کے موجودہ پتے سے لاعلم ہے۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ میری کا کوئی شوہر بھی تھا لیکن وہ اس کے حلیے کے بارے میں کچھ نہ بتاسکی۔

فہرست میں آخری نام سیڈی لیون جونز کا تھا جو ابھی تک بوڈن اسٹریٹ پر واقع اسی دومنزلہ اینٹوں سے بنے ہوئے مکان میں رہ رہی تھی جس کا پتا سارہ نے بتایا تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے سفید بلاؤز اور سیاہ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ کے قریب تھا اور گہری سبز آنکھوں کی وجہ سے اس کے چہرے کی کشش میں اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لونگ روم میں لے گئی جو قیمتی فرنیچر سے مزین تھا۔ اس نے کولن کو کافی کی پیشکش کی لیکن اس نے انکار کردیا اور نوٹ بک کھولتے ہوئے بولا۔

"ہیریسن سے تمہاری شادی کب ہوئی تھی؟"

وہ چونکتے ہوئے بولی۔ "ہیریسن؟"

کولن نے اسے تصویر دکھائی تو اس نے کہا۔ "میرے شوہر کا نام جیمس جونز ہے۔ ہماری شادی 1940ء میں ویلنٹائن ڈے کے موقع پر ہوئی اور وہ یکم نومبر کو مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ گھر سے کہہ کر گیا تھا کہ قریبی دکان سے دودھ لینے جارہا ہے لیکن پلٹ کر نہیں آیا۔ اس کے بعد سے اب تک میں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا اور نہ ہی کبھی اسے دیکھا۔"

"لگتا ہے کہ تم اس کی پہلی بیوی ہو؟" کولن نے کہا۔

"پہلی بیوی۔" وہ چونکتے ہوئے بولی۔ "کیا اس کی اور بھی کوئی بیوی ہے؟"

"ایک دو نہیں بلکہ پانچ۔" کولن نے کہا۔ "اور کسی سے طلاق نہیں لی۔"

"مجھے یہ امید نہیں تھی۔" وہ حیرانی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "تاہم میں اس کی پہلی بیوی نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی وہ ایک شادی کرچکا تھا۔ اس عورت کے انتقال کے بعد اس نے مجھ سے شادی کی تھی۔"

"یہ کب کی بات ہے۔ اس عورت کا انتقال کیسے ہوا تھا۔ کیا تم مجھے اس کا نام اور پتا بتاسکتی ہو؟"

"ڈورس یہ 1939ء کے کرسمس سے کچھ روز پہلے کی بات ہے۔ اسے ایک حادثہ پیش آیا تھا۔"

کولن اس کا شکریہ ادا کرکے چلا آیا۔ اگلے روز وہ ناگہانی اموات کے شعبے میں گیا جہاں اس کا ایک پرانا واقف کار ناتھن اسٹیک کام کرتا تھا۔ اس نے اپنی نوٹ بک کھولی کہ وہ 1939ء میں حادثے کا شکار ہونے والی ڈورس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسٹیک اور کولن کے درمیان پرانی واقفیت تھی لہٰذا اسٹیک کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کی بات ٹال دے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور چند منٹوں میں ڈورس کی فائل لے کر آگیا۔ جس کے مطابق اس کی موت 15 دسمبر 1939ء میں واقع ہوئی تھی۔ وہ پانی میں ڈوب کر مری تھی اور اسے ایک حادثہ قرار دیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی اس کی

تصدیق ہوگئی تھی۔

''حادثاتی موت۔'' کولن نے طنزیہ انداز میں کہا۔''اس کے شوہر کے بارے میں کچھ معلومات ہیں؟''

''اس کا نام ہبریسن جونز اور پیشہ گشتی سیلز مین لکھا ہوا ہے۔ وہ ان دنوں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے واپس آکر لاش وصول کرلی لیکن ڈورس کا انشورنس نہیں تھا۔''

کولن نے اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا اور دفتر کی عمارت سے باہر آگیا۔ ابھی تک ہبریسن کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوسکی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ کیری گرانٹ کا پرستار تھا۔ اس نے ایک ریستوران میں لنچ کرنے کے دوران اخبار دیکھا تو معلوم ہوا کہ کورٹیز سینما میں کیری گرانٹ کی دو فلمیں چل رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی لنچ ختم کیا اور سینما کی طرف چل دیا۔ چار بجے کا شو شروع ہونے والا تھا اور سینما کے باہر ٹکٹ خریدنے والوں کی ایک لمبی قطار موجود تھی۔ کچھ لوگ ہال سے باہر جارہے تھے اور کچھ اندر جارہے تھے۔ کولن نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کردی اور سینما ہال سے نکلنے اور اندر جانے والے لوگوں کو دیکھنے لگا گو کہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ہبریسن یہ فلم دیکھنے آئے گا لیکن تھوڑا بہت امکان ضرور تھا کیونکہ اگلے روز اس کی جگہ دوسری فلم لگ جاتی اور ہبریسن کے بارے میں اس کی ایک بیوی نے بتایا تھا کہ وہ کیری گرانٹ کی فلمیں بار بار دیکھتا ہے۔ اس لیے اگر وہ شہر میں موجود ہے تو یہ فلم دیکھنے ضرور آئے گا لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کون سا شو دیکھے گا۔ کولن نے فیصلہ کرلیا کہ وہ رات بارہ بجے تک ہر شو کے شروع ہونے پر سینما کا چکر لگاتا رہے گا۔

وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے سینما کے داخلی دروازے پر نظریں جمائے کھڑا ہوا تھا کہ قریبی عمارت سے ایک شخص بنیان اور پجامہ میں ملبوس باہر نکلا اور آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔''تمہیں نو پارکنگ کا بورڈ نظر نہیں آرہا۔ اس کے باوجود تم نے اپنی گاڑی یہاں کھڑی کردی۔''

کولن نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا اور ٹالنے کے انداز میں بولا۔''میں نے گاڑی پارک نہیں کی ایک دوست کا انتظار کررہا ہوں۔ چند منٹوں بعد چلا جاؤں گا۔''

''تم ایسے نہیں مانو گے۔ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔

کولن اپنی گاڑی ہٹانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر قطار میں کھڑے ہوئے ایک سرخ بالوں والے شخص پر گئی۔ کولن سب کچھ بھول کر اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس نے تیزی سے سڑک پار کی اور ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ یقیناً ہبریسن تھا۔ وہ ٹکٹ لے کر قطار سے باہر آیا تو ایک لمبے قد کی سنہرے بالوں والی عورت نے اس کا بازو تھام لیا اور اس کے ساتھ سینما ہال میں چلی گئی۔ اتنی دیر میں کولن ان دونوں کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ ہبریسن نے سفید شرٹ کے ساتھ سلیٹی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی جبکہ عورت کا لباس زرد بلاؤز اور سفید اسکرٹ پر مشتمل تھا۔

کولن تیزی سے واپس آیا اور اپنی کار سینما کی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کردی پھر وہ ٹکٹ خرید کر ہال میں داخل ہوگیا۔ فلم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اندر کی بتیاں روشن تھیں جس کی وجہ سے اسے اپنی مطلوبہ نشست تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ہبریسن کی نشست سے دو قطار پیچھے ایک ایسی جگہ پر بیٹھ گیا جہاں سے اس کی نقل و حرکت پر بہ آسانی نظر رکھی جاسکتی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی ہال میں اندھیرا چھا گیا اور فلم شروع ہوگئی۔ ہبریسن اور اس کی ساتھی عورت فلم دیکھنے کے بجائے سرگوشیوں میں مصروف تھے اور کبھی کبھی اتنے قریب ہوجاتے کہ کسی غیر اخلاقی حرکت کا گمان ہونے لگتا۔

پہلا شو ختم ہوا تو وہ دونوں باہر لاؤنج میں آگئے اور کوک سے دل بہلانے لگے۔ کولن کا خیال تھا کہ وہ اس شو کے اختتام پر روانہ ہوجائیں گے لیکن وہ دوسری فلم دیکھنے کے لیے رک گئے جو ایک سال پہلے ریلیز ہوچکی تھی اور اب دوسری بار نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی لیکن انہوں نے پوری فلم نہیں دیکھی بلکہ تیسرا ایکٹ ختم ہوتے ہی باہر آگئے۔ کولن نے بھی ان کی تقلید کی اور کچھ فاصلہ رکھ کر تعاقب کرتا رہا۔ وہ دونوں پارکنگ لاٹ کی طرف جانے کے بجائے پیدل کورٹیز اسٹریٹ پر آگئے اور بینگ اسٹریٹ پر واقع ایک دو منزلہ مکان میں داخل ہوئے لیکن ہبریسن اندر نہیں گیا بلکہ دروازے سے ہی واپس آگیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک ریستوران میں داخل ہوا اور کاؤنٹر کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ کولن نے بھی اس کے برابر والا اسٹول سنبھال لیا۔ ایک لمبے قد کی ویٹرس نے ان کے آگے کافی اور مینو رکھ دیا۔ ہبریسن نے کلب سینڈوچ کا آرڈر دیا جبکہ کولن نے اپنے لیے سادہ سینڈوچ منگوائے۔ ویٹرس کے جانے کے بجائے کولن آہستہ سے بولا۔

''ہبری، اگر میں غلطی نہیں کررہا تو یہ تمہاری آٹھویں بیوی ہوگی؟''

ہیریسن نے چونک کر اسے دیکھا اور اپنی نظریں کولن کے چہرے پر گاڑ دیں۔ چند لمحوں بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔“

”شاید۔“ کولن نے سرسری انداز میں کہا۔

”سٹی پارک اسٹیڈیم۔“ ہیریسن نے کولن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”سٹی چیمپئن شپ، تم نے ہی وننگ شاٹ کھیلا تھا۔“

یہ جملہ سن کر کولن بھی ماضی میں پہنچ گیا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ ہیریسن اس تاریخی فتح کی یاد دلا دے گا جسے وہ خود بھی بھلا چکا تھا۔ اس نے اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم غالباً فٹ بال کھیلتے تھے۔“

”نہیں، تمہاری تصویر بھی اخبار میں شائع ہوئی تھی۔“

کولن سوچنے لگا کہ اس شخص کی یادداشت کتنی تیز ہے کہ اسے تیرہ برس پرانی باتیں بھی یاد ہیں اور یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ان باتوں کو دہرا کر کس طرح بھٹکایا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ”وہ سنہرے بال والی عورت کون ہے، اگر تم نہیں بتاؤ گے تو مجھے خود اس سے پوچھنا پڑے گا۔“

”ڈورتھی پال۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

ویٹرس سینڈوچ لے کر آ گئی تھی۔ ان دونوں نے اپنی اپنی پلیٹ اٹھائی اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ہیریسن بولا۔ ”میں ایک آوارہ گرد شخص ہوں۔ کام کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ جس میں مجھے بہت زیادہ سفر کرنا پڑتا ہے۔ اسی دوران اس طرح کے واقعات پیش آ جاتے ہیں۔ مجھ میں ایک بہت بری عادت ہے جسے کوشش کے باوجود دور نہیں کر سکا۔ میں کسی بھی عورت کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہوں۔ بعض معمولی شکل وصورت کی عورتوں پر بھی میرا دل آ جاتا ہے۔ میں اس سے شادی کر لیتا ہوں۔ ہنی مون بہت اچھا گزرتا ہے لیکن سال چھ مہینے بعد میرا دل اکتا جاتا ہے اور میں کسی دوسری عورت کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔“

”تم ان سب سے شادی کر لیتے ہو؟“ کولن نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں لیکن انہیں طلاق بھی دے دیتا ہوں۔“

”طلاق، وہ کس طرح؟“

”رینو نویدا میں میری کزن جج ہے۔ جب بھی ضرورت پڑتی ہے ٹرین کے ذریعے وہاں جاتا ہوں اور دوسری شادی کرنے سے پہلے طلاق نامہ حاصل کر لیتا ہوں۔ اس طرح مجھ پر قانون کی خلاف ورزی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔“

”لیکن یہ کیسے ممکن ہے، تمہاری بیویوں کو تو اس کا علم نہیں ہے۔ وہ اب بھی تمہیں اپنا شوہر سمجھتی ہیں۔“

”یہ میرا دردسر نہیں ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو میری کزن سنبھال لے گی۔“

”تم نے ان کے بینک اکاؤنٹ سے جو رقومات نکالی ہیں ان کے بارے میں کیا کہو گے؟“

”یہ رقم طلاق کے اخراجات کی نذر ہو جاتی ہے۔ تم جانتے ہو آج کل ریل کا سفر کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔“

”گویا اب تم ڈورتھی سے بھی شادی کرو گے؟“ کولن نے پوچھا۔

”امید تو ہے۔ شاید یہ شادی دو سال چل جائے کیونکہ وہ دیکھنے میں بہت خوب صورت ہے۔“ ہیریسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنے بارے میں نہیں بتایا، سراغ رساں ہو یا رپورٹر؟“

کولن نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اسے دکھایا اور بولا۔ ”پرائیویٹ سراغ رساں، تمہاری دو بیویوں نے میری خدمات حاصل کی ہیں۔“

”وہ کس لیے؟“

”وہ دونوں اب بھی تمہیں اپنا شوہر سمجھتی ہیں اور انہوں نے مجھے تمہاری تلاش پر مامور کیا ہے۔“

”تم بے شک میرے بارے میں انہیں بتا دو۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ زیادہ سے زیادہ مقدمہ کریں گی۔ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ نہیں۔“

”زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ورنہ میں ڈورتھی کے سامنے تمہارا کچا چٹھا بیان کر دوں گا تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ ہنی مون کے بعد اس کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ تم مجھے ساتھ لے کر چلو گے یا......“

ہیریسن اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”اگر مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو اس میں تمہیں ناکامی ہوگی۔ ڈورتھی تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کرے گی۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے اور اس وقت بھی اس سلسلے میں وہاں ایک پارٹی ہو رہی ہے۔ میں تمہیں ساتھ لے چلتا ہوں لیکن تم اپنی زبان بند رکھو گے۔“

جب کولن نے ڈورتھی کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک دیکھی تو وہ اپنا ارادہ قائم نہ رکھ

سکا۔ وہ اس عورت کا دل نہیں توڑنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اسے یہ گوارہ تھا کہ وہ ڈورتھی کی پارٹی میں کوئی بدمزگی پیدا کرے۔ وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرا اور ڈورتھی سے رسمی گفتگو کرنے کے بعد ہیریسن سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تم سے بعد میں ملاقات ہوگی۔“

یہ سن کر ہیریسن نے سکون کا سانس لیا ورنہ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں کولن اس کا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔

دفتر واپس آ کر اس نے ہیریسن کی سب بیویوں کو باری باری فون کر کے بتایا کہ ہیریسن کہاں مل سکتا ہے۔ اس نے جو پتا بتایا وہ ڈورتھی کے اپارٹمنٹ کا تھا۔ ایتھل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ کیا انہیں اس کے معاوضے کے سلسلے میں مزید رقم ادا کرنا ہوگی۔ جس پر کولن نے کہا کہ جو کچھ انہوں نے ایڈوانس میں دیا تھا وہی کافی ہے۔ ویسے بھی کولن کو اس شخص کی تلاش میں زیادہ وقت صرف نہیں کرنا پڑا اور وہ صرف دو دن میں ہی اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بجنے والے تھے، اس نے دروازہ کھول کر نیچے جھانکا تو ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ وہ ہوی سائڈ برانچ کا لیفٹیننٹ فرگوسن تھا۔ کولن نے اسے اوپر آنے کا اشارہ کیا اور فریج کھول کر اس کی خاطر تواضع کے لیے مشروب نکالنے لگا۔ فرگوسن بڑی بے تکلفی سے لونگ روم میں پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کولن نے گلاس میں مشروب انڈیلا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس وقت کیسے آنا ہوا؟“

فرگوسن نے ایک گھونٹ لیا پھر جیب سے کوئی چیز نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اسے پہچانتے ہو؟“

وہ کولن کا بزنس کارڈ تھا جس پر خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہاں یہ میرا کارڈ ہے لیکن تمہیں کہاں سے ملا اور اس پر خون کے دھبے کیسے لگے؟“

فرگوسن نے اپنی نظریں کولن کے چہرے پر گاڑ دیں اور قدرے سرد لہجے میں بولا۔ ”ہیریسن نامی شخص کو کسی نے آٹھ بجے کے قریب بین ولا اسٹریٹ پر واقع براؤن اسٹون کے باہر گولی مار دی اور اس کی جیب سے تمہارا یہ کارڈ برآمد ہوا ہے۔“

کولن کو یاد آیا کہ اس نے سینما سے واپس آتے

بہن کی فضیلت

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ”تم جب اپنی بہن کے گھر جاؤ تو اپنی بساط کے مطابق کچھ لے کے جاؤ۔ کیونکہ تمہاری بہن کا تم پر حق اسے والدین کی ولایت وراثت سے ملا ہے۔ اور انتہائی بدنصیب ہے وہ شخص جس کی بہن اس سے ناراض ہو اور اس کی یا بہن کی موت واقع ہو جائے۔ پس خدا کا شکر کرو کہ اللہ پاک نے تمہیں یہ پاکیزہ رشتہ عطا کیا اور تمہیں تمہارے دکھوں کا سہارا دیا۔ خدا کی قسم یہ وہ رشتہ ہے جو اگر نہ ہوتا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنا عزم پورا نہ کر پاتے۔“

اللہ پاک دنیا کی سب بہنوں کو سدا خوش رکھے۔ آمین

کفارہ

سلطان الہند معین الدین چشتیؒ نے ایک مرتبہ سوچ سمجھ کر نفلی روزہ توڑ دیا اور پھر 60 روزے رکھ کر کفارہ ادا کیا۔

ہوا یہ تھا کہ ایک بہت ہی ضعیف شخص جو بہرہ اور گونگا تھا۔ بہت دور سے پیدل چل کر آپ کے پاس کھانا لے کر آیا۔

وہ شخص بضد تھا کہ آپ اس کا لایا ہوا کھانا کھا لیں۔ وہ شخص سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ آپ روزے سے ہیں۔ آپ نے اس شخص کا لایا ہوا کھانا شروع ہی کیا تھا کہ تیسرا شخص آیا اور کہنے لگا، آپ تو روزے سے تھے اس پر آپ نے خوب صورت ارشاد فرمایا کہ روزہ توڑنے کا کفارہ ہے۔ ”مگر دل توڑنے کا کفارہ نہیں۔“

اسلام تحقیق کی روشنی میں

امریکی سائنس دانوں نے قرآن پاک کے تصور موت وحیات کو تسلیم کر لیا ہے۔

انسان کو آسمان سے نازل کیا گیا۔

موت کے بعد بھی حیات ہے۔

”تحقیقاتی رپورٹ تحقیق قرآن پاک کی روشنی میں کی گئی ہے جو سو فیصد سچ ثابت ہوئی۔“ ڈاکٹر سلور

”جو انسان دنیا میں پیدا ہوا ہے وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا جو کچھ قرآن پاک میں ہے وہ سچ ہے تورات، زبور، انجیل، میں آخری رسول اور قرآن کا ذکر موجود ہے۔“ ڈاکٹر رابرٹ

مرسلہ: محمد جاوید، تحصیل علی پور

ہوئے ہیریسن کو یہ کارڈ دیا تھا۔ وہ یہ بات بتانے ہی والا تھا لیکن اس سے پہلے ہی فرگوسن بول اٹھا۔ ”تم جائے وقوعہ سے غیر موجودگی کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟“ کولن کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگا۔

فرگوسن قہقہہ مارتے ہوئے بولا۔ ”گھبراؤ نہیں، میں مذاق کر رہا تھا۔ موقع کے گواہ نے سیاہ لباس اور ہیٹ پہنے ہوئے شخص کو فرار ہوتے دیکھا ہے جس کا قد تمہارے مقابلے میں بہت کم تھا اور ویسے بھی تم نے ڈیپارٹمنٹ چھوڑنے کے بعد کبھی ہیٹ نہیں پہنا۔“

کولن نے مشروب کی بوتل اٹھا کر فریج میں رکھی اور کافی بنانے کے لیے پانی گرم کرنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ اس قتل میں اس کی پانچ بیویوں میں سے کسی ایک کے ملوث ہونے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“ وہ اس کے سامنے کافی کی پیالی رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے آج ہی انہیں باری باری فون کر کے اس کے ٹھکانے کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ ان میں سے دو نے اسے تلاش کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں۔“

فرگوسن نے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ”تب تو ہمیں ایک ساتھ مل کر اس کیس پر کام کرنا چاہیے۔“

”مت بھولو کہ تم پولیس سراغ رساں ہو جبکہ میں پرائیویٹ طور پر یہ کام کرتا ہوں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ فرگوسن بولا۔ ”تمہارے ساتھ رہنے سے مجھے کافی مدد مل سکتی ہے۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ جب تم انہیں اس قتل کے بارے میں بتاؤ گے تو ان کا ردعمل دیکھنے والا ہوگا اس کے ذریعے ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔“

ان کی کار بیرک اسٹریٹ سے گزر رہی تھی۔ کولن نے پوچھا۔ ”اسے کتنی گولیاں لگیں؟“

”قاتل نے سڑک کے پار سے گولی چلائی جو اس کے سینے میں لگی۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ زخم کی نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس رائفل کا سائز اعشاریہ بائیس کے ریوالور جتنا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے گولی کے سائز کا پتا چل سکتا ہے۔“

سب سے پہلے وہ ایتھل کے گھر پہنچے۔ وہاں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کولن نے اطلاعی گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ چوتھی کوشش پر ایک کمرے کی لائٹ روشن ہوئی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا اور کسی نے باہر کی طرف جھانکا۔

ایتھل نے اسے پہچان لیا تھا۔ چنانچہ اس نے دروازہ کھول دیا۔ کولن... آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”لیفٹیننٹ فرگوسن تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“

ایتھل نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور ہچکچاتے ہوئے انہیں اندر بلا لیا۔ لونگ روم کو خاصی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ نیا فرنیچر، دیواروں پر آویزاں تصاویر اور کونے میں رکھا ہوا خوب صورت لیمپ اس کی سجاوٹ میں اضافہ کر رہے تھے۔ کولن نے تعریفی انداز میں کمرے کا جائزہ لیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کیا تم شام سے ہی گھر پر ہو؟“

”ہاں۔“ وہ کچھ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

”جب میں نے تمہیں ہیریسن کا پتا بتایا، اس کے بعد گھر سے باہر گئی تھیں؟“

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولی۔ ”لگتا ہے کوئی خاص بات ہوئی ہے؟“

کولن نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”میں نے تمہیں جس عمارت کا پتا بتایا تھا اس کے باہر کسی نے ہیریسن کو گولی مار دی۔“

”کیا......!“ وہ اپنی جگہ سے تقریباً اچھلتے ہوئے بولی۔ ”وہ کس اسپتال میں ہے؟“

کولن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ایتھل کا منہ کھلا رہ گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور مکان کے عقبی حصے کی طرف بھاگی۔ کولن اور فرگوسن بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ انہوں نے دیکھا ایتھل کچن میں کھڑی عقبی صحن میں کھلنے والے دروازے کی چٹخنی گرا رہی تھی پھر وہ تیزی سے باہر نکلی اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں پورچ لائٹ کے نیچے کھڑے اس کا انتظار کرتے رہے۔ کولن نے آگے بڑھ کر دیکھا تو اسے وہاں پلائی ووڈ کے تختے رکھے ہوئے نظر آئے۔

تھوڑی دیر بعد ایتھل تیزی سے واپس آئی اور ان کے پاس سے گزرتی ہوئی کچن کے سنک پر گئی۔ اس نے ایک گلاس میں پانی بھرا اور اپنا چہرہ دھونے لگی پھر اس نے تولیے سے اپنا منہ صاف کیا اور کچن ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ فرگوسن نے اپنی نوٹ بک کھولی اور بولا۔ ”تو تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟“

ایتھل نے نفی میں سر ہلایا اور کہنے لگی۔ ”میرے والد بھی یہیں رہتے ہیں۔“

”کیا وہ گھر میں موجود ہیں؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے کولن سے پوچھا۔ ”کیا تم نے باہر کوئی پیلے رنگ کی بیوک دیکھی ہے؟“

”نہیں، باہر صرف ایک سیاہ رنگ کی پرانی کار نظر آ رہی ہے۔“

”وہ میری کار ہے۔“ ایتھل نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ شاید کسی دوست سے ملنے گئے ہوں۔“

فرگوسن کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور سوالات کرنا شروع کر دیے، پہلا سوال تھا۔ ”کیا تم نے ہی ہیریسن کو گولی ماری ہے؟“

”میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ فرگوسن نے اس سے تمام معلومات حاصل کر لیں۔ ہیریسن سے اس کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ وہ اسے چھوڑ کر کیوں چلا گیا۔ اس نے اسے کہاں کہاں تلاش کیا۔ سارہ سے وہ کس طرح ملی، وغیرہ وغیرہ۔

پوری کہانی سن لینے کے بعد فرگوسن جانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا اور ایتھل سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”فی الحال سارہ کو فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہم اس سے مل لیں پھر وہ خود تمہیں فون کرے گی۔“

سارہ بھی شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کے چہرے پر چکنائی کی تہ نظر آ رہی تھی۔ غالباً سونے سے پہلے وہ کوئی کریم استعمال کرتی تھی۔ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں لیکن جب کولن نے اسے بتایا کہ ہیریسن کو کسی نے گولی مار دی ہے تو اس کی نیند غائب ہو گئی۔ اس نے دروازے کی چوکھٹ کا سہارا لیا اور بولی۔ ”کیا وہ اسپتال میں ہے؟“

”نہیں۔“ کولن نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی نوبت ہی نہیں آئی، وہ مر چکا ہے۔“

وہ بری طرح لڑکھڑائی اور اس سے پہلے کہ وہ فرش پر گرتی۔ کولن نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوئی البتہ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اسے ہیریسن کی موت پر شدید صدمہ ہوا ہے۔ وہ تنہا رہتی تھی لہٰذا اس نے فون کر کے ایتھل کو بلا لیا۔ جس وقت کولن اور فرگوسن وہاں سے رخصت ہو رہے تھے تو

جواب آں غزل

دوست۔ ”یار یہ سکون اور چین کیا ہوتا ہے؟“

دوسرا دوست۔ ”پتا نہیں یار میری تو خود کراچی کی پیدائش ہے۔“

ختم شد

آدمی بیوی کو دفنا کے گھر آیا تو آسمان پر بادل گرجنے لگ گئے۔

بجلی کڑکی اور طوفان آ گیا۔

آدمی اوپر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”لگتا ہے پہنچ گئی ہے۔“

حکایت جدید

میرے استاد کہتے ہیں، لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔

ہیرے کو ہیرا کاٹتا ہے۔

آپ کو ایک دن کتا کاٹے گا۔

کیونکہ......

کتا کسی کو بھی کاٹ سکتا ہے، آپ کیا سوچ رہے تھے؟ کیا یار خود پے؟

اوہ نہیں بھائی جی ایسا نہیں ہو سکتا اپنی سوچ بدلو اور خود کو بھی پلیز۔

امارت

بوائے فرینڈ۔ ”ہائے۔“

گرل فرینڈ۔ ”ہیلو۔“

بوائے فرینڈ۔ ”کہاں ہو؟“

گرل فرینڈ۔ ”میں پاپا کی BMW میں کلب جا رہی ہوں۔ ابھی ڈرائیور مجھے کلب چھوڑ دے گا اس کے بعد مارکیٹ میں شاپنگ کے لیے جاؤں گی، تب تم کو کال کرتی ہوں، تم کہاں ہو؟“

بوائے فرینڈ۔ ”میں W-11 کی بس میں تمہاری سیٹ کے پیچھے ہوں تم کرایہ نہیں دینا میں دے چکا ہوں۔“

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

ایتھل اپنی سیاہ کار میں سارہ کے گھر پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

اب وہ کیسی طرجونز کے پاس جارہے تھے۔ اس بار بھی اس نے دروازہ کھولنے کے بجائے انٹرکام کے ذریعے ہی گفتگو کرنے کو ترجیح دی۔ زیادہ تر سوالات فرگوسن نے کیے جبکہ کولن نے مکان کے اطراف کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ ڈرائیو وے میں ایک پرانی کار کھڑی ہوئی تھی جب وہ مکان کا چکر لگا کر واپس آیا تو اس کے کانوں میں کیسی کی آواز آئی جو کہہ رہی تھی۔

"میرے پاس کوئی گن نہیں ہے اور اگر تم کوئی حوالہ چاہتے ہو تو سنو، میں ڈسٹرکٹ اٹارنی کی سیکریٹری ہوں۔ اگر تمہیں مجھ سے مزید سوالات کرنا ہیں تو میرے دفتر آجاؤ میں اپنے گھر پر اجنبیوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔"

اس دوٹوک جواب کے بعد ان کا وہاں رکنا بے سود تھا چنانچہ وہ دونوں ایلما ہیریسن کی جانب روانہ ہوگئے۔ رات بہت زیادہ ہوگئی تھی لیکن انہیں اندازہ تھا کہ ایلما جیسی عورتیں دیر تک جاگتی رہتی ہیں۔ ان کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ایلما اس وقت بھی اپنے پسندیدہ مشروب سے دل بہلا رہی تھی۔ اس نے انہیں اندر بلالیا اور فرگوسن کو پیٹرک جونز کے بارے میں سب کچھ بتادیا جو وہ جانتی تھی۔

"مجھے اس وقت تک اس کا اصلی نام معلوم نہیں تھا۔ یہ مجھے اس اسمارٹ شخص نے بتایا تھا۔" اس نے کولن کی طرف مشروب کا گلاس بڑھایا لیکن اس نے انکار کردیا۔ بقیہ وقت وہ کیری گرانٹ کے قصیدے پڑھتی رہی۔ بڑی مشکل سے ان دونوں نے پیچھا چھڑایا اور وہاں سے روانہ ہونے میں کامیاب ہوسکے۔

سیڈی لیون جونز کو بھی ان کا بے وقت آنا اچھا نہ لگا اور اس نے اس کا اظہار بھی کردیا لیکن جب کولن نے آنے کی وجہ بتائی تو وہ سنجیدہ ہوگئی اور بولی۔ "تم لوگ بیٹھو میں تمہارے لیے کافی کا بندوبست کرتی ہوں۔"

کافی بدمزہ ضرور تھی لیکن اس وقت انہوں نے اسے بھی غنیمت جانا۔ فرگوسن نے پہلا گھونٹ لیا اور گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔ "ہیریسن سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی تھی؟"

سیڈی نے اسے بھی وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے کولن سے کہہ چکی تھی۔ فرگوسن نے پوچھا۔ "تم یہاں تنہا رہتی ہو؟"

"فی الحال تو تنہا ہی ہوں۔" اس نے فرگوسن پر ایک پرتجسس نگاہ ڈالی۔ وہ اس وقت شب خوابی کے لباس میں تھی۔ "تم نے یہ کیوں پوچھا۔ کیا کسی ٹھکانے کی تلاش میں ہو؟"

"فی الحال نہیں۔" فرگوسن نے سرد لہجے میں کہا۔ "تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟"

"ہاں، میں پرندوں کا شکار کرتی ہوں۔ الماری میں بائیس بور کی دو رائفلیں موجود ہیں۔ تم نے بتایا ہے کہ ہیریسن کو بھی ایسی ہی رائفل سے قتل کیا گیا ہے۔ تم یہ دونوں رائفلیں لے جاکر چیک کرسکتے ہو۔"

فرگوسن نے دونوں رائفلیں قبضے میں لے لیں اور ان کی رسید دے دی۔ راستے میں کولن نے کہا۔

"حیرت ہے کہ یہ عورت پرندوں کے شکار کے لیے بائیس بور کی رائفل استعمال کرتی ہے۔"

"کسی پر شک کرنے سے پہلے حقائق پر نظر ڈالنا بہتر ہے۔" فرگوسن نے کہا۔ "اس عورت کا قد پانچ فٹ دس انچ ہے جبکہ میں تمہیں پہلے بتاچکا ہوں کہ قاتل چھوٹے قد کا تھا۔"

☆☆☆

کولن سوا گیارہ بجے کے قریب سینٹ چارلس کے گرجا گھر پہنچا تو پارکنگ لاٹ مکمل طور پر بھر چکا تھا۔ اسے اپنی گاڑی گرجا سے آدھے بلاک کے فاصلے پر پارک کرنا پڑی۔ فرگوسن پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس نے کولن سے سرگوشی میں کہا۔ "ہیریسن کا قتل سیڈی کی رائفل سے نہیں ہوا۔"

یہ کہہ کر وہ کولن کے ساتھ بڑے ہال میں داخل ہوگیا۔ وہاں لوگوں کی کثیر تعداد کو دیکھ کر کولن حیران رہ گیا۔ ہیریسن کی تمام سابقہ بیویاں اس کی آخری رسومات کے موقع پر موجود تھیں۔ ڈورتھی نے سیاہ سلک کا اسکرٹ پہن رکھا تھا اور وہ کافی خوب صورت نظر آرہی تھی۔ ایتھل اور سارہ بھی سیاہ ماتمی لباس میں تھیں۔ کیسی طران دونوں کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس نے ان سے کوئی بات نہیں کی جبکہ ایلما نے کولن کو دیکھ کر خاصی گرم جوشی کا اظہار کیا تھا جیسے وہ اسے برسوں سے جانتی ہو۔

پادری کے آنے پر دعائیہ تقریب شروع ہوئی تو وہ دونوں گرجا کے عقبی دالان میں آگئے۔ فرگوسن نے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہیریسن کی مقبولیت کا راز کیا تھا۔ عورتیں اس پر کس طرح فریفتہ ہوجاتی تھیں؟"

"وہ ان کی باتیں غور سے سنتا تھا، ان پر پوری توجہ دیتا تھا۔" کولن نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" فرگوسن بولا۔

"حالانکہ بہت سی عورتیں کہہ چکی ہیں کہ میں بہت اچھا سامع ہوں۔ اس کے باوجود کسی عورت کا ساتھ نصیب نہیں ہوا۔ میں ابھی تک تنہا ہوں۔"

"ہمارا دماغ اتنا تیز نہیں چلتا کہ عورتوں کو قابو میں کرسکیں۔"

"ہاں اور ہیریسن میں یہ صلاحیت تھی۔" کولن نے اعتراف کیا۔

پادری نے دعا ختم کی تو پورا ہال خواتین کی سسکیوں سے گونج اٹھا۔ اچانک فرگوسن کی نظر ایتھل اور سارہ کے درمیان بیٹھے ہوئے شخص پر گئی تو وہ بولا۔ "سراغ رساں مفروضوں پر کام نہیں کرتے، یہ تصدیق کرنا ضروری ہے کہ یہ ناراض شخص ایتھل کا باپ ہے۔"

"اس کا قد پانچ فٹ چار انچ کے قریب معلوم ہوتا ہے۔" کولن نے کہا۔

"ہاں تمہارا خیال درست ہے۔"

"تمہارے مشتبہ افراد کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا۔" کولن نے معنی خیز انداز میں کہا۔

دعا ختم ہونے کے بعد سب لوگ قبرستان جانے کے لیے اپنی کاروں کی طرف جانے لگے لیکن کولن نے اپنی گاڑی کا رخ کسی اور جانب موڑ دیا۔ وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر آیا اور اپنی کار ایتھل کے مکان کے باہر کھڑی کرکے خود عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔ درخت کے ساتھ رکھے ہوئے پلائی وڈ کے ٹکڑے پر کم از کم ایک درجن گولیوں کے نشان نظر آرہے تھے۔ جس جگہ مکان کی حد ختم ہوئی تھی وہاں جنگل گھنا تھا۔ اس نے وہاں پلائی وڈ کے دو تختے دیکھے جن پر سیاہ دائرے بنے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے نشانہ بازی کی مشق کی ہو۔ اس کا خیال درست نکلا۔ اسے وہاں تین خالی کارتوس نظر آئے جو درخت کی جڑ اور تنے کے درمیانی حصے میں گڑے ہوئے تھے۔ کولن نے جیب سے چاقو نکالا اور بڑی احتیاط سے کارتوسوں کے اردگرد کی جگہ سے انہیں احتیاط سے نکال لیا۔ ان کارتوسوں کی ساخت سے لگ رہا تھا کہ انہیں اعشاریہ بائیس کی گن سے فائر کیا گیا تھا۔ کولن نے چاقو جیب میں رکھا اور واپسی کے لیے مڑا ہی تھا کہ ایک فائر کی آواز سن کر بوکھلا گیا لیکن اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور تیزی سے بھاگ کر ایک درخت کی آڑ میں ہوگیا۔

"اپنی جگہ پر رک جاؤ اور ہتھیار پھینک دو۔" یہ فرگوسن کی آواز تھی۔

کولن نے جیب سے اپنا ریوالور نکال لیا اور کسی ناخوشگوار صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہوگیا پھر اسے زمین پر کسی ہتھیار کے گرنے کی آواز سنائی دی۔

"اب تم باہر آسکتے ہو مسٹر پرائیویٹ سراغ رساں۔ میں نے اسے قابو کرلیا ہے۔"

کولن نے دیکھا کہ ایک چھوٹے قد کا آدمی فوجی ہیٹ پہنے ہاتھ اوپر کیے کھڑا ہے۔ اس کے قدموں کے پاس ایک رائفل پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بالکل عقب میں فرگوسن دونوں ہاتھوں سے اعشاریہ 38 کا ریوالور تھامے کھڑا تھا۔

"اس سے ملو کولن، یہ ایتھل کا باپ ہے۔" فرگوسن نے طنزیہ انداز میں کہا۔

کولن درخت کی آڑ سے نکل آیا تھا۔ فرگوسن نے اسے رائفل اٹھانے کے لیے کہا۔ وہ اعشاریہ بائیس کی رائفل تھی۔ فرگوسن نے جیب سے ہتھکڑیاں نکال کر ایتھل کے باپ کے ہاتھوں میں ڈال دیں۔ وہ بوڑھا کولن پر غرانے لگا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ کولن نے اس کے کوٹ کی جیبیں دیکھیں تو اسے بائیں جیب کے نیچے کارتوس کے قطر کے برابر سوراخ نظر آیا۔

فرگوسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے کہ تم بھی تھوڑی بہت سراغ رسانی سیکھ گئے ہو۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" کولن منہ بناتے ہوئے بولا۔ "میں نے ہی تمہیں قاتل تک پہنچایا ہے۔"

فرگوسن کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ مسلسل ہنستا رہا۔ یہاں تک کہ اسے کھانسی آگئی۔ اس نے بڑی مشکل سے کھانسی پر قابو پایا اور بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے ایتھل بھی اس جرم میں باپ کے ساتھ شریک ہے؟"

"بالکل نہیں۔" کولن نے کہا۔ "اسے ہیریسن سے بہت محبت تھی اور وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا باپ جوش انتقام میں اس حد تک آگے بڑھ جائے گا۔"

"بہت خوش نصیب تھا ہیریسن جس کے لیے ایک نہیں چھ چھ عورتیں پریشان ہورہی تھیں۔" فرگوسن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا اور ایتھل کے باپ کو لے کر پولیس کار کی جانب چل دیا۔

کولن نے ایک سگریٹ سلگایا اور ایتھل کے بارے میں سوچنے لگا جو شوہر کے بعد باپ سے بھی محروم ہوگئی تھی۔ کولن کے دماغ میں ایک خیال ابھرا کہ کہیں اس نے ہیریسن کو تلاش کرکے غلطی تو نہیں کی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سر کو جھٹکا اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔

وقت کا دھارا

مرزا امجد بیگ

گھر بنانے کا خواب صرف عورت کی آنکھ ہی نہیں دیکھتی بلکہ عہدِ حاضر میں ہر ایسے انسان کی خواہش بھی بن گئی ہے جو معمولی تنخواہ کے ساتھ اپنے گھر کی چھت سے بھی محروم ہیں... اور جب ان حالات میں بے بسی جنون بھی سوار کردے تو ایسی حماقتیں سرزد ہو ہی جاتی ہیں جن کا خمیازہ تمام عمر کی جمع پونجی گنوانے کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ ایسے میں کسی جرم کے ارتکاب سے خود کو روکنا جوئے شیر لانے کے برابر ہی ہوسکتا ہے... یہ کارنامہ اس نے بھی انجام تو دے ڈالا تھا مگر سنبھلنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت تھی اور ایسے میں اسے بیگ صاحب جیسے ہمدرد کا ساتھ ملا تو گویا نہ صرف ڈوبے ہوئے کو تنکے کا سہارا میسر آگیا بلکہ لٹی ہوئی پونجی کی جھلک بھی نظر آگئی لیکن... ہر ایک کو کب ایسا سہارا ملتا ہے لہٰذا جمع پونجی داؤ پر لگانے سے پہلے ہر زاویے پر غور کرلیا جائے تو بہتر ہے ورنہ پونجی جمع کرنے میں ہی عمر گھٹ جاتی ہے۔

آسان اقساط پر مشکلات کو دعوت دینے والے دعووں کا کچا چٹھا

آپ نے اکثر لوگوں کی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلتے سنے ہوں گے، دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس کے بل بوتے پر دنیا کی ہر شے خریدی جاسکتی ہے حتیٰ کہ جج، وکیل، گواہ...... سب ''برائے فروخت'' ہیں۔ سب کا اپنا اپنا ایک مخصوص ریٹ ہے۔ اگر آپ میں قوت خرید ہے تو ان لوگوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام نکلوا سکتے ہیں۔ وکیل اگر مٹھی میں ہو تو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنا چنداں مشکل نہیں۔ بعض تو تمسخرانہ انداز میں یہ جملہ بھی بول جاتے ہیں۔

''صاحب! غریب آدمی وکیل کرتا ہے اور صاحب ثروت جج......!''

عدالت، انصاف، وکیل اور جج کے حوالے سے اس نوعیت کی آراء سے میں مکمل اختلاف کرتا ہوں۔ اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ سو میں سے کسی ایک آدھ کیس میں جزوی یا کلی طور پر اس قسم کی صورتِ حال پیش آگئی ہوتا ہم اس کو فارمولا بنا کر ایک فتویٰ جاری کردینا کسی بھی طور مناسب نہیں۔ ایسی باتیں عموماً وہی لوگ کرتے ہیں جو قانون کی پیچیدگیوں اور انصاف کے تقاضوں سے کماحقہ، واقف نہیں ہوتے۔ کسی بھی معاملے کی تہ میں اتر کر حقائق سے آگاہی حاصل کرنے کے بجائے وہ لغو اور فروعی باتوں کو سچ جان کر نہ صرف یہ کہ خود بدگمان ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ایک روز میں عدالتی بکھیڑوں سے نمٹ کر اپنے آفس پہنچا تو انتظار گاہ میں فردِ واحد کو بیٹھے دیکھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی اس فوری حرکت سے شناسائی جھلکتی تھی۔ میں اس کے پاس سے گزرا تو اس نے مجھے سلام کیا۔ میں اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اپنے مخصوص کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا۔ ''جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

ابتدائی تعارف میں اس نے اپنا نام خالد نیازی بتایا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سے متجاوز تھی۔ وہ عام سی شکل وصورت کا مالک ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ جب میں انتظار گاہ میں اس کے قریب سے گزرا تھا تو میں نے اس کے ہاتھ میں ایک فائل دبی دیکھی تھی۔ وہ مذکورہ فائل کو اپنے سامنے میز پر

رکھنے کے بعد بولا۔

"بیگ صاحب! میں اپنا ایک کیس آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ میرا شناسا نہیں تھا ورنہ کیس کی بات کرنے سے پہلے وہ تعارف کے دوران میں مجھے یہ ضرور باور کرانے کی کوشش کرتا کہ مجھے کیوں کر جانتا ہے۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ جب میں آفس میں داخل ہوا تو آفس بوائے نے اشارے سے اسے میرے بارے میں بتا دیا ہو اور اس نے کسی واقف کار کی طرح اٹھ کر میرا استقبال کیا ہو۔ بہرحال، اس کی بات کے جواب میں، میں نے کہا۔

"نیازی صاحب! میں اس بلڈنگ میں اسی لیے دفتر کھولے بیٹھا ہوں کہ لوگوں کے کیس لوں۔ آپ بتائیں، کیا مسئلہ ہے......؟"

"میرا مسئلہ اس فائل کے اندر موجود ہے بیگ صاحب!" وہ اپنے سامنے، میز پر رکھی فائل کو تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔

"لائیں......" میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں دیکھوں، آپ کا مسئلہ کیا ہے......؟"

وہ فائل کو میرے حوالے کرنے کے بجائے عجیب سے لہجے میں بولا۔ "جناب! میں چاہتا ہوں، پہلے فیس کا معاملہ طے کرلیں۔"

مجھے خالد نیازی کا یہ انداز قطعاً پسند نہ آیا تاہم وہ کہتے ہیں نا کہ جب دکان کھول کر بیٹھ جائیں تو پھر کسی بھی طرح کا گاہک آسکتا ہے۔ مجھے بھی ہر ورائٹی کے کلائنٹس سے واسطہ پڑتا رہتا تھا اور میں کسی کے بھی اسٹائل کو مائنڈ نہیں کرتا تھا۔ پسند اور ناپسند کی بات الگ ہے۔

"خالد نیازی صاحب!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دراصل، فیس کی بات پہلے ہو نہیں سکتی۔"

"جی...... میں کچھ سمجھا نہیں۔" وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔ "آپ اپنی بات کی وضاحت کریں گے؟"

"بالکل کروں گا۔" میں نے خالص پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔ "نیازی صاحب، میں کلائنٹ کو اپنی فیس کے بارے میں اس وقت بتاتا ہوں جب میں اس کا کیس لینے کا حتمی فیصلہ کرلوں اور یہ فیصلہ میں تمام تر حالات و واقعات کی پوری جان کاری کے بعد کرتا ہوں۔ ایک اہم بات اور......"

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"جب میں کسی کیس کو لینے کا ارادہ ظاہر کردوں تو اپنی فیس ایڈوانس میں وصول کرتا ہوں۔"

"اوہ......!" اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔ "آپ تو دوسرے وکیلوں سے بہت مختلف ہیں۔"

"رزق کے حوالے سے میرا عقیدہ یہ ہے کہ اس کی ذمے داری کسی اور ہی ذات نے اٹھا رکھی ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "انسانوں میں سے کوئی نہ تو مجھے رزق دے سکتا ہے اور نہ ہی میرا رزق چھین سکتا ہے لہٰذا میں فیس وصول کرنے سے پہلے اس بات کی تسلی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں جس کام کے پیسے وصول کر رہا ہوں وہ انسانی، اخلاقی، معاشرتی اور قانونی بنیادوں پر درست بھی ہے یا نہیں۔ میں رزق حلال کے اطمینان کے بعد کیس لیتا ہوں......"

"بیگ صاحب! آپ نے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے کہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔" وہ فائل کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آپ اچھی طرح ان کاغذات کا مطالعہ کرلیں جناب، پھر بات کرتے ہیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے فائل لی اور کھول کر اس کے اندر لگے ہوئے کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔

فائل کے اندر مختلف قسم کی ادائی کے ذیل میں حاصل ہونے والی رسیدیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک دو ایسی دستاویزات بھی تھیں جنہیں ایگری منٹ کہا جاسکتا تھا۔ کسی ایفی ڈیوٹ کی ایک فوٹو کاپی بھی نظر آرہی تھی۔ بیشتر رسیدوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی فلیٹ وغیرہ کی بکنگ کے سلسلے میں ادا کی جانے والی ماہانہ اقساط کے حوالے سے ہیں۔ علاوہ ازیں چند بھاری رقوم کی ادائیوں کی رسیدیں بھی موجود تھیں۔ یہ تمام تر کاغذات کسی "ڈائمنڈ پلازا" نامی اپارٹمنٹس بلڈنگ سے تعلق رکھتے تھے۔

میں نے ان تمام کاغذات کا معائنہ کرنے کے بعد فائل کو بند کیا اور اپنے سامنے بیٹھے خالد نیازی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ان دستاویزات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے ڈائمنڈ پلازا نامی کسی اپارٹمنٹس بلڈنگ میں کوئی فلیٹ بک کرایا تھا جس کے سلسلے میں آپ ماہانہ اقساط ادا کرتے رہے ہیں اور دو تین مرتبہ بھاری رقوم بھی جمع کرائی ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟"

"نہیں جناب، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ کا پریشان حال میرے پاس آنا اور اس فائل

کی بنیاد پر کوئی کیس میرے حوالے کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بلڈر کے ساتھ آپ کا کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں درست اندازہ لگا پایا ہوں؟"

"جی ہاں!" اس نے ایک بار پھر سر کو اثباتی جنبش دی۔ "آپ کا اندازہ وہی ہے جو حقیقت ہے۔ بیگ صاحب! میں بے حد پریشان ہوں۔ آپ اگر میرا مسئلہ حل کرانے کو تیار ہوجائیں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

"کاغذات کو میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اب آپ حالات و واقعات کی تفصیل بھی بتادیں۔"

اس نے چند لمحات تک خاموش رہ کر ذہن میں بکھرے خیالات کو مجتمع کیا پھر مجھے اپنی بپتا سنانے میں مصروف ہوگیا۔

خالد نیازی کی زبانی مجھے اس کیس کے حوالے سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے میں خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ ان میں سے بہت ساری باتیں مجھے بعد میں پتا چلی تھیں تاہم واقعات کی ترتیب کے پیشِ نظر انہیں بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض باتیں میں نے دانستہ آپ سے چھپالی ہیں۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں سنسنی خیز مواقع پر کیا جائے گا۔

☆☆☆

خالد نیازی محدود آمدنی والا ایک غریب شخص تھا۔ وہ کسی مقامی ڈائجسٹ میں پروف ریڈنگ کی جاب کرتا تھا۔ مذکورہ ڈائجسٹ کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بہرحال، پروف ریڈر کی جو تنخواہ ہوتی ہے اس میں وہ کھینچ تان کر گزارہ کر رہا تھا۔ وہ لوگ پٹیل پاڑا کے علاقے میں ایک چھوٹے سے دو کمروں کے گھر میں رہتے تھے۔ ان کے دو بچے تھے۔ فائزہ کی عمر آٹھ سال تھی جبکہ عمران پانچ سال کا تھا۔ نیازی کی بیوی ریحانہ ایک روایتی قسم کی گھریلو عورت تھی۔

ایک رات جب دونوں بچے سو چکے تھے تو ریحانہ نے نیازی سے کہا۔ "تمہاری آدھی کے لگ بھگ تنخواہ تو مکان کے کرایے میں نکل جاتی ہے۔ باقی پیسوں سے میں گھر کیسے چلاؤں......؟"

"میں اپنی پوری تنخواہ لا کر تمہارے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔" خالد نے جھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بس، تم سے کرایے بھاڑے کے پیسے لیتا ہوں۔ میں کوشش تو کر رہا ہوں کہ آفس ہی میں مجھے کوئی اضافی کام مل جائے۔ میں نے پیسٹر کی منت خوشامد کر کے کاپی پیسٹنگ کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ اگر مجھے یہ کام پارٹ ٹائم بھی مل گیا تو آمدنی میں اچھا خاصا اضافہ ہوجائے گا۔"

"وہ تو جب ہوگا نا جب تمہیں پیسٹنگ کا کام ملے گا۔" ریحانہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں تو ابھی کی سوچ رہی ہوں۔"

"سوچنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔" نیازی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن ایک بات ذہن میں رکھو ریحانہ...... ہتھیلی پر کبھی سرسوں نہیں جما کرتی۔"

"لیکن ہتھیلی پر مہندی رچ جاتی ہے۔" وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔

خالد نیازی نے الجھن زدہ انداز میں اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا ریحانہ؟"

وہ اس کے سوال پر توجہ دیے بغیر بولی۔ "میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے نیازی!"

"اس آئیڈیا کو اپنے ذہن سے باہر نکالو۔" نیازی نے گہری دلچسپی سے کہا۔ "میں بھی تو دیکھوں، وہ آخر ہے کیا؟"

"کسی طرح اگر ہمارا چھوٹا سا اپنا گھر ہوجائے تو بہت سارے مسئلے خود بہ خود حل ہوجائیں گے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کرایے کی مد میں جانے والی رقم بچے گی تو پھر تمہاری اسی تنخواہ میں بھی بہت اچھا گزارہ ہونے لگے گا۔"

"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنا گھر ہوگا کیسے!" نیازی نے سوال اٹھایا۔ "تم نے آئیڈیا تو آسانی سے سوچ لیا۔ اب میرے سوال کا جواب بھی دے دو؟"

ریحانہ نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے، میں تو اپنے گھر کے خواب دیکھتے دیکھتے ہی قبر میں اتر جاؤں گی۔"

"مایوسی گناہ ہے ریحانہ۔" نیازی نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

"جب ساری زندگی کرایے کے گھر میں گزرتی دکھائی دے رہی ہو تو کیا گناہ اور کیا ثواب۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "لگتا ہے، تمہیں میرا ذرا سا بھی خیال نہیں۔"

"تم ہر بات کے لیے مجھے ہی قصوروار ٹھہراتی رہتی ہو۔" نیازی نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ "بتاؤ، میں

اس تنخواہ میں تمہارے لیے ذاتی گھر کیسے خرید سکتا ہوں؟"

"میں خریدنے کو کب کہہ رہی ہوں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

نیازی نے الجھن زدہ انداز میں بیوی کو دیکھا۔ "پھر......؟"

"آج کل گھر حاصل کرنا بہت آسان ہوگیا ہے نیازی۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولی۔

"وہ کیسے؟" نیازی کی الجھن حیرت میں بدل گئی۔

"میں فلیٹ بک کرانے کی بات کررہی ہوں......" وہ گویا انکشاف کرنے والے انداز میں بولی۔

"اوہ...... تو تمہارا یہ مقصد تھا۔" نیازی نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "تم قسطوں والے فلیٹ کی بات کررہی ہو؟"

ریحانہ نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

نیازی نے کہا۔ "اللہ کی بندی! یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے جیسا تم سوچ رہی ہو۔ یہ قسطوں کا گورکھ دھندا بڑا عجیب اور پھنسانے والا ہے۔ اگر بک کرانے والا کسی وجہ سے ڈی فالٹر ہوجائے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔"

"سوچتے رہنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ "انسان عملی قدم اٹھائے تو مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہوجاتا ہے۔ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا ان کے بارے میں بھی سننے میں آتا ہے کہ انہوں نے فلیٹ بک کرالیا ہے۔ اب ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں......" وہ لمحے بھر کے لیے تھمی، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"آخر کسی نہ کسی طرح ہم ہر ماہ اس گھر کا کرایہ بھی تو دے ہی رہے ہیں نا۔ اسی میں دو چار سو ملا کر فلیٹ کی قسط بھر دیا کریں گے۔ اگر تم کسی بلڈنگ میں فلیٹ بک کرانے کے لیے تیار ہوجاؤ تو میں کم سے کم پیسوں میں گھر چلانے کا وعدہ کرتی ہوں۔"

ریحانہ کا منصوبہ تو خاصا پُرکشش تھا لیکن خالد نیازی بہت ہی محتاط واقع ہوا تھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کا عادی تھا۔ جب تک وہ کسی معاملے سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوجاتا تھا، ہامی نہیں بھرتا تھا۔ ریحانہ کی بات اس نے توجہ سے سنی اور یہ اعتراض اٹھایا۔

"یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ ہم کرایے والی رقم میں دو چار سو ڈال کر فلیٹ کی قسط ادا کر دیا کریں گے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "لیکن شاید تم اس حقیقت کو فراموش کررہی ہو کہ فلیٹس وغیرہ تیار ہونے میں سال، دو سال اور بعض پروجیکٹس تو تین چار سال کا عرصہ بھی کھینچ جاتے ہیں......"

"ہاں......" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ "یہ بات میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"اچھی طرح جانتی ہو تو......" نیازی نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "پھر یہ بھی بتادو کہ اتنا عرصہ ہم رہیں گے کہاں کیونکہ فلیٹ کی قسط تو اسی صورت جاسکے گی اگر ہم گھر کا کرایہ ادا نہ کریں اور ایسا ممکن بنانے کے لیے ہمیں کرایے کا یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔"

"مجھے پتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے......" وہ ایسی نظر سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی جیسے وہ ابھی اس کے قدموں میں گر کر اس کی لیاقت کا اعتراف کرلے گا۔

"ٹھیک ہے، تمہیں پتا تھا۔" خالد نیازی معتدل انداز میں بولا۔ "جب تمہیں اس سوال کا پہلے سے علم تھا تو پھر جواب بھی دے دو۔"

"تمہارے اس سوال کا جواب ہے ظفر ماموں......!" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

"ظفر ماموں......" نیازی چونک اٹھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

ریحانہ کا ایک ماموں موٹر مکینک تھا جس کا نام ظفر حسین تھا۔ فلمستان کے قریب اس کا موٹر مرمت کا ایک گیراج تھا۔ وہ گاڑیوں کی مرمت کے علاوہ خرید و فروخت میں بھی گھسا ہوا تھا۔ وہ پرانی، خصوصاً خراب گاڑیوں کو خرید کر ان کی مرمت وغیرہ کرتا اور پھر انہیں اچھی قیمت پر فروخت کر دیا کرتا تھا۔ ظفر حسین کی رہائش گولیمار کے علاقے میں تھی۔ پٹیل پاڑا، گولیمار اور فلمستان میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ آپ انہیں ایک دوسرے سے واکنگ ڈسٹینس پر سمجھ لیں۔ یہ وضاحت میں نے صرف ان قارئین کے لیے کی ہے جو کراچی کے اندرونی جغرافیہ سے واقفیت نہیں رکھتے۔

"مطلب یہ کہ ہم ظفر ماموں کے گھر شفٹ ہوجائیں گے۔" ریحانہ اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بولی۔ "ان کا گولیمار میں دو منزلہ مکان ہے۔ زیریں منزل پر وہ خود رہتے ہیں اور اوپر کا پورشن وہ اکثر کرایے پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ آج کل وہ پورشن خالی پڑا ہے۔ ہم کرایے کا یہ مکان چھوڑ کر فوری طور پر ظفر ماموں کے اس پورشن میں منتقل ہوسکتے ہیں۔"

"مجھے تو یوں محسوس ہورہا ہے......" وہ اپنی بیوی کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے اس سلسلے میں اپنے ظفر ماموں سے بات کرلی ہے۔"

"اور نہیں تو کیا......" وہ اترا کر بولی۔ "تم سے ضد ایسے ہی تو نہیں کررہی۔ میں تمہارے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جب تک تم بال کی کھال نہ نکال لو، مطمئن ہی نہیں ہوتے......"

"ٹھیک ہے۔" نیازی نے کہا۔ "فرض کرو، ہم کرایے کا یہ گھر چھوڑ کر تمہارے ماموں کے گھر کی بالائی منزل پر شفٹ ہوجاتے ہیں۔ ہم جتنا عرصہ بھی وہاں رہیں گے کیا ظفر ماموں ہم سے کرایہ نہیں لیں گے......؟"

"میں نے اس سلسلے میں بھی ماموں سے بات کرلی ہے۔" ریحانہ فخریہ انداز میں بتانے لگی۔ "ماموں کا کہنا ہے، وہ ہمارے لیے رعایتی کرایہ مقرر کردیں گے اور اس کے ساتھ ہی یہ سہولت بھی دیں گے کہ ہمیں جب بھی آسانی ہو، انہیں کرایہ دے دیا کریں۔ جب ہم ان کا گھر چھوڑ کر اپنے فلیٹ میں منتقل ہوجائیں گے تو واجبات کا حساب بھی کرلیں گے۔ جب کی جب دیکھی جائے گی۔"

"واہ بھئی......" نیازی مسرت آمیز حیرت سے بولا۔ "تمہارے ماموں تو ہمارے لیے بہت بڑی قربانی دے رہے ہیں۔"

"وہ میرے اکلوتے ماموں ہیں اور میں ان کی اکلوتی بھانجی" ریحانہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "وہ میرے لیے جو بھی کریں، کم ہے۔"

"اللہ ان کو اس کا اجر دے گا۔" نیازی نے کہا۔ پھر تشویش بھرے انداز میں بولا۔ "لیکن ریحانہ! فلیٹ کی بکنگ کے سلسلے میں ہم نے سب سے زیادہ سنگین معاملے پر تو ابھی بات ہی نہیں کی......"

"مثلاً کون سا معاملہ؟" ریحانہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

خالد نیازی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جب کوئی فلیٹ بک کرایا جاتا ہے تو بکنگ کے وقت ایک بھاری رقم بھی ادا کرنا ہوتی ہے۔ ماہانہ اقساط کا مرحلہ تو بعد میں شروع ہوتا ہے۔ وہ رقم یکمشت کہاں سے آئے گی؟"

"تمہارے آفس سے۔" ریحانہ نے ٹھوس انداز میں کہا۔

"آفس سے...... کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس رقم کے حصول کے لیے تم اپنے دفتر میں قرض کی درخواست دو گے۔" ریحانہ نے کہا۔ "تمہیں اس آفس میں کام کرتے ہوئے آٹھ دس سال ہوگئے ہیں۔ مجھے یقین ہے، تمہارا باس اس درخواست کو رد نہیں کرے گا......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے آج تک تمہارے باس کے جو بھی قصے سنے ہیں ان سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ ایک نیک دل اور خداترس انسان ہے۔ وہ اپنے ورکرز کا بہت خیال رکھتا ہے۔ چپراسی کی بہن کی شادی ہو یا کسی کے گھر میں میت کا معاملہ، وہ مالی مدد کرنے میں کسی حیل وحجت سے کام نہیں لیتا۔ پھر آپ ہی تو بتاتے ہو کہ آفس کی طرف سے ہر سال کسی ایک شخص کو حج پر بھی بھیجا جاتا ہے۔"

"ہاں......" نیازی نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "یہ سب تو درست ہے۔"

"بس تو پھر دیر کس بات کی ہے۔" وہ حوصلہ بڑھانے والے انداز میں بولی۔ "تمہارا تو ریکارڈ بھی کورے کاغذ کی طرح صاف ہے۔ مجھے امید ہے، جب تم پہلی مرتبہ قرض کے لیے درخواست ڈالو گے تو تمہیں انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور باس اس بات پر بھی راضی ہوجائے گا کہ واپسی کے لیے تمہاری تنخواہ میں سے کم سے کم کٹوتی ہو......"

"ہاں، یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" خالد نیازی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "مجھے بھی یقین ہے کہ میری قرض کی درخواست ضرور منظور ہوجائے گی۔"

"بس تو پھر ہم کل ہی جا کر کسی اچھے سے پروجیکٹ میں قسطوں والے فلیٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔" ریحانہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "پہلے سارا نقشہ ہمارے سامنے آجائے، پھر آرام سے بیٹھ کر پلاننگ کریں گے کہ وہ رقم ہم کس طرح اور کہاں کہاں سے جمع کرسکتے ہیں۔"

ریحانہ کی تجویز نے خالد نیازی کے دل کو چھو لیا تھا لہٰذا اگلے روز اس نے آفس سے چھٹی ماری اور بیوی کو ساتھ لے کر ایک سنسنی خیز اور مستقبل سنوار مشن پر روانہ ہوگیا۔ دو چار مقامات کا سروے کرنے کے بعد ان کی نگاہ انتخاب گارڈن ویسٹ کے ایک پروجیکٹ پر آکر ٹھہر گئی۔ مذکورہ پروجیکٹ کا نام تھا "ڈائمنڈ پلازا"

وہ دونوں "ڈائمنڈ پلازا" کے بکنگ آفس پہنچ گئے۔ یہ پروجیکٹ چڑیا گھر کے بہت قریب واقع تھا۔ یہی چڑیا گھر جو

کسی زمانے میں گاندھی گارڈن کہلاتا تھا۔ ”ڈائمنڈ پلازا“ والا پروجیکٹ ”شاہ بلڈرز“ والوں کا تھا۔ وہاں ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے لوگ بکنگ کرانے آئے ہوئے تھے۔ اپنی باری پر وہ بکنگ کلرک کے پاس پہنچ گئے۔

کلرک نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ان کا استقبال کیا پھر پوچھا۔ ”آپ کس قسم کا فلیٹ بک کرانا چاہتے ہیں؟“

”دیکھیں صاحب!“ نیازی نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت تو ہم صرف معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔ بکنگ کا فیصلہ گھر جا کر اپنے بجٹ کو دیکھتے ہوئے کریں گے۔“

”عقل مندی کا تقاضا بھی یہی ہے۔“ بکنگ کلرک نے مسکا پالش سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”انسان کو اپنی چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانا چاہئیں......“

ریحانہ نے پوچھا۔ ”بھائی صاحب! آپ نے یہ کیوں کہا کہ ہمیں کس قسم کا فلیٹ چاہیے۔ کیا آپ کے پروجیکٹ میں تمام فلیٹس ایک جیسے نہیں ہیں؟“

”بہت اچھا سوال کیا ہے آپ نے۔“ وہ تعریفی نظر سے ریحانہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دراصل ہمارے اس پروجیکٹ میں تین ٹائپ کے فلیٹس ہیں۔“

”کون کون سی ٹائپ؟“ نیازی نے پوچھ لیا۔

”ٹائپ ون، ٹو اینڈ تھری۔“ کلرک وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ٹائپ ون کی تفصیل کچھ اس طرح ہے...... تین بیڈ اٹیچڈ باتھ، ایک ڈرائنگ، ایک ڈائننگ، ٹی وی لاؤنج، کچن اور دو جانب گیلریاں۔ ٹائپ ٹو میں دو بیڈروم اٹیچڈ باتھ، ایک ڈائننگ، ایک ڈرائنگ، کچن اور ایک گیلری جبکہ......“ اس نے لحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جبکہ ٹائپ تھری میں دو بیڈروم اٹیچڈ باتھ، ایک ڈرائنگ روم، کچن اور ایک گیلری ہے۔“

”یہ ٹائپ تھری والا فلیٹ ہمارے لیے مناسب رہے گا۔“ نیازی، کلرک کے خاموش ہوتے ہی بول پڑا۔

”ٹھیک ہے۔“ کلرک نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”گویا آپ ٹائپ تھری کا فلیٹ بک کرانا چاہتے ہیں......؟“

”جی ہاں۔“ ریحانہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”آپ ہمیں ٹائپ تھری کے حوالے سے مکمل معلومات فراہم کردیں۔“

کلرک رٹا رٹایا ہوا سبق دہرانے لگا۔ ”دیکھیں جناب! ٹائپ تھری کی بکنگ آٹھ ہزار روپے سے ہے۔ ہمارا یہ پروجیکٹ دو سال کے تعمیراتی عرصے پر محیط ہے یعنی چوبیس ماہ۔ آٹھ سو ماہانہ کے حساب سے آپ کو چوبیس قسطیں بھی ادا کرنا ہوں گی۔“

خالد نیازی کے حسابی ذہن نے فوراً تخمینہ جوڑا اور بولا۔ ”یعنی صرف ستائیس ہزار دو سو روپے میں ہم فلیٹ کے مالک بن جائیں گے۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”یہ رقم خاصی کم نہیں ہے؟“

”یہ رقم آپ کو کم اس لیے لگ رہی ہے کہ ابھی بہت سی چیزیں آپ کے علم میں نہیں ہیں۔“ کلرک نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”مثلاً کون سی چیزیں؟“ ریحانہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

”مثلاً یہ کہ......“ کلرک وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ان دو سالوں میں ہر چھ ماہ کے بعد آپ کو آٹھ ہزار روپے ادا کرنا ہوں گے۔ یعنی یہ چار ادائیاں بتیس ہزار کی ہوجائیں گی۔ بتیس اور ستائیس ہوگئے انسٹھ ہزار روپے۔ اس کے بعد قبضہ کے وقت آپ کو ایک بھاری ادائی کرنا ہوگی۔ مبلغ بیس ہزار روپے۔ چنانچہ جب آپ کو تیار فلیٹ کی چابی تھمائی جائے گی تو آپ ہمیں لگ بھگ اسی ہزار ادا کرچکے ہوں گے۔ آپ جو بیس ہزار کی آخری پے منٹ دیں گے اس میں فلیٹ کے مکمل ڈاکومینٹس بھی تیار کرا کے آپ کے حوالے کیے جائیں گے۔“

”اللہ کا شکر ہے!“ ریحانہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”دو سال کے بعد ہم اپنے ذاتی فلیٹ میں منتقل ہوچکے ہوں گے اور وہ بھی صرف اسی ہزار کی ادائی کے بعد۔“

”ابھی ایک مرحلہ باقی ہے۔“ کلرک نے گویا ریحانہ کی خوشیوں پر اوس ڈالتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اس فلیٹ پر آسان قسطوں کی صورت کم و بیش ساٹھ ہزار روپے مزید ادا کرنا ہوں گے۔“

”وہ کس مد میں جناب؟“ خالد نے تقریباً اچھلتے ہوئے کہا۔

کلرک نے جواب دیا۔ ”ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن......!“

”کیا مطلب؟“ ریحانہ نے سوال کیا۔

”ہم جو بھی رہائشی پروجیکٹ شروع کرتے ہیں اس کے لیے ”ایچ۔ بی۔ ایف۔ سی“ سے قرضہ منظور کراتے ہیں جو بعد میں تمام فلیٹس پر تقسیم کردیا جاتا ہے۔ ٹائپ تھری کے چھوٹے فلیٹس پر لگ بھگ ساٹھ ہزار کا قرضہ ہوگا۔“

”یہ قرضہ تو کارپوریشن سے آپ لوگ لیں گے۔“

ریحانہ نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ایک نکتہ اٹھایا۔ ”اس کی ادائی بھی آپ ہی کو کرنا چاہیے۔“

”ہماری شکل پر کیا ”ب“ بنا ہوا ہے؟“ کلرک نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”جی کیا مطلب؟“ ریحانہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

خالد نیازی نے پوچھا۔ ”بھائی صاحب! اس ”ب“ سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”بے وقوف!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”کیا ہم آپ کو بے وقوف نظر آتے ہیں جو آپ سے لگ بھگ اسی ہزار دو سال میں قسطوں کی صورت وصول کرنے کے بعد ایک لاکھ چالیس ہزار روپے مالیت کا فلیٹ آپ کے حوالے کردیں گے......؟“

”ہمارا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ خدانخواستہ بے وقوف ہیں۔“ خالد نے جلدی سے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”ہم تو اصل میں اس سسٹم کو سمجھنا چاہتے تھے۔“

”ٹھیک ہے......!“ کلرک گویا ان دونوں پر احسانات کے ڈونگرے برساتے ہوئے بولا۔ ”تو پھر سمجھیں اس نکتے کو کہ آپ نے دو سال میں کم و بیش اسی ہزار ہمیں ادا کرنا ہے اور جب آپ اپنے فلیٹ کا قبضہ حاصل کرلیں گے تو باقی کے ساٹھ ہزار آسان اقساط میں ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کو ادا کرنے ہوں گے۔ اسی طرح کل ملا کر آپ کو یہ ٹائپ تھری فلیٹ ایک لاکھ چالیس ہزار میں پڑے گا اور......“ اس نے لحاتی توقف کرکے ایک آسودہ سی سانس خارج کی پھر ریحانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میڈم! آپ کو ایک فائدے اور راز کی بات بتاؤں......“

”جی بتائیں۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

”جب ڈائمنڈ پلازا مکمل ہوجائے گا تو اس کے فلیٹس کی اہمیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں۔“ وہ شاطرانہ انداز میں بولا۔ ”آپ کا ٹائپ تھری فلیٹ جو آپ کو آسان اقساط پر ایک لاکھ چالیس ہزار میں پڑے گا اس کی مارکیٹ ویلیو کم از کم دو لاکھ ہوجائے گی۔ اگر آپ کا موڈ بنے تو دو سال کے بعد یہ فلیٹ آپ مجھے دے دیجیے گا...... پورے دو لاکھ روپے میں!“

بکنگ کلرک کی لچھے دار باتوں نے دونوں میاں بیوی کو بے حد متاثر کیا اور وہ مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد یہ کہہ کر اس کے آفس سے اٹھ گئے۔

”جناب! ہم گھر جا کر آپس میں مشورہ کرلیں۔ ایک دو دن کے بعد آکر بکنگ کرالیں گے۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ کلرک نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”باہمی صلاح و مشورہ بہت ضروری ہے۔ آپ کا جب بھی آنے کا ارادہ ہو، ہم آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں لیکن زیادہ دیر نہ کردیجیے گا ورنہ یہ نہ ہو کہ آپ جب تشریف لائیں، پلازا کی بکنگ مکمل ہوچکی ہو......“

”نہیں نہیں......“ ریحانہ نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ”ہم زیادہ سے زیادہ دو دن میں آپ کے پاس آرہے ہیں۔“

”تب تو ٹھیک ہے۔“ بکنگ کلرک نے ایک آسودہ سانس خارج کی۔ ”یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ہمارا آفس ہر چھٹی کے دن بھی آپ لوگوں کی سہولت کے لیے کھلا رہتا ہے۔“

وہ دونوں مذکورہ آفس سے نکل کر گھر آگئے۔

آپ ٹائپ تھری والے اس فلیٹ کی قیمت پر بالکل حیران نہ ہوں۔ یہ واقعہ آج سے کم و بیش چالیس سال پہلے کا ہے۔ فلیٹ کی بکنگ کے حوالے سے وہ اچھی خاصی معلومات کرچکے تھے۔ اب ان کے بیچ بجٹنگ پر تبادلۂ خیالات ہونے لگا۔ ریحانہ نے صلاح دی۔

”نیازی! تم کل ہی باس کو پندرہ ہزار روپے کے قرض کے لیے درخواست دے دو۔ مجھے امید ہے، ایک آدھ دن میں تمہیں آفس سے یہ رقم مل جائے گی۔“ لحاتی توقف کے بعد اس نے ایک گرہ بھی لگا دی۔ ”باس کو یہ ضرور بتا دینا کہ تم فلیٹ بک کرانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ مجھے یقین ہے، باس تمہاری بات سن کر بہت خوش ہوگا۔“

”فلیٹ ہم بک کرا رہے ہیں اور خوش باس ہوگا۔“ نیازی نے الجھن زدہ انداز میں اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ”میں تمہاری بات کو سمجھ نہیں پایا ہوں ریحانہ؟“

”تم نے ہی تو بتایا تھا کہ باس کو اس بات سے بہت اطمینان ہوتا ہے کہ اس کے ملازمین کے پاس ذاتی رہائش ہو۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”کئی سال پہلے تو باس نے اپنے آفس کے لوگوں کے لیے لیاقت آباد کے علاقے میں آٹھ دس فلیٹ ایک بلڈنگ میں خرید لیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ وہ فلیٹ میں رہ کر تھوڑے تھوڑے پیسے ہر ماہ اپنی تنخواہ سے کٹواتے رہیں۔ تقریباً اتنا ہی اماؤنٹ جو وہ گھر کے کرایے میں دے رہے تھے۔“

”وہ گئے زمانے کی باتیں ہیں ریحانہ!“ نیازی ایک

ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”ان ملازمین میں سے اکثر نے باس کو دھوکا دیا تھا...... باس کا دل کھٹا ہوگیا اور آیندہ پھر کبھی اس کے دل میں ایسی رہائشی اسکیم کا خیال نہیں آیا۔ بہرحال......“ اس نے پھر لمحاتی توقف کیا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں کل ہی باس سے بات کرتا ہوں......“

”شاباش!“ ریحانہ نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”اگر میرے دماغ سے سوچو گے تو ہر مشکل آسان ہوجائے گی۔“

”اچھا!“ نیازی نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔ ”فوری طور پر تو تم میری یہ مشکل آسان کردو کہ پندرہ ہزار قرض لینے کا مشورہ کیوں دے رہی ہو۔ فلیٹ کی بکنگ تو آٹھ ہزار سے ہو رہی ہے؟“

”تم اسے آٹھ نہیں بلکہ دس ہزار سمجھو!“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ”آٹھ ہزار بکنگ کے، آٹھ سو پہلی قسط اور کچھ دیگر دستاویزاتی اخراجات بھی ہوسکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے......!“ نیازی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”اور باقی کے پانچ ہزار......؟“

”ہاتھ میں رکھنے کے لیے۔“ ریحانہ نے کہا۔ ”کچھ رقم ہاتھ میں رہے گی تو بعد میں کوئی پرابلم نہیں ہوگی اور میں فریج بھی تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں......“

”فریج کیوں تبدیل کرنا چاہتی ہو؟“ نیازی نے پوچھا۔

”دس سال سے چل رہا ہے۔“ ریحانہ نے کہا۔ ”اس کی باڈی کئی جگہ سے گل چکی ہے۔ کمپریسر میں بھی جان نہیں رہی۔ ظہور صاحب کی بیوی اپنا فریج بیچ رہی ہیں۔ صرف ایک ڈیڑھ ہزار ہی ملانا پڑے گا۔ میں سوچ رہی ہوں اپنے فریج کو نکال کر وہ فریج لے لوں۔ وہ دو سال چلا ہوا ہے۔ ظفر ماموں کے گھر جارہے ہیں تو کھٹارا فریج کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں۔ وہ کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں......؟“

فریج کے موضوع پر نیازی نے اپنی بیوی سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس کا کوئی حاصل وصول نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں ایک بار جو بات سما جاتی تھی پھر وہ اس پر عمل کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھتی تھی۔ وہ موجودہ موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔

”ریحانہ! اگر مجھے آفس سے قرض مل جاتا ہے تو سمجھو فلیٹ کی بکنگ کا ابتدائی مرحلہ تو طے ہوجائے گا۔ لیکن ایک بات میرے ذہن کو پریشان کررہی ہے......“

”کون سی بات؟“ ریحانہ نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”یہ جو ہر چھ ماہ کے بعد آٹھ ہزار روپے ادا کرنا ہیں وہ کہاں سے آئیں گے۔“ وہ فکرمندی سے بولا۔ ”اور فلیٹ کا قبضہ لیتے وقت تو پورے بیس ہزار ادا کرنا ہوں گے؟“

”فلیٹ کے قبضے میں ابھی دو سال پڑے ہیں نیازی اور آٹھ ہزار کی ادائی بھی چھ ماہ کے بعد کرنا ہوگی۔“ وہ تسلی بھرے انداز میں بولی۔ ”اللہ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر ہی دے گا۔ ابھی سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

ریحانہ کی ”اطمینان بھری“ وضاحت جب نیازی کو ہضم نہیں ہوئی تو اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ ریحانہ نے اس کی کیفیت کو فوراً بھانپ لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”دل چھوٹا نہیں کرو نیازی! اگر رقم کا بندوبست کسی بھی طرح نہ ہوسکا تو میں اپنا زیور بیچ دوں گی۔“

”زیور......!“ نیازی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو ریحانہ؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”اپنے گھر کا خواب میں ایک عرصے سے دیکھ رہی ہوں۔ زیور کا کیا ہے۔ یہ تو دوبارہ بن جائے گا۔“

”لیکن تمہارے پاس اتنا زیور ہے ہی کہاں جس سے......“

”جو بھی ہے!“ وہ نیازی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ”اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ تم اس کی نوبت نہیں آنے دو گے۔ زیور بکنے سے پہلے ہی تم کہیں نہ کہیں سے رقم کا بندوبست کرلو گے......“

خالد نیازی یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔

چند روز کے بعد وہ لوگ ظفر ماموں کے ہاں منتقل ہوگئے۔ آفس سے پندرہ ہزار کا قرضہ منظور ہوگیا تھا لہٰذا وہ پہلی فرصت میں ”ڈائمنڈ پلازا“ کے بکنگ آفس پہنچ گئے۔

ابتدائی معاملات نمٹانے کے بعد انہیں ایگری منٹ کی کاپی فراہم کردی گئی۔ یہ ایگری منٹ خالد نیازی اور ”شاہ بلڈرز“ کے درمیان ڈائمنڈ پلازا کے تھرڈ فلور پر واقع ٹائپ تھری کے فلیٹ نمبر تین سو تین کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ آٹھ ہزار بکنگ کی رقم اور پہلی آٹھ سو ماہانہ قسط کی ادائی کی رسیدیں بھی ایگری منٹ کے ساتھ منسلک تھیں۔ یہ تمام کاغذات ایک فائل میں لگا کر انہیں پیش کیے گئے تھے۔ فائل کے کور پر ”شاہ بلڈرز“ چھپا ہوا تھا۔ مذکورہ ایگری منٹ کی پشت پر قواعد و ضوابط بہت ہی مہین تحریر میں درج تھے۔ خالد نیازی نے جب ان قواعد و ضوابط کا مطالعہ کیا تو پریشان ہوگیا۔ دیگر چھوٹے موٹے اصولوں کے علاوہ دو شرائط بڑی کڑی تھیں۔

نمبر ایک، اگر ماہانہ قسط مسلسل دو ماہ تک ادا نہ کی گئی تو فلیٹ کی بکنگ خود بہ خود کینسل ہوجائے گی اور جس وقت ایسا ہوگا اس وقت تک کمپنی کے پاس جمع ہونے والی رقم پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد ڈی فالٹر الاٹی کو ادا کی جائے گی۔ نمبر دو، اگر چھ ماہ بعد دی جانے والی آٹھ ہزار کی کوئی قسط ایک ماہ کے اندر ادا نہ کی گئی تو الاٹی ایسی صورت میں بھی ڈی فالٹر تصور کیا جائے گا اور یقینی طور پر اس کی بکنگ کو کینسل کردیا جائے گا۔ ”شاہ بلڈرز“ اس بات کا مجاز ہوگا کہ اپنی مرضی سے وہ فلیٹ کسی اور پارٹی کو الاٹ کردے۔

یہ شرائط پڑھ کر نیازی فکرمند ہوگیا۔ اس نے ریحانہ کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ کائیاں بکنگ کلرک بڑی توجہ سے ان کے چہروں پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ انہیں الجھن میں مبتلا دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔

”جناب! ان نکات کو پڑھ کر آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے آپ بس رسمی سی کارروائی سمجھ لیں۔“

”کیا مطلب!“ نیازی نے پوچھا۔ ”کیا ان اصولوں کا اطلاق الاٹی پر نہیں ہوتا؟“

”ہر الاٹی پر نہیں ہوتا صاحب!“ وہ ذومعنی انداز میں بولا۔ ”کم از کم آپ جیسے شریف لوگوں پر تو بالکل نہیں ہوتا۔“

”میں سمجھ نہیں سکا؟“ نیازی کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔

بکنگ کلرک سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”جناب! اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ آپ خوامخواہ پریشان نہ ہوں۔ اس قسم کی شرائط محض پھڈے باز قسم کے لوگوں کو قابو کرنے کے لیے ایگری منٹ میں شامل کردی جاتی ہیں تاکہ بعد میں کوئی قانونی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ......“ وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”بعض عادی مجرم تو ایسے بھی ہیں اس شہر میں کہ وہ دھونس دھاندلی سے رقم جمع کرائے بغیر ہی فلیٹ پر قابض ہونے کے چکر میں رہتے ہیں۔ یہ شرائط ایسے لوگوں سے کورٹ میں نمٹنے کے لیے بڑی موثر ثابت ہوتی ہیں۔“

بکنگ کلرک کی وضاحت نے دونوں میاں بیوی کی تسلی کردی اور وہ سائٹ آفس سے اٹھ کر گھر آگئے۔ ویسے بھی وہ ایگری منٹ پر دستخط کرچکے تھے۔ اگر انہوں نے قواعد و ضوابط کا مطالعہ بعد میں کیا تھا تو اس میں ”شاہ بلڈرز“ کا کوئی ”قصور“ نہیں تھا۔

بکنگ کے بعد، خالد نیازی نہایت پابندی کے ساتھ ماہوار اقساط ادا کر رہا تھا۔ بیچ میں چھ ماہ کے بعد اس نے کہیں سے پکڑ کر آٹھ ہزار روپے بھی ”شاہ بلڈرز“ کے دفتر میں جمع کرادیے تھے۔ یعنی آٹھ ہزار شروع میں بکنگ کے وقت اور آٹھ ہزار چھ ماہ کے بعد۔ پھر جب ماہانہ قسطیں ادا کرتے ہوئے ایک سال گزر گیا تو نیازی کو گہری تشویش نے آگھیرا۔ وہ جب بھی قسط جمع کرانے جاتا، سائٹ کا معائنہ بھی ضرور کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے بہت مایوسی ہوئی کہ ابھی تک ”ڈائمنڈ پلازا“ کی باقاعدہ تعمیر کا کام شروع نہیں ہوسکا تھا۔ وہ کسی طرح گھس گھسا کے ”شاہ بلڈرز“ کے مالک سے ملنے میں کامیاب ہوگیا۔

”شاہ بلڈرز“ نامی وہ تعمیراتی کمپنی دراصل دو بھائیوں کی مشترکہ کاوشوں سے چل رہی تھی۔ بڑے بھائی کا نام قربان شاہ اور چھوٹے بھائی کا نام فرقان شاہ تھا جو علی الترتیب ”بڑے شاہ جی“ اور ”چھوٹے شاہ جی“ کہلاتے تھے۔ نیازی کی ملاقات جب چھوٹے شاہ جی سے ہوئی تو اس نے اپنی تشویش کو کھل کر بیان کردیا۔

”شاہ جی! بکنگ کو تقریباً ایک سال ہونے والا ہے۔ میں نہایت ہی پابندی کے ساتھ قسطیں جمع کرارہا ہوں اور ابھی تک کل ملا کر پچیس ہزار چھ سو روپے میں آپ کے آفس میں جمع کراچکا ہوں۔ آپ کے بندے نے بکنگ کے وقت بتایا تھا کہ دو سال میں یہ پروجیکٹ مکمل ہوجائے گا......“

”ہمارے بندے نے آپ کے ساتھ کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی جناب۔“ چھوٹا شاہ جی کراری آواز میں بولا۔ ”ہماری پلاننگ کے مطابق یہ تعمیراتی منصوبہ دو سال کی مدت ہی میں مکمل ہوگا۔“

”لیکن شاہ جی......!“ نیازی نے فکرمندی سے کہا۔ ”ان دو سال میں سے ایک سال تو گزر گیا اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ابھی تک باقاعدہ تعمیر کا کام شروع ہی نہیں ہوسکا؟“

”جی ہاں، میں بالکل دیکھ رہا ہوں، ہم سے زیادہ اس معاملے کو اور کون دیکھے گا۔“ شاہ جی نے کہا۔ ”لیکن اگر ابھی تک تعمیراتی کام میں تیزی نظر نہیں آرہی تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔“

”پھر کس کا قصور ہے؟“ نیازی پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

شاہ جی نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”ایچ بی ایف سی والوں کا۔“

”جی......!“ نیازی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”میں سمجھا نہیں شاہ جی۔ ایچ بی ایف سی والوں کا قصور کس طرح ہے......؟“

”انہوں نے ابھی تک لون سنکشن نہیں کیا۔“

”کیوں جناب!“ نیازی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”ایک سال ہونے کو آرہا ہے۔ آپ نے ابھی تک لون کے لیے کوشش کیوں نہیں کی؟“

”ہماری کوششیں برابر جاری ہیں جناب!“ چھوٹے شاہ جی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ایچ بی ایف سی میں بھی انسان ہی بیٹھے ہوئے ہیں اور ان سے ہمارے مذاکرات چل رہے ہیں۔ انشاءاللہ! بہت جلد کوئی مثبت نتیجہ سامنے آجائے گا۔“

فرقان شاہ کی باتوں سے خالد نیازی کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے قدرے بدگمان لہجے میں پوچھا۔ ”جناب! ایچ بی ایف سی سے آپ کے کس قسم کے مذاکرات چل رہے ہیں؟“

”یہ مذاکرات قرضے کی منظوری کے سلسلے میں ہیں۔“ شاہ جی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو کیا پتا کہ ہمارے ملک کے ہر محکمے میں کام کروانے کے لیے مال کھلانا پڑتا ہے......“

”شاہ جی! ماشاءاللہ، آپ تو کافی عرصے سے یہ کام کر رہے ہیں۔“ نیازی نے شاکی نظر سے فرقان شاہ کو دیکھا۔ ”مال کھلانے والی یہ راز کی بات آپ کو پہلے معلوم نہیں تھی؟“

”بالکل معلوم تھی صاحب!“ وہ بڑے زوردار انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ ہم تو ہر پروجیکٹ کے وقت ان کی ”خدمت“ کرتے ہیں مگر اس مرتبہ وہ دوگنا کا مطالبہ کررہے ہیں۔“

”اوہ......!“ نیازی ایک گہری سانس خارج کرکے رہ گیا۔

”ہم اگر ان کا مطالبہ مان لیں تو اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں۔“ چھوٹا شاہ، نیازی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”بلکہ اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے ہمیں مجبوراً الاٹیز پر بوجھ ڈالنا پڑے گا جس کے نتیجے میں فی فلیٹ بیس، تیس ہزار قیمت بڑھ جائے گی اور ہم ایسا نہیں چاہتے۔“

”یہ تو خاصی تشویش ناک صورتِ حال ہے۔“ نیازی پریشان ہوگیا۔

”آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑا صبر سے کام لیں۔“ فرقان شاہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”ہم ایچ بی ایف سی والوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیں گے۔“

چھوٹے شاہ کی وضاحت پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ نیازی قرضہ جات اور اس کی منظوری کے گھماؤ پھراؤ سے واقفیت نہیں رکھتا تھا تاہم اس نے سر میں محوِ گردش خدشے کا اظہار کرنے میں کوئی قباحت نہ سمجھی اور مستفسر ہوا۔

”شاہ جی! اگر ایچ بی ایف سی والوں نے مزید ایک سال تک آپ لوگوں کو قرضہ نہ دیا تو پروجیکٹ کی تعمیر کا کام شروع نہیں ہوسکے گا۔ اس صورت میں بے چارے ہم کہاں جائیں گے۔ میرے تو پچیس ہزار چھ سو پھنس گئے نا......؟“

”دیکھیں صاحب!“ چھوٹا شاہ نہایت ہی متحمل انداز میں بولا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ دیر یا سویر، اس پروجیکٹ پر کام ضرور ہونا ہے اس لیے آپ کی ادا کردہ رقم کے ضائع ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ کے تو پچیس چھبیس ہزار لگے ہوئے ہیں اور ہمارے صرف پلاٹ پر ہی لاکھوں کی انویسٹمنٹ ہے پھر پچھلے ایک سال سے سائٹ آفس کھولے بیٹھے ہیں۔ پانچ چھ افراد کا اسٹاف رکھا ہوا ہے۔ ان کی تنخواہیں اور آفس کے دیگر اخراجات ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، اگر ہم اس پروجیکٹ کے ساتھ سنجیدہ نہ ہوتے تو کیا ہمارا دماغ خراب ہے جو اتنا پیسا لگاتے......“

”مجھے آپ کی نیت یا سنجیدگی پر کوئی شک نہیں شاہ جی!“ نیازی اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”آپ کو شاید علم نہیں کہ ہم اپنے ماموں کے گھر میں عارضی طور پر رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ امید تھی کہ دو سال کے بعد ذاتی فلیٹ میں منتقل ہوجائیں گے مگر یہاں تو سارے ارمانوں پر پانی پھرتا نظر آرہا ہے۔“

”نیازی صاحب! آپ مسلمان ہیں نا؟“ چھوٹا شاہ شاطرانہ انداز میں مستفسر ہوا۔

اس غیر متوقع سوال پر نیازی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بہ آوازِ بلند جواب دیا۔ ”الحمدللہ...... میں مسلمان ہوں۔“

”اگر آپ سچے مسلمان ہیں تو آپ کو یہ بھی پتا ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مایوسی کو سخت ناپسند فرمایا ہے۔“ چھوٹا شاہ بہ دستور نیازی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ مایوسی کو گناہ تصور کیا جاتا ہے۔“

”جی......!“ نیازی ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں یہ بات جانتا ہوں۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ چھوٹا شاہ نیازی کا نفسیاتی ٹریٹمنٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ مایوس نہیں بلکہ پریشان ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟“

”نہیں شاہ جی......“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بالکل یہی بات ہے۔“

”فی الحال......“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کی پریشانی کا میرے پاس صرف ایک ہی حل ہے۔“

نیازی دلچسپی بھری سوالیہ نظر سے چھوٹے شاہ جی کو تکتے ہوئے بولا۔ ”کون سا حل؟“

”اگر آپ مزید انتظار کے متحمل نہیں ہوسکتے تو اپنی بکنگ کینسل کرادیں......!“ فرقان نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

”تو کیا ایسی صورت میں میرے پچیس ہزار چھ سو روپے مجھے فوراً مل جائیں گے؟“ نیازی نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

”فوری طور پر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ چھوٹے شاہ جی نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ”یہ ادائی ایگریمنٹ میں درج شرائط کے عین مطابق پروجیکٹ کی تکمیل پر ہوسکے گی۔“

نیازی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ہر زاویے سے پھنس گیا تھا۔ اگر وہ فلیٹ کی بکنگ کو کینسل کراتا تھا تو اس کے پچیس ہزار چھ سو پروجیکٹ کی تکمیل سے پہلے نہیں مل سکتے تھے اور ایک سال گزر جانے کے باوجود بھی ابھی تک پروجیکٹ کا عملی کام شروع نہیں ہوسکا تھا۔ اگر یہ کام اسی رفتار سے آگے بڑھنا تھا تو آیندہ دس سال میں بھی اس کی تکمیل کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ کڑوا گھونٹ سمجھ کر قسطوں کی ادائی کا سلسلہ جاری رکھے اور اللہ سے دعا کرتا رہے کہ ایچ بی ایف سی والے جلد از جلد لون سنکشن کردیں۔

”آپ کن سوچوں میں گم ہیں نیازی صاحب؟“ چھوٹا شاہ ٹٹولنے والے انداز میں بولا۔ ”آپ اگر آج بکنگ کینسل کرتے ہیں تو اس فلیٹ کے دس خریدار کھڑے ہوں گے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ”ڈائمنڈ پلازا“ کتنی پرائم لوکیشن پر بننے جارہا ہے......“

”نہیں شاہ جی۔“ نیازی نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بکنگ کینسل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ...... جب اوکھلی میں سر دے دیا تو پھر موسلوں سے کیا ڈرنا!“

”شاباش!“ چھوٹا شاہ ستائشی نظر سے نیازی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب آپ نے کی ہے نا مردوں والی بات...... بس آپ، صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھیں۔ اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔“

خالد نیازی نے چھوٹے شاہ جی کا شکریہ ادا کیا اور اس کے دفتر سے نکل آیا۔

گھر آکر اس نے ریحانہ کو تمام تر صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ باہمی مشاورت کے بعد یہی طے پایا کہ بکنگ کو کینسل کرانا حماقت ہوگی لہٰذا قسطوں کی ادائی کا سلسلہ جاری رکھا گیا پھر دو ماہ کے بعد انہیں ایک خوش خبری سننے کو ملی کہ ایچ بی ایف سی نے "شاہ بلڈرز" کو قرضہ جاری کر دیا ہے۔ اس کے بعد پروجیکٹ پر بڑی تیزی سے کام شروع ہوگیا تھا۔

ریحانہ اور خالد نیازی بہت خوش تھے کہ بہت جلد وہ اپنے ذاتی فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں گے تاہم ماہانہ قسطوں کی ادائی میں ان کا جلوس نکل گیا تھا۔ خاص طور پر چھ ماہ بعد آٹھ ہزار روپے کی ادائی نے انہیں قرض کی دلدل میں گردن تک دھنسا دیا تھا۔ ریحانہ کا زیور فروخت ہوگیا، نیازی اپنے جس جاننے والے سے جو بھی لے سکتا تھا وہ اس نے لیا، آخری بیس ہزار کی بھاری پے منٹ کے لیے انہیں ظفر ماموں کے سامنے بھی ہاتھ پھیلانا پڑے تھے بہرحال، سب خیریت سے نمٹ گیا تھا لیکن اس تمام تر ادائی کے دوران میں تین چار مرتبہ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ دو تین بار ماہانہ قسطیں تاخیر سے جمع کرائی گئی تھیں، ایک دفعہ آٹھ ہزار والی پے منٹ بھی مقررہ دورانیے سے لیٹ ہوگئی تھی اور بیس ہزار والا اماؤنٹ بھی چند روز کی تاخیر سے جمع کرایا گیا تھا۔ ان مواقع پر نیازی نے اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ سے پوچھا۔

"جناب! یہ جو پے منٹ میں تھوڑی بہت تاخیر ہوگئی ہے اس کا بکنگ پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا؟"

"ارے نہیں صاحب!" کیشیئر نے سرسری لہجے میں جواب دیا تھا۔ "آپ کا ریکارڈ بہت صاف ہے۔ شاہ جی آپ سے بہت خوش ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

نیازی مطمئن ہوگیا تھا۔ "ڈائمنڈ پلازا" کا پروجیکٹ تکمیل کے آخری مراحل میں داخل ہوا تو ایک ناخوشگوار خبر نے نیازی کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے۔ یقیناً دیگر الاٹیز کی ذہنی کیفیت بھی ویسی ہی ہوئی ہوگی جو نیازی اور ریحانہ کی تھی۔ پتا یہ چلا تھا کہ دونوں بھائیوں میں کسی بات پر شدید ترین جھگڑا ہوگیا تھا یعنی بڑے شاہ جی قربان علی اور چھوٹے شاہ جی فرقان علی میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔

یہ بات کسی الاٹی کے علم میں نہیں تھی کہ دونوں بھائیوں کی لڑائی کا سبب کیا تھا۔ بس، چھوٹا شاہ اچانک منظر سے غائب ہوگیا تھا۔ البتہ بڑا شاہ گنڈے دار آفس کا چکر لگا رہا تھا تاکہ الاٹیز کو زیادہ مایوسی نہ ہو۔ آفس کا عملہ الاٹیز کو تسلی دلاسے دے رہا تھا کہ وہ فکر نہ کریں، بہت جلد اس مسئلے کو حل کر لیا جائے گا۔ بڑا شاہ جی عموماً الاٹیز سے ملاقات نہیں کرتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے آفس آتا، الاٹیز کو جھلک دکھلاتا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا جاتا۔

دونوں بھائیوں کی پھوٹ کا سب سے زیادہ اثر پروجیکٹ پر پڑا تھا۔ تعمیر کا کام رک گیا تھا۔ پروجیکٹ آخری مراحل میں تھا اور ایک آدھ ماہ میں الاٹیز کو قبضہ دیا جانے والا تھا۔

بڑا شاہ جی، قربان علی اگرچہ الاٹیز کو فیس نہیں کر رہا تھا تاہم اس نے اپنا "سیاسی بیان" آفس کے عملے کو رٹا رکھا تھا جو کچھ اس طرح تھا کہ "دراصل دونوں بھائیوں میں کوئی جھگڑا وغیرہ نہیں ہوا بلکہ چھوٹا شاہ فراڈ کر کے کہیں غائب ہوگیا ہے۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ ملک سے باہر نکل گیا ہو۔ پیسے کا سارا حساب کتاب فرقان شاہ کے پاس تھا۔ لگ بھگ بیس لاکھ روپے تھے اس کے ہاتھ میں۔ بڑا شاہ جی بالکل خالی ہوگیا ہے لیکن پھر بھی وہ الاٹیز کے بیچ موجود ہے اور بڑی شد و مد سے رقم کے انتظام میں لگا ہوا ہے تاکہ پروجیکٹ کو جلد از جلد مکمل کر کے الاٹیز کے حوالے کیا جاسکے۔ وہ اپنے فراڈیا بھائی کو تو ڈھونڈ کر نہیں لاسکتا تاہم اس کی نیت بالکل صاف ہے۔ وہ جلد یا بہ دیر الاٹیز کی امیدوں پر پورا اتر کے دکھا دے گا۔ وغیرہ وغیرہ......!"

یہ صورتِ حال خاصی مایوس کن تھی تاہم الاٹیز کے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا دوسرے لوگوں کی طرح نیازی بھی صبر کرنے پر مجبور تھا۔ ممکن تھا کہ وہ کافی عرصہ صبر کیے بیٹھا رہتا کہ ایک سنسنی خیز واقعے نے اس کی رات کی نیند اور دن کا سکون اڑا کر رکھ دیا۔ ایک روز وہ آفس سے واپسی پر جب ڈائمنڈ پلازا کی طرف سے گزرا تو اس کے جی میں آئی کہ سائٹ آفس جا کر تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہی حاصل کرے۔ جب وہ پلازا کے سامنے پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ پلازا کے دس فیصد فلیٹ آباد ہو چکے تھے۔ گیلریوں کے باہر بندھی ہوئی الگنیاں اور ان پر لہلہاتے ہوئے کپڑے اس بات کا بین ثبوت تھے کہ وہاں فیملیز رہائش پذیر ہو چکی ہیں جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ان لوگوں کو فلیٹ کا قبضہ مل چکا تھا۔ یہ منظر دل خوش کن تھا۔ وہ اپنے فلیٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے دفتر کے اندر گھس گیا۔

آفس کے عملے میں اکثر نئے چہرے نظر آرہے تھے۔ بکنگ کلرک، کیشیئر، چپراسی سب نئی بھرتی تھی۔ نیازی نے

معلوماتی کاؤنٹر پر جا کر مسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جناب! کیا ڈائمنڈ پلازا کے الاٹیز کو قبضہ دینے کا کام شروع ہوگیا ہے؟"

"جی صاحب! بالکل......" اس شخص نے بتایا۔

"مجھے اپنے فلیٹ کے بارے میں پوچھنا تھا؟"

"آپ اس کاؤنٹر پر چلے جائیں۔" وہ شخص بکنگ کلرک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔"

نیازی نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور بکنگ کلرک کے پاس پہنچ گیا۔ پہلے والا بکنگ کلرک اسے اچھی طرح جانتا تھا اور نیازی جب بھی وہاں پہنچتا وہ مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کا استقبال کرتا تھا اور رسمی علیک سلیک بھی لازمی تھی لیکن نئے کلرک نے نیازی پر نظر پڑتے ہی کھرے لہجے میں کہا۔

"جی فرمائیں......؟"

"وہ پہلے والے کلرک صاحب کہاں چلے گئے ہیں؟" نیازی نے پوچھا۔

"ان کی چھٹی کردی گئی ہے۔" اس نے بتایا۔ "بلکہ جن ملازموں کو چھوٹے شاہ جی نے رکھا تھا، بڑے شاہ جی نے ان سب کو فارغ کر دیا ہے۔ بڑے شاہ جی کہتے ہیں...... فرقان شاہ فراڈ نکلا ہے تو اس کے رکھے ہوئے بندے بھی کسی موقع پر دھوکا دے سکتے ہیں۔ صاحب بڑا خراب وقت آگیا ہے۔ لوگوں کے خون سفید ہوگئے ہیں۔ بھائی، بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔ اللہ معاف کرے......!"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" نیازی نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "اللہ ہم سب کی حفاظت کرے۔"

"خیر......!" کلرک ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میں نے بھی اس پلازا میں ایک ٹائپ تھری فلیٹ بک کرا رکھا ہے۔" نیازی نے بتایا۔ "اسی کے قبضے کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہوں۔"

"آپ فلیٹ کی فائل ساتھ لائے ہیں؟" کلرک نے استفسار کیا۔

"نہیں جناب! فائل تو گھر میں رکھی ہے۔"

"فائل مکمل تو ہے نا؟" کلرک نے پوچھا۔

"جی ہاں...... بالکل مکمل ہے۔" نیازی نے جوش بھرے لہجے میں بتایا۔ "میں نے ہر چھوٹی بڑی ادائی کر دی ہے۔ سب رسیدیں بھی فائل کے اندر لگی ہوئی ہیں۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔" وہ اطمینان سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ کل کسی وقت فائل لے کر آجائیں۔ آپ کو کاغذات کی اوریجنل فائل کے ساتھ قبضہ دے دیا جائے گا۔"

نیازی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ "آپ چاہیں تو اپنے ریکارڈ میں چیک کر کے تسلی کرسکتے ہیں۔ میرے فلیٹ کا نمبر ہے تین سو تین......!"

"سوری جناب!" کلرک نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "بڑے شاہ جی نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ غیر متعلقہ افراد کو کسی بھی نوعیت کی معلومات فراہم نہ کی جائیں۔ جب سے چھوٹے شاہ جی فراڈ کر کے غائب ہوئے ہیں، بڑے شاہ جی اس پروجیکٹ کے حوالے سے بہت محتاط ہوگئے ہیں۔"

"لیکن صاحب! میں تو غیر متعلق شخص نہیں ہوں۔" نیازی نے شکایتی نظر سے نئے کلرک کی طرف دیکھا۔ "پچھلے تین سال سے میرا یہاں آنا جانا ہے۔ اس پلازا میں مجھے ایک فلیٹ الاٹ ہوا ہے۔ میں نے باقاعدگی کے ساتھ اس کی ساری اقساط بھری ہیں۔ میں غیر متعلق کیسے ہوسکتا ہوں؟"

"آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کی باتوں کو جھٹلا تو نہیں رہا۔" کلرک نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "میں نے تو ایک اصولی بات بیان کی ہے۔ میں چونکہ آپ کو شکل و صورت سے نہیں جانتا اس لیے مجھے اسی وقت آپ کے الاٹی ہونے کا یقین آئے گا جب آپ فلیٹ کی فائل اپنے ساتھ لے کر آئیں گے۔"

کلرک کے ساتھ بحث کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا لہٰذا نیازی واپس آگیا تاہم واپسی کے سفر میں اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ بڑے فخر کے ساتھ ریحانہ کو یہ خوش خبری دینے والا تھا کہ کل انہیں ان کے ذاتی فلیٹ کا قبضہ مل جائے گا۔

ریحانہ کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ یہ خبر تھی ہی ایسی کہ انہیں جسم و جاں سے نہال کر گئی تھی۔ وہ لمحہ آن پہنچا تھا جس کے لیے انہوں نے ایک ایک دن گن کر گزارہ تھا۔ ان تین سال کے دوران میں دو تین ایسے مرحلے بھی آئے تھے جب انہیں فلیٹ ہاتھ سے نکلتا اور رقم ڈوبتی محسوس ہوئی تھی لیکن پھر تقدیر ان پر مہربان ہوگئی تھی۔ ظفر ماموں بھی ان کی خوشی میں برابر کے شریک تھے۔ انہوں نے اخلاقی اور مالی دونوں طریقوں سے ان کی حتی الامکان مدد کی تھی۔

اگلی صبح نیازی اور ریحانہ ناشتے کے فوراً بعد "ڈائمنڈ

پلازا" کے آفس پہنچ گئے۔ نیازی نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ قبضہ ملنے کے بعد اپنے فلیٹ پر نیا تالا ڈالے گا اور پھر آفس چلا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے رات ہی کو جا کر ایک بڑا سا مضبوط تالا بھی خرید لیا تھا۔ وہ لوگ کلرک کی آمد سے بھی پہلے پلازا کے آفس پہنچ گئے تھے۔ فائل کو نیازی نے بڑی حفاظت سے تھام رکھا تھا۔

کلرک اپنی سیٹ پر متمکن ہوا تو نیازی اس کے پاس پہنچ گیا۔ کلرک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ رات کو بھی آئے تھے نا......؟"

"جی...... جی......" نیازی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"لائیں فائل دکھائیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

نیازی نے فائل اس کی جانب بڑھا دی۔

کلرک نے بہ غور فائل کا جائزہ لیا۔ نیازی یک ٹک کلرک کے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔ کلرک کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہوئے تو نیازی کو گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"جناب! آپ خاموش کیوں ہیں؟"

"خالد نیازی آپ ہی ہیں نا؟" کلرک نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، میں ہی ہوں۔" اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ "آپ کو کوئی شک ہو رہا ہے تو میں اپنا کارڈ دکھاتا ہوں......"

"بات شک کی نہیں ہے نیازی صاحب......!"

"پھر کیا بات ہے؟" ریحانہ جو نیازی کے قریب ہی بیٹھی تھی چونک کر مستفسر ہوئی۔

"ایک منٹ......!" کلرک نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "میں پہلے اپنا ریکارڈ چیک کر لوں پھر بتاتا ہوں۔"

ریحانہ اور نیازی نے پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ریحانہ بولی۔ "نیازی، یہ کیا چکر ہے؟"

"مجھے کیا معلوم......!" وہ الجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"تم تو رات کو بھی یہاں سے ہو کر گئے ہو نا......!" وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "اگر کوئی ایسی ویسی بات تھی تو......"

"آپ لوگ آپس میں نہ الجھیں پلیز۔" کلرک نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ "سارا چکر میری سمجھ میں آ گیا ہے۔"

"کیسا چکر؟" وہ دونوں بہ یک زبان ہو کر بولے۔

"دیکھیں صاحب!" کلرک نیازی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ درست ہے کہ ماہانہ اقساط کی ادائی میں ایک قسط دس دن اور دوسری قسط بارہ دن مقررہ تاریخ سے لیٹ جمع کرائی تھی......؟"

"جی ہاں، ایسا ہوا تھا۔" نیازی نے تصدیق کی۔

"اور ہر چھ ماہ کے بعد جو آٹھ ہزار والی پے منٹ تھیں ان میں سے بھی آپ نے ایک پے منٹ مقررہ تاریخ گزر جانے کے ڈیڑھ ماہ بعد جمع کرائی تھی؟"

"جی، یہ حقیقت ہے۔" نیازی نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ سے پہلے جو کلرک تھے انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس معمولی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

کلرک اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ "اور سب سے آخر والی بیس ہزار کی پے منٹ جو لگ بھگ تین ماہ پہلے آپ نے جمع کرائی ہے وہ بھی مقررہ تاریخ سے کوئی ڈیڑھ، دو ماہ لیٹ تھی؟"

"جناب! میں نے عرض کیا ہے نا کہ آپ سے پہلے والے کلرک نے کہا تھا، مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" نیازی اپنی صفائی دیتے ہوئے بولا۔ "یہ معمولی سی......"

"دیکھیں نیازی صاحب!" کلرک قطع کلامی کرتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔ "کوتاہی معمولی سی ہو یا بہت بڑی...... وہ کوتاہی ہی کہلائے گی۔ ہم لوگ ایگری منٹ پر درج قواعد وضوابط کی بڑی سختی سے پاس داری کرتے ہیں اور آپ کو بھی ایسا ہی کرنا ہوگا......!"

"مطلب کیا ہے، آپ کا؟" پہلی مرتبہ نیازی کے لہجے میں درشتی آ گئی۔

"صاف سی بات ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "قواعد وضوابط کی رو سے آپ تین بار ڈی فالٹر ہو چکے ہیں......"

"تو......؟" ریحانہ نے بکھری ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"تو آپ کی بکنگ کینسل کر دی گئی ہے۔" کلرک نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا۔ "دو ماہ پہلے آپ کا فلیٹ کسی اور پارٹی کو الاٹ کر دیا گیا ہے۔"

یہ اطلاع ان دونوں میاں بیوی کے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ نیازی نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"اگر ایسی کوئی بات تھی تو مجھے اسی وقت کیوں نہیں بتا دیا گیا جب پہلی بار پے منٹ لیٹ ہوئی تھی؟"

"آپ کا اعتراض جائز ہے نیازی صاحب۔" کلرک نے تحمل سے جواب دیا۔ "مجھ سے پہلے جو کلرک تھا اسے یقیناً آپ پر یہ واضح کر دینا چاہیے تھا۔ پہلی بار نہیں تو دوسری مرتبہ، دوسری مرتبہ نہیں تو تیسری دفعہ......"

"یہ تو آپ کے کلرک کی غلطی ہوئی نا۔" ریحانہ نے برہمی سے کہا۔ "اس کے کیے کی سزا ہم کیوں بھگتیں۔ ہم نے تو فلیٹ کی پوری قیمت چکا دی ہے......"

"میڈم! بڑے شاہ جی کے ساتھ لاکھوں کا فراڈ ہوا ہے۔ کسی اور نے نہیں بلکہ سگے چھوٹے بھائی نے انہیں دھوکا دیا ہے۔" کلرک اپنی کمپنی کی حمایت کرتے ہوئے بولا۔ "پہلے والا کلرک بھی چھوٹے شاہ جی ہی کا رکھا ہوا بندہ تھا۔ اس کے بھی کافی گھپلے سامنے آئے ہیں اسی لیے بڑے شاہ جی نے اسے ملازمت سے نکال دیا ہے۔"

"شاہ جی اسے ملازمت سے نکالیں یا جہنم میں پھینکیں، ہمیں اس بات سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی غرض۔" ریحانہ غصے سے بولی۔ "ہم نے فلیٹ کی قیمت کلرک کو نہیں بلکہ "شاہ بلڈرز" کو ادا کی ہے اور "شاہ بلڈرز" بڑے شاہ جی کی کمپنی ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی نے ان کے ساتھ کیا کیا، وہ ہمارا مسئلہ نہیں۔"

"یقیناً وہ آپ کا مسئلہ نہیں۔" کلرک نے تائیدی انداز میں کہا۔ "کمپنی نے آپ کا فلیٹ اس لیے کینسل نہیں کیا کہ چھوٹے شاہ جی کمپنی کے ساتھ کسی قسم کا فراڈ کر کے غائب ہو گئے ہیں......"

"پھر......" ریحانہ کلرک کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "پھر ہمارا فلیٹ کینسل کر کے کسی اور پارٹی کو کیوں الاٹ کر دیا گیا ہے؟"

"اس لیے کہ قواعد وضوابط کی رو سے ایک نہیں، آپ تین بار ڈی فالٹر ہو چکے تھے۔" کلرک نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ "آپ نے وہ ایگری منٹ سائن کیا ہے جس پر درج قواعد وضوابط کا میں ذکر کر رہا ہوں......"

"کیا کسی فلیٹ کو کینسل کرنے یا کسی نئی پارٹی کو الاٹ کرنے کے اختیارات آپ کے پاس ہیں؟" نیازی نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"فائنل اتھارٹی تو بڑے شاہ جی ہی ہیں۔" کلرک نے بتایا۔ "ہم لوگ انہیں مشورہ دے سکتے ہیں اور وہ خود بھی ہم سے گاہے بہ گاہے مشورہ لیتے رہتے ہیں۔"

"میں بڑے شاہ جی سے ملنا چاہتا ہوں۔" نیازی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"فوری طور پر تو یہ ممکن نہیں جناب۔" کلرک روکھے انداز میں بولا۔

"میں شام میں آ جاتا ہوں۔"

"نہیں جناب!" کلرک دوٹوک لہجے میں بولا۔ "اگر آپ کو شاہ جی سے ملنا ہے تو دو ماہ تک انتظار کرنا ہوگا......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔

"میں سمجھتا ہوں، بڑے شاہ جی سے ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ قصور آپ کا ہے۔ کمپنی کے اصول کے مطابق، ہم نے آپ کی بکنگ کینسل کر کے دوسری پارٹی کو اس فلیٹ کا قبضہ دے دیا ہے۔ وہ لوگ تو اب فلیٹ نمبر تین سو تین میں رہائش بھی اختیار کر چکے ہیں۔ انہوں نے یکمشت پے منٹ کر دی تھی۔"

"کون ہیں وہ لوگ؟" ریحانہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"کامران نام ہے ان کا۔" کلرک نے بتایا۔ "وہ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ اس فلیٹ میں شفٹ ہوئے ہیں۔ کامران صاحب کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔"

"پولیس......!" ریحانہ اور نیازی نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

پولیس کا نام سن کر ان کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی تھی۔ ایک تو بلڈر ہی سے نمٹنا تقریباً ناممکن دکھائی دے رہا تھا اوپر سے وہ فلیٹ کسی پولیس والے کو الاٹ ہو چکا تھا۔

نیازی نے مریل سی آواز میں کلرک سے پوچھا۔ "شاہ جی سے ملاقات کے لیے دو ماہ تک انتظار کیوں کرنا پڑے گا؟"

"بڑے شاہ جی حج پر گئے ہوئے ہیں۔" کلرک نے بتایا۔ "ان کی واپسی دو ماہ کے بعد ہوگی۔"

ریحانہ نے بڑا اہم سوال کیا۔ "فرض کریں، ہماری ہی کسی غلطی کے سبب وہ فلیٹ کسی اور کو الاٹ ہو چکا ہے لیکن یہ بھی تو ایک ٹھوس حیثیت ہے نا کہ ہم نے اس فلیٹ کے حصول کے لیے "شاہ بلڈرز" کو ایک لاکھ چالیس ہزار روپے ادا کیے ہیں۔ ہمارے پاس ہر چھوٹی بڑی ادائی کی رسید موجود ہے۔"

"میں کب اس حقیقت سے انکار کر رہا ہوں میڈم!" کلرک زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ کی ادا کردہ رقم ایک امانت کی حیثیت سے "شاہ بلڈرز" کے پاس محفوظ ہے اور آپ کمپنی کے قواعد کی روشنی میں وہ رقم واپس لے سکتے ہیں۔"

"ایگری منٹ میں تو یہی اصول درج ہے کہ بکنگ کینسل ہونے کی صورت میں پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد جمع شدہ رقم واپس کر دی جائے گی۔" نیازی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ پروجیکٹ تو اب مکمل ہو چکا۔"

"جی ہاں، بالکل......" کلرک تائیدی انداز میں بولا۔ "نہ صرف پروجیکٹ مکمل ہو چکا بلکہ دس سے پندرہ فیصد فلیٹس میں تو لوگوں نے رہائش بھی اختیار کرلی ہے۔"

"تو پھر براہ مہربانی آپ ہماری رقم واپس کردیں۔" نیازی نے دانش مندی کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہ تو بڑے شاہ جی سے ملنا ہے اور نہ ہی کسی اور سے۔"

ریحانہ نے بھی شوہر کی تائید میں کہا۔ "ہم کسی سے لڑائی جھگڑا تو کرنہیں سکتے۔ اب اس مسئلے کا آخری حل یہ ہے کہ آپ ہمارے ایک لاکھ چالیس ہزار لوٹادیں۔"

"آپ کی ادا کردہ رقم میرے نہیں بلکہ شاہ جی کے اکاؤنٹ میں محفوظ ہے۔" کلرک انہیں ہری جھنڈی دکھاتے ہوئے بولا۔ "آپ کو ہر صورت میں شاہ جی کی واپسی کا انتظار کرنا ہوگا البتہ......" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"البتہ...... میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی رقم بالکل محفوظ ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ دونوں گردنیں جھکا کر، ستے ہوئے چہروں اور بوجھل دلوں کے ساتھ آفس سے باہر نکل آئے۔ یہ حقیقت تھی کہ جو صورتِ حال ان کے سامنے آئی تھی اس میں اگر ان کے ایک لاکھ چالیس ہزار ہی واپس مل جاتے تو وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے۔

واپسی کی راہ اختیار کرتے ہوئے ریحانہ نے کہا۔ "نیازی کیوں نہ ہم ایک نظر اپنے فلیٹ کو دیکھتے چلیں......!"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ جھنجلاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ "تم کس فلیٹ کو اپنا کہہ رہی ہو...... وہ جو ہمارا ہونے سے پہلے ہی کسی پولیس والے کا ہو چکا ہے۔"

"اس میں بھی تو تمہارا ہی قصور ہے نا۔" ریحانہ بگڑ کر بولی۔ "اگر تم بروقت قسطیں......!"

"بکواس بند کرو......" وہ یکدم غصے میں آگیا۔ "اس دنیا کے ہر الٹے کام میں تمہیں میرا ہی ہاتھ نظر آتا ہے۔ میں بلڈر کا حرامی پن صاف سمجھ رہا ہوں۔ یہ لوگ کسی بھی حیلے بہانے سے الاٹیز کو ڈی فالٹر کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ ان کی رقم سے یہ پلازا کھڑے کرتے ہیں پھر جب بلڈنگ رہائش کے قابل ہو جاتی ہے تو کسی دوسری پارٹی سے زیادہ رقم لے کر فلیٹ اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اگر شاہ جی کی نیت صاف تھی تو ہمیں اسی وقت ڈی فالٹر کر دینا چاہیے تھا جب میری طرف سے پہلی قسط لیٹ ہوئی تھی۔ یہ بدمعاش بلڈرز پروجیکٹ مکمل ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں کیونکہ تیار فلیٹ کی زیادہ قیمت مل جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے، شاہ جی نے پولیس والے کامران کو دو، ڈھائی لاکھ سے کم میں یہ فلیٹ نہیں بیچا ہوگا۔ جب وہ ہمارے ایک لاکھ چالیس ہزار واپس کرے گا تو کم از کم ایک لاکھ کا پروفٹ پھر بھی اس کی جیب میں چلا جائے گا......" وہ لمحے بھر کو رکا پھر زہریلے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"سچ کہتے ہیں...... پیسا، پیسے کو کھینچتا ہے۔ کاروبار چاہے، بے ایمانی کا ہو یا نیک نیتی کا...... ہر جگہ یہی اصول کارفرما دکھائی دیتا ہے......"

"کچھ بھی ہے۔" ریحانہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "فلیٹ تو ہاتھ سے نکل گیا۔ اب تم گھر جاؤ گے یا آفس؟"

"گھر ہی چلتے ہیں۔" وہ بوجھل آواز میں بولا۔ "آج آفس جانے کو جی نہیں چاہ رہا......"

دو ماہ تک وہ شاہ جی کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ پھر پتا چلا، وہ سعودیہ سے ایران چلے گئے ہیں۔ بہرحال ایران، عراق اور شام وغیرہ سے ہوتے ہوئے جب وہ واپس کراچی پہنچے تو اس دوران میں چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ یہاں آتے ہی ان کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ ہفتے دس دن میں ایک آدھ چکر آفس کا لگ جاتا۔ نیازی نے ہمت اور کوشش کرکے شاہ جی سے ایک آدھ ملاقات بھی کرلی لیکن رقم وصول ہونے کی کوئی سبیل نہ بن سکی۔ شاہ جی یہ تو مانتے تھے کہ وہ نیازی کی رقم ضرور واپس کریں گے مگر کبھی حالات کا رونا اور کبھی طبیعت کا بہانہ کرکے وہ چکنی مچھلی کی طرح نیازی کے ہاتھ سے نکل جاتے تھے۔

جب خالد نیازی کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ شاہ جی کی نیت میں خرابی ہے اور وہ کسی بھی صورت میں اس کی رقم ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تو اس نے اپنا حق وصول کرنے کے لیے قانونی چارہ جوئی کے بارے میں سوچا تھا۔ مجھ سے اس کی ملاقات اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

☆☆☆

پچھلی ملاقات پر وہ فائل میرے حوالے کرتے ہوئے بڑے شاہ جی یعنی قربان شاہ کی چکر بازیوں سے مجھے تفصیلاً آگاہ کرگیا تھا لہٰذا میں نے فیس وصول کرکے یہ کیس اپنے ہاتھ میں کرلیا تھا۔ اب کی بار جو وہ دوبارہ مجھ سے ملنے آیا تو امید بھرے انداز میں پوچھا۔

"بیگ صاحب! آپ نے اس فائل کا مطالعہ

کرلیا ہوگا؟''
''جی ہاں...... بہت اچھی طرح!'' میں نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔
''تو پھر کیا رائے ہے آپ کی۔'' وہ بہ دستور امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو میرے کیس میں کوئی جان نظر آتی ہے؟''
''ایسی ویسی جان......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نیازی صاحب! یہ ایک جاندار اور ایمان دار کیس ہے جس میں مجھے آپ کی کامیابی کے روشن امکانات نظر آرہے ہیں۔ یہ دوسرے کیسوں کی بہ نسبت مختلف نوعیت کا کیس ہے۔''
''گویا میری ڈوبی ہوئی رقم وصول ہوجائے گی؟'' وہ امید بھری، تصدیق طلب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔
''کیوں نہیں۔'' میں نے پُروثوق انداز میں کہا۔ ''لیکن اس کے لیے آپ کو میری ہدایات پر من وعن عمل کرنا ہوگا نیازی صاحب!''
''آپ جو بھی حکم کریں گے، میں اس کی تعمیل کروں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔
میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''نیازی صاحب! شاہ جی جیسے فراڈیا لوگوں کو بڑے طریقے سلیقے سے گھیرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ لوگ چونکہ بہ یک وقت کئی افراد سے فراڈ کررہے ہوتے ہیں اس لیے کورٹ کچہری کا سامنا کرنے یا ان کے معاملات کو اخبارات کی زینت بننے میں انہیں خاصی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ کیس کو کورٹ میں لے جائے بغیر، میں یہاں، اس آفس ہی میں شاہ جی سے بہ آسانی نمٹ لوں گا۔''
''اچھا...... وہ کیسے؟'' وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔
میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''شاہ جی کی فطرت! ایسے لوگ اس اصول کے تحت دھوکا دہی کا کاروبار کرتے ہیں کہ کمزور کو دباؤ اور خاموشی سے ہڑپ کر جاؤ اور اگر کسی زورآور سے پالا پڑجائے تو اس کے سامنے فوراً گھٹنے ٹیک دو۔ اس دنیا میں چونکہ کمزور افراد کی تعداد زیادہ ہے لہٰذا اس قسم کے فراڈیے زیادہ تر فائدے میں اور کبھی کبھار نقصان میں رہتے ہیں۔''
''میں پہلے کمزور تھا۔'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔ ''لیکن اب مجھے آپ جیسے قابل وکیل کا ساتھ اور تعاون حاصل ہے اس لیے میں خود کو کافی طاقتور محسوس کررہا ہوں۔''
''اس لیے آپ کے معاملے میں شاہ جی کے ساتھ بھی کبھار والی صورتِ حال پیش آئے گی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ گھٹنے ٹیک دے گا اور خود نقصان میں رہ کر آپ کی رقم واپس کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔''
''وہ ٹھگ مجھ میرے ایک لاکھ چالیس ہزار روپے بڑے مزے سے ہڑپ کیے بیٹھا ہے۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ ''اسے میری رقم اگلنا ہی ہوگی......''
''نیازی صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہاں میں ایک بات کی تصحیح کرنا ضرور سمجھتا ہوں۔''
''کون سی بات؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔
''جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں یا جہاں تک آپ کے فلیٹ کی فائل نے میری رہنمائی کی ہے اس کے مطابق، آپ نے ''شاہ بلڈرز'' کو مختلف اقساط کی صورت میں لگ بھگ اسّی ہزار روپے ادا کیے ہیں۔ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے ساٹھ ہزار ملانے کے بعد فلیٹ کی کل قیمت ایک لاکھ چالیس ہزار بنتی ہے، چونکہ آپ کو فلیٹ کا قبضہ نہیں ملا لہٰذا ''ایچ بی ایف سی'' کی اقساط بھی شروع نہیں ہوسکیں۔ یہ ساٹھ ہزار تو آپ نے فلیٹ میں رہائش اختیار کرنے کے بعد آسان اقساط کی صورت ادا کرنا تھے...... آپ میری بات سمجھ گئے نا؟''
''جی...... اچھی طرح سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ حکم کریں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟''
آیندہ پندرہ بیس منٹ میں اسے میں نے اچھی طرح سمجھادیا کہ میں اس سے کس نوعیت کا تعاون چاہتا ہوں۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔
''آپ بالکل بے فکر ہوجائیں بیگ صاحب! میں آپ کی مطلوبہ معلومات دوتین دن میں آپ کو فراہم کردوں گا۔''
''دوتین دن نہیں، میں اس کام کے لیے آپ کو پورا ایک ہفتہ دیتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اس دوران میں خود بھی شاہ جی پر تھوڑی ریسرچ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہوگا......''
میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما تو اس نے پوچھ لیا۔ ''جی، کون سی بات بیگ صاحب؟''
''کسی بھی قیمت پر شاہ جی کو یہ بھنک نہیں پڑنا چاہیے کہ آپ نے اپنا کیس کسی وکیل کے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔'' میں نے تھوڑا آگے جھک کر سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اور یہ کہ آپ شاہ جی کے خلاف کسی قسم کی قانونی چارہ

جوئی کا ارادہ رکھتے ہیں۔''
''جی، میں اچھی طرح سمجھ گیا۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی ہدایات کا پوری طرح خیال رکھوں گا۔ میری کارکردگی آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔''
میں نے اسے رخصت کردیا۔
آیندہ چند روز میں، میں نے اپنے تعلقات کے گھوڑے ہر سمت دوڑائے اور ''شاہ بلڈرز'' خصوصاً بڑے شاہ جی قربان علی کے حوالے سے بہت سی سنسنی خیز معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس مہم جوئی میں کئی ایک تہلکہ خیز انکشافات بھی ہوئے جن کا ذکر میں آگے چل کر عدالتی کارروائی کے دوران میں کسی مناسب موقع پر کروں گا، بشرطیکہ ایسا کوئی موقع آیا تو......!
ایک ہفتے کے بعد خالد نیازی میرے دفتر آیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش اس امر کا غماز تھا کہ میں نے اس کے ذمے جو کام لگایا تھا وہ اسے کرنے میں خاطر خواہ کامیاب رہا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔
''نیازی صاحب! کیا رہا؟''
''آپ کے حکم کے مطابق، میں نے وہ ساری معلومات جمع کرلی ہیں جن کی بنا پر شاہ جی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''آپ کی ہدایت کی روشنی میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔''
''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔
ہمارے درمیان تھوڑی دیر تک اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر بات ہوتی رہی پھر میں نے تسلی دینے کے بعد اسے رخصت کردیا۔
دو روز کے بعد ان حاصل شدہ معلومات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ''شاہ بلڈرز'' کے روحِ رواں شاہ جی قربان علی کے نام ایک قانونی نوٹس بہ ذریعہ رجسٹری ڈاک پوسٹ کردیا۔ اس نوٹس کا مضمون انگلش میں کچھ اس طرح تھا۔
''میرے موکل مسمی خالد نیازی ولد افضل نیازی رہائشی گولیمار، مکان نمبر فلاں بٹا فلاں جو کہ آپ کے رہائشی پروجیکٹ ''ڈائمنڈ پلازا'' واقع گارڈن ویسٹ نزد چڑیا گھر کا الاٹی ہے، اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے اپنے مختلف تعمیراتی ہتھکنڈوں کے ذریعے مرحلہ وار فراڈ کرکے اس سے لگ بھگ اسّی ہزار روپے بٹور لیے ہیں لیکن پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد آپ نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ مذکورہ اپارٹمنٹس بلڈنگ ''ڈائمنڈ پلازا'' کا فلیٹ نمبر تھری ناٹ تھری یعنی تین سو تین جس کی بکنگ میرے موکل کے نام سے تھی اور وہی اس فلیٹ کا الاٹی بھی تھا مگر آپ نے مختلف حیلوں بہانوں سے خالد نیازی کو ڈیفالٹر قرار دے کر مذکورہ فلیٹ کسی پولیس والے کے ہاتھ مہنگے داموں فروخت کردیا ہے۔ آپ کا یہ فعل سراسر غیراخلاقی، غیرقانونی اور غیرانسانی ہے۔ میں خالد نیازی کا وکیل مرزا امجد بیگ اس لیگل نوٹس کے ذریعے آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس نوٹس کی ترسیل کے بعد عرصہ دس یوم کے اندر میرے موکل کی رقم مبلغ اسّی ہزار روپے، شرافت کے ساتھ اسے واپس کردیں۔ بہ صورت دیگر آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی......''
اس نوٹس کے اندر بعض خالصتاً قانونی نوعیت کی ٹیکنیکل باتیں بھی شامل تھیں جن کا ذکر آپ کو بور کرنے کے مترادف ہوگا لہٰذا ہم چپکے سے آگے بڑھتے ہیں۔
اس نوٹس کو پوسٹ کیے پانچ یا چھ دن ہوئے تھے کہ ایک باریش شخص میرے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کی عمر پچاس کے آس پاس رہی ہوگی۔ چہرہ سرخ وسپید، ڈاڑھی درمیانے سائز کی اور شب دیجور کی طرح سیاہ۔ ڈاڑھی کے بالوں کا رنگ سر کے بالوں سے مماثلت نہیں رکھتا تھا۔ ڈاڑھی کی ایک دم سیاہ رنگت کو دیکھتے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ اس نے کوئی اعلیٰ درجے کا خضاب (ہیئر ڈائی) استعمال کررکھا تھا۔ لباس سفید اور کلف دار تھا۔ اس کے اوپر سیاہ واسکٹ اور پاؤں میں پشاوری چپل تھی۔ اس کی شخصیت مجموعی طور پر خاصی پُرکشش اور متاثر کن تھی۔ اس نے ہاتھ میں ایک عالی شان، قیمتی بریف کیس بھی اٹھا رکھا تھا۔
میں نے حسبِ معمول پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ گہری سنجیدگی کے ساتھ ایک کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔
''جی فرمایئے...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''
''غالباً......'' وہ سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مرزا امجد بیگ آپ ہی ہیں؟''
''غالباً نہیں......'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''یقیناً میں ہی مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہوں۔''
اس نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے ایک لفافہ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''یہ نوٹس آپ ہی کے دفتر سے ارسال کیا گیا ہے نا؟''
یہ وہی لفافہ تھا جو میں نے چند روز قبل بڑے شاہ جی کے نام پوسٹ کرایا تھا۔ گویا اس وقت قربان شاہ فراڈیا بہ نفس غلیظ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

”جی ہاں...... یہ نوٹس میں نے ہی بھیجا تھا۔“ میں نے بلاتردد کہہ دیا۔

وہ بولا۔ ”میں اس لفافے کی پشت پر درج ایڈریس کی انگلی تھام کر آپ کے آفس تک پہنچا ہوں۔“

”غالباً آپ بڑے شاہ جی ہیں؟“ میں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”قربان علی شاہ...... شاہ بلڈرز والے!“

”میں بھی آپ کی طرح غالباً نہیں، یقیناً ہوں۔“ وہ میری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے بولا۔ ”آپ مجھے قربان شاہ سمجھ سکتے ہیں۔“

”اوکے......“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”شاہ جی! میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟“

”میں اس نوٹس کا مقصد جاننا چاہتا ہوں؟“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ”مقصد اس نوٹس کی تحریر میں واضح اور سادہ الفاظ کی مدد سے اجاگر کیا گیا ہے۔ لگتا ہے، آپ نے اس نوٹس کو توجہ سے نہیں پڑھا۔“

”میں اس نوٹس کے ایک ایک پوائنٹ پر غور کرچکا ہوں۔“ وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ”اور یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ آپ کیا چاہتے ہیں......!“

”جب آپ سب کچھ سمجھ چکے ہیں تو پھر میرے پاس آنے کی زحمت کیوں گوارا کی۔“ میں نے روکھے انداز میں کہا۔ ”بائی داوے...... کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ آپ کی سمجھ میں کیا آرہا ہے؟“

”آپ ایک بلیک میلر وکیل ہیں۔“ وہ میرے طنزیہ انداز پر تلملا کر رہ گیا۔ ”مگر میری ایک بات ذہن نشین کرلیں کہ آپ جو کچھ چاہ رہے ہیں وہ ہو نہیں سکے گا۔“

”مطلب......؟“

”مطلب یہ کہ آپ مجھے اس نوٹس کی بنیاد پر بلیک میل کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”آپ قربان شاہ کو جانتے نہیں ہیں......“

”میں آپ کو جاننے سے کوئی دلچسپی رکھتا ہوں اور نہ ہی آپ پر پی ایچ ڈی کرنے کا میرا کوئی ارادہ ہے۔“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”اور یہ خیال دل سے نکال دیں کہ میں نے آپ کو بلیک میل کرنے کے لیے یہ نوٹس بھیجا ہے۔ اگر آپ نے اس نوٹس کا کوئی معقول تحریری جواب نہ دیا تو پھر ہماری آیندہ ملاقات عدالت کے کمرے میں ہوگی۔“

”آپ بہت جلدی ناراض ہوجاتے ہیں۔“ وہ ایک دم کینچلی بدلتے ہوئے بولا۔ ”ایک وکیل کو اتنا زیادہ جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔“

میں اس کے اچانک بدلتے ہوئے انداز پر حیران رہ گیا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ”آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“

”بیگ صاحب! آپ مجھے اپنا دوست ہی سمجھیں۔“ وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک اچھے دوست کی طرح آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

”میں حادثاتی دوستی کا قائل نہیں ہوں شاہ جی۔“ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”اور جس انداز میں آج ہمارا تعارف ہوا ہے اس کی روشنی میں تو دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تو پھر آپ مجھے اپنا کلائنٹ سمجھ لیں۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

”کلائنٹ...... کس کیس میں؟“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”بھئی اسی کیس میں جس کے لیے آپ نے مجھے یہ لیگل نوٹس بھیجا ہے۔“ وہ میز پر رکھے لفافے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ ”اس کیس میں تو میں خالد نیازی کا وکیل ہوں۔ آپ میرے کلائنٹ کیسے ہوسکتے ہیں؟“

”اس طرح کہ......“ وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”آپ خالد نیازی کی وکالت سے ہاتھ کھینچ لیں۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے۔“ میں نے برہمی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں نے خالد نیازی سے اس کام کی فیس وصول کی ہے۔“

”اس کی فیس آپ واپس کرکے اس کیس سے معذرت کرلیں۔“ وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں آپ کو دوگنا فیس دینے کو تیار ہوں۔“

”یہ کاروباری اخلاقیات کے منافی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ جو چاہ رہے ہیں وہ نہیں ہوسکتا۔“

”میں تو آپ کا بھلا کرنا چاہ رہا تھا۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ کو میرا یہ عمل پسند نہیں آیا تو آپ کی مرضی ہے۔“

”اس خیرخواہی کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں۔“ میں نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ کو کچھ اور نہیں کہنا تو آپ جاسکتے ہیں۔ میرے پاس بہت سے ضروری کام ہیں۔“

میرے آخری الفاظ سے اسے توہین کا احساس ہوا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”لگتا ہے، ہماری ملاقات اب عدالت ہی میں ہوگی۔“

”آپ کو صرف لگتا ہے اور مجھے اس بات کا یقین ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ پاؤں پٹخ کر میرے آفس سے نکل گیا۔

قربان شاہ جیسے لوگ ہر چیز کو خریدنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ ان کی سوچ کے مطابق ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ کوئی زن سے، کوئی زر سے، کوئی زمین سے اور کوئی آنسوؤں سے خریدا جاسکتا ہے۔ جو ان جالوں میں پاؤں نہ رکھے اسے دھونس دھاندلی اور غنڈا گردی سے قابو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر میں نے کبھی قربان شاہ جیسے لوگوں کو اہمیت نہیں دی اور ہمیشہ اپنے کاروباری پیشہ وارانہ اصولوں کی پاس داری کی ہے۔

آیندہ ایک دو روز میں، میں نے قربان شاہ کے خلاف فراڈ اور دھوکا دہی کا ایک مضبوط کیس تیار کیا اور اس معاملے کو عدالت کے حوالے کردیا۔

ابتدائی چند پیشیوں میں عدالت کی رسمی کارروائی ہوئی جس کی ٹیکنیکل تفصیل آپ کو بور کردے گی لہٰذا میں اس قصے کو گول کرکے آگے بڑھتا ہوں۔

☆☆☆

قربان شاہ عرف بڑے شاہ جی اپنی مخصوص متاثر کن شخصیت کے ساتھ اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) میں کھڑا تھا۔ گزشتہ پیشی پر جج نے فرد جرم پڑھ کر سنادی تھی اور میرے موکل خالد نیازی کا تفصیلی بیان بھی ریکارڈ کرلیا گیا تھا جس میں اس نے الف سے یے تک مختصر الفاظ میں بڑے شاہ کے فراڈ کی کہانی عدالت کو سنا ڈالی تھی۔ جواب میں جب عدالت نے قربان شاہ کا موقف سنا تو اس نے وہی رونا رویا تھا جو وہ اس سے پہلے روتا آیا تھا۔ ان باتوں کی تفصیل پچھلے صفحات میں موجود ہے۔ گزشتہ پیشی پر ہمارے کیس کو زیادہ وقت نہیں ملا تھا لہٰذا میں قربان شاہ پر جرح نہیں کرسکا تھا لیکن آج ہمارا کیس پہلا تھا چنانچہ شاہ جی کی کھال کھینچنے کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ وہ خود کو پُراعتماد ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد جرح کے لیے قربان شاہ کے قریب چلا گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''شاہ بلڈرز کے مالک آپ ہی ہیں؟''
وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''جی، اب تو اس کا مالک میں ہی ہوں۔''
''گویا پہلے اس کمپنی کا مالک کوئی اور شخص تھا۔'' میں نے غیر محسوس انداز میں چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے یہ کمپنی اس شخص سے خرید لی ہے۔''
''جی، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پہلے یہ پارٹنرشپ بزنس تھا۔ میرا چھوٹا بھائی اس کاروبار میں میرا پارٹنر تھا۔ اب میں بلاشرکت غیرے اکیلا ہی ''شاہ بلڈر'' کا مالک ہوں اور......'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''اور یہ بات آپ کو بھی معلوم ہے وکیل صاحب!''
''ہمیں، آپ کو اور ہم سب کو بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن عدالت کے علم میں لانے کے لیے، انہیں دہرانا پڑتا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ آپ کی اپنے چھوٹے بھائی سے کاروباری علیحدگی کیسے ہوئی مطلب...... آپ اس بزنس کے اکلوتے مالک کیسے بن گئے؟''
''علیحدگی نہیں ہوئی بلکہ وہ مجھے دھوکا دے کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مصنوعی پن جھلکتا تھا۔ ''اس نامعقول انسان کی وجہ سے میں نے بہت نقصان اٹھایا ہے۔''
میں نے اپنے مخصوص انداز میں اسے گھسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سنا ہے، آپ کا چھوٹا بھائی ایک بھاری رقم بھی ساتھ لے گیا ہے؟''
''جی، آپ نے بالکل درست سنا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس مالی نقصان کی وجہ سے پروجیکٹ کی تکمیل میں بھی تاخیر ہوئی جس کے سبب ''ڈائمنڈ پلازا'' کی تعمیر کے اخراجات کئی گنا بڑھ گئے تھے۔''
''چھوٹے شاہ جی آپ کو کتنے کی ڈز دے گئے ہیں؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔
''پچیس سے تیس لاکھ کی۔'' اس نے جواب دیا۔
''جب کوئی پارٹنرشپ بزنس کیا جاتا ہے تو کمپنی کے نام سے اکاؤنٹ بھی کھولا جاتا ہے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اکاؤنٹ جوائنٹ ہوتا ہے۔ شاہ جی! کیا آپ نے ''شاہ بلڈرز'' کا ایسا کوئی اکاؤنٹ کسی بینک میں کھول رکھا تھا؟''
''ظاہر ہے، یہ تو بہت ضروری تھا۔'' اس نے میرے جال میں قدم رکھ دیا۔
''شاہ بلڈرز کی ساری رقوم یقیناً اسی اکاؤنٹ میں جمع رہتی ہوں گی؟'' میں نے استفسار کیا۔
''جی بالکل۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔
''جوائنٹ اکاؤنٹ کے اصول کے مطابق جب تک تمام فریق کسی چیک پر دستخط نہ کر دیں، بینک اس چیک کو کیش نہیں کر سکتا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''آپ کا چھوٹا بھائی فرقان شاہ آپ کے علم میں لائے بغیر پچیس تیس لاکھ ایسی خطیر رقم کس طرح کمپنی کے اکاؤنٹ سے نکال کر فرار ہو گیا۔ کیا آپ نے اتنی ہیوی اماؤنٹ کے کسی چیک پر دستخط کیے تھے؟''
''نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اس نے میرے اعتماد کا خون کیا ہے۔''
''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔
''چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے میں فرقان شاہ پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بلینک چیکس پر دستخط کر کے چیک بک اس کے حوالے کر رکھی تھی۔ اسے جب، جتنے پیسوں کی ضرورت ہوتی، اپنے دستخط کر کے وہ مطلوبہ رقم بینک سے نکلوا لیا کرتا تھا اور بعد میں مجھے بتا دیا کرتا تھا۔ سال ہا سال سے اسی طرح کام چل رہا تھا۔ کبھی ایک پیسے کی اونچ نیچ نہیں ہوئی مگر کسی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ......'' لحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''کہ انسان کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں فرقان شاہ پر بھروسا کرتا رہا اور وہ مجھے دھوکا دے کر فرار ہو گیا۔''
''شاہ جی! میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔'' میں نے مصنوعی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''پچیس تیس لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ آپ نے چھوٹے شاہ جی کو تلاش کرنے کی کوشش تو کی ہوگی؟''
''میں جہاں جہاں تلاش کر سکتا تھا، میں نے ڈھونڈ لیا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔'' وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے شک ہے کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔''
''کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ ''شاہ بلڈرز'' کا اکاؤنٹ کس بینک کی کس برانچ میں تھا؟'' میں نے اپنے نادیدہ جال کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔
وکیل صفائی شاہ جی کی مدد کو لپکا۔ ''جناب عالی! زیر سماعت کیس کا ''شاہ بلڈرز'' کے بینک اکاؤنٹ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ وکیل استغاثہ ایک غیر متعلق سوال کر رہے ہیں۔''
جج نے نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا اور کہا۔ ''آپ کیا کہتے ہیں بیگ صاحب اس سلسلے میں؟''
''یور آنر! میں وکیل صفائی کی اس بات سے متفق ہوں کہ ''شاہ بلڈرز'' کے اکاؤنٹ کا زیر سماعت کیس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ بلاواسطہ تعلق موجود ہے لہٰذا میرا سوال غیر متعلق نہیں ہو سکتا اور ویسے بھی...... میں نے یہ سوال کسی اور مقصد کی خاطر پوچھا تھا۔''
''کس مقصد کی خاطر؟'' وکیل صفائی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔
''آپ کے موکل کے جھوٹ کو پکڑنے کے لیے!'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔
''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل صفائی تیز آواز میں بولا۔ ''وکیل استغاثہ میرے موکل کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ وہ میرے موکل کو دروغ گو کہہ کر سنگین جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔''
''بیگ صاحب! آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔
''جناب عالی!'' میں نے نہایت ہی مودبانہ انداز میں کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ میں شاہ جی کی دروغ گوئی کے حوالے سے کوئی الزام نہیں لگا رہا۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ یہ جھوٹے، دھوکے باز، عیار اور مکار درجۂ اوّل ہیں۔ اگر یہ میری باتوں کی تردید کرتے ہیں تو خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے انہیں معزز عدالت کے سامنے چند شواہد پیش کرنا ہوں گے۔''
''مثلاً کس قسم کے شواہد؟'' وکیل صفائی نے مجھ سے پوچھا۔
''نمبر ون...... انہیں معزز عدالت کو بتانا ہوگا کہ ''شاہ بلڈرز'' کا اکاؤنٹ کس بینک کی کون سی برانچ میں تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کے ساتھ ہی وہ چیک بک بھی عدالت میں پیش کرنا ہوگی جس کی مدد سے چھوٹا شاہ پچیس تیس لاکھ کا فراڈ کر کے فرار ہو گیا اور مجھے یقین ہے کہ شاہ جی کسی بھی قیمت پر ایسا نہیں کر پائیں گے۔''
''وہ چیک بک تو...... فرقان شاہ اپنے...... ساتھ ہی لے گیا تھا۔'' وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ ''اسے...... عدالت میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔''
''اوکے......!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔
''چیک بک کے سلسلے میں عدالت آپ کو مجبور نہیں کرے گی مگر عدالت یہ ماننے کو تیار نہیں ہوگی کہ چھوٹا شاہ کوئی ''عفریت من الجن'' تھا جو بینک کی اس برانچ کو بھی اپنے ساتھ اٹھا لے گیا جس میں ''شاہ بلڈرز'' کا اکاؤنٹ تھا۔ یہ چونکہ ممکن نہیں ہے لہٰذا بڑے شاہ جی اس بات کے پابند ہیں کہ عدالت کو اس بینک کا نام بتائیں اور آیندہ پیشی پر وہ بیلنس شیٹ بھی اس بینک سے نکلوا کر عدالت میں پیش کریں جس میں اس چیک کا اندراج ہو جس کی مدد سے چھوٹے شاہ نے کمپنی کے اکاؤنٹ سے پچیس تیس لاکھ نکال لیے تھے۔ یہی نہیں......'' میں نے لحاتی توقف کر کے ایک طویل سانس لی پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
''جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ شاہ جی کو اس بات کا بھی پابند کیا جائے کہ آیندہ پیشی پر یہ اس ''پارٹنرشپ بزنس'' کے لیگل ڈاکومینٹس بھی عدالت میں پیش کریں جن کی بنا پر یہ دونوں بھائی اس بزنس میں ایک دوسرے کے پارٹنر تھے۔''
''ہمارا بزنس اعتماد اور بھروسے پر چل رہا تھا۔'' شاہ جی نے سیانا کوا بننے کی کوشش کی۔ ''ہم نے آپس میں ایسا کوئی پارٹنرشپ بزنس سائن نہیں کیا تھا اور نہ ہی ایسے لیگل ڈاکومینٹس تیار کیے تھے۔''
میں میکانکی انداز میں جھکا اور ایک طرف کو گھوم کر شاہ جی کے پاؤں کو دیکھتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''شاہ جی! آپ کے پاؤں کہاں ہیں؟''
''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ برہمی سے پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔ ''میرے پاؤں میرے ساتھ ہیں۔''
وکیل صفائی نے کہا۔ ''یہ کیا مذاق ہے؟''
''جناب عالی!'' میں جج کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہم بچپن سے پڑھتے اور سنتے آئے ہیں کہ ''جھوٹ کے پاؤں کہاں؟'' میں بھی یہی دیکھ رہا تھا کہ شاہ جی کے پاؤں کہاں ہیں۔ انہوں نے تو دروغ گوئی کی انتہا کر دی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی بینک کسی کمپنی کا جوائنٹ اکاؤنٹ آنکھیں بند کر کے کھول دے۔ ایسے اکاؤنٹ کھولنے کے لیے کمپنی کے لیگل ڈاکومینٹس اور پارٹنرشپ بزنس کی دستاویزات اکاؤنٹ کے فارم کے ساتھ منسلک کرنا لازمی ہوتی ہیں اور...... شاہ جی فرما رہے ہیں کہ ان بھائیوں کا بزنس ''اللہ توکل'' چل رہا تھا۔ مذاق کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور وہ بھی معزز عدالت کے سامنے......''
جج نے گھور کر قربان شاہ کی طرف دیکھا اور خفگی آمیز

لہجے میں کہا۔ ”مسٹر شاہ! یہ عدالت آپ کو اس بات کا پابند کرتی ہے کہ آپ آیندہ پیشی پر پارٹنرشپ بزنس کے لیگل ڈاکومینٹس اور بینک کا اس دور کا بینک اسٹیٹ منٹ عدالت میں پیش کریں جب مذکورہ بینک سے پچیس تیس لاکھ ایسی خطیر رقم نکالی گئی تھی۔ جب آپ بینک اسٹیٹ منٹ پیش کردیں گے تو پھر خود ہی یہ بات سامنے آجائے گی کہ ”شاہ بلڈرز“ کا اکاؤنٹ کس بینک کی کون سی برانچ میں تھا۔“

عدالت کے ان احکامات پر شاہ جی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس موقع پر اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ امداد طلب نظر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وکیل صفائی فوراً اس کی دست گیری کو لپکا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”میرے فاضل دوست! آپ اپنے موکل کو بھول کر غیر متعلقہ باتوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں اور آپ کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس وقت عدالت میں کون سے کیس کی سماعت ہو رہی ہے......“

”رئیلی......!“ میں نے اس کی چوٹ کو طنز کی زبان میں جوتے کی نوک پر مارتے ہوئے کہا۔ ”واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مجھے اپنے موکل کے مفادات کی نگرانی کرتے ہوئے اس کے حقوق کی جنگ لڑنا چاہیے......“ پھر میں کٹہرے میں کھڑے بڑے شاہ جی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

”شاہ جی! میرے موکل سے آپ کی کیا دشمنی ہے؟“ میں نے تیکھے انداز میں سوال کیا۔

وہ گڑبڑا گیا اور جلدی سے بولا۔ ”میری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔“

”آپ نے مختلف تعمیراتی ہتھکنڈوں کو آزما کر اس غریب کے مبلغ اسّی ہزار روپے ہڑپ کر لیے ہیں۔“ میں نے تیز آواز میں بولنا شروع کیا۔ ”اسے جو فلیٹ الاٹ کیا گیا تھا وہ دھوکا دہی سے آپ نے کامران نامی کسی پولیس والے کے ہاتھ مہنگے داموں فروخت کردیا۔ میری معلومات کے مطابق مذکورہ فلیٹ آپ نے کامران سے ڈیڑھ لاکھ وصول کرنے کے بعد اس کے نام کیا ہے۔ آپ نے یہ ظلم کیوں کیا...... کیوں؟“

شاہ جی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وکیل صفائی حق نمک ادا کرتے ہوئے بولا۔ ”شاہ جی نے کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ ہر معاہدے کے کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں، ان کی پاس داری لازمی ہوتی ہے۔ شاہ جی نے خلافِ اصول کوئی عمل نہیں کیا۔“

”آپ کن قواعد وضوابط کی بات کررہے ہیں؟“ میں نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔

”جن کی بنا پر آپ کا موکل خالد نیازی اس فلیٹ کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں ڈیفالٹر ہوگیا تھا لہٰذا مذکورہ فلیٹ کسی بھی قیمت پر اسے الاٹ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شاید آپ نے ایگریمنٹ کی پشت پر درج قواعد وضوابط کا مطالعہ نہیں کیا۔“

آخری جملہ اس نے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میں ادا کیا تھا۔ میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ ”جی ہاں، میں نے میگنی فائنگ گلاس کی مدد سے وہ شرائط نامہ بہ غور پڑھا ہے کیونکہ اس گلاس کے بغیر کوئی ”سکس بائی سکس“ نگاہ والا شخص بھی اس مہین تحریر کو نہیں پڑھ سکتا۔“

”تو پھر آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ رقم کی ادائی کے دوران میں آپ کا موکل چار مرتبہ ڈیفالٹر ہوگیا تھا۔“ وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ”دو مرتبہ ماہانہ اقساط کے سلسلے میں، تیسری مرتبہ ششش ماہی قسط کے سلسلے میں اور چوتھی مرتبہ آخری بڑی پے منٹ کے سلسلے میں...... اس صورت حال میں اگر شاہ جی نے آپ کے موکل کا فلیٹ کینسل کرکے کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کردیا ہے تو وہ حق بہ جانب ہیں۔“

”اپنے موکل کی طرح آپ بھی غلط بیانی کے ماہر نظر آتے ہیں میرے فاضل دوست۔“ میں نے ترش لہجے میں کہا۔ ”میرا موکل چار بار نہیں، صرف دو بار ڈیفالٹر ہوا تھا اور آفس کے عملے نے اس پر اسے چھوٹ دے دی تھی۔“

”یہ بات آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ صرف دو بار ڈیفالٹر ہوا تھا؟“ وکیل صفائی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”انہی قواعد وضوابط کو پڑھنے کے بعد جن کو میگنی فائنگ گلاس کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔“ میں نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ”شرط نمبر ایک کے مطابق اگر ماہانہ قسط مسلسل دو ماہ تک ادا نہ کی گئی تو فلیٹ کی بکنگ خود بہ خود کینسل ہوجائے گی۔ میرا موکل صرف دو بار ماہانہ قسط کے سلسلے میں لیٹ ہوا۔ ایک بار دس دن اور دوسری مرتبہ بارہ دن لہٰذا اس شرط کے مطابق وہ ڈیفالٹر نہیں کہلائے گا البتہ ششماہی قسط اور آخری بڑی قسط کے سلسلے میں وہ ڈیفالٹر ہوگیا تھا تاہم اس سلسلے میں جب اس نے متعلقہ عملے سے بات کی تو ان کا کہنا یہ تھا کہ کمپنی نے یہ قواعد وضوابط پھڈے باز قسم کے لوگوں کو قابو کرنے کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ آپ جیسے شریف لوگوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا لہٰذا آپ بالکل بے فکر رہیں۔ یہ فلیٹ آپ ہی کو الاٹ ہوگا۔“

”اوّل تو عملے کا کوئی شخص ایسی احمقانہ بات کر نہیں سکتا۔“ وکیل صفائی نے کہا۔ ”اگر ایسا ہوا بھی تو آپ کا موکل اسے ثابت نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خالد نیازی کمپنی کے قواعد وضوابط کی رو سے ڈیفالٹر ہوچکا تھا لہٰذا شاہ جی نے وہ فلیٹ کینسل کرکے کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اللہ اللہ، خیر سلا!“

”یوں آپ کے کہہ دینے سے ”اللہ اللہ، خیر سلا“ نہیں ہوجاتا میرے فاضل دوست!“ میں نے مستحکم انداز میں کہا۔ ”آپ نے قواعد وضوابط کی روشنی میں جو حقیقت بیان کی ہے، وہ ادھوری ہے۔“

”ادھوری ہے...... کیا مطلب؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”مطلب یہ کہ جن قواعد وضوابط کی بنیاد پر آپ میرے موکل کو ڈیفالٹر قرار دے رہے ہیں انہی میں یہ بھی درج ہے کہ ڈیفالٹر شخص کی ادا کی ہوئی رقم پروجیکٹ کی تکمیل پر اسے واپس کردی جائے گی۔ میرا موکل شاہ جی کے فراڈ کے کڑوے گھونٹ پی کر اس بات کے لیے بھی راضی تھا کہ اب تو پروجیکٹ مکمل ہوچکا۔ اگر شاہ جی اس کے اسّی ہزار ہی واپس کردیں تو وہ خوش ہوجائے گا مگر شاہ جی تو ایک پائی ادا کرنے کو تیار نہیں ہیں......“ میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”جنابِ عالی! میں نے ایک لیگل نوٹس کے ذریعے اس معاملے کو اپنے آفس ہی میں نمٹانے کی کوشش کی تھی مگر شاہ جی اس بات کے لیے راضی نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے مجھے رشوت دینے کی کوشش بھی کی تھی تاکہ میں اس کیس سے الگ ہوجاؤں۔“

”میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔“ شاہ جی احتجاجی لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔“

”یہ الزام اس وقت حقیقت بن جائے گا جب آیندہ پیشی پر میں اس گفتگو کا ثبوت پیش کروں گا جو اس روز ہمارے بیچ ہوئی تھی۔“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ بہت بدمعاش ہیں وکیل صاحب!“ وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اس دن والی باتوں کو ریکارڈ کرلیں گے۔ بہت نیچ حرکت کی ہے آپ نے...... چچ چچ چچ!“

”میں نے کوئی گری ہوئی حرکت کی ہے یا اعلیٰ، اس بات کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کے ردِّعمل نے یہ ثابت کردیا ہے کہ آپ نے اس روز مجھے رشوت کی پیشکش کرکے اس کیس سے الگ رہنے کی درخواست کی تھی۔ اب آیندہ پیشی پر مجھے کوئی ٹھوس ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہی......“

”میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں۔“ وہ تلملا کر بولا۔

”پوائنٹ از ٹو بی نوٹیڈ......!“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”یور آنر! شاہ جی مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔“

جج نے کڑے الفاظ میں قربان شاہ کو سرزنش کی اور وکیل صفائی کو ہدایات دیں کہ وہ آیندہ پیشی پر اپنے موکل کی طرف سے بینک اور بزنس کے حوالے سے وہ تمام دستاویزات عدالت میں پیش کرے جن کا تھوڑی دیر پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

”دی کورٹ از ایڈجارنڈ......!“

☆☆☆

اگلی پیشی پر شاہ جی عدالت میں حاضر ہوا تو کافی ٹوٹا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ گزشتہ پیشی پر میں نے عدالت کی نظر میں اسے جھوٹا ثابت کردیا تھا۔ اگر وہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے وہ تمام دستاویزاتی ثبوت فراہم کردیتا جن کے بارے میں عدالت نے پچھلی پیشی پر اسے ہدایت کی تھی تو شاید کوئی بات بن جاتی مگر چونکہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا لہٰذا آج اس کا چہرہ اترا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ کیسٹ عدالت میں پیش کردیا جس میں، میں نے اپنی اور بڑے شاہ کی گفتگو ریکارڈ کرلی تھی۔ یہ گفتگو اس کے مجرم ہونے کا بین ثبوت تھی۔

اگرچہ ایک لحاظ سے یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی لیکن اخلاقیات کا مظاہرہ صرف وہاں مناسب رہتا ہے جہاں آپ کے سامنے کوئی شریف النفس انسان موجود ہو۔ بڑے شاہ جیسے خبیث لوگوں سے نمٹنے کے لیے اس نوعیت کے ہتھکنڈے آزمانا بالکل جائز ہوتا ہے۔ جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکل رہا ہو تو پھر انگلی کو ٹیڑھا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا۔

پچھلی پیشی پر جج نے وکیل صفائی کو جو ہدایات دی تھیں جب ان کی تعمیل نہیں ہوئی تو جج نے برہمی کا اظہار

کرتے ہوئے بڑے شاہ اور اس کے وکیل کو کھری کھری سنا ڈالیں۔ وکیل صفائی نے وعدہ کیا کہ وہ آیندہ پیشی پر عدالت کے احکامات کی تکمیل کرنے کی کوشش کرے گا۔

''جنابِ عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کراری آواز میں کہا۔ ''مذکورہ دستاویزات اگر بفرضِ محال عدالت میں پیش کردی گئیں تو بھی اس سے شاہ جی کے جرم کی سنگینی کم نہیں ہوگی۔ یہ محض اتنا ثابت کرسکیں گے کہ چھوٹے بھائی کے ساتھ ان کا کوئی پارٹنرشپ بزنس تھا اور وہ بھائی ان کے مطابق، کمپنی کے پچیس، تیس لاکھ لے کر رفوچکر ہوچکا ہے۔ اگرچہ یہ ثابت کرنا بھی ممکن نہیں لیکن اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو یہ میرے موکل کے کسی کام نہیں آئے گا۔ میرے موکل کو اس کا حق ملنا چاہیے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں وکیل صاحب۔'' جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''واضح الفاظ میں وضاحت کریں۔''

''یور آنر!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرے موکل کی فائل سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے ''شاہ بلڈرز'' کو چھوٹی بڑی اقساط کی شکل میں کل اسّی ہزار روپے کی ادائی کی ہے جس کے بدلے اسے ''ڈائمنڈ پلازا'' کا فلیٹ نمبر تین سو تین مل جانا چاہیے تھا مگر اس وقت وہ فلیٹ کامران نامی ایک شخص کی ملکیت ہے کیونکہ شاہ جی کے مطابق میرا موکل ڈی فالٹر ہوگیا تھا لہٰذا اس نے مذکورہ فلیٹ کینسل کرکے کامران کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اگر ان تمام معاملات کو صد فیصد درست بھی مان لیا جائے تو بھی......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تو بھی میرا موکل اپنے اسّی ہزار روپے واپس لینے کا حق رکھتا ہے کیونکہ کسی الاٹی کے ڈیفالٹر ہوجانے کی صورت میں قواعد وضوابط کے مطابق کمپنی اس شخص کی ادا کی ہوئی رقم پروجیکٹ کی تکمیل کے فوراً بعد ادا کرنے کی پابند ہے۔ مذکورہ پروجیکٹ نہ صرف مکمل ہوچکا بلکہ اکثر مالکان اب اس میں رہائش پذیر بھی ہیں۔ معزز عدالت سے میری بس اتنی سی استدعا ہے کہ میرے موکل کو اس کا جائز حق دلایا جائے۔ دیٹس آل یور آنر......''

جج نے میری طرف دیکھ کر گردن کو اثباتی جنبش دی پھر اس فائل کے ورق الٹنے لگا جس کے مطابق میرے موکل خالد نیازی نے ''شاہ بلڈرز'' کو اسّی ہزار روپے ادا کیے تھے۔ فائل کے مطالعے کے بعد اس نے غصیلے انداز میں شاہ جی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''مسٹر شاہ! کیا آپ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ خالد نیازی نے آپ کی کمپنی ''شاہ بلڈرز'' کو ڈائمنڈ پلازا کے فلیٹ نمبر تین سو تین کی بکنگ کے سلسلے میں اسّی ہزار روپے ادا کیے ہیں؟''

''جناب! یہ ڈی فالٹر ہوگیا تھا اور وہ فلیٹ میں نے......!''

''عدالت نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب دیں۔'' بڑے شاہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جج نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا۔ ''خالد نیازی نے آپ کی کمپنی کو اسّی ہزار روپے دیے تھے یا نہیں......؟''

''ججج......جی......دیے تھے......'' اسے اقرار کرتے ہی بنی کیونکہ دور دور تک فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''آپ خالد نیازی کی رقم کب واپس کر رہے ہیں؟'' جج نے ٹھوس لہجے میں استفسار کیا۔

''جناب! ابھی تو میری مالی پوزیشن ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ عذرِ لنگ پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''اور میں بیمار بھی ہوں۔ فرقان شاہ کے فراڈ نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔''

''یور آنر! شاہ جی جھوٹ اور غلط بیانی کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''میں یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ نہ تو ان کی مالی حالت اتنی پتلی ہے کہ یہ اسّی ہزار ادا نہ کرسکیں اور نہ ہی انہیں کوئی بیماری شیماری ہے۔ میری معلومات کے مطابق یہ ہٹے کٹے ہیں اور ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے شاہ جی چار، پانچ ملکوں کا دورہ بھی فرما کر آئے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں شاہ جی......؟''

آخری جملہ میں نے قربان شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ جزبز ہوکر رہ گیا تاہم ہونٹوں سے ایک لفظ ادا نہیں کیا۔

''آپ یہ سب کس طرح ثابت کرسکتے ہیں وکیل صاحب؟'' جج نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! اگر معزز عدالت اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ''شاہ بلڈرز'' اور قربان شاہ کے بینک اکاؤنٹس چیک کروائے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ ان اکاؤنٹس میں لاکھوں روپے موجود ہیں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''باقی شاہ جی کی صحت کا پول میں ابھی کھول دیتا ہوں۔''

بات مکمل کرنے کے بعد میں جج کی اجازت سے

قربان شاہ والے کٹہرے کی جانب بڑھ گیا پھر اس کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

''شاہ جی! کیا یہ درست ہے کہ چند ماہ پہلے آپ حج ادا کرنے سعودی عرب تشریف لے گئے تھے؟''

''جی ہاں، یہ درست ہے!'' اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اور آپ کی واپسی کوئی لگ بھگ چار ماہ بعد ہوئی تھی؟''

''جی، ساڑھے چار ماہ بعد۔'' اس نے جواب دیا۔

''حج کا فریضہ ادا کرنے میں اتنا زیادہ عرصہ نہیں لگتا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اس دوران میں اور کیا کیا کرتے رہے تھے؟''

''میں فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد سعودیہ سے ایران، عراق اور شام چلا گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرنے۔''

''ماشاءاللہ!'' میں نے ستائشی انداز میں کہا مگر اس ستائش کے اندر بڑی چبھن تھی۔ ''یہ تو بڑے اعزاز کی بات ہے لیکن......'' میں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ کر ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے، آپ یہاں بھی غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے، آپ کا؟'' وہ چوکنا انداز میں مجھے تکنے لگا۔

''گھبرائیں نہیں شاہ جی۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب یہ تھا کہ آپ سعودی عرب سے شام، عراق اور پھر ایران گئے ہوں گے...... ہیں نا؟''

''اوہ......!'' اس نے اطمینان کی سانس لی۔ ''ایک ہی بات ہے...... ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''یقیناً یہ سفر آپ نے پاسپورٹ اور ان ممالک کے ویزا کے بغیر تو نہیں کیا ہوگا۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''جی...... جی ہاں......'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''شاہ جی!'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''کیا آپ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے وہ پاسپورٹ عدالت میں پیش کرسکتے ہیں جس پر سعودی عرب، شام، عراق اور ایران کے ویزا لگے ہوئے ہوں؟''

''کردوں گا، اگر ضرورت پیش آئی تو۔'' وہ سرسری انداز میں بولا پھر پریشان نظر سے اپنے وکیل کی جانب دیکھنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وکیل صفائی اس کی مدد کو لپکتا، میں نے جارحانہ لہجے میں کہا۔ ''شاہ جی! آپ ایسا نہیں کرسکیں گے......کبھی نہیں کرسکیں گے کیونکہ......آپ ان ممالک گئے ہی نہیں......آپ نے محض ان معصوم اور مظلوم الاٹیز سے چھپنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا تھا جن کی رقوم ہضم کیے بیٹھے ہیں اور ان میں سے بیشتر کے فلیٹس آپ نے مہنگے داموں دوسری پارٹیوں کو فروخت کردیے ہیں۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے ان کے دماغ میں جھوٹ کی فیکٹری لگی ہوئی ہے......؟''

وہ شکل سے برسوں کا تھکا ہوا دکھائی دینے لگا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی اور تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''اس نام نہاد دورے کے بعد جب آپ واپس اپنے ملک تشریف لائے تو پھر بیمار پڑ گئے تھے تاکہ مزید کچھ عرصے تک لوگوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔'' وہ نیم احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''پاکستان واپسی پر میں شدید بیمار پڑ گیا تھا۔ ایک ہفتے سے زیادہ تو میں ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل رہ کر علاج کراتا رہا ہوں۔''

''اس پرائیویٹ اسپتال کا نام بتائیں جس میں آپ زیرِ علاج رہے تھے۔'' میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''اور یہ بھی بتادیں کہ آپ کو کون سی بیماری لاحق تھی، آپ کون کون سی ادویہ استعمال کرتے رہے ہیں؟''

''میں یہ سب آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔'' وہ روٹھی ہوئی بیوی کے سے انداز میں بولا۔

''مجھے نہ بتائیں، معزز عدالت کو بتادیں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔ ''عدالت خود آپ کے بیان کا آپریشن کرالے گی، پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔''

وہ آئیں، بائیں، شائیں کرنے لگا۔

جج نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں دس منٹ باقی تھے۔ جج نے قربان شاہ کو اس بات کا پابند کیا کہ آیندہ پیشی پر وہ مذکورہ پاسپورٹ کو عدالت میں پیش کرے گا اور اس کے ساتھ ہی اس کی بیماری اور پرائیویٹ اسپتال کا نام بھی پوچھ لیا۔

شاہ جی نے ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' کی سی کیفیت میں، جان چھڑانے کے لیے ایک پرائیویٹ اسپتال کا نام بتادیا۔

”جناب عالی! یہ شخص سکہ بند دروغ گو ہے اور جھوٹ پر جھوٹ بولے جارہا ہے۔“ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے پاس اپنی باتوں کو ثابت کرنے کے لیے ایک بھی ثبوت نہیں ہے اور میں تو اب کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں......“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو شاہ جی بے چینی سے بول اٹھا۔ ”آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ جانا اور بدستور روئے سخن جج کی جانب رکھا۔ جج نے پوچھا۔

”وکیل صاحب! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”جناب عالی! خالد نیازی کی طرح کے تین چار اور بھی متاثرین میرے دفتر کے چکر لگا رہے ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”شاہ بلڈرز نے ان کے ساتھ بھی وہی ”ہاتھ“ کیا ہے جو میرے موکل خالد نیازی کے ساتھ ہوا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ان کے کیس بھی پکڑ لوں۔ اس طرح ان بے چاروں کی ڈوبی ہوئی رقم بھی مل جائے گی۔“

میری بات سن کر شاہ جی کی ٹانگوں سے جان نکل گئی اور وہ کٹہرے کا سہارا لیتے ہوئے نحیف سی آواز میں بولا۔

”پ...... پانی......“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔

☆☆☆

ہمارا کیس بہت واضح تھا۔ میں نے عدالت کی نظر میں شاہ جی کو ہر زاویے سے جھوٹا اور دغاباز ثابت کردیا تھا۔ اس نے اپنی صفائی میں کوئی بھی ثبوت نہ پیش کرکے اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ گزشتہ پیشی پر میں نے جو ”تین چار اور کلائنٹس“ والی بات کی تھی اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا جو خاصا کارگر ثابت ہوا تھا۔ شاہ جی میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

اگلی پیشی سے پہلے وہ مجھ سے ملنے دفتر آیا اور درخواست آمیز لہجے میں بولا۔ ”بیگ صاحب! میں خالد نیازی کے اسی ہزار روپے ادا کرنے کو تیار ہوں۔ آپ اس کیس کو ادھر ہی ختم کردیں۔“

”اب وقت بہت آگے بڑھ چکا ہے شاہ جی۔“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیس عدالت میں ہے، فیصلہ بھی عدالت ہی کرے گی۔ آپ آئندہ پیشی پر میرے موکل کے اسی ہزار روپے لے کر عدالت میں پہنچ جائیں، کیس اسی روز ختم ہوجائے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔“ وہ کمال شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مگر آپ بھی مجھ سے ایک وعدہ کریں......!“

بات کے اختتام پر اس نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

”شاہ جی! میں آپ سے کوئی وعدہ کرنے کا پابند تو نہیں ہوں لیکن پھر بھی آپ بولیں...... کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”آپ وعدہ کریں کہ ”ڈائمنڈ پلازا“ کے سلسلے میں اور کسی کا کیس نہیں لیں گے!“

”اوہ...... تو یہ بات ہے۔“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وعدہ تو نہیں مگر میں آپ کی درخواست پر غور ضرور کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور شکر گزاری کے انداز میں بولا۔ ”اب عدالت ہی میں ملاقات ہوگی۔“

”اور آپ خالی ہاتھ عدالت نہیں آئیں گے۔“ میں نے یاددہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ”اس پیشی پر آپ نے میرے موکل کا حساب صاف کرنا ہے۔“

”جی جی...... بالکل۔“ وہ جلدی سے بولا پھر مجھ سے گرم جوش مصافحہ کرکے رخصت ہوگیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا کہ میں ڈھونڈ ڈھانڈ کر ”ڈائمنڈ پلازا“ کے کیس پکڑنے کی مہم میں لگ جاؤں۔ میں نے اپنی انگلی محض گھی نکالنے کی غرض سے ٹیڑھی کی تھی اور میرا یہ حربہ صد فیصد کامیاب رہا تھا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ اپنی صفائی میں کسی بھی قسم کا ثبوت پیش نہ کرکے شاہ جی نے خود کو ڈیفالٹر ثابت کردیا تھا چنانچہ اسی روز مختلف عدالتی خانہ پُری کے بعد میرے موکل خالد نیازی کو اس کے ڈوبے ہوئے اسی ہزار روپے حاصل ہوگئے۔

اس روز خالد نیازی بہت خوش تھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور ڈھیروں دعائیں دینے کے بعد میرے دفتر سے رخصت ہوگیا۔

کسی نے بالکل ٹھیک کہا ہے...... گردش ایام بڑی ظالم شے ہے۔ یہ بادشاہ کو گداگر اور گداگر کو بادشاہ بنادیتی ہے۔ وقت کے دھارے سے ہمیشہ بچ کر رہنا چاہیے۔ یہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتا۔ جو بھی اس کے سامنے آتا ہے، اسے کاٹ کر رکھ دیتا ہے......

خدا ہم سب کو شاہ جی جیسے فراڈ لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے...... آمین!

(تحریر: حسام بٹ)

فلورا کی پُرسکون اور آراستہ خواب گاہ میں بیٹھے ہوئے دفعتاً فلپ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ نہایت مطمئن اور خوش ہے۔ اس کی عمر چالیس سال سے تجاوز کرچکی تھی، یہ ایک ایسی عمر ہے جو عام طور پر ذمہ داریوں اور...

پریشانیوں کے بوجھ تلے دبی ہوتی ہے، لیکن وہ خود کو ہوا کے مانند آزاد اور بہار کے مانند نوجوان محسوس کررہا تھا۔ سکون کے یہ لمحات انسان کو زندگی بھر یاد رہتے ہیں۔

اس خوشی میں فلورا کے خلوص کا بہت بڑا حصہ تھا۔ وہ

چارہ گر

عبدالقیوم شاد

انسان اکثر بہت چالاک بننے کی خوش فہمی میں مبتلا ہوکر انتہائی احمقانہ قدم اٹھا لیتا ہے مگر... اس کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب اس کی عقلمندی کا جنازہ رسوائی کے کاندھوں پر اٹھتا ہے۔ زیرنظر تحریر میں بھی وہی پتے ہوا دے گئے جن پر اس نے سر رکھا تھا۔ یہ حماقت اس سے کیسے سرزد ہوگئی... اس نے اپنی باقی ماندہ زندگی بس یہی سراغ لگاتے گزار دی۔

ایک بے نیل و مرام کی فریب

نظر کا دلچسپ تماشا

نوجوان حسین اور پُرکشش تھی اس کے باوجود فلپ سے والہانہ محبت کرتی تھی، اس کی موجودگی میں فلپ اپنا گنجا سر، پھولا ہوا پیٹ اور سفید ہوتے ہوئے بالوں کو بھول کر جوانی اور لڑکپن کی ترنگ محسوس کرنے لگتا۔ حالانکہ تینتالیس سال کی عمر میں اس قسم کا خیال بھی معیوب معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً اس کے اندر کوئی ایسی خوبی اور کشش موجود تھی جس نے فلورا جیسی حسین اور نوخیز لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔

اس شام وہ خلافِ معمول کچھ زیادہ ہی آزادی اور خوشی محسوس کررہا تھا، حالانکہ اس سے پہلے بھی وہ فلورا کے ساتھ کئی شامیں گزار چکا تھا۔ جبکہ اس کی بیوی یہ سمجھتی تھی کہ اسے کام کی زیادتی کے باعث دیر تک دفتر میں بیٹھنا پڑتا ہے، یا دفتری کاموں کے لیے شہر سے باہر جانا پڑتا ہے وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے سوچنے لگا کہ آج اس کی خوشی کا اصل سبب کچھ اور ہی ہے۔ دراصل اسے عنقریب اپنی بیوی سے چھٹکارا ملنے والا تھا۔

اس وقت وہ فلورا کے ساتھ سرخ رنگ کے خوبصورت صوفے پر بیٹھا تھا۔ فلورا نے اس کے قریب کھسکتے ہوئے کہا۔ ”کیوں ڈیئر! کیا سوچ رہے ہو؟“

”اوہ کوئی خاص بات نہیں۔“ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ...... کہ آج میں کتنا خوش ہوں۔ یہ سب تمہاری محبت اور خلوص کا نتیجہ ہے۔“

”اچھا؟“ فلورا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”سچ بتاؤ ڈارلنگ کیا تم مجھ سے واقعی خوش ہو؟“

”کیوں نہیں، کیوں۔“ فلپ نے اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں دیکھ کر میرا دل فضاؤں میں پرواز کرنے لگتا ہے۔“

”شکریہ میری جان۔“ فلورا نے کہا۔ ”تمہیں خوش رکھنا ہی میری زندگی کا مقصد ہے۔“

فلپ نے اس کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اس کے علاوہ کوئی مقصد نہیں؟“

اس کے علاوہ میں تم سے محبت کرتی ہوں ڈیئر۔“ فلورا نے کہا۔ ”اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تمہاری محبت ہی میری سب سے بڑی خوشی ہے۔“

فلپ کے ذہن میں اپنی بیوی کا خیال آگیا۔ جس کی خوشی اور محبت قیمتی زیورات اور دولت سے وابستہ تھی۔

”تمہاری یہی بات مجھے پسند ہے اور میں خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں۔“

اس وقت فلپ کے دل میں خوشی اور محبت کے بے پناہ جذبات موجیں مار رہے تھے۔ فلورا کی والہانہ محبت نے اسے دنیا کی ہر شے سے غافل کردیا تھا۔ البتہ ذہن کے کسی تاریک سے گوشے میں اپنی بیوی کا خیال موجود تھا جس سے وہ عنقریب نجات حاصل کرنے والا تھا۔

فلپ نے بے شمار جاسوسی کہانیاں پڑھی تھیں اور اپنی بیوی کو قتل کرنے کے لیے کئی منصوبے بنائے تھے۔ لیکن وہ ان سے مطمئن نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بیوی کے قتل کا پہلا شبہ شوہر پر کیا جاتا تھا اور اس شبے کی موجودگی میں موجودہ زمانے کی پولیس کے لیے ثبوت فراہم کرنا مشکل کام نہیں، ہرچند وہ اپنی بیوی کو کسی استعمال شدہ پرانے کوٹ کے مانند اتار پھینکنا چاہتا تھا، تاہم وہ تختۂ دار پر یا برقی کرسی پر بیٹھنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔

اسے ایک حیرت انگیز اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس ذہنی کشمکش کے دوران اس کی ملاقات فلورا سے ہوئی جس کی پُرخلوص محبت نے اس کی نصف سے زیادہ پریشانیاں کم کردیں۔ کچھ روز بعد شوستار نامی ایک شخص اسے ملا جس نے اس کے تمام مسائل کا آسان حل پیش کردیا۔

ایک روز وہ اسینک بار میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ یہ بار اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ وہ تنہا وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک فلورا اندر داخل ہوئی اور شراب کا آرڈر دینے کے بعد اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ چند لمحوں کے بعد دونوں کے درمیان کسی باہمی دلچسپی کے موضوع پر گفتگو چھڑ گئی۔ بات بہ ظاہر بڑی سیدھی سادی تھی لیکن اس سے مزید ملاقاتوں کا راستہ کھل گیا، پھر ایک روز فلورا نے اسے اپنے اپارٹمنٹ میں مدعو کیا اور یہ دن ان کی محبت کا پہلا دن ثابت ہوا۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنی زندگی کے تمام رازہائے نہاں فلورا کے سامنے کھول کر رکھ دیے، بچپن سے لے کر شادی تک کی تمام باتیں اس کے سامنے بیان کردیں۔ اور یہ بھی بتادیا کہ وہ اپنی بیوی سے سخت بیزار ہے اور ہر وقت اس سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔

فطری طور پر فلورا نے اسے طلاق کا مشورہ دیا۔ تاہم طلاق دینا تقریباً ناممکن تھا۔ اس کی بیوی ہرگز طلاق لینے پر آمادہ نہیں ہوگی اس میں کئی قانونی پیچیدگیاں تھیں۔ علاوہ ازیں کوئی عورت اتنی آسانی کے ساتھ سونے کی کان سے دستبردار نہیں ہوتی۔

وہ خاصی بڑی دولت کا مالک تھا۔ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو کئی پشتوں سے دولت مند چلا آرہا تھا۔ اس کی بیوی نے شاید دولت ہی کی خاطر اس کے

ساتھ شادی کی تھی۔ بہرکیف طلاق دینا ناممکن تھا۔ آخری حل یہی تھا کہ وہ اپنی بیوی کو قتل کردے، تاہم اس نے کبھی فلورا کے سامنے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔

فلورا نے بھی اس قسم کے سنگین معاملات میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ وہ نہایت سادہ طبع اور نرم مزاج لڑکی تھی۔ اپنے ذاتی اپارٹمنٹ میں رہتی تھی اور اپنی محنت پر گزارہ کرتی تھی۔ اس نے کبھی فلپ کے پیش کردہ تحائف قبول نہیں کیے اور اکثر یہ کہا کرتی تھی۔ ”ڈارلنگ میری زندگی اب تمہاری ہوچکی ہے۔ مجھے تمہاری محبت کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں تحائف لے کر اپنی محبت کو فروخت نہیں کرنا چاہتی۔“

اگلی صبح فلپ اپنے دفتر میں بیٹھا کام کررہا تھا کہ اس کی سیکریٹری نے بتایا کہ ایک اجنبی شخص اسے ملنا چاہتا تھا۔ سیکریٹری نے مزید کہا۔ ”اس شخص نے اپنا نام نہیں بتایا۔ صرف اتنا کہا ہے کہ ملاقات کا تعلق مس فلورا آرنلڈ سے ہے۔“

فلورا کا نام سنتے ہی فلپ کا رنگ سفید پڑ گیا۔ کیونکہ فلورا سے اس کے تعلقات کی بابت کوئی شخص نہیں جانتا تھا۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”اس شخص کو اندر بھیج دو۔“

مذکورہ شخص نہایت اطمینان کے ساتھ خراماں خراماں اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی پائی جاتی تھی۔ اس نے تنقیدی نظروں سے پہلے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ فلپ کی طرف دیکھا اور سر کو ہولے سے جنبش دیتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ فلپ کی سیکریٹری جو دروازے تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔ ایک ثانیے کے لیے دروازے کے درمیان کھڑی ہونے کے بعد دروازہ بند کرکے واپس چلی گئی۔

”مسٹر فلپ۔“ نووارد نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ کو اپنے دفتر میں ہر طرح کی تنہائی اور رازداری میسر ہے؟“

”کیا میں تمہارے سوال کا مقصد پوچھ سکتا ہوں؟“ فلپ نے حیرت اور غصے سے پوچھا۔

”مقصد کی طرف آنے سے قبل میں اس بات کا اطمینان ...کرلینا چاہتا ہوں کہ کوئی تیسرا شخص ہماری گفتگو تو نہیں سن رہا! یہ احتیاط تمہارے ہی مفاد میں ہے۔“

”تم اطمینان کے ساتھ بات کرسکتے ہو۔“ فلپ نے میز کے پہلو میں لگا ہوا ایک سوئچ دباتے ہوئے کہا۔ ”میری سیکریٹری نے کہا تھا کہ تم فلورا آرنلڈ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔“

”یقیناً۔“ نووارد نے سر کو نصف انچ کے قریب خم کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے...... جیب سے طلائی سگریٹ کیس نکالا۔ سگریٹ سلگانے کے بعد سگریٹ کیس واپس جیب میں رکھا اور ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ”اس جسارت پر معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل تمہارے دفتر میں باریابی پانے اور اپنی آمد کے مقصد کو خفیہ رکھنے کے لیے مجھے اس نام کا سہارا لینا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ پہلے میں اپنا تعارف کرادوں۔ مجھے شوستار کہتے ہیں۔“

”مس فلورا نام...... میرا مطلب ہے، کہ مس آرنلڈ کا نام“ ...... دفعتاً وہ رک گیا اور گہری نظروں سے اجنبی کو گھورنے لگا۔

”تم نے کہا کہ تم اپنی آمد کے مقصد کو خفیہ رکھنا چاہتے ہو...... اوہ میں سمجھ گیا۔ تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو...... یا جو کچھ بھی تمہارا نام ہے تم نے غلط دروازے پر دستک دی ہے۔ بلیک میلروں کی سرپرستی میرے اصول کے خلاف ہے۔“

”شوستار......“ شوستار نے اپنے نام کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بلیک میل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے برعکس میں تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں خوب سمجھتا ہوں۔“ فلپ نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”غالباً تم فلورا کے بارے میں کچھ باتیں جانتے ہو اور شاید تمہارا خیال ہے کہ میں اس معاملے کو خفیہ رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں ان لوگوں میں سے نہیں جو خواہ مخواہ خوفزدہ ہوجاتے ہیں۔ اب بولو تم کیا چاہتے ہو؟“

”فلورا کا نام تمہارے دماغ پر کچھ زیادہ ہی چھایا ہوا ہے۔“ شوستار نے اطمینان کے ساتھ کہا۔ ”بندہ پرور، یہ نام میں نے محض تمہارے دفتر میں داخل ہونے کے لیے استعمال کیا تھا بہ صورت دیگر میں خاتون کو نہیں جانتا۔ نہ تو کبھی اس سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے اور نہ ہی اس سے ملنے کی کوئی خواہش رکھتا ہوں۔ میری آمد کا مقصد دراصل تمہاری مدد اور خدمت کرنا ہے۔“

فلپ کا دماغ چکرا گیا۔ اس شخص کا پُرسکون اور پُراعتماد لب و لہجہ اس کے اعصاب پر مسلط ہوتا جارہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرلیں اور کرسی پر ٹیک لگا کر سوچنے لگا پھر اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

”اگر تم مس فلورا کو جانتے نہیں تو تمہیں اس کا نام کس طرح معلوم ہوا؟“

”کیونکہ۔“ شوستار نے معنی خیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں جانتا ہوں۔" پھر اس نے فلپ کی میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "تاہم میں تمہیں ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ تمہارے ساتھ میری واقفیت محض کاروباری نوعیت کی ہے۔ میں بعض خانگی مشکلات میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے ایک آنکھ دبائی۔ "تمہاری بیوی کے معاملے میں! میں ایک بہترین حل لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"میری بیوی کا معاملہ قطعی طور پر نجی نوعیت کا ہے۔" فلپ نے سختی سے کہا۔

"اسی طرح مس فلورا کا معاملہ بھی...... تمہیں کسی کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔"

"شاید میں اپنا مقصد واضح نہیں کرسکا۔" شوسٹار نے کہا۔ "ہماری تنظیم کا مقصد ہی لوگوں کے خانگی مسائل حل کرنا ہے۔ اس سے قبل بے شمار افراد ہماری خدمت سے فیضیاب ہوچکے ہیں۔ اب سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔ تمہارے پاس آنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ میں تمہارے مسئلے کا بہترین حل لے کر آیا ہوں۔"

فلپ کو اس کی باتوں میں تھوڑی دلچسپی پیدا ہوچکی تھی۔ "میرے خیال میں میرے مسئلے کا کوئی حل نہیں۔" فلپ نے ہولے سے کہا۔

"بالکل ہے۔" شوسٹار نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "ہم کسی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے جس میں ناکامی کا امکان ہو۔"

فلپ آنکھیں جھپکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک طویل وقفے تک خاموشی چھائی رہی۔ شوسٹار نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے مزید کہا۔

"مسٹر فلپ، تم اکثر جاسوسی کہانیاں پڑھتے رہتے ہو؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں تمہاری بیوی کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔" شوسٹار نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "اسی طرح مس فلورا آرنلڈ کے بارے میں بھی۔ یہ ہمارے شعبۂ معلومات کا کمال ہے، ہماری تنظیم بجا طور پر اس شعبے پر فخر کرتی ہے۔"

"تنظیم۔" فلپ نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

شوسٹار نے فخریہ انداز میں سر کو تھوڑا سا خم کیا پھر اس نے نہایت احتیاط سے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"تم نے جاسوسی کہانیوں میں خفیہ تنظیموں کا ذکر اکثر پڑھا ہوگا۔ ایسی تنظیمیں جو معقول معاوضہ لے کر مخصوص افراد کو دنیا سے غائب کردیتے ہیں۔"

"قتل اینڈ کمپنی لمیٹڈ؟" فلپ نے کہا۔

"بہت بے ڈھنگی تشبیہ ہے۔" شوسٹار نے بھویں سکیڑ کر کہا۔ "یہ تشبیہ کسی بوچڑ خانے پر تو پوری اتر سکتی ہے، لیکن ہماری تنظیم پر نہیں۔ ہم نہایت جدید اصولوں کے مطابق کام کرتے ہیں۔ سیدھے سادے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہم کسی بھی شخص کو صفحۂ ہستی سے غائب کردینے کی اہلیت رکھتے ہیں، طریقہ کار ایسا لاجواب ہے کہ دنیا کی کوئی پولیس سراغ نہیں لگاسکتی۔ بس آدمی غائب ہوجاتا ہے۔"

"ناقابلِ یقین......؟" فلپ نے کہا۔

"کیا تم نے اخبارات میں ایسی خبریں نہیں پڑھیں؟" شوسٹار نے کہا۔ "دراصل میں نے ایک حیرت انگیز بات کو سیدھے سادے الفاظ میں پیش کردیا ہے۔ اس لیے تمہیں تعجب ہوا ہے۔"

"لیکن"

"مجھے معلوم ہے۔" شوسٹار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "درحقیقت تم اتنا بڑا فیصلہ کرنے میں متامل ہو۔ اگر اجازت ہو تو مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرسکتے ہو، ہمارا دفتر صبح ساڑھے نو بجے سے پانچ بجے تک کھلا رہتا ہے۔"

اس نے جیب سے ایک پرس نکالا اور اس میں سے چھوٹا سا سفید تعارفی کارڈ نکال کر فلپ کے سامنے رکھ دیا۔ پھر وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

"ایک منٹ۔" فلپ نے جلدی سے کہا۔ شوسٹار رک گیا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ...... کہ تم معاوضہ لے کر میری بیوی کو قتل کرسکتے ہو؟"

"میں؟" شوسٹار نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں غلطی ہوئی، مسٹر فلپ! میں صرف سیلز مین ہوں۔ اس ترقی یافتہ دور میں ہر کام ماہرین کے سپرد کرنا زیادہ بہتر ثابت ہوتا ہے۔ میں صرف سیل کے کام میں ماہر ہوں۔"

"اگر میری بیوی قتل ہوگئی تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ پولیس سب سے پہلے مجھ پر شک کرے گی۔" فلپ نے کہا۔ "اور اس طرح تمام راز کھل جائیں گے اور انہیں معلوم ہوجائے گا کہ میں نے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں اور پھر۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔" شوسٹار نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "انہیں کبھی اس بات کا پتا نہیں چلے گا کہ...... تمہاری بیوی کو قتل کیا گیا ہے۔ ہمارا طریقہ کار نہایت اطمینان بخش ہے۔"

"لیکن......"

"سردست اتنا ہی کافی ہے۔" شوسٹار نے ملائمت سے کہا۔ "جب تم ہماری خدمات سے فائدہ اٹھانے کا پختہ ارادہ کرلو تو ہمارے دفتر میں آجانا یا فون کردینا تاکہ معاملے کے تمام پہلوؤں پر بات کی جاسکے۔"

شوسٹار دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ فلپ چند لمحوں تک بند دروازے کو گھورتا رہا۔ "ناقابلِ یقین، اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

کئی روز تک وہ تذبذب میں مبتلا رہا۔ شوسٹار کی پیشکش بہ ظاہر بڑی پُرکشش تھی۔ تھوڑے سے پیسے خرچ کرکے وہ اپنی جھگڑالو بیوی سے چھٹکارا پاسکتا تھا، ناولوں اور کہانیوں میں تو اس نے ایسی بے شمار تنظیموں کے بارے میں پڑھا تھا لیکن اس وہم میں بھی نہیں تھا کہ عملی زندگی میں بھی ایسا ہوسکتا ہے۔ مسٹر شوسٹار کا پُراعتماد لہجہ خاصا اُمید افزا تھا۔

اُس نے نہایت محتاط انداز میں فلورا سے اس معاملے...... کا ذکر کیا۔ اصل صورت حال کو پس پردہ رکھتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ معاملہ اس کے کسی دوست سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اس بات پر خاصا مسرور تھا کہ فلورا اصلیت سے قطعی طور پر بے خبر ہے اور ہرگز یہ نہیں جانتی کہ وہ براہ راست اس معاملے سے تعلق رکھتی ہے، فلورا کا مشورہ بہت سیدھا سادا تھا۔

"میرے خیال میں تمہارے دوست کا تنظیم سے رابطہ قائم کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔ اگر وہ تنظیم واقعی اس کا مسئلہ حل کرسکتی ہے تو اسے ان کی خدمت حاصل کرلینی چاہیے۔ بشرطیکہ وہ ان کا معاوضہ ادا کرسکتا ہو۔"

ذاتی طور پر فلپ کا بھی یہی خیال تھا، خاصی سوچ بچار کے بعد اس نے شوسٹار کو فون کیا اور ملاقات کے لیے وقت طے کرلیا۔

ان کا دفتر ایک پرانی وضع کی عمارت کے دسویں فلور پر واقع تھا۔ کمرا نمبر 1012 کے دروازے پر پہنچ کر فلپ نے ایک بار پھر تعارفی کارڈ پر نمبر دیکھا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ کمرا تقریباً خالی تھا۔ وسط میں ایک بڑی سی میز پڑی تھی جس کے پیچھے مسٹر شوسٹار بیٹھا تھا۔

”ہمارا تعلقات عامہ کا دفتر وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتا رہتا ہے۔“ شوستار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے ہم کسی قسم کی رہائش کا اہتمام نہیں کرتے، البتہ ہمارے پرنسپل آفس میں ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں۔ تاہم واضح وجوہات کی بنا پر ہم اپنے موکل کو پرنسپل آفس کے بارے میں بتانا مناسب نہیں سمجھتے۔“

فلپ خاموشی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”ویسے بھی ہم دوسروں کی توجہ کا مرکز بننا پسند نہیں کرتے۔“ شوستار نے مزید کہا۔ ”ہمارے کام کی نوعیت ہی کچھ اس قسم کی ہے۔“

”ظاہر ہے۔“ فلپ نے بے خیالی میں کہا۔ پھر اس نے دل میں کہا۔ میں اس قسم کی پیش بندیوں کے بارے میں شاید اس سے زیادہ معلومات رکھتا ہوں۔ نامعلوم یہ شخص مجھے کیا سمجھ رہا ہے۔ ”میں تمہارے طریقہ کار کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”معذرت چاہتا ہوں ......“ شوستار نے کہا۔ ”میں تمہیں طریقہ کار کی باریکیاں بتانے سے قاصر ہوں۔ یہ بات ہمارے کاروباری اصول کے خلاف ہے۔ ہم اپنے راز نہیں بتایا کرتے۔ امید ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔“

”میں ایک انجانی بات پر کس طرح بھروسا کر سکتا ہوں۔“

”تم پورے اعتماد کے ساتھ ہمارے اوپر بھروسا کر سکتے ہو۔“ شوستار نے کہا۔ ”اگر تمہیں کسی قسم کی زحمت اٹھانی پڑی تو سب سے پہلے ہماری تنظیم بے نقاب ہو جائے گی۔ تمہارے مفاد کے علاوہ ہمارا مفاد بھی اسی بات میں ہے کہ کام پورے اطمینان بخش طریقے پر انجام پائے۔ ہمارے ماہرین منصوبہ بناتے وقت ہر پہلو پر غور کر لیتے ہیں۔ بہرحال تم بالکل فکر نہ کرو۔“

”ٹھیک ہے۔“ فلپ نے کہا۔ ”کیا تم اپنی گذشتہ کارکردگی کا کوئی حوالہ دے سکتے ہو؟“

”یہ بہت اچھا سوال کیا۔ میں خود بھی یہ بات کہنے والا تھا۔“ شوستار نے کہا۔ ”مسز ولسن کو جانتے ہو۔ مسٹر ایڈورڈ ولسن کی بیوی......“

”تمہارا مطلب ہے کہ!“ شوستار نے معنی خیز انداز میں سر کو جنبش دی۔ ”لیکن اس کی موت تو بالکل طبعی طور پر واقع ہوئی تھی۔ ہارٹ اٹیک کی وجہ سے!“

شوستار نے سر کو قدرے خم کرتے ہوئے کہا۔ ”یوں کہہ سکتے ہیں کہ کارونر کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت ہارٹ اٹیک سے ہوئی تھی، تاہم اسے اوپر پہنچانے کا سہرا ہمارے ماہرین کے سر ہے۔ اب تمہیں یقین آ گیا ہو گا کہ ہمارا طریقہ کار لاجواب اور شک و شبہ سے بالا ہے۔“

فلپ نے ایک لمبا سانس لیا اور چند لمحوں تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔

”پچھلی مرتبہ تم نے معاوضے کا ذکر کیا تھا۔“ بالآخر اس نے کہا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارا معاوضہ کس قدر ہو گا؟“

شوستار بھویں سکیڑ کر میز کو گھورنے لگا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر کہا۔

”معاوضہ ہر کیس میں مختلف ہوتا ہے۔ تمہارے معاملے میں دس ہزار ڈالرز مناسب رہیں گے۔“

”دس ہزار ڈالرز......؟“ فلپ نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”ناممکن! انتہائی نامعقول! میں عملی طور پر اتنی بڑی رقم دینے کے قابل نہیں ہوں۔“

”یہ ہمارے شعبۂ معلومات کا دوسرا کمال ہے۔“ شوستار نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

”ہمارے پاس تمہارے سرمائے کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔ ہمیں بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ فی الوقت تمہارے اکاؤنٹ میں کتنی رقم موجود ہے اور تم کتنا معاوضہ ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہو، تمہارے لیے دس ہزار ڈالرز نہایت ہی معقول معاوضہ ہے۔“

فلپ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا۔

”اچھی بات ہے۔“ آخرکار اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ”لیکن میں یہ رقم پیشگی نہیں دوں گا۔“

”بجا ارشاد......“ شوستار نے کہا۔ ”تنظیم کے ضوابط کے مطابق تمہیں پانچ ہزار ڈالرز پیشگی اور پانچ ہزار تسلی بخش تکمیل پر ادا کرنے ہوں گے۔“

”یہ بہت زیادہ ہے۔“ فلپ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے افسوس ہے۔“ شوستار نے کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”اس معاملے میں، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ذرا خیال رہے جاتے وقت دروازہ زور سے بند نہیں کرنا۔“

”لیکن......“

”معذرت چاہتا ہوں، ہم سودے بازی نہیں کرتے۔“ شوستار نے سرد لہجے میں کہا۔

چند لمحوں تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر فلپ نے کہا۔ ”کیا آپ لوگ چیک بھی لے لیتے ہیں؟“

”صرف نقد!“ شوستار نے کہا۔ ”وجوہات بالکل واضح ہیں۔“

قدرے تامل کے بعد فلپ نے پانچ پانچ سو ڈالرز کے دس نوٹ جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیے اور شوستار نے نہایت بے نیازی کے ساتھ انہیں اٹھا کر دراز میں ڈال دیا۔ اس کا لہجہ ایک بار پھر دوستانہ ہو گیا۔

”ہفتے کی شام جب تم گھر پہنچو گے تو تمہاری بیوی غائب ہو چکی ہو گی۔“

شوستار کے دفتر سے نکلنے کے بعد فلپ عجیب سی خوشی محسوس کرنے لگا۔ اس نے سوچا، اب وہ فلورا کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لے گا۔ ہفتے کی شام کو اس نے چند دوستوں کے ساتھ ایک بار میں شراب پی۔ وہاں سے نکلنے کے بعد دانستہ اپنی گاڑی غلط جگہ پر کھڑی کر دی اور حسبِ توقع اس کا چالان ہو گیا۔ پھر اس نے کچھ خریداری کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر سیدھے فلورا کے پاس پہنچ گیا۔ اسے امید تھی کہ اب تک اس کی بیوی ٹھکانے لگ چکی ہو گی۔ حسبِ معمول اسے دیکھ کر فلورا کے چہرے پر ایک دم رونق آ گئی۔ اس نے فلپ کی بانہوں میں جھولتے ہوئے کہا۔

”اوہ ڈیئر میں ابھی ابھی تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تمہیں دیکھ کر میرا دل خوشی سے جھومنے لگتا ہے...... لیکن جب تم نہ ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے چاروں طرف تاریکی چھا گئی ہے۔“

”جانِ من اب تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“ فلپ نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”چند دنوں کے بعد ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔“

فلورا حیرت اور معصومیت کے ساتھ اس کا منہ تکنے لگی۔

”آج مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔“ اس نے مزید کہا۔ ”اس لیے اجازت چاہتا ہوں، کل پھر ملاقات ہو گی۔“

راستے بھر اس کا ذہن عجیب و غریب خیالات میں الجھا رہا۔ نامعلوم اس کی بیوی کی موت کس انداز میں ہوئی ہو گی۔ بہرحال یہ بہت ضروری بات تھی کہ اسے سخت حیرت اور افسوس کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ کسی کو ذرا سا بھی شبہ نہ ہو۔ اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں وہ بڑی عمدہ الیہ اداکاری کر سکتا ہے۔

چند منٹوں بعد وہ ہاتھوں میں خریداری کا سامان اٹھائے مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے ہولے ہولے سیٹی بجاتے ہوئے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ پتا نہیں محترمہ کہاں پڑی ہو گی؟ ہو سکتا ہے خواب گاہ میں ہو یا ڈرائنگ روم کے اندر کسی صوفے پر اوندھے منہ پڑی ہو۔ اس نے دروازے کو حسبِ معمول پرشور آواز کے ساتھ بند کر دیا اور بتی جلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”فلپ!“ دفعتاً اس کے کانوں میں اپنی بیوی کی واضح آواز آئی۔ وہ اس غیر متوقع صورتِ حال سے بری طرح چونک گیا۔ تاہم اس نے جلد ہی اپنی حیرت پر قابو پا لیا اور بتی جلا کر اپنی بیوی کو گھورنے لگا۔ وہ ہمیشہ کی طرح تندرست و توانا اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اسے قتل کرنا بہت دور کی بات کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

پین امریکن کا ٹرائی جیٹ ہوائی جہاز تیز رفتاری کے ساتھ نیویارک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شوستار نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے فلورا کی طرف دیکھا جو برابر والی سیٹ پر اطمینان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اب تک فلپ گھر پہنچ چکا ہو گا۔“ شوستار نے کہا۔ ”اور پوری صورتِ حال سے آگاہ ہو چکا ہو گا۔“

”مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ پولیس کے پاس رپورٹ نہ درج کرا دے!“ فلورا نے کہا۔

”کس بات کی رپورٹ؟“ شوستار نے مطالبہ کیا۔

”اس بات کی رپورٹ کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کرانے کے لیے ایک شخص کو پانچ ہزار ڈالرز دیے تھے اور وہ قتل کیے بغیر بھاگ گیا۔“

”ناممکن! رپورٹ درج کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ ویسے اگر اس کی بیوی کسی اتفاقی حادثے میں ہلاک ہو جاتی تو ہم مزید پانچ ہزار ڈالرز کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو قناعت پسندی سے کام لینا چاہیے۔ زیادہ لالچ اچھا نہیں۔ بہرحال اب تو ہمارا آفس بھی بند ہو چکا ہے۔ خوامخواہ کے اخراجات کا بوجھ پڑ رہا تھا۔ مجھے تو ایک مہینے کا کرایہ بھی خاصا کھل رہا تھا۔ اب وہ کبھی ہماری شکل نہیں دیکھ سکے گا۔“

”تم واقعی لاجواب انسان ہو۔“ فلورا نے کہا۔

”اصل کام تو تم نے کیا۔“ شوستار نے کہا۔ ”تمام ضروری معلومات مہیا کیں۔ آہ بے چارا فلپ، مجھے اُمید ہے کہ وہ اب بھی تمہاری یاد میں آہیں بھر رہا ہو گا۔“

محفلِ شعر و سخن

* محمد صفدر معاویہ...... خانیوال
ہزار جام لطف ہزار مے خانے
نگاہِ یار کی لذت شراب کیا جانے

* زاہد چودھری...... چھور کینٹ
بے کار خیالوں سے لپٹ کر نہیں دیکھا
جو کچھ بھی ہوا ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا
اس ڈر سے کہ نہ کٹ جائیں بینائی کے ریشے
آنکھوں نے تیری راہ سے ہٹ کر نہیں دیکھا

* عادل خان خٹک...... چارسدہ
خوشی میں بھی نکل آتے ہیں آنسو
ہر ایک آنسو ثبوتِ غم نہیں ہوتا

* حماد اینڈ اعجاز ملک...... سینٹرل جیل ساہیوال
زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

* آبشار احمد...... سرگودھا
اِک رونے سے تو مل جائے تو خدا کی قسم
اس دھرتی پہ ساون کی برسات لگا دوں

* اعجاز احمد راحیل...... ساہیوال
بھول جاتے بناوٹی چہرے
تم نے وہ سادگی نہیں دیکھی!
وہ اُجالا تھا میرے آنگن میں
رات بھر تیرگی نہیں دیکھی

* عائشہ اقبال...... کراچی
وہ کیسے لوگ تھے جنہوں نے پالیا تجھ کو یارب
ہمیں تو ہو گیا اِک شخص کا ملنا مشکل

* افتخار احمد تارڑ...... کوٹ قادر بخش
مل بھی جاتے ہیں تو کترا کے گزر جاتے ہیں
ہائے دوست موسم کی طرح بدل جاتے ہیں
وہ اپنی جفاؤں پہ کبھی شرمندہ نہ ہوا
ہم سمجھتے رہے کہ پتھر بھی پگھل جاتے ہیں

* افتخار کمہار...... ڈسٹرکٹ سرگودھا جیل
پچھلے برس یہ خوف تھا تجھے کھو نہ دوں
اب کے برس دعا ہے تیرا سامنا نہ ہو

* امتیاز علی لالہ...... سرگودھا
تم سمندر کی بات کرتے ہو
لوگ آنکھوں میں ڈوب جاتے ہیں

* محمد عمار حسنین معاویہ...... ضلع خانیوال
جو آنا چاہو ہزار رستے
نہ آنا چاہو تو عذر لاکھوں
مزاج برہم طویل رستہ
برستی بارش خراب موسم

* عباسہ مغل...... ڈنگہ ضلع گجرات
وفا کی قدر آج بھی وہی ہے محسن
فقط مٹ چکے ہیں ٹوٹ کر چاہنے والے

* محمد جاوید عباسی...... نیو سینٹرل جیل ملتان
اس کو چاہا بھی تو اظہار نہ کرنا آیا
کٹ گئی عمر ہمیں پیار نہ کرنا آیا
اس نے مانگی تو فقط ہم سے جدائی مانگی
اور ہم تھے کہ ہمیں انکار نہ کرنا آیا

* محمد عثمان انصاری...... نیو سینٹرل جیل ملتان
طوفان سے جو ڈر جائے وہ سمندر نہیں ہوتا
حالات سے جو گھبرائے وہ قلندر نہیں ہوتا
ہوتا ہے کوئی ایک ہی قسمت کا دھنی بھی
ہر کوئی مقدر کا سکندر نہیں ہوتا

* طالب حسین طلحہ...... نیو سینٹرل جیل ملتان
وقت خود ہی بتائے گا کہ میں زندہ ہوں
کب وہ مرتا ہے جو زندہ رہے کردار کے ساتھ
آ میرے دوست ذرا دیکھ میں ہارا تو نہیں
میرا سر بھی تو پڑا ہے میری دستار کے ساتھ

* ڈاکٹر امین شیخ...... سرگودھا
وہ آج بھی صدیوں کی مسافت پر کھڑا ہے
ڈھونڈا تھا جسے وقت کی دیوار گرا کر

* عاطف شاہین...... اروتی سندھیلیانوالی
وہ کب کا بھول چکا ہو گا یادوں کا قصہ
بچھڑ کر کسی سے، کسی کو، کسی کا خیال کب رہتا ہے

* ہارون رشید...... کاٹلنگ مردان
اب مگر کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں ہو سکتا
اپنے جذبات سے رنگین شرارت نہ کرو
کتنی معصوم ہو، نازک ہو، حماقت نہ کرو
بارہا تم سے کہا تھا کہ محبت نہ کرو

* محمد خواجہ...... کورنگی، کراچی
لفظ و معنی میں نہیں جلوہ و صورت میں نہیں
عشق ایک چیز ہے جو حرف و حکایت میں نہیں

* اظہر حسین بچار...... ہزاری، جتوئی
امیرِ شہر میری جھونپڑی پہ طنز نہ کر
یہ تیرے ظرف سے ہر حال میں بڑی ہو گی

* افتخار حسین اعوان...... مظفر آباد آزاد کشمیر
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں پکاروں ہائے دل

* مہرین ناز ڈوگر...... حیدرآباد
کتنے اندھیروں کی راہ گزر پہ چراغ صبح جلا جلا کر
قسم ہے آنکھیں بھی تھک گئی ہیں تمہارے آنسو چھپا چھپا کر
کیا خبر تھی کہ اِک چہرے سے اتنے چہرے کشید ہوں گے
میں تھک گئی ہوں تمہارے چہرے کو آئینے میں سجا سجا کر

* سوہا جی...... کراچی
میرے خوابوں کے گلشن میں خزائیں رقص کرتی ہیں
میرے ہونٹوں کی لرزش میں وفائیں رقص کرتی ہیں
مجھے وہ لاکھ تڑپائے، مگر اس شخص کی خاطر
میرے دل کے اندھیرے میں دعائیں رقص کرتی ہیں

* قاضی عرفان احمد عاجز، ندیم افضل...... آڑہ
وہ اس انداز کی مجھ سے محبت چاہتا ہے
میرے ہر خواب پر اپنی حکومت چاہتا ہے
وہ کہتا ہے میں اس کی ضرورت بن چکا ہوں
تو گویا وہ مجھے حسبِ ضرورت چاہتا ہے

* حاجی خالد محمود خان...... سوہان اسلام آباد
سانسوں میں بھی شامل لہو لہو بھی رواں ہو
لیکن میرے ہاتھوں کی لکیروں میں کہاں ہو

* محمد قدرت اللہ نیازی...... حکیم ٹاؤن خانیوال
اس خوشی کا حساب کیسے ہو؟
تم جو پوچھو جناب کیسے ہو؟

* شبیر ملک...... لاہور
نظر سے دور رہ کر بھی، یہ تیرا روبرو رہنا
میرے پاس رہنے کا سلیقہ کوئی تم سے سیکھے

* حاجی محمد زاہد اقبال زرگر...... نئی منڈی سکھیکی
گھروں میں اپنے جو رہتے ہیں بے گھروں کی طرح
گزار دیتے ہیں عمریں قلندروں کی طرح
تم اپنا غم ہی میرے دل میں منتقل کر دو
سلوک کچھ تو کرو بندہ پروروں کی طرح

* احمد حسن عرضی خان...... قبولہ شریف بائی پاس
کیوں میں کروں یہ دعا کہ اسے میری عمر لگ جائے
ہو سکتا ہے آج آخری رات ہو میری زندگی کی

* محمد امجد ریاض...... اقبال نگر چیچہ وطنی
اس کے رخسار پر ایک اشک کی آوارہ گردی
ہم نے یاقوت کے سینے پہ سمندر دیکھا

❋ مرزا طاہر الدین...... میر پور خاص
بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

❋ رحیمہ سرور...... لاہور
پلٹ کے آئیں زمانے وہی محبت کے
کہ رنگ چلنے لگیں اور صبا ٹھہر جائے

❋ عبدالغفور خان...... اٹک
مانا کہ غم کے بعد مسرت ضرور ہے
لیکن جیے گا کون تیری بے رخی کے بعد

❋ سلیم کامریڈ...... کھاتاں
حوادث سے الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پہ اشک برسانا نہیں آتا

❋ احمد خان توحیدی...... اسٹیل ٹاؤن، کراچی
جو اک حرف کی حرمت نہ رکھ سکا محفوظ
میں اس کے ہاتھ میں ساری کتاب کیا دیتا

❋ سیدہ مینا نقوی...... ملتان
بچھڑ کر مجھ سے اگرچہ اداس وہ بھی تھا
پتا چلا کہ زمانہ شناس وہ بھی تھا
میرے زوال سے پہلے ہی مجھ کو چھوڑ گیا
غضب کا ستارہ شناس وہ بھی تھا

❋ ریاض بٹ...... حسن ابدال
قاتل نے کیا صفائی سے دھوئی ہے آستین
اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

❋ بشیر احمد بھٹی...... فوجی بستی، بہاولپور
مجھ سے وہ پوچھنے آیا ہے وفا کے معنی
یہ اس کی سادہ دلی مار نہ ڈالے مجھ کو

❋ بلیک ٹائیگر...... کرک تخت نصرتی
چھپ کے آتا ہے کوئی خواب چرانے میرے
پھول ہر شب کو چمکتے ہیں سرہانے میرے

❋ محمد اشفاق سیال...... شورکوٹ
لوگوں کو روشنی میرے کام سے ملی مگر
میں اپنی ذات کے لیے بے نور ہو گیا

❋ طاہرہ گلزار...... پشاور
میری طرف اٹھاتے رہے انگلیاں وہی
جو اپنی خامیوں کا احاطہ نہ کر سکے

❋ حبیب اللہ چنائے...... انگوڑی کرک
بغیر اس کے اب آرام بھی نہیں آتا
وہ شخص جس کا مجھے نام بھی نہیں آتا
کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

❋ نوشتہ گلزار...... بھکر، سرائے مہاجر
اس کے نزدیک غم ترک وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں
کل بچھڑنا ہے تو پھر عہد وفا سوچ کے باندھ
ابھی آغازِ محبت ہے گیا کچھ بھی نہیں

❋ طیب اسد...... ڈیرہ اسماعیل خان
راہوں پہ نظر رکھنا ہونٹوں پہ دعا رکھنا
آجائے کوئی شاید دروازہ کھلا رکھنا
احساس کی شمع کو کچھ اس طرح جلا رکھنا
اپنی بھی خبر رکھنا اس کا بھی پتا رکھنا

❋ فیصل حسن پرنس...... جھنگ
حرمت سگِ کوئے یار بھی لازم ہے
جسے ہو انا کا خیال محبت نہ کرے

❋ منزہ بصیر...... کھاریاں
وابستہ ہو گئی تھیں کچھ امیدیں آپ سے
امیدوں کا چراغ بجھانے کا شکریہ

❋ راحیلہ رحمان...... پھالیہ منڈی بہاؤالدین
ماں تیرے بعد بتا کون لبوں سے اپنے
وقتِ رخصت میرے ماتھے پہ دعا لکھے گا

کوپن برائے شمارہ اپریل 2014

مُحفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --

نئی الف لیلہ

منظر امام

جس طرح لباس کے بدلنے سے صرف شخصیت میں تبدیلی آتی ہے لیکن روح وہی رہتی ہے بالکل اسی طرح پرانی کہانی کے کردار کے بدل جانے سے وہ کوئی نیا رخ اختیار ضرور کر لیتی ہے مگر پیغام میں کوئی تبدیلی نہیں آتی... زیرِ نظر تحریر بھی انہی جدتوں کے ساتھ حاضر ہے شاید کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات کے مصداق...

پرانی تصویر میں نئے رنگوں کا عجیب امتزاج...... مصنف کی عہد حاضر پر گہری نظر

اردو ادب کا کلاسیک۔ جس میں ہزاروں چھوٹی بڑی دلچسپ کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں صرف حیرت اور دلچسپی کے پہلو نہیں ہیں بلکہ ان میں اخلاقی نصیحتیں بھی ہیں، جو ہر کہانی کے انجام پر سامنے آتی ہیں۔ ہم میں سے ہزاروں نے ان کہانیوں کو پڑھا ہوگا۔ ان کے ذہنوں کے گوشوں میں یہ کہانیاں دھندلی یادوں کی طرح محفوظ ہوں گی۔

میں نے الف لیلہ کی چند مختصر کہانیوں کو ماڈرنائز کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اپنی کاوش سے پہلے بہتر ہے کہ

وہ کہانیاں بھی سنادی جائیں جو الف لیلہ میں موجود ہیں تاکہ آپ کی یادداشت تازہ ہوسکے۔

کہانی نمبر ایک۔

ایک بار چند لومڑیاں کچھ کھانے کی چیز ڈھونڈ رہی تھیں کہ انہیں ایک مرا ہوا اونٹ ملا۔ وہ کہنے لگیں۔ ''اب ہمیں بہت دنوں کے لیے کھانا مل گیا ہے لیکن ہمیں ڈر ہے کہ ہم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنے لگیں اور مضبوط کمزور کو نہ دبا لے۔'' (دیکھا! اس زمانے کی لومڑیوں میں بھی کتنی انسانیت پائی جاتی تھی)

انہوں نے کہا کہ ایسا ہوا تو کمزور ہلاک ہوجائیں گے۔

پھر ایک لومڑی نے مشورہ دیا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم ایک حاکم تلاش کریں جو ہمارا حصہ بخرہ کردیا کرے تاکہ پھر طاقتور کی کمزور کے خلاف کچھ نہ چلے۔

ان میں یہی صلاح مشورہ ہورہا تھا کہ ایک بھیڑیا آپہنچا۔ لومڑیاں آپس میں کہنے لگیں کہ اگر سب کی رائے ہو تو اس بھیڑیے کو اپنا حاکم بنالیں۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ پہلے بھی اس کا باپ ہمارا بادشاہ ہوا کرتا تھا اور ہم خدا سے امید رکھیں کہ وہ ہمارے درمیان انصاف کرے۔

یہ کہہ کر لومڑیاں بھیڑیے کے پاس گئیں اور کہا کہ ہم تجھے اپنا حاکم بناتے ہیں۔ تو ہم میں سے ہر ایک کو ضرورت کے مطابق دے تاکہ ہم میں سے زبردست کمزور پر ظلم نہ کرے اور ہم آپس میں کٹ نہ مریں۔

بھیڑیے نے منظور کرلیا اور اس دن کے لیے ان میں کافی حصہ تقسیم کردیا۔

لیکن دوسرے دن وہ اپنے دل میں کہنے لگا۔ ''اگر میں اس اونٹ کو اسی طرح ان کمزوروں میں بانٹتا رہا تو مجھے بھی اتنا ہی ملے گا جتنا کہ انہوں نے میرے لیے مقرر کررکھا ہے۔ اگر میں اونٹ کو اکیلا ہی کھالوں تو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ کیونکہ وہ میرے اور میرے گھر والوں کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے بھیڑ بکریاں۔ میں کیوں نے خود قبضہ کرلوں۔ غالباً خدا نے اپنی طرف سے یہ نعمت میرے لیے بھیج دی ہے پھر میں ان کا احسان کیوں اٹھاؤں۔ بہتر ہے کہ میں اونٹ کو اپنے لیے مخصوص کرلوں اور ان کو کچھ نہ دوں۔''

صبح ہوئی تو لومڑیاں دستور کے مطابق بھیڑیے کے پاس اپنا حصہ لینے گئیں۔ بھیڑیے نے جواب دیا۔ ''جاؤ یہاں سے۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ باقی نہیں۔''

لومڑیاں پریشان ہوکر وہاں سے چل دیں اور کہنے لگیں۔ ''خدا نے ہمیں بڑی مصیبت میں مبتلا کردیا۔ یہ خبیث خائن خدا سے بھی نہیں ڈرتا اور ہم اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتے۔''

ایک لومڑی بولی۔ ''ہوسکتا ہے کہ آج وہ بہت بھوکا ہو۔ اسے پیٹ بھر کر کھا لینے دو اور کل پھر اس کے پاس چلیں گے۔''

دوسرے دن لومڑیوں نے اس کے پاس جاکر کہا۔ ''ہم نے تو تجھے اس لیے اپنے اوپر حاکم مقرر کیا تھا کہ تو ہم میں سے ہر ایک کو اس کی روزی دے، طاقت ور کے مقابلے میں کمزور کا انصاف کرے، جب یہ اونٹ ختم ہوجائے تو ہمارے لیے اور کھانا تلاش کرے اور ہم ہمیشہ کے لیے تیری فرماں بردار رعایا رہیں۔ ہم نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ ہم بھوکے ہیں، ہمارا کھانا دے اور باقی کا جو تیرا جی چاہے کر۔''

بھیڑیے نے کچھ جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس کا دل اور سخت ہوگیا۔ انہوں نے اسے بہت سنایا لیکن اس نے نہ سننا تھا نہ سنا۔ اب لومڑیوں کی یہ رائے ہوئی کہ ہم شیر کے پاس چل کر اپنے آپ کو اس کے سپرد کردیں اور اونٹ اس کے حوالے کردیں۔ اگر اس نے ہمیں اس میں سے کچھ دے دیا تو اس کی مہربانی ہے، ورنہ اس خبیث سے تو وہی زیادہ مستحق ہے۔

چنانچہ شیر کے پاس جاکر انہوں نے بھیڑیے کا سارا قصہ سنایا اور کہا کہ ہم تیرے غلام ہیں اور تجھ سے مدد لینے آئے ہیں، تو اس بھیڑیے سے ہماری جان چھڑا۔ ہم ہمیشہ تیرے فرماں بردار رہیں گے۔

لومڑیوں کی یہ باتیں سن کر شیر کی حمیت جوش میں آگئی اور وہ ان کے ساتھ ہولیا۔ جوں ہی بھیڑیے کی نظر شیر پر پڑی۔ وہ بھاگ لیا لیکن شیر اس کے پیچھے دوڑا۔ پکڑ کر اس کی تکا بوٹی کرڈالی اور لومڑیوں کا شکار ان کے حوالے کردیا۔

یہ تھی الف لیلہ کی کہانی۔ اب ہماری کہانی کچھ یوں ہے۔

وہ چار بھائی تھے۔ عمران، نعمان، فرقان اور عدنان۔ ترتیب کے لحاظ سے عمران سب سے بڑا تھا، اس کے بعد بقیہ تینوں تھے۔

ان کا باپ سلطان تھا، نام کا سلطان، ویسے وہ ایک پیٹرول پمپ پر کیشئر کی نوکری کیا کرتا۔ اس کی بیوی یعنی ان چاروں کی ماں کا انتقال ہوچکا تھا۔

سلطان بے چارہ محنت کر کے بوڑھا ہوچکا تھا۔ یہ سب دو کمروں کے ایک کوارٹر میں رہا کرتے تھے۔ بہت پریشان کرنے والی زندگی تھی ان کی۔ ایک دن وہ چاروں

سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

''عمران بھائی، ہمارا کیا بنے گا۔ کیا مستقبل ہے ہمارا؟'' نعمان نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔ ''سب سے بڑی پرابلم یہ ہے کہ بابا نے کچھ جمع ہی نہیں کیا ہے۔ ساری زندگی کیشئر بن کر گزار دی ہے۔''

''ہم لوگ تو کیشئر بھی نہیں بن سکتے۔'' فرقان نے کہا۔

''بھائیو! میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔'' سب سے چھوٹا عدنان بولا۔ وہ اسی قسم کی جوڑ توڑ کیا کرتا تھا۔

''کیا ترکیب ہے؟''

''دیکھو، بابا پیٹرول پمپ پر کیشئر ہے۔ شام کے وقت اس کے پاس ہزاروں روپے ہوتے ہیں، میں نے خود نوٹوں کی گڈیاں دیکھی ہیں۔''

''تو پھر اس سے کیا ہوا؟''

''کیوں نہ پیٹرول پمپ پر ڈاکا ڈالا جائے۔'' عدنان نے اپنی ترکیب بتادی۔

''پاگل ہوگئے ہو۔'' ایک بھائی نے جھڑک دیا۔ ''یہ کیسی ترکیب بتا رہے ہو۔ الٹا بے چارہ بابا مصیبت میں پھنس جائے گا اور ویسے بھی پیٹرول پمپ والے ہم بھائیوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔''

''ہم سب نقاب پوش بن کر جائیں گے۔''

''نہیں، یہ بے وقوفی کی بات ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''کوئی اور ترکیب بتاؤ۔''

''اس کے بعد تو کسی بینک پر ڈاکا رہ جاتا ہے۔''

''ہاں، یہ اچھا ہے۔'' نعمان نے تائید کی۔ ''مجھے بچپن سے بینک لوٹنے کا شوق ہے۔ میں اکثر خواب میں یہی دیکھتا ہوں۔''

''تو کیا خواب میں خود کو جیل جاتے ہوئے نہیں دیکھتے؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں۔ جیل والا خواب بھائی عدنان دیکھتے ہیں۔''

''یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔ دولت مند بننے کا کوئی اور طریقہ سوچو۔''

''پھر ایک اور طریقہ ہے۔'' عدنان نے کہا۔ ''وہ یہ ہے کہ ہم سب مل کر بابا کا انشورنس کروا دیتے ہیں۔ بابا کی موت کے بعد انشورنس کی رقم ہمیں مل جائے گی۔''

''ہاں یہ طریقہ ہے تو قانونی اور اس میں کوئی خطرہ بھی نہیں ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ بابا ابھی مرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ ہر ہفتے حکیم صاحب سے دوائی لے آتے ہیں، صبح سویرے سیر کے لیے چلے جاتے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہم سب نکل لیں گے اور بابا اپنی جگہ رہے گا۔''

''ہاں عمران بھائی، یہ تو ہے، پچھلے ہفتے بابا اپنی شادی کا پروگرام بھی بنا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ دوسری شادی کرلوں تو زندگی بڑھ جائے گی۔ کیونکہ اس کے لیے اس عمر میں سپلی مینٹ کی بہت ضرورت ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''یہ ہوسکتا ہے کہ بابا کا انشورنس کرانے کے بعد ان سے ریکوئسٹ کی جائے کہ خدا کے لیے اپنی اولاد کی بھلائی کے لیے آپ انتقال فرما جائیں۔ لوگ تو اپنی اولادوں کے لیے کیا کیا نہیں کرتے۔ آپ اپنی جان بھی نہیں دے سکتے۔''

''بابا کا ماننا بہت مشکل ہے۔''

''ہم سب ایک وفد کی صورت میں ان سے مذاکرات کرتے ہیں۔'' عمران نے کہا۔ ''اس کے بعد سوچیں گے۔''

رات کے کھانے کے بعد وہ چاروں بابا کے گرد جمع ہوگئے۔

پروگرام کے مطابق عمران نے سلطان کا سر دبانا شروع کردیا۔ نعمان اور عدنان اس کی ٹانگیں دبانے لگے جبکہ فرقان نے ہاتھ دبانا شروع کردیا۔

''کیا بات ہے، آج تو بڑی خوشامدیں ہورہی ہیں۔'' سلطان نے پوچھا۔

''بابا۔ تم پر پیار آرہا ہے نا اس لیے۔'' عدنان نے کہا۔

''ایسا پیار پہلے کیوں نہیں آیا؟''

''آتا ہے بابا۔ لیکن تم تو مصروف رہتے ہونا۔ رات کو دیر سے آتے ہو۔ خدمت کا موقع نہیں ملتا۔ آج جلدی آگئے ہو اس لیے خدمت کررہے ہیں۔''

''بابا۔ ایک بات تو بتاؤ۔ یہ انشورنس کیا ہوتا ہے۔'' عمران نے سر دباتے ہوئے پوچھا۔

''کیا! تم لوگوں کو نہیں معلوم؟''

''نہیں بابا۔ ہمیں دنیا کی کیا خبر! پلیز، ذرا اس کے فائدے تو بتاؤ۔''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ بالکل ناجائز اور حرام چیز ہے، شریعت کے خلاف۔''

''بابا۔ کس شریعت کی بات کررہے ہو۔ میں نے تمہیں کبھی جمعہ کی نماز تک پڑھتے نہیں دیکھا۔'' ایک نے بلبلا کر کہا۔

''ابے وہ بات دوسری ہے۔ دل میں تو احترام ہے نا۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنی اولادوں کا بھلا

نہیں چاہتے۔"

"ابے، ایسامت سمجھ، دیکھ لینا میری موت کے بعد تم لوگ مالامال ہو جاؤ گے۔"

"وہ کس طرح ابا۔" سب ہی سلطان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"ابھی نہیں بتاؤں گا۔ بس جس وقت دم نکل رہا ہوگا۔ اس سے ایک گھنٹا پہلے بتا دوں گا۔"

"لیکن تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ ایک گھنٹا کے بعد دم نکلنے والا ہے؟" عدنان نے پوچھا۔

"چل جاتا ہے پتا، اللہ والوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔"

چاروں بیٹے برا سامنہ بنا کر رہ گئے۔ ان کی یہ اسکیم بھی ناکام ہو گئی تھی۔ سلطان نے ان کی بات مذاق میں اڑا دی تھی۔

ایک رات وہ چاروں پھر ایک کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

"بھائیو! یہ بابا تو ہم لوگوں کو مفلسی میں مارنا چاہتے ہیں۔" فرقان نے کہا۔

"لیکن وہ بتا تو رہے تھے کہ ہم ان کی موت کے بعد مالامال ہو جائیں گے۔"

"یہ سب بہلاوے ہیں۔ ان کے پاس ہمیں مالامال کرنے کے لیے رکھا ہی کیا ہے۔" عدنان منہ بنا کر بولا۔

"یہ تو ہے۔"

"ابھی ایک اور ترکیب میرے ذہن میں آرہی ہے۔" عدنان نے اپنے بھائیوں کی طرف دیکھا۔

"چلو وہ بھی بتا دو۔"

"کیوں نہ ہم ابا کو کہیں بیچ دیں۔"

"بیچ دیں!" سب ہی اچھل پڑے تھے۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ کس کا دماغ خراب ہے جو ابا کو خریدے گا اور کیوں خریدنے لگا؟"

"اور ابا کوئی صوفہ تو ہیں نہیں کہ ہم نے اٹھا کر بیچ دیا اور وہ خاموشی سے بک گئے۔"

"سوال پھر وہی ہوتا ہے کہ آخر کوئی کیوں خریدے گا؟"

"میرے بھائیو، تم لوگوں نے اخباروں میں اس قسم کے اشتہار تو دیکھے ہوں گے کہ فلاں بے اولاد جوڑے کو ایک بچے کی ضرورت ہے جس کو وہ گود لے سکے۔"

"تو ابا کو کون گود لے گا؟"

"سنو تو، اسی طرح بعض خاندان ایسے ہوتے ہیں؟ جن میں کوئی بڑا بوڑھا نہیں ہوتا۔ وہ چاہتے ہیں کہ گھر میں کسی بزرگ کا سایا رہے، جس سے وہ دعائیں لیتے رہیں۔"

"ابے تو ابا بزرگ کہاں ہیں۔" عمران نے کہا۔

"اس گھر میں جا کر ہو جائیں گے۔ یہاں تو ہمارے سامنے چونچلے میں رہتے ہیں۔"

"یہ بالکل فالتو اسکیم ہے۔ کچھ اور سوچو۔" عمران نے کہا۔

"چلو، کچھ دن کا موقع دو۔ کچھ اور سوچ لیتے ہیں۔"

اس رات سلطان نے کھانے کے بعد ان لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا اور سنسنی خیز انداز میں بولا۔ "دیکھو میرے بچو، مجھے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ تم سب میری موت کی خبر سننے کے لیے بے چین ہو رہے ہو۔"

"نہیں ابا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" فرقان نے کہا۔ "اور اس کا ثبوت بھی ہے ہمارے پاس۔"

"اور وہ ثبوت کیا ہے؟"

"ثبوت یہ ہے کہ اولاد اس وقت اس قسم کے منصوبے بناتی ہے جب باپ کی موت کے بعد دولت ملنے کی امید ہو اور تمہارے پاس دھرا ہی کیا ہے، ابھی تو تم ہی ہم لوگوں کو پال رہے ہو۔ جاب کرتے ہو۔ اگر تم نہیں رہے تو ہم شاید بھیک مانگنے لگیں گے۔"

"نہیں میرے بچو، میں کنگال نہیں ہوں۔" سلطان نے کہا۔ "میرے پاس پانچ کروڑ روپے ہیں، لیکن میں نے کبھی تم لوگوں کو اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔"

"کیسی بات کر رہے ہو ابا۔ کہاں سے آئے پانچ کروڑ؟"

"پانچ سال پہلے میں نے پچیس ہزار کا ایک بانڈ خریدا تھا۔ یہ اسی کا انعام ہے۔ میں نے وہ پیسے بینک میں جمع کرا دیے تھے اور آج تک بینک میں پڑے ہوئے ہیں۔"

"سچ کہہ رہے ہو ابا۔" وہ سب خوشی سے اچھل پڑے تھے۔

"ہاں میرے بچو بالکل سچ۔" سلطان نے کہا، پھر فرقان سے مخاطب ہوا۔ "جاؤ، میری الماری میں ایک چھوٹا سا بیگ ہے وہ لے آؤ۔"

فرقان جلدی سے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بیگ لیے ہوئے اندر آ گیا۔ سلطان نے اس میں سے بینک کی ایک سلپ نکال کر سب کے سامنے رکھ دی۔

اور اس سلپ کے مطابق سلطان نے واقعی پانچ کروڑ روپے بینک میں جمع کروائے تھے۔

"ابا۔" فرقان نے سلطان کا ہاتھ تھام کر اسے چومنا شروع کر دیا۔

"بس بس۔ زیادہ خوشامد کی ضرورت نہیں۔" سلطان نے کہا۔ "میں اس طرح یہ رقم تم لوگوں کے حوالے نہیں کرنے والا۔"

"تو پھر کس طرح دیں گے ابا۔" عمران نے پوچھا۔

"دیکھو بچو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ رقم تم چاروں میں ایمانداری اور انصاف کے ساتھ تقسیم کر دوں، لیکن میں جانتا ہوں کہ دولت بہت بری چیز ہے۔ اس کی وجہ سے رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ آپس میں خوں ریزی ہو جاتی ہے، طاقت ور کمزور کا حق مار لیتا ہے۔ کسی نہ کسی بہانے دوسرے کی رقم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔"

"ابا۔ تو پھر کیا چاہتے ہو تم؟"

"میں نے ببن بھائی سے بات کر لی ہے۔" سلطان نے بتایا۔

"ببن ماموں۔" سب چیخ اٹھے۔ "ابا ببن ماموں کیا کریں گے؟"

"بیٹا، ہمارے خاندان میں ایک ہی ایماندار آدمی ہے۔" سلطان نے کہا۔ "ببن بھائی تم لوگوں کے درمیان مکمل انصاف کریں گے۔ ہر ایک کو اس کا حصہ برابر دے دیں گے۔"

"ابا اتنے جھنجٹ کی کیا ضرورت ہے؟" فرقان نے کہا۔ "آپ تو زندہ ہیں نا۔ تو خود ہی کیوں نہیں تقسیم کر دیتے۔"

"نہیں بیٹا، یہ میرے بس سے باہر ہے۔" سلطان دھیرے سے بولا۔ "میں تم میں سے کسی کا نام نہیں لینا چاہتا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں تم چاروں میں سے کسی دو سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ نام اس لیے نہیں لے رہا کہ دوسرے دو ناراض ہو جائیں گے اور میں پھر چاروں کے درمیان انصاف نہیں کر سکوں گا۔"

"تو ابا۔ ببن ماموں کون سا انصاف کر دیں گے۔"

"میں جانتا ہوں اس کو۔ وہ بہت ہی ایماندار اور انصاف پسند انسان ہے۔" سلطان نے کہا۔

"چلیں۔ اگر آپ ایسا ہی سمجھتے ہیں تو بلا لیں ببن ماموں کو۔"

سلطان نے ببن کو بلوا لیا۔ وہ بھی شاید یہاں آنے کے لیے ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر انسان تھا جس نے اپنی زندگی پتنگ بازی اور کبوتر بازی میں گزار دی تھی۔

"ہاں بھئی، ایسی کون سی افتاد آن پڑی جو مجھ غریب کو بلوا لیا۔" ببن نے کہا۔ "ویسے تو کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کیا ہوگا۔ لیکن جب پولیس پیچھے پڑی ہے تو ببن یاد آ گئے۔"

"پولیس، کون سی پولیس؟" سلطان نے حیرت ظاہر کی۔

"ارے سب سمجھتا ہوں میں، تم لوگوں کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میرا لنگوٹیا پولیس کا سپاہی ہے، اس لیے تم لوگوں پر جب آفت آئی تو مجھے بلا لیا۔"

"ارے نہیں ببن بھائی۔" سلطان نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم پر کوئی آفت نہیں آئی ہے۔ سب خیریت سے ہیں۔"

"حیرت ہے بھائی۔ تو پھر کیوں بلایا ہے؟"

"ببن بھائی، ہم آپ کے ذریعے انصاف کروانا چاہتے ہیں۔" سلطان نے بتایا۔ "یہ بات میں جانتا ہوں کہ آپ میں انصاف کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔"

"ایسا ویسا۔" ببن نے اپنی گردن اکڑا لی۔ "دور دور سے لوگ میرے پاس انصاف کے لیے آتے ہیں۔"

"اور آپ ایماندار بھی بہت ہیں۔"

"خیر۔ اس کا تو پوچھنا کیا ہے۔ جس جس کے کبوتر بھٹک کر میری چھت پر آ جاتے ہیں، گنتی کر کر کے واپس کر دیتا ہوں۔ لیکن بات کیا ہے؟"

"ببن بھائی، آپ کو میرے چاروں بیٹوں میں انصاف کرنا ہوگا۔ جس جس کو جو رقم میں بتاؤں گا۔ وہ رقم آپ ہر مہینے اس کو دے دیا کریں گے، نہ کم نہ زیادہ۔"

"ارے بھائی، دس پانچ ہزار ہوں گے، اس کے لیے اتنا جھنجٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے ہی بانٹ دو۔"

"نہیں ببن بھائی، پیسے کچھ زیادہ ہیں۔"

"آخر کتنے زیادہ؟"

"پانچ کروڑ۔" سلطان نے بتایا۔

ببن یہ سن کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

تقسیم کچھ اس طرح ہوئی تھی۔ عمران کو ہر مہینے تیس ہزار۔ فرقان کو چھبیس ہزار، نعمان کو پچیس اور عدنان کو بائیس ہزار۔

یہ تقسیم کچھ مہینوں تک ہوئی تھی، اس کے بعد عمران کو ایک حصہ اور فرقان، نعمان اور عدنان کو دس دس لاکھ کم کر کے دینا تھا۔

اور دس لاکھ روپے جو بچ جاتے وہ ببن بھائی کی ایمانداری اور انصاف کے لیے تھے۔

پہلے تو ببن کو ان باتوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ لیکن بعد میں یقین آتا چلا گیا۔ ببن بھائی کے لیے دس لاکھ بہت بڑی رقم تھی، وہ دل و جان سے اس فرض کو ادا کرنے کے

لیے تیار ہوگیا تھا۔

پھر بین بھائی نے کچھ سوچ کر وہی سوال کیا جو سب کے ذہنوں میں تھا۔ ''سلطان میاں، تم تو ابھی زندہ ہو اور نہ جانے کب تک زندہ رہو۔ تو میں کیا تمہاری موت کے انتظار میں ہی بیٹھا رہوں۔''

''نہیں بھائی، آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں مرنے ہی والا ہوں۔''

''میاں، اچھے خاصے ہٹے کٹے ہو۔ ہاں اگر خودکشی کا ارادہ ہے تو بات دوسری ہے۔ ویسے فی الحال تو تمہارے نکلنے کے آثار نہیں لگتے۔''

''میں روز خواب میں موت کے فرشتے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھتا ہوں۔'' سلطان نے بتایا۔

''ابا، وہ دو نمبر فرشتہ ہوگا۔'' نعمان نے کہا۔ ''ورنہ موت کا فرشتہ پہلے سے انفارم نہیں کرتا۔''

''نہیں بے، وہ ایک نمبر ہی تھا، میں نے اس سے پوچھا بھی تھا۔ تب ہی تم لوگوں کو کنفرم کر رہا ہوں۔''

''اچھا چلو۔ آگے بتاؤ، کیا کہا اس فرشتے نے۔'' بین نے پوچھا۔

''اس نے بتایا کہ وہ پندرہ جولائی کو مجھے اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔''

''سن بھی بتایا؟''

''نہیں، سن تو نہیں بتایا۔''

''ابا، ابھی دو ہزار تیرہ ہے، ہوسکتا ہے پندرہ جولائی سن 2040 ہو، 2030 ہو۔''

''ہوسکتا ہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ یہی سال ہے، مجھے اسی سال کی پندرہ جولائی کو اوپر جانا ہے۔''

''چلو یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' بین نے کہا۔ ''آج دس جولائی ہے۔ صرف پانچ دن رہ گئے ہیں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔''

''بین بھائی، تم اب یہیں رہنا۔'' سلطان نے کہا۔ ''میری موت کے بعد ان بچوں کو سنبھالنے والا تو کوئی ہو۔''

''فکر مت کرو۔ میں بھی اپنا بوریا بستر لے کر ہی آیا ہوں۔''

کسی کو امید نہیں تھی کہ سلطان کی بات درست ہی نکلے گی لیکن چودہ جولائی کو اچانک اس کی طبیعت خراب ہونے لگی اور پندرہ جولائی کو اس کا انتقال ہوگیا۔

✂✂✂

''بین ماموں، ابا تو واقعی اللہ والے نکلے۔'' عمران نے بین سے کہا۔

''ہاں بیٹا۔'' بین نے ایک گہری سانس لی۔ ''بزرگوں کی یہی نشانی ہوتی ہے۔''

''لیکن ماموں، ابا کو تو نماز روزے سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ پھر وہ اچانک بزرگ کیسے ہوگئے؟''

''ابے بزرگی کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔'' بین نے کہا۔

یہ گفتگو سوئم کے بعد ہو رہی تھی۔ پورے محلے میں اس بات کا چرچا تھا کہ مرحوم سلطان موت سے پہلے اپنے مرنے کی خبر دے چکا تھا۔ دن اور تاریخ تک بتادی تھی۔

پندرہ بیس دنوں تک یہی ہوتا رہا۔

بیس دنوں کے بعد بین نے چاروں کو بلا کر ان کے درمیان اتنی رقم تقسیم کردی، جتنی سلطان نے بتائی تھی۔ اس دن چاروں کو احساس ہوا کہ اس کا باپ سلطان ٹھیک ہی کہتا تھا۔ بین واقعی ایک انصاف پسند شخص ہے۔

وہ بین کی خدمت کرنے لگے۔

اس کی ہر فرمائش پوری کرنا ان چاروں کا فرض بن گیا تھا۔

بین کو تازہ بالائی کھانے کا شوق تھا۔ ان چاروں میں سے کوئی ایک کہیں نہ کہیں سے ان کے لیے بالائی لے کر آجاتا۔ بالائی کے علاوہ بین کو بدایوں کے پیڑے بھی پسند تھے۔

عمران نے کراچی ہی میں ایک ایسا کاریگر تلاش کرلیا تھا جو اسی انداز کے پیڑے بنایا کرتا تھا، بین روزانہ ایک کلو کے قریب پیڑے بھی کھا جایا کرتا۔

پھر دوسرے مہینے جب بین نے پھر پوری ایمانداری کے ساتھ چاروں میں پیسے تقسیم کردیے تو سب کو ان کی ایمانداری اور انصاف پسندی پر مکمل یقین آگیا۔

وہ چاروں جب آپس میں بیٹھتے تو بین ہی کے بارے میں گفتگو ہوتی۔ ''بھائیو، یہ بین ماموں تو ولی اللہ نکلے۔''

''ہاں بھائی، کون کس روپ میں چھپا ہوتا ہے یہ کسی کو نہیں معلوم۔''

عمران نے کہا۔ ''بھائیو، میں نے تو یہ سوچ لیا ہے کہ بین ماموں کو اب اس گھر سے جانے نہیں دوں گا۔''

''ہاں بھائی۔'' عدنان نے بھی تائید کی۔ ''جب سے وہ اس گھر میں آئے ہیں، برکت ہی برکت ہو رہی ہے۔''

لیکن بین ماموں کی بزرگی اس وقت سامنے آگئی۔ جب اس نے تیسرے مہینے پیسے دینے سے انکار کردیا۔

''ارے بچو، اب میرے پاس پیسے کہاں رہے۔ وہ تو سب ختم ہوگئے۔''

"ختم ہوگئے۔" ان چاروں کے ہوش اڑنے لگے تھے۔ "کیسے ختم ہوگئے۔ ابھی آپ نے دیا ہی کتنا ہے، پورے پانچ کروڑ تھے۔"

"تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ میرے پاس پورے پانچ کروڑ آئے تھے۔"

"تو پھر کتنے آئے تھے؟"

"بچو، ٹیکس وغیرہ کاٹ کر صرف بیس لاکھ ملے تھے۔ جو میں تم کو دے چکا ہوں۔"

"ارے کس چیز کا ٹیکس۔"

"سیلز ٹیکس، بی ٹی آئی، ایف ٹی آئی، ائرپورٹ ٹیکس، روڈ ٹیکس، واٹر بورڈ والوں کا ٹیکس۔" ببن نے درجنوں ٹیکس گنوادیے۔

"ببن ماموں، یہ ایئرپورٹ ٹیکس اور روڈ ٹیکس وغیرہ ہم پر کیوں لگنے لگا؟"

"میرے بچو! تم کیا جانو سرکاری دھندوں کو۔ بس ایک بار پتا چل جائے کہ فلاں کے پاس پیسے ہیں۔ بس پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔"

چاروں اس وقت سکتے کے عالم میں تھے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ببن ان کے ساتھ اتنی بے ایمانی کرے گا (یہاں سے الف لیلہ کی کہانی کا وہ حصہ یاد کریں، جب بھیڑیے نے لومڑیوں کو حصہ دینے سے انکار کردیا تھا)

"اچھا۔ اگر آپ نے اتنے ٹیکس ادا کیے ہیں تو کوئی رسید تو ہوگی آپ کے پاس۔" فرقان نے پوچھا۔

"کیوں بچوں جیسی بات کررہے ہو۔ اس قسم کے لین دین کی رسید کہاں ہوتی ہے۔ وہ تو خاموشی سے دیا جاتا ہے۔"

"ببن ماموں، ویسے تو تمہیں ماموں کہتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔" عمران نے کہا۔ "ابا کے پیسے حرام کے نہیں تھے۔ پرائز بانڈ میں نکلے تھے۔"

"لیکن یہ تو دیکھو کہ تمہارے باپ نے وہ پرائز بانڈ چوری کیا تھا۔"

"چوری کیا تھا؟ جھوٹ ہے یہ، بکواس ہے، کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟"

"اگر ثبوت چاہیے تو جاؤ اپنے مرحوم باپ سے جاکر پوچھ لو۔"

اب ظاہر ہے کہ مرحوم باپ سے کون جاکر پوچھتا۔ اسی لیے سب بھنا کر خاموش ہوگئے لیکن ان کے سینوں میں آگ لگی ہوئی تھی، بہت بڑی رقم تھی، پورے پانچ کروڑ، جو ببن ہضم کرگیا تھا۔

کئی تجویزیں ان کے ذہنوں میں آئیں، ببن پر تشدد کیا جائے۔ اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ کرادی جائے لیکن اس کے لیے پھر ثبوت کی ضرورت ہوتی اور ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔

"بینک والے تو بتا دیں گے کہ ہمارے ابا کے اکاؤنٹ میں پانچ کروڑ تھے۔" نعمان نے کہا۔

"ہاں، بتا تو دیں گے لیکن ہم یہ کہاں سے ثابت کریں گے کہ ابا نے وہ پانچ کروڑ ببن کے حوالے کیے تھے۔"

"یہی تو پرابلم ہے کہ اس آدمی نے بہت ہوشیاری سے کام کیا ہے۔" عمران نے کہا۔ "اس نے رقم بینک میں رکھی ہی نہیں، بلکہ اپنے پاس رکھی ہے اور کہاں رکھی ہے، یہ کسی کو نہیں معلوم۔"

"کیوں نہ اس پر تشدد کیا جائے۔" عدنان نے تجویز پیش کی۔ "تھوڑی سی مار پیٹ کے بعد راستے پر آجائے گا۔"

"ارے بھائی، ہم لوگوں کو کسی پر تشدد کا تجربہ ہی کہاں ہے۔"

"اس کے لیے میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔" عدنان نے کہا۔

"پھر کوئی الٹی سیدھی ترکیب ہوگی۔"

"نہیں تو۔ بالکل سیدھی ترکیب ہے۔ تم لوگ بھی فوراً ہاں کہہ دوگے۔"

"تو بتاؤ کیا ترکیب ہے۔"

"بانکے دادا۔" عدنان نے بتایا۔ "سب جانتے ہیں وہ کتنا خطرناک آدمی ہے، اس کی ایک دھمکی سے ببن کے ہوش اڑ جائیں گے۔"

"لیکن بانکے دادا ہمارے لیے ایسا کام کیوں کرے گا؟"

"ارے بھائیو۔ وہ کرائے پر اسی قسم کے کام اپنی پوری ایمانداری سے کرتا ہے، چاہے کسی کو قتل بھی کروالو بس شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ جتنے پیسوں کا ایگری منٹ کیا ہے۔ وہ اس کو ملنے چاہئیں۔"

"عدنان کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔" فرقان نے کہا۔ "بانکے دادا ہی اس قسم کا کام کرسکتا ہے۔ وہ خطرناک آدمی ہے، ببن کے تو ہوش اڑ جائیں گے۔"

(یہاں سے پھر یاد کریں الف لیلہ کی کہانی، جب لومڑیوں نے بھیڑیے سے نجات کے لیے ایک شیر کی خدمات حاصل کی تھیں)

بانکے بھائی ایک خطرناک آدمی تھا، کئی بار جیل جاچکا

تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کرائے کا قاتل بھی ہے اور چھوٹے موٹے جرائم اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

یہ چاروں ایک وفد بنا کر بانکے بھائی کے پاس پہنچ گئے۔ بانکے اس وقت اپنی بیٹھک میں اپنے گرگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے بہت کڑی نگاہوں سے آنے والوں کو دیکھا تھا۔ "کیا بات ہے، کون ہو تم لوگ۔"

"بانکے بھائی، ہم آپ کے پاس ایک بہت ضروری کام سے آئے ہیں۔" عمران نے بتایا۔

"اوئے۔" بانکے نے اپنے ایک آدمی سے پوچھا۔ "ان لوگوں کی تلاشی لی تھی؟"

"ہاں بانکے بھائی، کچھ بھی نہیں ہے ان کے پاس۔"

"چلو ٹھیک ہے، اب بتاؤ۔"

"بانکے بھائی، آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔" نعمان نے کہا۔

"چکر کیا ہے۔"

"کوئی چکر نہیں ہے بانکے بھائی۔ ہم ایک سودا لے کر آئے ہیں۔ کاروباری بات ہے۔"

بانکے نے کچھ سوچ کر اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔ "ہاں، اب بتاؤ۔ کیا کہانی لے کر آئے ہو۔"

عمران نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتادیا۔ یہ سب سن کر بانکے کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ "واہ، اگر کہو تو مار کر ڈال دوں سالے کو۔"

"نہیں بانکے بھائی، اس کو مار ہی دیا تو پھر پیسوں کا پتا کہاں سے چلے گا۔" عمران نے کہا۔ "اس کی تھوڑی سی توڑ پھوڑ کر ڈالو، پھر سب کچھ بتادے گا۔"

"لیکن اب میرا معاوضہ بتاؤ۔"

"بیس لاکھ۔" عمران نے کہا۔

"نہیں، بیس لاکھ بہت کم ہیں۔" بانکے نے انکار میں گردن ہلادی۔ "کچھ بڑھانا پڑے گا۔"

بہر حال تھوڑی بہت بحث کے بعد چالیس لاکھ میں یہ معاملہ طے پاگیا تھا۔ بانکے کو چالیس لاکھ دینے کے بعد بھی ان چاروں کے پاس اتنی رقم بچ جاتی، جس سے وہ اپنی زندگی آرام سے گزار سکتے تھے۔

"اب تم لوگ مجھ پر چھوڑ دو۔" بانکے نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ وہ رہتا کہاں ہے؟"

"آج کل تو وہ ہمارے ہی یہاں رہ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیا وہ اس وقت ہوگا؟"

"ہاں بانکے بھائی، جس وقت ہم چلے تھے۔ وہ سو رہا تھا۔"

"بس تو میں جارہا ہوں تمہارے گھر کی طرف۔" بانکے نے بتایا۔ "تم چاروں آدھے گھنٹے کے بعد پہنچ جانا۔ تمہارا کام ہوچکا ہوگا۔"

وہ لوگ بہت خوشی خوشی بانکے بھائی کے ہاں سے نکل کر ایک پارک میں آکر بیٹھ گئے۔ انہیں آدھے گھنٹا ادھر ادھر گزارنا تھا۔

"بھائیو۔" عمران نے کہا۔ "حالانکہ چالیس لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ بانکے کو دیتے ہوئے دل دکھے گا لیکن اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔"

"یہ ضروری تھا عمران بھائی، ورنہ ہم پوری رقم سے چلے جاتے۔ ابھی بھی بہت کچھ آرہا ہے ہمارے پاس۔"

آدھا گھنٹا گزار کر وہ چاروں گھر پہنچ گئے۔

بانکے اور ببن ایک ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ بانکے نے ببن کے ساتھ کوئی سختی وغیرہ کی ہوگی۔

"بانکے بھائی، یہ...... یہ کیا تماشا ہے، تم نے پوچھا اس سے ہمارے پیسے کہاں رکھے ہیں؟"

"ہاں پوچھ لیا، اور اس نے بتا بھی دیا ہے۔" بانکے نے کہا۔

"خدایا۔ تیرا شکر ہے۔"

"لیکن تم لوگوں کو اس میں سے ایک پائی نہیں ملے گی۔"

"کیا! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"ایسا ہی ہونے والا ہے۔ ببن مجھے ایک کروڑ دے رہا ہے۔ باقی کے پیسے اس کے، کیس ختم۔ اب تم لوگ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو تو بگاڑ لو۔"

ان چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے ہوش ہوکر گر پڑے۔

(کہانی کا یہ انجام الف لیلہ کا نہیں ہے۔ کیونکہ الف لیلہ میں شیر نے بھیڑیے کو مار کر سارا اونٹ لومڑیوں میں تقسیم کردیا تھا)

وہ الف لیلہ کے زمانے کا شیر ہوگا۔ آج کے شیر بانکے بھائی کے مزاج کے ہوا کرتے ہیں۔ گویا اپنے معاملات خود نمٹانے کی کوشش کرو۔ باہر والوں کو درمیان میں نہ لاؤ، ورنہ وہی حشر ہوگا جو ان چاروں کا ہوا۔

ماروی

محی الدین نواب

چوتھی قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

محبوب ذہنی طور پر کچھ زیادہ ہی اُلجھ گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماروی کوٹھی سے باہر جائے اور شادی بیاہ جیسی تقریبات میں آزادی سے وقت گزارے۔ وہ حشمت جلالی کی کم ظرفی کو خوب سمجھتا تھا۔ اب عقل یہ کہہ رہی تھی کہ پارٹی کا چیئرمین بھی انتقاماً اس کے خلاف ہوکر جلالی کا ساتھ دے گا اور اس عاشق کو ذہنی تکلیف پہنچانے کے لیے ماروی کو نقصان پہنچائے گا۔

محبوب تو بہت چھوٹی سی بات سوچ رہا تھا کہ چیئرمین اسے نقصان پہنچائے گا۔ جب کہ وہ بڑی بے رحمی سے ماروی کو گولی ماردینے کا حکم دے چکا تھا۔ وہ ان کی بے رحمانہ سازشوں کو نہ جاننے کے باوجود سمجھ رہا تھا کہ ماروی کو اغوا کرنے والے اس کے ساتھ کیسا غیر انسانی سلوک کریں گے؟ بہت دور تک سمجھنے کے باوجود اس نے ماروی کی خوشیوں کو اہمیت دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مراد کی جدائی میں اداس رہنے والی اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھڑی دو گھڑی ہنس بول لے۔ یہ اس کے عشق کا مطالبہ تھا کہ وہ اپنی ماروی کے لبوں پر مسکراہٹیں لاتا رہے۔

اب کیا کیا جاسکتا تھا کہ آنسو پونچھنے والے کا سکون برباد ہوگیا تھا۔ وہ اس کے لیے حفاظتی انتظامات کررہا تھا۔ لنگڑا جانی اور اس کے مسلح ساتھی جی جان سے ماروی کی نگرانی کرنے والے تھے۔ انہیں دشمنوں سے نمٹنے کا پیشہ ورانہ تجربہ تھا۔ اس کے باوجود اسے اطمینان حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

کچھ روز پہلے رحمت جلالی' ماروی کی ٹوہ میں اس کی کوٹھی کی طرف گیا تھا۔ محبوب سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے لنگڑے جانی سے اس پر حملہ کرایا تھا۔ اس روز بھی اسے اطمینان نہیں تھا کہ جانی' رحمت کو عبرت ناک سزا دے سکے گا۔ وہ اپنے اطمینان کے لیے خود واردات کی جگہ سے کچھ دور چھپ کر اپنی کار میں بیٹھا آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا تب مطمئن ہوا تھا۔

اب بھی دل یہی کہہ رہا تھا کہ شادی کی رات ماروی وہاں رہے گی تو وہ بھی وہاں چھپ کر رہے گا۔ اپنے طور پر بھی اس کی حفاظت کرے گا۔ کسی کی نظروں میں نہ آنے کے لیے اپنی دوسری گاڑی میں جائے گا اور ہیلمٹ کے ذریعے اپنا چہرا چھپائے رکھے گا۔

اسی کو دیوانگی یا نادانی کہتے ہیں۔ اس کی بے چینی کسی قدر کم ہوگئی تھی۔

یہ تو کوئی نہیں جانتا کہ اگلے لمحہ کیا ہونے والا ہے۔ اس ہونے کے لیے ہی انسان نادانیاں اور جذباتی فیصلے کرتا رہتا ہے۔ وہ بڑی دیر سے ٹہل رہا تھا۔ ذرا اطمینان ہوا تو آرام سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ تنہائی پسند ہوگیا تھا اور تنہا ہوتے ہی وہ اسے سامنے بٹھا کر سوچتا رہتا تھا۔

ایک ملازم نے آکر کہا۔ "سمیرا صاحبہ تشریف لائی ہیں۔"

سمیرا اسے تصور کی آنکھوں سے دکھائی دی۔ وہ اس کے کاروباری معاملات میں مصروف رہنے لگی تھی۔ اس قدر ذمے داریوں کا بوجھ اٹھا رہی تھی کہ محبوب سے ملنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا اور محبوب تو خود اپنے آپ کو وقت نہیں دے پارہا تھا۔ اس نے کہا۔ "انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں آتا ہوں۔"

ملازم چلا گیا۔ وہ خیالوں کی نگری میں رہنے کا ایسا عادی ہوگیا تھا کہ وہاں سے آکر کسی سے بولنا بھاری لگتا تھا۔ اس کے باوجود سمیرا بہت اہم تھی۔ وہ اسے نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔

وہ ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ سلام کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے صوفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو۔ کیسی ہو؟"

وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "شاید اچھی ہوں۔"

"شاید کیوں کہہ رہی ہو؟ تمہیں اپنے بارے میں پوری طرح یقین ہونا چاہیے۔"

"آپ نے اس قدر مصروف کردیا ہے کہ میں آئینے میں بھی خود کو دیکھ نہیں پاتی ہوں۔"

وہ سنجیدگی سے بولا۔ "اس سے بڑا ظلم ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک جوان لڑکی کو آئینہ دیکھنے سے محروم کردیا جائے۔"

"آپ دفتر آتے رہیں گے۔ مجھے گائیڈ کرتے رہیں گے تو یہ ظلم نہیں ہوگا۔"

"میں تھوڑی دیر کے لیے ہی' دفتر اٹینڈ کرتا رہتا ہوں۔"

"ایسے وقت جب میں فیلڈ ورک میں یا دوسرے دفتری معاملات میں مصروف رہتی ہوں۔ جب ملنے آتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ جاچکے ہیں۔"

"ہاں تم سے ملاقات نہیں ہوتی لیکن تمہارے بارے میں مکمل رپورٹ ملتی رہتی ہے۔ تم میری توقعات سے زیادہ تمام ذمے داریوں کو سنبھال رہی ہو۔"

"شکریہ۔ ذمے داریاں اس قدر ہیں کہ کوئی مجھے سنبھالنے والا نہ ہوا تو بیمار ہوجاؤں گی۔"

اس کی یہ بات دور تک سمجھ میں آگئی۔ وہ انجان بن کر بولا۔ "ایسا کرو کہ قابل افراد کو انٹرویو کے لیے کال کرو

اور اپنے لیے دو معاون رکھ لو۔ کام کچھ ہلکا ہوجائے گا۔"

سمیرا نے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ "آپ نہیں سمجھیں گے۔ بلکہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھنا چاہیں گے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"کیا کہوں...... میں غلطی پر ہوں۔ آپ کے متعلق خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہوں۔"

"انسان کی زندگی میں کئی راستے انتخاب کے لیے ہوتے ہیں۔ اگر ایک راستہ مناسب نہ ہو یا آگے بڑھنے میں رکاوٹ ہو تو دوسرا تیسرا راستہ اختیار کرلینا چاہیے۔"

وہ بولی۔ "دل بہت ضدی ہوتا ہے۔ ہماری نہیں مانتا۔ اسی ایک راستے پر چلنے کے لیے مچلتا ہے۔"

"اس کو دیوانگی کہتے ہیں۔ میں تمہیں کیا کہوں' خود ہی دیکھ رہا ہوں کہ میرے راستے میں کانٹے ہی کانٹے ہیں اور بہت دور' میری پہنچ سے بہت دور ایک پھول کھلا ہے اور میں کچھ سوچے سمجھے بغیر کانٹوں سے گزر رہا ہوں۔ میری جان جاتی رہے گی اور وہ ہے کہ دل سے نہیں جائے گا۔"

"میرے دل کا بھی یہی آخری فیصلہ ہے۔ جان جائے' وہ پیار نہ جائے جو رگ رگ میں سما گیا ہے۔"

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ "ہم سب اپنے دل سے مجبور رہتے ہیں۔ جب دل مجبور کرتا ہے تو دماغ کسی کام کا نہیں رہ جاتا۔ کسی کی نصیحت اثر نہیں کرتی۔ کسی کا مشورہ قابل قبول نہیں ہوتا۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہورہا ہے۔ اس دل میں جو پیار سما گیا ہے' وہی پہلا اور آخری ہے۔ کوئی اور وہاں کبھی نہیں سمائے گا۔"

"پھر میری طرح تمہاری توجہ کاروباری مسائل سے اور اپنی ذمے داریوں سے کم ہوتی چلی جائے گی۔ ہوسکتا ہے' میری طرح تم بھی کسی کام کی نہ رہو۔"

اس نے بڑے اعتماد سے محبوب کو دیکھا پھر کہا۔ "ایسا نہیں ہوگا۔ ماروی آپ سے بہت دور ہے۔ اسے کبھی کبھی دیکھنے کے لیے آپ کو بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ میں نے تو آپ کا پورا کاروبار سنبھالا ہے۔ میں تو آپ کے سائے میں رہتی ہوں۔

میرے اندر یہ جذبہ ہے کہ آپ کو قائل کرنے کے لیے کاروبار کو کبھی ڈوبنے نہ دوں۔ آپ کی عزت' شہرت' عظمت اور شخصیت کو بحال رکھوں اور ایسا کرتے کرتے کسی دن بوڑھی ہوجاؤں گی۔ آپ بولیں' اس سے اچھی اور سچی محبت اور کیا ہوگی؟"

اس کی سوچ نے کہا۔ "واقعی یہ میرے اربوں کے کاروبار کو ڈوبنے نہیں دے گی۔ یہی تو پیار کی عظمت ہے۔" وہ دل سے متاثر ہوکر بولا۔ "اور میں بھی خالی ہاتھ بوڑھا ہوجاؤں گا۔ وہ جس کی امانت ہے اسے ملے گی۔"

"آپ کی دیوانگی سے میں نے سیکھا ہے' اپنے محبوب کو پالینا ضروری نہیں ہے۔ اس کے نام رہنے اور اس کے کام آتے رہنے سے عجیب طرح کا روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔"

"تم بہت اچھی ہو سمیرا! میرا خیال ہے کہ میں سب سے زیادہ تمہیں پسند کرتا ہوں اور تمہاری عزت کرتا ہوں۔"

"شکریہ۔ یہ سُن کر مجھے خوشی ہورہی ہے۔ کیا آپ میری ایک خواہش پوری کریں گے۔"

اس نے ایک ذرا سوچتے ہوئے اسے دیکھا وہ بولی۔ "میں ماروی کا کوئی حق نہیں مانگوں گی۔"

وہ مطمئن ہوکر بولا۔ "پھر تو کھل کر بولو۔ میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔"

"کیا آپ کا جی نہیں چاہتا کہ ماروی کے ساتھ باہر کہیں تھوڑا وقت گزاریں؟"

"بہت دل چاہتا ہے۔"

"آپ میرے ساتھ نیکی کریں گے تو آپ کے ساتھ بھی نیکی ہوگی۔ آپ میرا دل رکھیں گے تو وہ بھی آپ کی دلی خواہش کو ضرور سمجھے گی۔"

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "میں چاہتی ہوں ہر ہفتہ کی کوئی ایک شام میرے ساتھ گزاریں۔ ہوسکے تو میرے ساتھ ڈنر کریں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہوں گی۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "تم مستحق ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہر ہفتے کی کوئی شام گزاروں گا۔"

وہ وال کلاک کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ دل سے وعدہ کررہے ہیں تو ابھی شام کے پانچ بجے ہیں۔"

دوسرے دن ماروی میمن گوٹھ جانے والی تھی۔ وہ وسوسوں اور اندیشوں میں مبتلا تھا۔ سمیرا کے ساتھ سکون سے شام نہیں گزار سکتا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "آج نہیں۔ کیا بتاؤں' کل تک بڑی الجھنیں ہیں۔"

"کیا کل کے بعد الجھنیں نہیں رہیں گی؟"

"ہاں۔ پھر دو دنوں کے بعد جیل میں ملاقات کی تاریخ ہے۔ وہ مراد سے ملنے جائے گی۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "ایسے وقت اس کی سیکیورٹی کے انتظامات کرنے ہوں گے۔"

''یوں پہلے وعدہ کا پہلا ہفتہ گزر جائے گا۔آپ میرے ساتھ شام نہیں گزاریں گے۔''

''گزاروں گا۔زبان دی ہے تو ہر ہفتہ کی ایک شام تمہیں ضرور دوں گا۔سمیرا......!ابھی میں بیان نہیں کرسکتا کہ میرا ذہن کس بری طرح الجھا ہوا ہے۔''

''میں سلجھادوں گی۔میں آپ کو ماروی سے نہیں ملا سکتی لیکن اس کی پرچھائیں سے ملادوں تو آپ ابھی چلیں گے؟''

وہ ایکدم سے صوفہ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔حیرانی سے بولا۔''ماروی کی پرچھائیں......؟''

''ہاں۔آرٹس کونسل میں عمر ماروی کا ڈراما اسٹیج ہو رہا ہے۔میں مکمل اعتماد سے دو ٹکٹیں لے آئی ہوں۔میرا دل کہہ رہا تھا' آپ انکار نہیں کرسکیں گے۔''

وہ صوفہ سے اٹھ کر بولا۔''تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔بس میں ابھی چینج کر کے آرہا ہوں۔''

وہ تیزی سے پلٹ کر چلا گیا۔وہ بڑے دکھ سے مسکرانے لگی۔دکھ اس بات کا تھا کہ وہ ماروی کے نام سے جا رہا تھا۔مسکراہٹ اس لیے تھی کہ اس نے محبوب کی قربت کو آج شام اپنے نام کرلیا تھا۔

وہ فوراً ہی لباس تبدیل کر کے آگیا۔اس نے عمر ماروی کی داستان کبھی پڑھی تھی پھر اس کی زندگی میں ماروی آئی تو اس نے کئی بار سوچا کہ اس کی وہ داستان ضرور پڑھے گا۔

اس نے کوٹھی سے باہر آکر سمیرا کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔وہ خوش ہوگئی' ایک مدت کے بعد اسے محبوب کے برابر بیٹھنا نصیب ہو رہا تھا۔

ویسے برابر بیٹھنے والے کا مزاج اس کے برابر نہیں تھا۔وہ فطرتاً خاموش رہتا تھا۔وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے یوں ڈرائیو کر رہا تھا۔جیسے دور جانِ حیات کے پاس پہنچ گیا ہو۔وہ بولی۔''محبوب صاحب......!یہ درست نہیں ہے۔''

اس نے خیالات سے چونک کر پوچھا۔''کیا......؟''

''ڈرائیو کرنے کے دوران میں وہاں نہیں جانا چاہیے؟''

اس نے تعجب سے پوچھا۔''کہاں......؟''

''ماروی سے کہہ دیں جب کہیں آرام سے بیٹھیں گے تو اس کے پاس آجائیں گے۔''

وہ مسکرا کر رہ گیا۔سمیرا نے کہا۔''عشق کیا عجیب ہوتا ہے جو غائب ہوتی ہے اسے حاضر کر دیتا ہے اور جو حاضر بیٹھی ہے اسے غائب کر دیتا ہے۔''

وہ عاجزی سے بولا۔''پلیز مائنڈ نہ کرو۔میں نہ چاہوں' تب بھی وہ دماغ میں آجاتی ہے۔''

''وہ بہت اچھی ہے۔آپ مجھ سے بولتے رہیں گے تو میرا لحاظ کرے گی۔یہاں نہیں آئے گی۔''

جب باتیں کرتے رہو تو کسی طرح کی سوچ نہیں آتی۔ ذہن باتیں کرنے والے یا والی کے ساتھ لگا رہتا ہے۔سمیرا نے اسے اپنی طرف متوجہ رکھنے کا ایک نفسیاتی پہلو پیش کیا تھا۔

وہ مسکرا کر بولا۔''بے شک تم بہت ذہین ہو۔مجھے خود سوچنا چاہیے' جو موجود ہے اسے پوری توجہ سے کمپنی دی جائے۔''

وہ مسکرائی۔''تھینک یو۔''

''اچھا یہ بتاؤ گھر میں تمہارے والدین کے علاوہ اور کتنے رشتے دار ہیں؟''

''صرف والدین ہیں۔ویسے رشتے دار تو بہت ہیں۔وہ سب رسمی طور پر آتے جاتے رہتے ہیں۔''

''تم کھانا پکاتی ہو؟''

''امی پکاتی ہیں اور ایسا لذیذ پکاتی ہیں کہ ہم انگلیاں چاٹتے لگتے ہیں۔سی فوڈز کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔آج امی نے فرائی فش اور جھینگے پیاز کا سالن پکایا ہے۔''

''اوہو۔میں تو جھینگے بہت شوق سے کھاتا ہوں۔''

''تو پھر آرٹس کونسل کے بعد میرے گھر چلیں۔پہلی بار گھر چلنے کو کہہ رہی ہوں۔پلیز......انکار نہ کریں۔''

''میرے وعدے کے مطابق آج کی شام تمہاری ہے۔جہاں لے جاؤ گی' جاؤں گا۔''

اس کے حلق سے مسرت بھری چیخ نکلی۔اس نے فوراً ہی فون نکال کر اپنی والدہ کے نمبر پنچ کیے۔رابطہ ہونے پر کہا۔''امی! آج میں بہت خوش ہوں۔محبوب صاحب آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ابھی آرٹس کونسل جارہے ہیں۔ہم شاید گیارہ بجے تک آئیں گے۔''

اس نے محبوب کو دیکھتے ہوئے کہا۔''یہ بھی جھینگے بہت شوق سے کھاتے ہیں۔میں نے آپ کے پکوان کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔''

وہ خوشی کے مارے بولتی جارہی تھی۔محبوب چپ چاپ ڈرائیو کرتے ہوئے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کسی کے دل میں خوشیاں بھر دینے سے ہمیں کیسی فخریہ مسرتیں حاصل ہوتی ہیں؟ابھی سمیرا کو خوش ہوتے دیکھ کر مجھے اچھا لگ رہا ہے۔

پھر وہ سوچتے سوچتے بھٹک گیا۔خیال آیا کہ جب میں ماروی کو آرام و آسائش اور خوشیاں دیتا ہوں تو کیا وہ بھی

اسی طرح خوش ہوتی ہوگی؟ کیا میری بے غرض اور بلا معاوضہ محبت کے بارے میں بھی سوچتی ہوگی؟

وہ خیالات سے چونک گیا۔سمیرا فون بند کر کے پوچھ رہی تھی۔''آپ پھر وہاں چلے گئے؟''

وہ فوراً ہی بولا۔''لو آگیا۔''

وہ ہنسنے لگی۔محبوب نے اپنی ایک شام دے کر اسے مسرتوں سے مالا مال کر دیا تھا۔یہ سچ ہے' کسی کے منہ پر مسکراہٹ لانے کے لیے ایک پیسا بھی خرچ نہیں ہوتا۔پھر پتا نہیں کیوں یہ مفت کی چیز کوئی کسی کو نہیں دیتا۔

وہ آڈیٹوریم میں پہنچے تو ڈراما شروع ہو رہا تھا۔پس منظر سے ماروی کا تعارف لوک گیتوں کے ذریعہ پیش کیا جا رہا تھا۔سب سے اگلی قطار میں ان کی دو سیٹیں تھیں۔وہ وہاں جا کر بیٹھ گئے۔

ماروی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔اتنی حسین تھی کہ جو اسے دیکھتا وہ اس کا عاشق ہو جاتا۔

پہلے منظر میں ماروی اسٹیج پر آئی۔ایک بہت ہی حسین لڑکی کو ماروی کا رول دیا گیا تھا۔جیسا ماروی کے حسن و جمال کو بیان کیا گیا تھا۔ویسی تو نہیں تھی مگر ہاں خوبصورت تھی۔کسی حد تک ماروی کی جھلک پیش کر رہی تھی۔

اور محبوب کو اپنی ماروی دکھائی دے رہی تھی۔اس وقت تھر کے ایک گاؤں میں تھی۔وہاں ماں باپ کے کھیت اور کھلیان تھے۔ایک چرواہا ان کے مویشی چرایا کرتا تھا۔وہ ماروی کا عاشق ہوگیا تھا۔اس نے اپنے آقا سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تو آقا نے اسے نوکری سے نکال دیا اور بیٹی کا رشتہ اپنے برابر والے ایک نوجوان سے طے کر دیا۔

وہ چرواہا عمر کوٹ کے شاہ عمر کے محل میں پہنچا۔وہاں اس نے ماروی کے حسن و جمال کی تعریف ایسے دل کھینچنے والے الفاظ میں کی کہ عمر اسے حاصل کرنے کے لیے پاگل ہوگیا۔

اگلے منظر میں ماروی' عمر کے محل میں تھی۔وہ اسے اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا اور وہ انکار کرتی تھی۔کہتی تھی میرا منگیتر ہی میرا محبوب ہے، میری زندگی ہے۔میں اس کے سوا کسی اور کا منہ نہیں دیکھوں گی۔

سمیرا بڑی توجہ سے ڈراما دیکھ رہی تھی۔اس نے محبوب کی طرف جھک کر کہا۔''آپ نے ماروی کو قید نہیں کیا ہے۔حالات نے اس کے مراد کو قیدی بنا دیا ہے۔یہ ماروی اپنے منگیتر سے بچھڑ گئی تھی۔اور وہ اپنے مراد سے نامعلوم مدت کے لیے جدا ہوگئی ہے۔''

سچی دوستی

باپ۔''رات کو کہاں تھے؟''

بیٹا۔''دیر ہوگئی تھی، دوست کے گھر ہی رک گیا تھا۔''(باپ نے اسی وقت فون اٹھایا اور اس کے دس دوستوں کو کال کی)

چھ دوستوں نے کہا۔''ہاں انکل وہ رات میرے پاس ہی تھا۔''

تین نے کہا۔''انکل وہ سو رہا ہے۔آپ کہیں تو اٹھادوں۔''

ایک نے تو حد کردی۔''جی ابو، بولیں۔''

***

بے وقوف

بیٹے نے کہا۔''ابو مجھے اسکول میں جرمانہ ہوگیا ہے۔''

ابو۔''اچھا وہ کیسے؟''

بیٹا۔''ابو میں کل اسکول میں لیٹ گیا تھا اس لیے۔''

باپ نے غصے سے کہا۔''نالائق کہیں کے۔میں تمہیں اسکول پڑھنے کے لیے بھیجتا ہوں لیٹنے کے لیے نہیں بھیجتا، بے وقوف انسان۔''

مرسلہ:افتخار حسین اعوان،مظفر آباد، آزاد کشمیر

محبوب سوچ رہا تھا۔''ہاں میں نے بھی ماروی کو کروڑوں کی کوٹھی دی ہے۔ایک جیسے حالات ہیں۔لاکھوں روپے دیے ہیں پھر بھی وہ مائل نہیں ہو رہی ہے۔''

وہ سوچ رہا تھا۔''مجھ میں اور عمر میں یہ فرق ہے کہ اس نے ماروی کو جبراً قیدی بنا کر رکھا تھا۔میں نے ایسا نہیں کیا ہے۔لیکن وہ میرے احسانات کی ان دیکھی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔''

ڈرامے کا یہ آخری کلائمکس تھا کہ عمر اسے آزاد کر دیتا ہے۔وہ اپنے گاؤں واپس آتی ہے تو بدنام ہوتی ہے کہ محل سے داغدار ہو کر آئی ہے۔

اس کا محبوب اس کا منگیتر بھی اس پر شبہ کرتا ہے۔

ایسے وقت سمیرا اور محبوب نے ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ یہاں بھی ماروی اس کے ساتھ بدنام ہو رہی تھی۔

آرٹس کونسل سے سمیرا کے گھر جاتے وقت کار کی محدود فضا میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر محبوب نے کہا۔ ”پچھلے دنوں گارمنٹس فیکٹری میں آگ لگ گئی تھی۔ درجنوں کام کرنے والی عورتیں اور مرد بری طرح جل کر مر گئے۔ کیا وہ غریب مزدور گناہ گار تھے؟ اگر نہیں تھے تو آگ نے انہیں کیوں جلایا؟“

سمیرا نے کہا۔ ”آگ پھر آگ ہے۔ شیطان ہو یا فرشتہ سب کو جلاتی ہے۔“

”اگر میں اور ماروی اپنی ہتھیلیوں پر آگ رکھیں تو جل جائیں گے۔ سب ہمیں گناہ گار کہیں گے۔ یہ صرف خدا جانتا ہے کہ ہم بے داغ ہیں۔“

”آپ کی نیکیاں اور مہربانیاں آگ بن گئی ہیں۔ ہزار قسمیں کھانے کے باوجود تمام عمر رسوائیاں جلاتی رہیں گی۔“

وہ چپ رہا۔ سوچنے لگا کہ وہ ماروی کے عشق سے باز آجائے تب بھی بدنامی کا داغ کبھی نہیں دُھلے گا۔ وہ تو لگ چکا ہے۔ نیک نامی کو زخمی کر کے ناسور کی طرح اندر جا کر بیٹھ گیا ہے۔ موت کے بعد وہ قبر کے اندر رہیں گے۔ اس وقت بھی بدنامی باہر ہی ٹہلتی رہے گی۔

سمیرا نے کہا۔ ”پھر بھی کوشش کی جاسکتی ہے کہ کھوئی ہوئی نیک نامی بحال ہو جائے۔“

وہ بولا۔ ”ناممکن ہے۔“

وہ بولی۔ ”ممکن ہے۔ جہاں بدنامی ہو رہی ہے وہ جگہ چھوڑ دی جائے۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ ماروی کسی دوسرے علاقہ میں جا کر نئے سرے سے نیک نامی کے ساتھ رہ سکے گی۔“

”وہ کہیں بھی جائے جب تک مراد رہا ہو کر اسے اپنی منکوحہ بنا کر اس کے ساتھ نہیں رہے گا۔ اس وقت تک دنیا اس تنہا جوان لڑکی پر انگلیاں اٹھاتی رہے گی۔“

”وہ تنہا نہیں ہوگی۔ اس کے چاچا اور چاچی سرپرست کے طور پر رہیں گے۔“

”وڈیرا احشمت جلالی جیسے دشمن انہیں جینے نہیں دیں گے اور ایک وڈیرے کی ہی بات نہیں ہے۔ جوان عورت اپنے مرد کے بغیر کہیں محفوظ نہیں رہ سکتی۔“

سمیرا نے مزید بحث نہیں کی۔ یہ سمجھ گئی کہ ماروی اگر کسی دوسرے صوبے یا شہر میں جا کر چھپ کر رہنا چاہے گی تو محبوب اس کے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اسے کہیں جانے نہیں دے گا۔ طرح طرح کے بہانوں سے روک لے گا اور یہی ہو رہا تھا۔

☆☆☆

محبوب کا وکیل احمد صمدانی فائل کھولے مراد کے کیس کی اسٹڈی کر رہا تھا۔ معروف تجلی نے کھلے ہوئے دروازے پر دستک دیتے ہوئے پوچھا۔ ”اندر آسکتا ہوں؟“

صمدانی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے اٹھ کر کہا۔ ”تشریف لائیں جناب! یہ تو آپ ہی کا دفتر ہے۔ اور ہم بھی آپ ہی کے ہیں۔“

معروف نے قریب آکر مصافحہ کیا۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”آپ ہی کے کیس کی اسٹڈی کر رہا ہوں۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”خدا نہ کرے کہ میرا کوئی کیس ہو۔ بھئی قتل کا الزام مجھ پر نہیں مراد علی منگی پر ہے۔“

صمدانی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں الزام مراد پر ہے۔ لیکن مقدمہ آپ لڑ رہے ہیں۔“

”مقدمہ میں نہیں وہ دیوانہ محبوب علی چانڈیو لڑ رہا ہے۔“

”اور ان کی نمائندگی آپ کر رہے ہیں۔“

”ہاں۔ یہی دیکھنا ہے کہ نمائندگی کرتے کرتے کتنے برسوں تک جوتے گھستے رہیں گے۔“

”کورٹ سے سمن آیا ہے۔ بائیس تاریخ کو پیشی ہے۔“

”گویا یہ پہلی پیشی آغاز جنگ ہے۔ اس روز معلوم ہو گا کہ ہوا کا رخ کدھر ہوگا؟“

”ہمارا تو یہی دعویٰ رہے گا کہ قتل کا الزام جھوٹا ہے۔ لیکن وڈیرے نے اسے بڑی مہارت سے الجھایا ہے۔ الجھنوں کو سلجھانے میں پسینا آجائے گا۔“

”ہمارا سراغرساں حماد صدیقی ان کی ہیرا پھیری کی تہ تک پہنچنے کی کوششیں کر رہا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جھوٹ کے پاؤں لمبے نہیں ہوتے۔ وہ زیادہ دور تک نہیں چلتا۔“

”مقدمات سچے ہوں یا جھوٹے انہیں مال کمانے کے لیے دور تک چلایا جاتا ہے۔“

معروف نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ محبوب کے لیے بہت پریشان ہوں۔“

صمدانی نے سر ہلا کر کہا۔ ”مقدمہ مراد کا ہے اور پریشانی محبوب کے لیے ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ وہ مراد کی منگیتر ماروی کے جال میں پھنس گیا ہے۔“

”ایسا نہ کہیں۔ وہ ایک سیدھی سادی سی دیہاتی لڑکی ہے۔ کسی پر جال پھینکنا نہیں جانتی اور سچی بات یہ ہے کہ وہ محبوب کی طرف مائل نہیں ہے۔“

”پھر محبوب صاحب کس امید پر عشق کر رہے ہیں؟“

”وہ کہتا ہے معشوق ملے یا نہ ملے عاشق اس سے پیار کیے جاتا ہے۔ عشق کا ساز ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ سے تالی بجتی رہتی ہے۔“

”اور آپ یقیناً چاہتے ہوں گے کہ یہ تالی نہ بجے۔ کاروبار پر برا اثر پڑ رہا ہوگا؟“

”ہاں۔ اسے پہلے کی طرح پورے دل و دماغ سے بزنس کی طرف توجہ دینی چاہیے اور وہ دل و دماغ ہی ہارتا جا رہا ہے۔“

”میں تو وکیل ہوں۔ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”یہی کر سکتے ہیں کہ مراد کی جلد سے جلد رہائی کی کوشش کر سکتے ہیں۔ وہ باہر آئے گا۔ ماروی کو اپنی منکوحہ بنائے گا۔ محبوب اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ اس کی دلہن بن کر پرائی ہو گئی ہے۔ تب شاید اس کا عشق ٹھنڈا پڑ جائے گا۔“

”جو عشق ہاٹ بزنس کو ٹھنڈا کر رہا ہو وہ کبھی ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ عشق کا حاصل تو بس یہی ہے کہ محبوب صاحب کو ماروی حاصل ہو جائے۔ میری عقل تو یہی کہتی ہے۔“

”یہ تو اپنا بھی ذہن و تجربہ کہتا ہے۔ وہ محبوب کی زندگی میں آکر اسے نارمل بنا دے گی۔ پھر وہ پہلے کی طرح تازہ دم ہو کر بزنس کو رواں دواں رکھے گا۔“

”تو پھر لڑکی کو راضی کریں۔ اسے سمجھائیں مراد دو چار برسوں سے پہلے رہائی پانے والا نہیں ہے۔ میں تو وکیل ہوں یہی کہوں گا کہ رہائی پانے والا ہے۔ وہ اوپر بھی لٹک سکتا ہے۔ اگر وہ اوپر چلا جائے گا۔ تب وہ کیا کرے گی؟“

”تب عورت مجبور ہو جاتی ہے۔ ہوس پرستوں کی اس دنیا میں تنہا نہیں رہ سکتی۔ کسی کو سہارا بنا لیتی ہے۔ جب وہ نہیں آئے گا۔ تب ماروی ضرور مان جائے گی۔“

صمدانی نے کہا۔ ”تب مان جائے گی نا؟“

اس بات پر دونوں نے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ صمدانی نے کہا۔ ”اسے اسی طرح منوائیں۔ پہلی پیشی کے بعد ماروی کے سامنے بولتے رہیں کہ مراد کا مقدمہ کمزور ہے۔ اسے رہائی نہیں ملے گی۔ دوسری پیشی کے بعد بولیں کہ اسے عمر قید کی سزا ہوگی۔ وہ کبھی باہر نہ آسکے گا۔ وہ کبھی اس کی دلہن نہیں بن سکے گی۔“

معروف نے کہا۔ ”ہاں۔ اس کے باوجود وہ مراد کے بغیر ساری زندگی بن بیاہی محبوب کے رحم و کرم پر رہے گی اور محبوب کے ساتھ بدنام ہوتی رہے گی۔“

یہ کہہ کر وہ چپ ہوا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”عورت جلدی نہیں مانتی۔ ماروی انتظار کرے گی کہ شاید آگے جا کر عمر قید میں کمی ہو جائے اور وہ آجائے۔ پیار کے معاملہ میں غریبوں کا عشق بہت پختہ رہتا ہے۔ وہ باؤلی ہے۔ کئی برسوں انتظار کرے گی۔ تب تک محبوب پاگل ہو جائے گا۔“

”پھر تو اس لڑکی کو یہ کہہ کر شاک پہنچایا جائے کہ مراد کو سزائے موت ہونے والی ہے۔“

”عدالتی فیصلہ اس سے چھپا نہیں رہے گا۔ اسے معلوم ہو جائے گا ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔“

”کیا مشکل ہے؟ محبوب صاحب کو اور کوئی لڑکی نہیں ملی تھی عشق کرنے کے لیے؟ اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں جو پہلے ہی کسی کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ وہ مراد کو نہیں چھوڑے گی۔ یہ ماروی کے عشق سے باز نہیں آئیں گے۔“

”یہی سوچ کر ذہن جھنجلا جاتا ہے۔“

”جھنجلانے سے اپنا خون خشک ہوتا رہے گا۔ مسئلہ تو اپنی جگہ جوں کا توں رہے گا۔“

”بس ایک ہی صورت سے حل ہو جائے گا۔ جب مراد کو سچ مچ سزائے موت ہوگی۔“

انہوں نے گہری سنجیدگی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ معروف نے وکیل صمدانی کی طرف جھک کر دھیمے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہونے کو کیا نہیں ہو جاتا۔ جب انسان کو زندہ درگور کیا جاسکتا ہے تو اس زندہ کو تختۂ دار تک بھی پہنچایا جاسکتا ہے۔“

وہ صمدانی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ ”میں بہت مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں۔ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان رہے۔ محبوب کو بھی معلوم نہ ہو۔“

وہ بولا۔ ”جرائم کے ایسے راز جو دنیا کے کسی ریکارڈ روم میں نہیں رہ پاتے وہ وکیلوں کے سینے میں محفوظ رہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ قبر کھودنے کی فیس بتائیں۔“

”دس لاکھ...... نہ کم نہ زیادہ۔“

معروف نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”ڈن......!“

اب تو پہلی ہی پیشی سے مقدمہ کو کمزور کیا جائے گا۔

وہ دونوں میز کے اطراف تھے۔ مقدمہ کی بنیاد کو ہلانے والے ہاتھ اتنی دور سے آگے بڑھ کر مصافحہ کی سختی

سے مل گئے۔

☆☆☆

ماروی کا دل اچانک ہی گھبرانے لگا۔تنہائیوں میں مراد ہی اس کے سامنے آجاتا تھا۔وہ اس سے باتیں کرتی رہتی تھی اور بہلتی رہتی تھی۔لیکن اس وقت اچانک ہی دل گھبرانے لگا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی۔یہ کیا ہورہا ہے؟ مراد تو ٹھیک ہے؟ کہیں بیمار تو نہیں ہوگیا؟ وہاں کون اسے دیکھنے والا ہے؟

اس بات نے اسے رُلا دیا کہ وہ جیل میں بے یارو مددگار پڑا ہے۔محبوب باہر سے مددگار ہے۔اس کے اندر کے دکھ کو تو صرف وہی سمجھتی تھی۔

وہ بیڈ پر پہلو بدلتے ہوئے بولی۔"یاخدا! وہ ٹھیک تو ہے؟ وہ کسی تکلیف میں تو نہیں ہے؟"

وہ ایسے وقت قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاتی تھی۔یہ نہیں جانتی تھی کہ پریشانی اور گھبراہٹ کے وقت کون سی دعا پڑھنی چاہیے۔اسے نماز پڑھنے کے لیے کلام پاک کی چند آیتیں یاد تھیں۔وہ انہیں بار بار پڑھتی رہتی تھی۔

جب کہیں سے کوئی مدد نہ ہو۔کسی کا سہارا نہ ہو اور مراد کی طرف سے چلنے والی ہوا بھی نہ آتی ہو تو خدا کو یاد کر کے یک گونہ سکون ملتا تھا۔دل کہتا تھا' مراد کی سفارش اوپر تک پہنچ گئی ہے۔

پتا نہیں وہ کتنی دیر تک پڑھتی رہی۔پھر بیڈ سے اتر گئی۔اب بھی بے چین تھی۔وہ بہت یاد آرہا تھا۔اس نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا تو وہ نگاہوں کے سامنے مسکرانے لگا۔

ایسے وقت وہ ذرا الجھ جاتی تھی۔پہلے اچھی طرح یقین کرتی تھی کہ کسے دیکھ رہی ہے؟ مراد کو یا محبوب کو......؟

اس وقت اس نے دیکھا کہ اس کی مسکراہٹ بیمار سی ہے۔وہ کسی تکلیف میں ہے۔اس کے پاس آکر رسماً مسکرا رہا ہے۔

یوں یقین ہوا کہ وہ اپنے مراد کو ہی دیکھ رہی ہے۔وہ سچ مچ تکلیف میں ہے۔اسی لیے اس کا دل گھبرا رہا ہے۔"یا اللہ! کیسے معلوم ہو کہ وہ کس حال میں ہے؟"

خدا کے بعد مشکلیں دور کرنے والا بس ایک محبوب ہی تھا۔اچانک بیمار مسکراہٹ گم ہوگئی۔اب اس چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹیں تھیں۔سامنے صورت وہی تھی۔دلدار بدل گیا تھا۔

یوں سمجھ گئی کہ محبوب کو دیکھ رہی ہے۔اس نے مشکل میں اسے یاد کیا تو وہی سامنے آگیا۔وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر اس نے فون کو بیڈ سے اٹھا کر نمبر پنچ کیے۔رابطہ ہوتے ہی اس کی آواز سنائی دی۔"ہیلو ماروی! خیریت تو ہے؟"

وہ دھیمی آواز میں بولی۔"جی آپ کی مہربانیاں ہیں۔خیریت سے ہوں۔"

"پھر کیا بات ہے کہ جاگ رہی ہو۔گھڑی دیکھو رات کے دو بج رہے ہیں؟"

"آپ بھی جاگ رہے ہیں۔"

"آں...... ہاں!" وہ فوراً جواب نہ دے سکا۔بیڈ روم میں زیرو پاور کی دھیمی سی روشنی تھی اور سامنے بڑے سے ٹی وی اسکرین پر ماروی دکھائی دے رہی تھی۔اسکرین پر اندھیرا سا تھا۔اس ماحول میں یوں لگتا تھا کہ وہ اندھیرے میں اس کے پاس آگئی ہو۔وہ بولا۔"ہاں میں بھی جاگ رہا ہوں۔یہ محرومیاں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔سونے نہیں دیتیں۔"

وہ محرومی کا مطلب سمجھ گئی۔اشارہ اسی کی طرف تھا۔

وہ بولا۔"مراد یاد آرہا ہے نا؟"

اس نے دردبھری آواز میں کہا۔"ہاں......!"

اس کے منہ سے ہاں ایسے نکلی جیسے دل سے آہ نکلی ہو۔

محبوب نے بھی کہا۔"آہ......! بہت یاد آتی ہے۔یہ یادیں بہت تڑپاتی ہیں۔"

وہ اس کے حوالے سے اپنی بات کر رہا تھا اور یہ صاف سمجھ میں آرہا تھا۔ادھر ماروی کی جدائی ستا رہی تھی۔ادھر مراد کی جدائی رُلا رہی تھی۔

"میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں کہو۔سن رہا ہوں۔"

"کیا کہوں؟ کیسے کہوں؟ آپ خود الجھے ہوئے ہیں۔"

"یہ تقدیر کا تماشا ہے۔ہم دونوں کی الجھنیں ایک ہی ہیں۔میری بات نہ کرو۔اپنی تکلیف بیان کرو۔یقیناً تم نے بہت مجبور ہو کر مجھے کال کی ہے۔"

"ہاں میرا دل گھبرا رہا ہے۔بار بار یہی بات دماغ میں آرہی ہے کہ مراد بیمار ہوگا یا کسی مشکل میں ہوگا۔"

"خدا نہ کرے وہ کسی مشکل میں ہو۔میں نے جیلر کو اپنی مٹھی میں رکھا ہے۔مراد کو کوئی پریشانی ہوگی تو وہ دور کرے گا۔خدا نہ کرے کوئی بڑا مسئلہ ہوگا تو مجھے کال کرے گا۔تم فکر نہ کرو۔وہ وہاں آرام سے ہے۔"

وہ بولی۔"جیل والا اس کی تکلیف کو نظر انداز کر سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری پریشانی سمجھ رہا ہوں۔ کل صبح اس سے فون پر مراد کی خیریت معلوم کروں گا۔"

وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔ "کل صبح......؟"

"ہاں۔ اتنی رات کو وہ سو رہا ہوگا۔"

دوسری طرف ذرا خاموشی رہی۔ پھر وہ بولی۔ "یہ کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگتا۔ مگر کیا کروں......؟"

"کیا کہنا چاہتی ہو بولو؟"

"میں۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ پر...... پھر بوجھ ڈالنا چاہتی ہوں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "مجھ پر بوجھ کیسا؟"

"کیا کہوں؟ یہ سوچ کر ندامت سی ہوتی ہے کہ آپ میری سہولتوں کے لیے پانی کی طرح دولت بہا رہے ہیں۔ وہ جیلر مراد سے بات کرانے کے پھر پیسے لے گا۔"

وہ بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ "اتنا تو تم سمجھ رہی ہو کہ میری دولت نہیں بہہ رہی ہے۔ میں بہتا جا رہا ہوں۔"

یہ بات سمجھنے کی تھی اور وہ سمجھ رہی تھی۔ یہ دیکھتی آ رہی تھی کہ اسی کی سمت بہتا آ رہا ہے۔ وہ ساحل تھی اور وہ لہر لہر اس سے ٹکرا کر واپس چلا جاتا تھا۔ کیا وہ اسی طرح بہتے بہتے ڈوب جائے گا؟ یہ تو ظلم ہوگا۔ کیسی بیدردی ہوگی کہ اسے کسی تنکے کا بھی سہارا نہیں ملے گا۔

وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ محبوب نے کہا۔ "میں تمہارا آرام تمہاری نیند چاہتا ہوں۔ سو جاؤ۔ صبح پوری کوشش کروں گا کہ مراد سے تمہاری بات ہو جائے۔"

"یا اللہ! میں اس کی آواز سنوں گی؟"

"میں جو کہتا ہوں کرو۔ ابھی فون بند نہ کرو۔ اسے کان سے لگائے رکھو اور بیڈ پر جا کر لیٹ جاؤ۔"

ماروی نے خیالی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ سامنے تھا اور اسے سونے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔

اس نے پوچھا۔ "میں جو کہہ رہا ہوں، وہ کر رہی ہو؟"

وہ فون کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہاں۔"

"اب فون بند کر کے آنکھیں بند کرو۔ اللہ نے چاہا تو کل صبح تمہاری مراد پوری ہوگی۔"

اس نے فون بند کر کے دیکھا۔ صبح جس سے بولنے والی تھی، وہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پیاری سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی سماعت میں محبوب کی آواز سنائی دی۔ "سو جاؤ......!"

اس نے بڑے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے فرشی بستر پر سو رہا تھا۔ خواب گہری نیند میں آتے ہیں۔ وہ آ گئی تھی۔

وہ خیالوں میں دن رات رہتی تھی۔ خوابوں میں کبھی کبھی آتی تھی۔ اور جب بھی آتی تھی۔ اس کی فکر و پریشانیاں بڑھا دیتی تھی۔

اس نے پچھلی بار خواب میں دیکھا تھا کہ اس کا رہن سہن اور اس کا انداز بدل گیا ہے۔ وہ اونچی سوسائٹی کی ایک حسین دوشیزہ دکھائی دے رہی تھی۔ بڑے لوگوں کی محفلوں میں اس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ اس محفل میں مراد اس کے آگے پیچھے تھا۔ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ محبوب نظر آ رہا تھا۔ اس نے تاج محل کا تحفہ اسے پیش کیا تھا۔ اکثر خواب اشارہ دیتے ہیں کہ کیا ہونے والا ہے؟ نہ ہو تب بھی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جو دیکھا ہے، وہ ہونے والا ہے۔

اب بھی وہ فرشی بستر پر پڑا دل توڑنے والا خواب دیکھ رہا تھا۔ ماروی رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "میں کیا کروں؟ محبوب صاحب اپنی مہربانیوں سے حواس پر چھا گئے ہیں۔"

وہ بولا۔ "مہربانیاں متاثر کرتی ہیں۔ رلاتی نہیں ہیں۔"

"میں اس لیے رو رہی ہوں کہ محبت اور شرافت کے تقاضے پورے نہیں کر سکتی۔ مہربانیوں کا جواب مہربانیوں سے نہیں دے سکتی۔ میں انسانیت سے خالی ہو گئی ہوں۔ میں ان کے سامنے منہ پھیر کر رہتی ہوں جیسے ان کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ جبکہ اہمیت ہے۔ میری عزت اور شرافت کا وہ محافظ سب سے اہم ہو گیا ہے۔ وہ نہ ہوتا تو میں کہاں ہوتی؟ میں تو اس معاشرے کی ایک لٹی پٹی لڑکی کہلاتی۔

وہ بالکل اکیلے ہیں۔ میری طرف آنے والے پتھروں کو روک رہے ہیں۔ مجھے تو ان کی پاؤں کی جوتی بن جانا چاہیے۔ لیکن میں تمہارے حقوق انہیں نہیں دے سکتی۔ دل سے مجبور ہوں۔ تمہارے ہی نام سے جیوں گی...... لیکن میرا ضمیر......؟" وہ بڑی ندامت سے بولی۔ "میرا ضمیر مجھے جینے نہیں دے گا۔ یہ ضمیر کہتا ہے، انسان کو اس کی انسانیت کا اور نیکیوں کا صلہ دو۔ نہیں دو گی تو یہ تمہاری خود غرضی اور بے حسی ہوگی۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔ "یہ کھلی ہوئی سچائی ہے کہ سائیں ہم پر رحم کر رہے ہیں اور ہم ان پر ظلم کر رہے ہیں۔ ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ کیوں نہیں کر سکتے؟ کم از کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ ان پر ظلم نہ کریں اور یہی سمجھ

میں نہیں آتا کہ ایسا کیا کریں کہ ان پر ظلم نہ ہو۔ کچھ تو انہیں صلہ دیں۔"

وہ بولی۔ "سیدھی سی بات ہے۔ ایک ہی صلہ ہے کہ وہ مجھے چاہتے ہیں۔ میں ان کی ہو جاؤں۔

اور یہ کوئی بڑی بات تو نہیں ہے۔ بڑی آسانی سے ہو جاؤں گی۔ لیکن پھر کیا ہوگا؟

انہیں میرا بدن ملے گا۔ روح نہیں ملے گی انہیں میری خدمت گزاری ملے گی۔ پیار میں بھیگی ہوئی ماروی نہیں ملے گی اور جب پوری کی پوری خود کو نہیں دے سکوں گی۔ اندر سے تمہاری رہوں گی تو یہ سائیں سے سراسر بے ایمانی ہوگی۔"

وہ روتے روتے بولی۔ "میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟ کہیں جا کر چھپ جاؤں، نظر نہ آؤں تو میری طلب نہیں رہے گی۔ پھر بھی مطلوب رہوں تو مر جاؤں۔"

اچانک آنکھ کھل گئی۔ وہ کوٹھری کی تاریکی میں فرشی بچھونے پر پڑا ہوا تھا۔ فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ وہ فوراً ہی کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے خیالوں میں وہ اب تک رو رہی تھی۔

دل کو جکڑ لینے والے خواب اکثر فجر کو اس وقت آتے ہیں۔ جب رات دم توڑتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک تاریکی میں آنکھیں پھاڑے سوچتا رہا۔ پھر سپاہی نے معمول کے مطابق آ کر نماز کے لیے دروازہ کھول دیا۔

اس نے پچھلے روز نماز کے بعد پیش امام کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا تھا اور انہوں نے دینی احکامات کے مطابق مشورہ دیا تھا کہ قتل کا مقدمہ برسوں چلتا رہے گا۔ اس لڑکی کو اپنے بھروسے پر بن بیاہی نہ رہنے دو۔

مراد نے کہا تھا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں؟ وہ میرے سوا کسی اور کی منکوحہ نہیں بنے گی۔"

انہوں نے کہا تھا۔ "کسی سے نکاح نہیں کرے گی تو گمراہ ہو جائے گی یا گمراہ کر دی جائے گی۔ کمزور عورت جبر اور تشدد کے آگے ہار جاتی ہے۔ آبرو لٹا کر ہار جانے سے پہلے ہی ایک محافظ مرد کی منکوحہ بن جانا چاہیے۔"

وہ نماز پڑھنے کے بعد قیدیوں کے ساتھ بیٹھ کر کلام پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ کوئی بھی مسئلہ حل نہ کیا جائے تو وہ عبادت کے دوران میں الجھاتا ہے۔ اور یہ غلط ہو رہا تھا کہ وہ تلاوت کے دوران میں بھی بار بار آ رہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر کتاب کو چوم کر آنکھوں سے لگا کر بند کر دیا۔ کیا کرے؟ دماغ میں ہلچل سی مچی تھی۔ سوتے وقت خوابوں میں اور جاگتے وقت خیالوں میں محبوب کی نیکیاں اور احسانات تھے کہ ان کے ضمیر سے صلہ مانگ رہے تھے۔

وہ صلہ نہیں دے سکتی تھی اس لیے رو رہی تھی۔ مراد پر فرض تھا کہ اس کے آنسوؤں کو پونچھے۔ وہ بھٹک رہی تھی۔ اسے اس راہ پر لگائے، جہاں اس کی سلامتی یقینی تھی۔

مسئلہ ایک نہیں تھا۔ مسائل کا انبار تھا۔ وہ جیل کی چار دیواری میں رہ کر نہیں جانتا تھا کہ باہر ماروی کے لیے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں اور آج رات وہ ایک دلہن کیلی کو رخصت کرنے میمن گوٹھ کے میدانِ جنگ میں جانے والی تھی۔

عبادت کے بعد اس کی ڈیوٹی جیل کے باورچی خانے میں ہوتی تھی۔ وہ ادھر جانے لگا تو ایک سپاہی نے آ کر کہا۔ "ادھر چلو۔ جیلر صاحب نے بلایا ہے۔"

وہ اس کے پیچھے آفس میں آیا۔ وہاں جیلر میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بولا۔ "ہماری نوکری ہی ایسی ہے۔ ادھر سے ادھر ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی قانون کی طرف، کبھی مجرموں کی طرف۔ تیری لگائی کیا چیز ہے؟ وہ چانڈیو صاحب کو دوڑاتی ہے۔ چانڈیو صاحب ہمیں دوڑاتے ہیں۔ تیری کال آنے والی ہے۔"

مراد کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ وہ اپنی ماروی کی آواز سننے والا تھا۔ جیلر نے کہا۔ "پتا نہیں کتنی دیر میں کال آئے گی۔ تجھے کہاں بٹھائیں؟ قیدی ہمارے سامنے زمین پر اکڑوں بیٹھتے ہیں۔ مگر تو تو وی آئی پی ہے۔ مگر قیدی تو پھر قیدی ہی ہوتا ہے۔ تجھے سر پر تو نہیں بٹھا سکتے۔"

اس نے ایک سپاہی سے کہا۔ "آج ایک نیا حوالاتی آیا ہے۔ اسے لے آ۔"

سپاہی دوسرے کمرے میں گیا اور جیل میں آنے والے ایک دبلے پتلے سے بوڑھے قیدی کو پکڑ کر لے آیا۔ جیلر نے کہا۔ "اے بڈھے! چل گھوڑا بن جا۔"

وہ تھرتھراتے ہوئے دونوں گھٹنے اور دونوں ہاتھ فرش پر ٹیک کر گھوڑا بن گیا۔ جیلر نے ہنستے ہوئے مراد سے کہا۔ "لے بھئی وی آئی پی تیرے لیے کرسی بن گئی۔ دیکھ کیسی ریڈی میڈ ہے۔ بیٹھ جا۔"

مراد پریشان ہو گیا۔ اس بوڑھے کو دیکھتے ہی اسے اپنا مقتول باپ دکھائی دیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔ "حضور! میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

جیلر دلاور جان کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ "اور میں

جو کہہ رہا ہوں بیٹھنے کے لیے؟"

"آپ ہمارے حاکم ہیں۔ ہم غلام ہیں۔ آپ کے کسی حکم سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ مگر یہ بہت بوڑھے ہیں۔ باپ کی جگہ ہیں۔"

اس نے کہا۔ "تُو قاتل ہے تو تیرا یہ باپ چور ہے۔ بہت بڑی چوری کے الزام میں آیا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "جیسے میں جھوٹے الزام میں آیا ہوں۔"

"زیادہ نہ بول۔ بیٹھ جا۔"

وہ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے آگے سر جھکا کر بولا۔ "حضور! شرم سے مرجاؤں گا۔ مجھے کھڑا رہنے دیں۔"

وہ میز پر سے فون اٹھا کر بولا۔ "میں زیادہ نہیں بولتا۔ میرے فون پر کال آنے والی ہے۔ اس کا سوئچ آف کردوں گا۔ تیری لگائی وہاں ہیلو ہیلو چیختی رہے گی۔"

مراد نے تڑپ کر فون کو دیکھا۔ یوں لگا کہ جسم سے جان کھینچ لی گئی ہے۔ وہ پھر ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔ "میں مرجاؤں گا۔"

"گھوڑے پر بیٹھ کر زندہ رہے گا اور اب تو اس پر بیٹھ کر ہی فون پکڑے گا۔ نہیں تو کوئی بات نہیں ہوگی۔"

وہ دیدے پھیلا کر بوڑھے قیدی کو دیکھنے لگا۔ تصور میں دکھائی دیا۔ وہ تھرتھراتے ہوئے بوڑھے کی پیٹھ پر بیٹھا اپنی محبوبہ سے، اپنی جان حیات سے پیار بھری باتیں کر رہا ہے۔

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ایسے وقت تو محبت بھری گفتگو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پیٹھ پر تو گالیاں دینے کے لیے بیٹھا جاتا ہے۔

پیٹھ پر وہ بیٹھتے ہیں جو مغرور اور بد دماغ ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو لوگ تہذیب کی پیٹھ پر سوار ہو کر جیلوں میں آتے ہیں۔

مراد نے اس کمزور بوڑھے کو دیکھا۔ کسی کی پشت پر بیٹھنا' تہذیب کی دھجیاں اڑاتا ہے۔ کیا وہ ایک بزرگ کی پشت پر سوار ہو کر اپنی ماروی کے دُکھ درد کو اور مسائل کو سمجھ سکے گا؟

"نہیں۔" وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "میرے منہ سے آواز نہیں نکلے گی۔ یہ ماروی سے پیار نہیں ہوگا۔ اس کی توہین ہوگی۔

اور میں نے اس کی آواز نہ سنی تو کیا جیل کو کوٹھری میں سکون سے رہ سکوں گا؟"

دلاور جان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہارے جیسے چور' بدمعاش اور قاتل یہاں آتے ہیں۔ تم سے بھی زیادہ خطرناک قیدیوں کے ساتھ تماشے کرنے کا مزہ آتا ہے۔ ہم تمہاری اوقات دکھاتے ہیں کہ دیکھو تم سب جوتوں کی نوک پر رہنے والے بدمعاش ہو۔ یہاں تمہاری دہشت اور بدمعاشیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔"

"میں بدمعاش' قاتل اور دہشت گرد نہیں ہوں۔ میں باہر بھی سر جھکا کر چلتا رہا ہوں۔ یہاں بھی سر جھکا رہتا ہے۔ آپ میری گردن کاٹ کر پھینک دیں۔ لیکن فون بند نہ کریں۔ میری ویران زندگی میں وہی ایک آواز ہے جو مجھے زندہ رکھتی ہے۔"

"تو اتنی دیر سے بھونک رہا ہے اور حکم نہیں مان رہا ہے۔ قسمت کا دھنی ہے کہ میں چانڈیو صاحب کا لحاظ کر رہا ہوں۔ ورنہ اب تک پٹائی شروع ہوجاتی۔"

"میں آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ دیتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے ایسا حکم نہ دیں۔ میں آپ کے پاؤں پکڑتا ہوں۔"

وہ میز کے دوسری طرف جیلر کے قدموں میں جانا چاہتا تھا۔ دو سپاہیوں نے اسے پکڑ کر پیچھے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پھر اس بوڑھے کی طرف آگیا۔ وہ ابھی تک فرش پر گھوڑا بنا ہوا تھا۔

اچانک جیلر کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے نمبر پڑھ کر مسکراتے ہوئے فون کو فضا میں بلند کیا پھر کہا۔ "چانڈیو صاحب کال کر رہے ہیں۔ اب بول کیا بولتا ہے؟"

مراد نے پریشان ہو کر بوڑھے قیدی کو دیکھا۔ جیلر نے کہا۔ "اس پر بیٹھے گا تو اسے آن کروں گا۔ بات کراؤں گا۔ ورنہ یہ ابھی بند ہوجائے گا۔"

اس کا دل فون کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس فون کے پیچھے محبوب تھا اور محبوب کے بعد ماروی بولنے والی تھی۔ وہ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "حضور یہ بزرگ ہے۔ میرے ہی نہیں' آپ کے والد کے بھی برابر ہے۔"

وہ ایکدم سے گرجتے ہوئے گالیاں دیتے ہوئے بولا۔ "کتے! میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔ یہ تیرے جیسے حرامیوں کا باپ ہے۔ تُو اسے میرے باپ کے برابر کہہ رہا ہے؟ تیری شامت آگئی ہے۔ اب میں چانڈیو صاحب سے لین دین نہیں رکھوں گا۔"

اس نے فون والا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ "اے کتے......! یہ دیکھ......"

یہ کہتے ہی اس نے فون کا گلا دبا دیا۔ کالنگ ٹون کا دم

گھٹ گیا۔ کال کٹ گئی۔ مراد جیسے سانس لینا بھول گیا۔ ماروی آتے آتے واپس چلی گئی تھی۔

جیلر نے کہا۔ "یہاں میری حکومت ہے۔ تمام قیدی اس فون کی طرح میری مٹھی میں رہتے ہیں۔ ابھی پھر کال آئے گی۔ میں پھر بند کردوں گا۔"

وہ خالی خالی نظروں سے جیل کے حاکم اعلیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مُردہ فون کو دیکھ کر کہا۔ "ماروی! ہم نے بزرگوں کی گود میں بیٹھ کر پیار کرنا سیکھا ہے۔ پیٹھ پر بیٹھ کر تو فرعون بولتے ہیں۔ ہماری محبت کیسے بولے گی؟"

رنگ ٹون پھر چیخنے لگی۔ جیلر نے فون کو میز پر سے اٹھا کر اسے دکھایا پھر کہا۔ "وہ چانڈیو بھی تیری لگائی کا دیوانہ ہے۔ اسے خوش کرنے کے لیے اِدھر گھنٹی بجاتا رہے گا۔"

وہ فون بند کرکے بولا۔ "ابھی پھر گھنٹی بجے گی۔ یہ بھی خوب تماشا ہے۔ دیکھتا ہوں کب تک ہوتا رہے گا؟"

وہ گم صم سا تھا۔ ذہن پر دھند سی چھا گئی تھی۔ اس دھند میں ماروی کی سمت جانے کا راستہ گم ہوگیا تھا۔ وہ اس کے رس بھرے میٹھے لہجے سے محروم ہو رہا تھا۔

گھنٹی پھر بجنے لگی۔ جیلر نے فون اٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ بند ہونے والا ہے۔"

مراد نے بوڑھے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے پھر دونوں ہاتھ ٹیک کر بولا۔ "بابے! ہمیں آج نہیں تو کل مرنا ہی ہے۔ بہت عمر گزار لی۔ ہم خود مرجائیں یا یہ مار ڈالیں۔ مگر اس سے پہلے ایک نیکی کرتا جا۔ میری پیٹھ پر سوار ہوجا۔ میری محبت کو سربلند کردے۔"

بابے نے دیر نہیں کی۔ فرش سے اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ اس کا بوڑھا جسم ہمیشہ ہی ہولے ہولے لرزتا رہتا تھا۔ وہ لرزتے ہوئے اس کی پشت پر سوار ہوا تو جیلر کرسی سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ مراد نے صرف حکم عدولی نہیں کی تھی جیل کی سلطنت کے بادشاہ سلامت کی توہین بھی کی تھی۔

اس نے غصہ سے گرجتے ہوئے گالیاں دیتے ہوئے میز پر سے ایش ٹرے کو اُٹھایا۔ پھر اسے پتھر کی طرح کھینچ کر مارا۔ وہ بوڑھے کے سر پر واقعی پتھر کی طرح لگا۔ بے چارہ مراد کی پشت پر سے لُڑھک کر فرش پر گر کر پھڑپھڑانے لگا۔

دلاور جان دوڑتے ہوئے آکر مراد کو لاتیں مارنے لگا پھر ایک سپاہی سے ڈنڈا لے کر اس کی ہڈیاں توڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ ایسے وقت سپاہی نے چیخ کر کہا۔ "سر! بڈھا مرنے والا ہے۔"

دلاور جان کے جیل کے بادشاہ سلامت کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ جیل میں قیدی مرجائے تو اس کی ساری ذمے داریاں جیلر پر ڈالی جاتی ہیں۔ شاید اس کی شامت آگئی تھی۔

اس نے جھک کر بوڑھے کو دیکھا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ اس کی پیشانی سے لہو بہہ رہا تھا۔ آئندہ یہ جوابدہی لازمی تھی کہ وہ قیدی جیل میں جان لیوا حد تک زخمی کیسے ہوا تھا؟

ایک سپاہی جیل کے ڈاکٹر کو بلانے بھاگتا ہوا گیا تھا۔ جبکہ اسے اسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ لیکن یہ ایسا سنگین معاملہ تھا کہ دلاور جان اسے اندر ہی اندر نمٹا لینا چاہتا تھا۔ ابھی اس آفس کے باہر کسی کو بھنک ملنے والی نہیں تھی۔

وہ بری طرح جھنجلا گیا تھا۔ بیٹھے بٹھائے اس پر قانونی عذاب نازل ہونے والا تھا۔ وہ بوڑھے کے پاس سے اٹھ کر پھر مراد کو لاتوں سے مارنے لگا۔ اور کیا کرتا' اسی پر غصہ اُتار رہا تھا۔ اس نے بھاری بھرکم جوتے پہنے ہوئے تھے۔ یقیناً مار کھانے والے کو ہتھوڑے کی طرح لگ رہے ہوں گے۔

لیکن نہیں لگ رہے تھے۔ اس نے ایک بزرگ کی توہین نہ کرکے پیار کو عزت اور وقار دیا تھا۔ ایسے عاشق فنا ہوجاتے ہیں۔ تب ہی عشق کو لافانی کردیتے ہیں۔

☆☆☆

محبوب پریشان ہوگیا تھا۔ وہ اپنے خاموش فون کو دیکھ کر حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ "بات کیا ہے؟ میں کال کر رہا ہوں اور جیلر اسے کاٹ رہا ہے۔ کیا مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتا؟"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ سوچنے لگا۔ "کیا جیلر کا مزاج بدل گیا ہے؟ یا وہ رشوت کا بھاؤ بڑھانا چاہ رہا تھا؟ کیا سچ مچ مسلمان ہوگیا ہے؟ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ وہ رشوت خور سدھر جائے۔"

اس نے انکار میں سر ہلا کر سوچا۔ "نہیں۔ حرام کی کمائی ایسے لوگوں کے خون میں رچی بسی رہتی ہے۔ یہ لوگ سرکاری تنخواہ سے جی نہیں پاتے۔ جیلر حرام نہیں کھائے گا تو چربی پگھل جائے گی۔ سوکھ کر کانٹا ہوجائے گا۔ پھر بات کیا ہے۔ وہ بار بار کیوں میری کال کاٹ رہا ہے؟

اچانک کالنگ ٹون ابھری۔ وہ لپک کر فون کے پاس آیا۔ اسے بیڈ پر سے اٹھا کر دیکھا۔ ننھی سی اسکرین پر ماروی کا نام روشن تھا۔ وہ اپنی کوٹھی میں مراد کی کال کی منتظر تھی۔ محبوب نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ "ہاں۔ بولو ماروی؟"

میٹھی سی سریلی سی آواز سنائی دی۔ "آپ نے وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ میں بڑی دیر سے رابطہ کر رہا ہوں۔ جیلر اپنی سیٹ پر نہیں ہے۔ راؤنڈ پر نکلا ہوا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں اس سے بات ہو سکے گی۔"

اس نے جھوٹ کہہ دیا کہ جیلر سیٹ پر نہیں ہے۔ اگر سچ کہتا کہ وہ فون پر بات نہیں کر رہا ہے تو وہ مایوس ہو جاتی۔ اس کے چہرے پر جو رونق آئی ہے۔ وہ لوٹ جاتی۔

اس کے باوجود اس نے مایوسی سے پوچھا۔ "بات ہو گی نا؟ جیلر پریشان تو نہیں کرے گا؟"

"نہیں کرے گا۔ میں نے دو گھنٹے پہلے اسے فون کیا تھا۔ تمام معاملات طے کیے تھے۔ وہ راضی ہو گیا تھا۔ لیکن ڈیوٹی ایسی آپڑی ہو گی کہ وہ مجبور ہو گیا ہو گا۔ تم اطمینان سے رہو۔ گھنٹے دو گھنٹے میں ضرور مراد سے باتیں کر سکو گی۔"

وہ مطمئن ہو گئی۔ اس عرصہ میں محبوب پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرنے لگی تھی۔ وہ جو کہتا تھا' کرتا ضرور تھا۔

اور اب محبوب کو یہ فکر ہو گئی تھی کہ مراد سے کیسے بات کرائے؟ آخر وہ جیلر کیوں اس کی کال کاٹ رہا ہے؟

اس نے پھر اسے کال کیا۔ دوسری طرف دیر تک بیل سنائی دیتی رہی پھر پہلے کی طرح بند ہو گئی۔ اب ماتھا ٹھنکا۔ عقل نے کہا۔ مراد سے وہاں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ جیلر کسی وجہ سے ناراض ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مجرموں کی دنیا میں رہنے والے نے رشوت خوری سے توبہ کر لی ہو۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہاں جانا ہی ہو گا۔ اسے تو جیسے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ ماروی ایک بٹن دباتی اور وہ کھلونے کی طرح چل پڑتا تھا۔ وہ بیگ میں ایک بڑی رقم رکھ کر باہر اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ تیز رفتاری سے ادھر جانے لگا۔ اربوں روپے کا کاروبار کرنا بھی بھلا کوئی کام ہے؟ کام تو یہی تھا' اس کے آنسو پونچھتا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹیں لاتا۔

جیلر دلاور جان واقعی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ قسمت اس حد تک ساتھ دے رہی تھی کہ وہ بوڑھا مرتے مرتے بچ گیا تھا۔ اسے آکسیجن ماسک پہنا کر اس کی سانسیں بحال کی جا رہی تھیں۔

صرف ایک پریشانی یہ تھی کہ پیشانی پر زخم کا گہرا نشان ابھی تازہ تھا۔ وہ زخم بھرنے کے بعد بھی نظر آتا رہتا۔ کبھی وہاں مجسٹریٹ کی ٹیم آتی تو وہ بوڑھا اس جیلر کے خلاف بول سکتا تھا۔

محبوب وہاں پہنچا تو دلاور جان گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "دلاور صاحب! کیا بات ہے؟ آپ ہم سے ناراض ہیں؟"

وہ ناگواری سے بولا۔ "سوری چانڈیو صاحب! میں آپ کے ذلیل قیدی کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔"

"پلیز اس کا غصہ مجھے نہ دکھائیں۔ آپ سمجھ دار ہیں۔ غصہ میں بھی یاد رکھیں کہ میری ذات سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ فائدہ ہی فائدہ پہنچ رہا ہے اور آئندہ بھی پہنچتا رہے گا۔"

"آپ کے آدمی سے تو نقصان پہنچ رہا ہے۔ آپ کو پتا نہیں ہے۔ میں اس کی وجہ سے مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ قانون کے شکنجے میں پھنس سکتا ہوں۔"

محبوب نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "مراد نے ایسا کیا کیا ہے؟ آپ اس کی وجہ سے قانونی گرفت میں کیسے آئیں گے؟"

"اس کی نافرمانی کی وجہ سے۔ میں نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ ایک بوڑھے آدمی کی پشت پر بیٹھ جائے۔ لیکن اس نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔"

"کیوں انکار کر دیا؟"

"کہنے لگا۔ میرے ابا کا چالیسواں نہیں ہوا ہے۔ وہ بوڑھا میرے باپ جیسا ہے۔ میں اس پر نہیں بیٹھوں گا۔"

"جان صاحب! اس نے آپ کا حکم نہیں مانا یہ غلطی کی ہے۔ لیکن آپ ایک مقتول باپ کے بیٹے کے دلی جذبات کو سمجھیں جو بوڑھا اسے باپ نظر آتا ہو' وہ اس پر کیسے چڑھ کر بیٹھے گا۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولا۔ "کوئی باپ بیٹے کے جذبات نہیں تھے۔ عاشق معشوق کی بات تھی۔ میں نے کہا۔ اسے اس کی لگائی سے باتیں کرنے کے لیے اس وقت فون دیا جائے گا جب وہ میرے حکم کی تعمیل کرے گا۔"

محبوب نے حیرانی سے کہا۔ "آپ کیا حکم دے رہے تھے؟ وہ ایک بزرگ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنی ماروی سے کیسے باتیں کر سکتا تھا۔ کوئی محبت کرنے والا ایسا کر ہی نہیں سکتا۔"

"ایسی محبت کرنے والے لات جوتے بھی کھاتے ہیں۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "مراد کہاں ہے؟ میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

وہ بولا۔ "آج نہیں مل سکتے۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"آپ پریشانی بتائیں۔ میں دور کروں گا۔"

وہ بولا۔ "مجھے مراد پر غصہ آیا تھا۔ میں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ بوڑھا قیدی زخمی ہو گیا ہے۔ اگر اچانک یہاں مجسٹریٹ چیکنگ ہو گی تو میں پھنس جاؤں گا۔ وہ بوڑھا

میرے خلاف بیان دینے سے باز نہیں آئے گا۔"

"اس بوڑھے کو خریدا جا سکتا ہے۔"

"وہ ابھی مرتے مرتے بچا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکا ہوا ہے۔ خود کو بیچ کر رقم کہاں چھوڑ کر جائے گا۔"

"مرنے والوں کی ضرورتیں دنیا میں رہ جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کی کوئی آخری ضرورت رہ گئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں اس کی ضرورت پوری کروں گا۔ اس شرط پر رقم دوں گا کہ آپ مراد کو معاف کر دیں گے اور ابھی ایک گھنٹے کے اندر ماروی سے اس کی بات کرائیں گے۔"

جیلر نے اسے سوچتے ہوئے دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں ابھی اس بوڑھے بیمار سے معاملہ طے کر کے آتا ہوں۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔ چائے شائے پییں۔"

وہ چلا گیا۔ محبوب نے اسے ناگواری سے جاتے ہوئے دیکھا اور سوچا۔ "اونہہ! ان سرکاری افسروں کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا۔ میں خوب سمجھتا ہوں' یہ ابھی آئے گا۔ بڑی رقم طے کی تو ساری فرعونیت بھول کر مراد کو معاف کر دے گا جبکہ مراد نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ ایک بزرگ کا لحاظ بھی کیا ہے اور محبت کرنے والوں کی عظمت کو بھی برقرار رکھا ہے۔"

اور واقعی دلاور جان نے آفس کے باہر آکر سوچا۔ "بوڑھا قیدی آج ہی یہاں آیا ہے۔ انٹری رجسٹر میں صرف ایک بات کا اضافہ کروں گا کہ وہ زخمی حالت میں یہاں آیا تھا۔ وہ زخم گہرا ہے۔ بعد میں بھی اس کا نشان رہے گا۔"

وہ ہر پہلو پر غور کرتے ہوئے سوچ رہا تھا اور سر ہلا رہا تھا۔ "ہاں۔ اس طرح مجھ پر الزام نہیں آئے گا کہ میں نے اسے زخمی کیا ہے اور میرے دیے ہوئے زخم سے وہ بعد میں مر گیا ہے۔ بہرحال ابھی تو زندہ ہے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔"

وہ آفس میں آکر اپنی کرسی میں بیٹھ گیا۔ پھر محبوب سے بولا۔ "آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ اس بوڑھے کی کوئی آخری ضرورت ہو گی۔ دراصل اس کے بیٹے نے گریجویشن کیا ہے۔ اسے سعودی عرب میں اچھی نوکری مل رہی ہے۔ ایجنٹ پچاس ہزار روپے مانگ رہا ہے۔ اسی لیے رقم حاصل کرنے کے لیے بوڑھے نے چوری کی تھی اور پکڑا گیا تھا۔"

محبوب نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ آگے نہ بولیں۔ میں ابھی پچاس ہزار روپے دے رہا ہوں اور جو فون پر باتیں کرائیں گے اس کے دس ہزار الگ سے دے رہا ہوں۔ آپ مراد کو بلائیں۔"

جیلر نے سپاہی کو حکم دیا۔ "مراد کو یہاں لے آؤ۔"

سپاہی چلا گیا۔ محبوب نے بیگ سے رقم نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے مسکرا کر شکریہ ادا کرتے ہوئے رقم کو میز کی ایک دراز میں رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی مراد سپاہی کے ساتھ آیا تو اسے دیکھتے ہی محبوب کے دل کو چوٹ سی لگی۔ وہ زخمی تھا۔ اس کی مرہم پٹی کی گئی تھی۔ کئی جگہ مرہم لگا ہوا تھا اور کئی جگہ چھوٹی بڑی پٹیاں چپکی ہوئی تھیں اور چہرہ سوجا ہوا تھا۔

وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مراد کے دونوں شانوں کو تھام کر جیلر سے بولا۔ "دلاور صاحب! یہ آپ نے کیا کیا ہے؟ میں اس کی حفاظت اور سلامتی کے لیے آپ کے منہ سے نکلی ہوئی رقم دیتا ہوں۔ اور آپ ایسی حفاظت کر رہے ہیں؟"

"چانڈیو صاحب! میں نے آج تک اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ لیکن کچھ بھی ہو' حاکم کا حکم ہر حال میں ماننا پڑتا ہے اور اس نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔"

"خدا کے لیے آپ اس سے ایسا حکم تو نہ منوائیں جو انسانیت اور تہذیب کے خلاف ہو۔"

"آپ ادائیگی میں پکے ہیں۔ میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔"

محبوب نے مراد کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "دلاور صاحب زبان کے پکے ہیں۔ آئندہ تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہو گا۔"

"سائیں! آپ کی مہربانیوں کے باعث ایسا نہیں ہو گا۔ آپ ہمارے لیے جو کر رہے ہیں ایسا تو صرف خدا ہی اپنے بندوں کے لیے کرتا ہے۔"

محبوب اس کے زخموں کو اور اس کے سوجے ہوئے چہرے کو بڑی تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "دلاور صاحب! یہ زخم اور گہرے ہو سکتے ہیں۔ چہرے کی سوجن اور بڑھ سکتی ہے۔ جیل کا ڈاکٹر عام سی پانی ملی ہوئی دوائیں دے گا۔"

"چانڈیو صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ اسے پانی ملی ہوئی دوائیں نہیں دی جائیں گی۔ میں توجہ سے علاج کراؤں گا۔"

"کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ میں اس کے لیے یہاں کسی اسپیشلسٹ کو لے کر آؤں اور وہ اس کا علاج کرے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "سوری۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ جیل کے قوانین کے خلاف ہے۔"

"آپ بہت سے کام قوانین کے خلاف کر گزرتے ہیں۔"

"ابھی یہ باتیں چھوڑیں۔ مراد کی لگائی سے فون پر

بات کرائیں۔"

"ہاں۔" اس نے مراد کو دیکھ کر کہا۔ "وہ بہت دیر سے انتظار کر رہی ہے۔ پریشان ہو رہی ہے۔ کیا تم اسے بتاؤ گے کہ یہاں کیا ہو چکا ہے اور تم بہت زخمی ہو؟"

"نہیں سائیں! وہ اور زیادہ پریشان ہو جائے گی۔ فون پر ہی رونے لگے گی۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ وہ صدمہ پہنچانے والے حالات سے بے خبر رہے تو اچھا ہے۔"

وہ اپنا فون نکال کر نمبر پنچ کرتے ہوئے جیلر سے بولا۔ "پلیز! اسے واش روم میں جانے دیں۔"

وہ بولا۔ "میری طرف سے اجازت ہے۔"

محبوب نے فون مراد کو دیا۔ اس نے اسے لے کر کان سے لگایا۔ اسی وقت اس کے دل میں اتر جانے والی آواز سنائی دی۔ "ہیلو سائیں! میں انتظار کر رہی ہوں۔"

وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "ماروی...... ! میں مراد بول رہا ہوں۔"

اس نے واش روم میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

وہ ذرا چپ ہو گئی پھر اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ "تم۔ مراد ہو؟"

"میری پہچان کے لیے دل سے سنو۔"

اس نے کورڈ ورڈز ادا کیے۔ "میری ماروی کسی عمر کے شکنجے میں نہیں آئے گی۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "ہاں تم میرے مراد ہو۔ یا اللہ! میں کل رات سے انتظار کر رہی ہوں۔ سائیں نے کہا تھا صبح بات کرائیں گے اور اب صبح سے یہ وقت ہو گیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ بات تو ہو رہی ہے نا؟"

"ہاں خدا کا شکر ہے۔ سائیں کی مہربانی ہے۔ کل میرا دل گھبرا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تم بیمار ہو۔ دل ایسے ہی تو نہیں گھبرا رہا تھا۔ تم پر ضرور کوئی مصیبت آئی ہے۔"

وہ اپنے ایک زخم کی پٹی کو چھو کر بولا۔ "کوئی مصیبت نہیں آئی ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور مجھے یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ تم کیسی ہو؟ سائیں کے ساتھ تمہیں کوئی فکر اور پریشانی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو دن رات تمہارا خیال رکھتے ہوں گے۔"

"پھر بھی مجھے فکر اور پریشانی رہتی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو تمہاری فکر نہیں رہتی ہے۔ میں تمہارے لیے پریشان نہیں رہتی ہوں؟"

"یہ تمہارے دل کے معاملات ہیں۔ مجھے جب تک رہائی نہیں ملے گی تم پریشان رہو گی۔"

"کب رہائی ملے گی مراد؟ کبھی سوچتی ہوں کہ جیل توڑ کر چلے آؤ۔ ہم یہاں سے بھاگ کر دور بہت دور دنیا کے آخری سرے میں چلے جائیں گے۔"

"ایسی نادان سوچیں میرے دماغ میں بھی آتی ہیں اور میں لوہے کی مضبوط سلاخوں کو تھام کر رہ جاتا ہوں۔"

"آج یمین گوٹھ میں میری سہیلی رومانہ کی شادی ہے۔ میں تو کسی خوشی میں شریک نہیں ہوتی لیکن سہیلی نے ضد کی ہے۔ نہیں جاؤں گی تو مغرور کہلاؤں گی۔ ہمارے اس غریب علاقے کی کچھ عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ کوٹھی میں آئی تھیں۔ میں ان کی نظروں میں بہت اونچی امیرزادی ہو گئی ہوں۔"

"اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔"

"تم بھی یہی کہہ رہے ہو؟ اس کوٹھی میں اس امیرانہ ٹھاٹ باٹ میں کیا ہے میرا؟ اور کس رشتے سے میں یہاں رہتی ہوں؟"

"ماروی! یہ سوال میرا سر جھکا دیتا ہے۔"

"اسی لیے میں نے یہاں سے دور چلے جانے کا جو فیصلہ کیا ہے اس پر ضرور عمل کروں گی۔ بیس تاریخ کو تم سے جیل میں ملاقات کروں گی پھر اسی رات یا دوسرے دن چاچا چاچی کے ساتھ یہاں سے چھپ کر نکل جاؤں گی۔"

"سائیں کو دھوکا دے کر نہیں جانا چاہیے لیکن مجبوری ہے۔ وہ احسانات کا بدلہ نہیں چاہتے اور ہم دے بھی نہیں سکیں گے۔ ادائیگی بڑی مہنگی پڑے گی ماروی...... ! کیونکہ ان کا دل ان کی دیوانگی تمہیں چاہتی ہے۔"

"ہاں۔ یہاں سے دور چلے جانے سے ہی بات بنے گی۔ نہ میں ان کی نظروں کے سامنے رہوں گی۔ نہ وہ مہربانیاں کریں گے نہ میرے ضمیر پر بوجھ پڑے گا۔"

"تم بعد میں ان سے فون پر معافی مانگ لینا۔"

"ہاں۔ میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کروں گی اور وعدہ کروں گی کہ جس دن تمہیں رہائی ملے گی۔ اس دن تمہاری گھر والی بن کر ان سے ملنے کے لیے واپس آ جاؤں گی۔"

"ماروی! بیس تاریخ کو تم یہاں ملنے آؤ گی۔ اس کے ایک دن بعد بائیس تاریخ کو عدالت میں میری پہلی پیشی ہے۔"

"یہ تو اچھی خبر سنا رہے ہو۔ کیا اس دن فیصلہ ہو جائے گا۔ تمہیں رہائی مل جائے گی؟"

"فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔ پہلی پیشی میں مقدمہ کی ابتدائی کارروائیاں ہوں گی۔ دیکھیں گے کیا ہونے والا ہے۔"

محبوب بھی جیلر کے آفس میں تنہا بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ عدالت میں پہلی سنوائی ہے۔ پتا نہیں مقدمہ کون سا رخ اختیار کرے گا۔ مجھے اس کے آنسو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ مراد کو رہائی ملے گی۔ ماروی کو دلی مراد ملے گی تو میں اسے ہمیشہ ہنستے بولتے دیکھتا رہوں گا۔ یا خدا......! مجھے کتنی آسودگی حاصل ہوگی۔

پھر اس عاشق کے ذہن میں پیار کا دوسرا پہلو آیا۔ کسی کو ٹوٹ کر چاہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیں مل جائے۔ اس کے حسن کی تازگی اور دلکشی اس کی اداؤں کا بانکپن ہمارے لیے ہو۔

اس کے دل سے ایک سرد آہ نکلی۔ "ہاں۔ میں اس کے پورے وجود کو اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے جب مراد نہ ہو۔

اور وہ کیسے نہ ہو؟

ایسے کہ مقدمہ کمزور ہو جائے۔ اسے سزائے موت ہو جائے۔ موت اسے گم کردے گی تو وہ مجھ میں اپنے مراد کو دیکھے گی۔ وہ محبوب کو نہ سہی مراد کی ہی صورت دیکھ کر آئے گی۔ میری زندگی میں آجائے گی۔"

وہ گونگا طلبگار تھا۔ زبان سے طلب نہیں کرتا تھا۔ اسے پالینے کے لیے اندر ہی اندر ٹوٹتا بکھرتا رہتا تھا۔ اپنے بہترین اعمال پر اعتماد تھا کہ وہ ایک دن اس کی طرف کھنچی آئے گی یا حالات خود ہی اس کی جھولی میں اسے لاکر ڈال دیں گے۔

وہ خیالات سے چونک گیا۔ آفس کا بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ ایک جوان حسینہ اور ایک برقع پوش خاتون نظر آئیں۔ جیل کے اندرونی دروازے سے ایک سپاہی نے آکر ایڑی بجاتے ہوئے انہیں سلیوٹ کیا۔ وہ حسینہ محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے سپاہی سے پوچھا۔ "پاپا کہاں ہیں؟"

سپاہی نے کہا۔ "ریسٹ روم میں ہیں۔"

پتا نہیں کیا بات تھی۔ اس حسینہ نے پھر محبوب کو ایک ذرا سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ دوسری عبا اور نقاب میں تھی بالکل گم ہوگئی تھی۔ نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ نقاب کے پیچھے سے بولی۔ "چلو اپنے باپ کے پاس۔"

وہ دونوں اس دفتری کمرے سے گزرتے ہوئے دوسرے دروازے سے ریسٹ روم کی طرف جانے والی تھیں۔ اس وقت بھی وہ چور نظروں سے محبوب کو دیکھتی جا رہی تھی۔ اس نے دروازے پر رک کر کہا۔ "موم! آپ جائیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

موم کہلانے والی خاتون چلی گئی۔ محبوب اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے جیسے ٹہلنے کے انداز میں چلتے ہوئے جیلر کی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ پھر انگریزی میں بولی۔ "مجھے یاد آتا ہے۔ میں نے کوئی دس ماہ پہلے تمہیں بریڈ فورڈ میں دیکھا تھا۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "ہاں میں بزنس کے سلسلے میں برطانیہ اور امریکا جاتا رہتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "بریڈ فورڈ ساؤتھ میں پولیس اور ایک مفرور کے درمیان کاؤنٹر فائرنگ ہو رہی تھی۔ ٹریفک رک گئی تھی۔ تم ایک اسٹریٹ میں اپنی کار روک کر کہیں سے نکلنے کا راستہ دیکھ رہے تھے۔ اور پریشان ہو رہے تھے۔"

محبوب نے کہا۔ "او گاڈ......! تمہاری یادداشت بہت شارپ ہے۔ ایسی فائرنگ کے وقت تم نے مجھے کہاں سے دیکھ لیا تھا؟"

وہ بولی۔ "تمہاری یادداشت کمزور ہے۔ یا پھر حسین لڑکیاں تمہیں یاد نہیں رہتیں۔ میں نے ہی تمہیں وہاں سے نکالا تھا۔"

محبوب نے اسے شدید حیرانی اور توجہ سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "ہاں۔ کچھ یاد آرہا ہے۔ وہ لیڈی انسپکٹر تم ہی تھیں۔ وردی میں تو تمہاری پرسنلٹی ہی بدل گئی تھی۔"

"میں برٹن مسلم کمیونٹی سے تعلق رکھنے والی پولیس میں ایم پی ہوں۔ اس روز اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سینئر سرونگ پولیس آفیسر کو اسسٹ کر رہی تھی۔"

وہ یاد کرنے لگا۔ اس نے ایک اسٹریٹ میں اپنی کار روکی تھی۔ وہ پولیس کی وردی میں چھپ چھپ کر فائر کرتے ہوئے ایک شخص کے لیے ڈھال بنتے ہوئے اس کے پاس آئی تھی۔ اس سے کہا تھا۔ "یہ شخص بیمار ہے اور خوفزدہ ہے۔ اسے اپنی کار میں لے جاؤ۔"

وہ شخص پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی کے اندر آگیا تھا۔ اس لیڈی انسپکٹر نے آگے والی گاڑیوں کا راستہ کلیئر کرایا تو محبوب کو بھی وہاں سے بخیریت نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔

وہ بولا۔ "تم نے جس شخص کو پیچھے بٹھایا تھا۔ وہ آگے پیچھے کی سیٹوں کے درمیان منہ چھپا کر پڑا ہوا تھا۔ وہ سہما ہوا نہیں تھا۔ اس نے آگے جاکر کار روکنے کو کہا۔ میں نے بریک لگائے تو وہ دروازہ کھول کر میرا شکریہ ادا کرکے بھاگتے ہوئے دوسری گاڑی میں جاکر بیٹھ گیا۔ میں نے حیرانی سے دیکھا وہ گاڑی جیسے اسی کے انتظار میں تھی۔ فوراً ہی فراٹے بھرتی ہوئی کہیں چلی گئی۔"

وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔ "میرا نام مرینہ ہے۔"

وہ جیلر کی کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "یہ میرے پاپا ہیں۔ میں دس برس کی تھی تب سے لندن میں ہوں۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ وہیں پولیس ٹریننگ بھی حاصل کی۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"محبوب علی چانڈیو...... مجھے بتاؤ وہ کون تھا؟"

مرینہ نے پوچھا۔ "کون؟"

"وہی جسے تم نے میری گاڑی میں بٹھایا تھا۔ اس کے لیے آگے دوسری گاڑی تیار کھڑی تھی۔"

وہ ہنستے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولی۔ "یہ نہ پوچھو۔ یہ پولیس کے کھیل تماشے ہیں۔"

"میں پولیس والا نہیں ہوں لیکن کھیل تماشے جانتا ہوں۔ وہ مجرم تھا۔ تمہاری مدد سے فرار ہوگیا تھا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "رات گئی بات گئی۔ دس مہینے گزر گئے۔ میں ایسی باتیں یاد نہیں کرتی۔ تمہیں دیکھا تو یاد آیا کہ اس روز میں نے چالیس ہزار پونڈز کمائے تھے۔"

"تم مجھ سے بول رہی ہو۔ کیا ایسی باتیں کسی کے سامنے کھل کر بولی جاتی ہیں؟"

"میں کسی کے باپ سے بھی نہیں ڈرتی۔ ابھی تم نے سنا ہے۔ بولو میرا کیا بگاڑ لوگے؟"

"کچھ نہیں۔" وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "سنا ہے کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ آنکھ والے مجھے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں۔"

اس نے توجہ نہیں دی۔ سنی ان سنی کردی۔ وہ بولی۔ "ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تمہارا چہرہ مجھے یاد کیوں رہ گیا؟"

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "اس لیے کہ اس روز چالیس ہزار پونڈز کمائے تھے۔"

"کمائی تو ہوتی رہتی ہے۔ اسی لیے میں پاپا جیسی ملازمت کر رہی ہوں۔ لیکن تم دوسروں سے کچھ الگ ہو۔ تم یقین کروگے میں نے تمہیں خواب میں بھی دیکھا تھا۔ صبح پریشان ہوگئی تھی کہ کیوں دیکھا ہے۔ پھر بھول گئی۔"

وہ اسے سنجیدگی سے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ "چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟"

"بولنے کے لیے کچھ ہو تو بولوں گا۔"

"یہ تو کہہ سکتے ہو کہ لوگ درست کہتے ہیں یا نہیں۔ میں حسین ہوں یا نہیں؟"

"لوگ درست کہتے ہیں۔"

"تم کیا کہتے ہو؟"

وہ لندن سے آئی تھی۔ بہت بے باک تھی۔ اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ویسے یہ سچ کہا تھا کہ اسے خواب میں دیکھ چکی ہے اور اب سوچ رہی تھی کہ وہ دوسروں سے الگ کیوں لگ رہا ہے؟

ایک سپاہی نے آکر واش روم کے دروازے پر دستک دی۔ پھر کہا۔ "ایک گھنٹا ہوگیا ہے۔ باہر آؤ۔"

تھوڑی دیر میں دروازہ کھل گیا۔ مراد باہر آیا تو مرینہ نے حیرانی سے دیکھا۔ وہ محبوب جو کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہی قیدی کے لباس میں واش روم کے دروازے پر کھڑا تھا۔

وہ دو ہم شکل کو دیکھ کر اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ مراد نے محبوب کے پاس آکر فون اسے دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کی مہربانی سے خوب باتیں ہوئیں۔ وہ بہت خوش ہے۔ آپ کو دعائیں دے رہی ہے۔"

وہ خوش ہوگئی تھی۔ محبوب کے چہرے پر بھی رونق آگئی تھی۔ وہ بھی مسکرانے لگا۔ سپاہی نے مراد سے کہا۔ "اندر چلو...... صاحب نے کہا ہے بہت ٹائم ہو چکا ہے۔"

محبوب نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "پھر کسی دن ملاقات ہوگی۔ بیس تاریخ کو یہاں ماروی آئے گی۔ پھر اس سے جی بھر کر باتیں کرسکوگے۔"

وہ اسے تسلیاں دے کر مرینہ کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ مرینہ نے بھی اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ مراد کو دیکھے جارہی تھی۔ دونوں ایک ہی تھے۔ وہ سپاہی کے ساتھ جانے لگا تو اس نے حکم دیا۔ "رک جاؤ۔"

وہ دونوں رک گئے۔ وہ سپاہی کو اشارے سے جانے کے لیے بولی۔ وہ باہر چلا گیا۔ مراد نے اب اسے توجہ سے دیکھا تو مرینہ بھی اسے گہری سنجیدگی سے دیکھنے لگی۔ ذہن میں بات آئی کہ اس نے خواب میں محبوب کو نہیں' قیدی کو دیکھا تھا۔ اس کے خواب میں وہ قیدی کے لباس میں تھا۔

اگرچہ دونوں ہم شکل تھے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا پھر بھی وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی نامعلوم سی کشش ہے۔ وہ اس کی طرف بہت دھیمے سے کھنچی جارہی تھی۔

اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔ "کیا نام ہے؟"

"مراد...... مراد علی منگی۔"

"تم زخمی ہو اور زخم تازہ ہیں۔ میں سمجھ رہی

ہوں۔ یہاں تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہوگی؟"

وہ اپنے باپ کی کرسی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کیا جرم کیا ہے؟ کب سے یہاں ہو؟"

وہ بولا۔ "جلالی گوٹھ کا وڈیرا میرا دشمن ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کے قتل کا جھوٹا الزام مجھ پر لگایا ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے آج تک کسی کو ایک تھپڑ نہیں مارا ہے۔ کسی کی بیٹی کو بھلا کیوں ماروں گا۔ میں پریشان ہوں کہ عدالت میں میری بے گناہی ثابت ہو سکے گی یا نہیں؟"

"تمہارا سب سے بڑا قصور یہی ہے کہ تم نے کبھی کسی کو طمانچا نہیں مارا۔ جو کسی کو مارتے نہیں ہیں۔ وہ گویا مار کھانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔"

وہ کرسی پر ادھر سے ادھر گھوم کر بولی۔ "یہ میرے اصول ہیں' چلو تو آگے والوں کو کچلتے ہوئے چلو۔ جیو تو اوروں کی جان جلاتے ہوئے جیو۔ تب ہی یہ دنیا تمہیں ہنستے بولتے جینے دے گی۔"

وہ بولا۔ "جیسے آپ کے اصول ہیں' ویسے ہمارے نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم غریب ہیں اور کمزور ہیں۔"

"وہ مرد ہی کیا جو غریبی کا رونا روتا رہے اور اپنی کمزوریاں دور نہ کر سکے۔ تم دیکھنے میں تو فولادی دکھائی دیتے ہو۔ حالات سے ہارنے والے نہیں لگتے۔"

"مجھے دنیا والوں سے ہارنے کی پروا نہیں ہے۔ میں صرف اپنی ماروی کو جیتنا چاہتا ہوں۔"

"یہ کون ہے؟"

"میری محبت ہے۔ میری زندگی ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "ارے واہ......! کیا بات ہے۔ مجنوں کے خاندان سے ہو؟ یہ تو جانتے ہو کہ عشق کرنے والے سب ہی ہارتے رہے ہیں اور مرتے رہے ہیں۔"

"محبت میں مرنے والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔"

"محبت میں مرنے کے بعد تمہاری محبوبہ کا کیا بنے گا؟ وہ محبت ہی کیا' جو اپنی محبوبہ کو بھی مار ڈالے۔ کبھی سوچا ہے کہ جسے زندگی کہتے ہو اور جان سے زیادہ چاہتے ہو۔ وہ تمہارے بعد کیسے جیئے گی؟ کس کے ہاتھوں میں جائے گی۔"

یہ ٹھیس پہنچانے والا سوال تھا۔ سیدھا سا جواب سمجھ میں آتا تھا کہ محبوب کے ہاتھوں میں جائے گی۔

مرینہ نے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو گئے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو کہ محبت میں مرنے کے بعد بھی نام کرنا چاہتے ہو۔ ارے واہ......! مرنے کے بعد اس کی عزت آبرو کی سلامتی نہیں چاہتے۔ مجھے سمجھاؤ' یہ کیسی محبت ہے؟"

مرینہ کی باتوں نے ایک ذرا چکرا دیا۔ اس نے کہا۔ "آپ نہیں جانتیں۔ میرے پاس نہ دولت ہے نہ ہتھیار ہے نہ طاقت ہے۔ میں تو یہ مقدمہ لڑنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ سائیں محبوب میرے لیے لڑ رہے ہیں۔"

"دوسرے کا احسان لے رہے ہو۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ کوئی مفت میں احسان نہیں کرتا۔"

یہ بات بھی پتھر کی طرح لگی۔ وہ مرینہ سے یہ نہ کہہ سکا کہ محبوب بھی اس کی ماروی کا عاشق ہے۔ کہنے کے لیے منہ نہیں کھلتا تھا۔ بڑی ہتک محسوس ہوتی تھی۔

وہ بولی۔ "میں یقین سے کہتی ہوں کہ احسان لے رہے ہو۔ ورنہ بولو' کیا احسان کرنے والا تمہارا کوئی رشتے دار ہے۔ رشتے دار بھی کچھ وصول کیے بغیر اپنوں کے کام نہیں آتے اور مقدمات میں تو لاکھوں روپے پانی کی طرح بہتے رہتے ہیں۔"

وہ چپ رہا۔ وہ بولی۔ "تمہاری کوئی کمزوری ہے۔ تم نہیں بولو گے۔ میں دماغ کی تاریکیوں میں گھس کر اندر کے بھید نکال لاتی ہوں۔ تمہاری کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں رہے گی۔

بہتر ہے۔ کچھ نہ چھپاؤ۔ اپنی پوری ہسٹری سناؤ۔ اگر تم نے قتل نہیں کیا ہے تو یقین کر لو کہ تمہاری بے گناہی ثابت کرنے والی آ گئی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟"

مراد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس سے نظریں ملیں تو دل نے کہا۔ وہ بڑی پکی ہے۔ جو کہتی ہے وہ کر گزرنے والی ہے۔ اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

وہ بولا۔ "ہم قیدیوں کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔"

وہ سخت لہجے میں بولی۔ "میں کسی کی اجازت کی محتاج نہیں ہوں۔ حکم دے رہی ہوں۔ بیٹھ جاؤ۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ "میں جلالی گوٹھ میں پیدا ہوا۔ وہیں پلا بڑھا۔ دس جماعتیں پاس کیں۔ وڈیرے حشمت جلالی کی بیٹی زلیخا ان کے ظالمانہ دستور کے مطابق بن بیاہی بیٹھی تھی۔ وہ اور کیا کرتی' فطری جذبات سے مغلوب ہو کر ایک رات میرے پاس آ گئی۔ میں نے گناہ سے انکار کیا تو اس نے دھمکی دی۔"

مرینہ نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے واہ رے سادھو سنیاسی! عورت تمہارے پاس آئی تھی اور تم مرد ہو کر انکار کر رہے تھے۔ ایسا پہلی بار سن رہی ہوں۔"

وہ آگے سنانے لگا۔ وہ اسے سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سادگی اور شرافت متاثر کر رہی تھی۔ اس پولیس والی کی زندگی میں جو آتے رہے تھے' وہ چھٹے ہوئے بدمعاش ہوتے تھے۔ اس نے ایسے بدمعاشوں کے کل پرزے ڈھیلے کر کے انہیں توبہ کرنے اور کان پکڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس نے پوری روداد سننے کے بعد مراد سے کہا۔ "یہ جو محبوب ابھی یہاں آیا تھا۔ یہ تمہاری ماروی سے لائن مارتا ہے اور تم کہتے ہو کہ اس کا ہاتھ بھی نہیں پکڑتا ہے۔"

وہ میز پر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "یا تو تم سیدھے سادے مٹی کے مادھو ہو یا پیدائشی گدھے ہو۔ کیا اس نے یوں ہی اسے پانچ لاکھ روپے دیے ہیں جبکہ وہ ماڈل نہیں ہے۔ کیا تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہے؟ تم سمجھ رہے ہو کہ اس نے کروڑوں روپے کی کوٹھی رہنے کو دی ہے اور اس کے ساتھ سوتا نہیں ہے؟ عبادت کرتا رہتا ہے؟"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "خدا کے لیے ایسے الفاظ منہ سے نہ نکالو۔ ماروی مر جائے گی لیکن میرے سوا کسی دوسرے کا منہ نہیں دیکھے گی۔"

"اس اندھے اعتماد نے تمہیں سچ مچ عقل کا اندھا بنا دیا ہے۔ چلو میں ایسی بات نہیں کروں گی۔ تم ہی بتاؤ۔ اس دوسرے عاشق کے لاکھوں کروڑوں روپے کس کھاتے میں جا رہے ہیں؟ کیا دنیا کا کوئی ایک آدمی ان کی پارسائی پر یقین کرے گا؟"

"آپ پولیس والی ہیں۔ آپ نے چور بدمعاش اور گناہ گار ہی دیکھے ہیں۔ ابھی ہماری دنیا میں ایمان اور شرافت ہے۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ انہیں گالی نہ دیں۔"

مرینہ نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ سوچ رہی تھی کہ یہ درست کہہ رہا ہے۔ میرا واسطہ چور بدمعاشوں سے پڑتا ہے اور میں لندن سے شادی کرنے یہاں کسی شریف آدمی کی تلاش میں آئی ہوں اور یہ جو ننگا ہوں کے سامنے آ گیا ہے' اپنی سادگی اور شرافت سے متاثر کر رہا ہے۔

پھر وہ کرسی پر ذرا سیدھی ہو کر دل میں بولی۔ "ارے ہاں۔ یہ تو سمجھ میں آنا چاہیے کہ میں نے اسے خواب میں کیوں دیکھا تھا اور وہ بھی قیدی کے لباس میں...... یہ تو عجیب سی بات ہے۔ جان پہچان تھی نہ کہیں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ پھر یہ خواب میں کیسے آ گیا تھا؟"

یہی ایک ایسی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی جس سے وہ متاثر ہو رہی تھی اور اس سے دلچسپی لے رہی تھی۔ دراصل اس نے محبوب کو پہلے بریڈ فورڈ میں دیکھا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد وہی صورت خواب میں نظر آئی تھی۔ لیکن یہ عجیب سی بات تھی کہ وہ جو محبوب کی صورت والا تھا' وہ قیدی کے لباس میں تھا اور ان لمحات میں بھی اس کے سامنے وہی خواب والا قیدی تھا۔

ایسی کوئی عجیب سی بات ہو تو دل کو جکڑ لیتی ہے کہ اس معاملے میں ضرور کوئی قدرتی بھید ہے۔

☆☆☆

ماروی بہت خوش تھی۔ مراد سے باتیں کرنے کے بعد اس نے فون پر محبوب کا شکریہ ادا کیا تھا۔ پھر گہری نیند سو گئی تھی۔ پچھلی رات سے جاگ رہی تھی اور شام کو ہیلی کی شادی میں جانا تھا۔ اسے یہ مصروفیات اچھی لگ رہی تھیں۔ بڑے دنوں بعد زندگی میں چہل پہل سی محسوس ہو رہی تھی۔

شام کو چاچی متی نے پوچھا۔ "کیا ہمارے ساتھ بندوق والے جائیں گے؟"

ماروی نے کہا۔ "نہیں۔ غریبوں کی بستی میں خوامخواہ نمائش ہوگی کہ بڑے لوگ آئے ہیں۔"

چاچا جمرو نے کہا۔ "ہم کوٹھی میں رہتے ہیں۔ کیا بڑے لوگ نہیں ہیں؟"

"یہ کس کی کوٹھی ہے چاچا؟ یہ سب خیراتی مال ہے۔ ہم اپنی اوقات میں رہیں گے۔ چاچی میں کہنا بھول گئی تھی۔ ہم سونے کے زیور پہن کر نہیں جائیں گے۔"

متی نے کہا۔ "ٹھیک کہتی ہو بیٹی! ہم نمائش نہیں کریں گے۔ میمن گوٹھ کے لوگ سب ہی جانے پہچانے ہیں۔ انہوں نے ہمارا برا وقت دیکھا ہے۔ ہم انہیں شان و شوکت نہیں دکھائیں گے۔"

محبوب کا ڈرائیور ان کے لیے گاڑی لے کر آیا۔ ماروی نے فون پر کہا۔ "سائیں! ہم ایسی خوبصورت مہنگی کار میں نہیں جائیں گے۔ یہ بیچارے غریبوں کو غرور دکھانے کے برابر ہوگا۔ ہم سونے کے زیور بھی پہن کر نہیں جا رہے ہیں۔"

محبوب نے کہا۔ "تم بہت سمجھ دار ہو۔ بہت اچھا کر رہی ہو۔ میں دوسری گاڑی بھیج رہا ہوں۔"

"کوئی گاڑی نہ بھیجیں۔ ہم ٹیکسی میں چلیں جائیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ہیلی کو رخصت کرتے ہی جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کروں گی۔"

وہ پریشان کیسے نہ ہوتا۔ دو دنوں سے یہی فکر کھا رہی تھی کہ وہاں شادی کی رات کیا ہوگا؟ وہ چاچی چاچا کے ساتھ ٹیکسی میں جا رہی تھی۔ ادھر یہ بھی تیار بیٹھا تھا۔ اس نے

سیاہ چُست پتلون، سیاہ شرٹ اور فل بوٹس پہنے تھے۔ میمن گوٹھ کے قریب پہنچ کر ہیلمٹ پہننے والا تھا۔ یوں اسے چہرے سے کوئی پہچان نہ پاتا۔

اس وقت قدِ آدم آئینے کے سامنے وہ کسی ایکشن فلم کا ہیرو لگ رہا تھا۔ لباس کے اندر بھرا ہوا ریوالور تھا۔ بلٹس سے بھرا ہوا ایک ڈبا کار میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے احتیاطاً فرسٹ ایڈ باکس بھی گاڑی میں رکھ لیا تھا۔

لنگڑے جانی نے دوپہر کو فون پر کہا تھا کہ اس کے ایک ایک دو دو آدمی میمن گوٹھ جاتے ہیں اور گھوم پھر کر وہاں کا جائزہ لے کر آجاتے ہیں۔ اندھیرا ہونے کے بعد وہ سب شادی والے گھر کے چاروں طرف مورچے بنا لیں گے۔

شام چھ بجے میمن گوٹھ میں شور اٹھا کہ ماروی آرہی ہے۔ اس علاقہ کے بچے اس کی ٹیکسی کے آگے پیچھے، دائیں بائیں دوڑتے آرہے تھے۔ دکانوں میں کھڑے ہوئے لوگ اس ٹیکسی کو دیکھ رہے تھے۔ عورتیں گھروں سے نکل آئی تھیں۔ وہاں ایسی دھوم مچی تھی جیسے کسی ریاست کی رانی ہاتھی پر بیٹھ کر آرہی ہو۔

اس کی سہیلی رومانہ کے گھر کو اندر اور باہر سے کاغذی رنگین جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ بڑے بڑے ڈیک کے ذریعہ فلمی گیت دور تک گونج رہے تھے۔ گھر کے اندر اور شامیانے میں عورتیں آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

رومانہ کو دلہن کی طرح سجایا جا رہا تھا۔ اس کی سہیلیوں نے بڑی محبت سے ماروی کا استقبال کیا۔ اسے لے کر رومانہ کے پاس آئیں۔ دو سہیلیوں کو گلے ملتے دیکھ کر عورتیں خوش ہو رہی تھیں۔ انہیں دعائیں دے رہی تھیں۔

یہ زندگی کتنی خوشیاں دیتی ہے اور کتنا رلاتی ہے؟ عورتیں چاچی متی کو بھی ہاتھوں ہاتھ لے رہی تھیں اور ان کی نئی کِھل کِھلاتی ہوئی زندگی کے متعلق کرید کرید کر سوالات کر رہی تھیں۔ بہ ظاہر یہی دکھائی دے رہا تھا کہ شادی کی اس تقریب میں خوشیاں ہی خوشیاں اور محبتیں ہی محبتیں ہیں۔

وہاں صمدو کی بیوی، جوان بہن اور جوان بیٹیاں بھی تھیں۔ دو دن پہلے ہی ان سب کی مٹھیاں گرم کر دی گئی تھیں۔ انہیں سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ سب ماروی کے آس پاس رہا کریں گی اور اغوا کرنے والوں کو رازداری سے ماروی کی نشاندہی کرتی رہیں گی۔

صمدو ڈل مین بلو شاہ کا پرانا ملازم تھا۔ پارٹی کے غنڈے گامے نے بلو کو یقین دلایا تھا کہ آج رات ماروی اس کے خفیہ اڈے میں پہنچ جائے گی۔ بلو نے صمدو کو حکم دیا تھا کہ وہ گامے کے احکامات کی تعمیل کرتا رہے۔ یوں صمدو بلو کا تابعدار تھا اور گامے، چیئرمین بابر بشیر کا نمک خوار تھا۔

ان میں سے ایک ماروی کو رنگ رلیوں کے لیے طلب کر رہا تھا۔ دوسرا آن دی اسپاٹ اسے گولی مار دینے کا حکم دے چکا تھا اور یہ دونوں ہی کام دونوں کے مشترکہ غنڈے کرنے والے تھے۔

عجب تماشا ہونے والا تھا۔ ماروی ایک ہی تھی۔ وہی ایک اغوا ہونے سے پہلے ماری جانے والی تھی اور وہی ماری جانے سے پہلے اغوا بھی ہونے والی تھی۔

صمدو کا گھر شادی والے گھر سے ایک گلی پیچھے تھا۔ تین گن مین صمدو کے مہمان بن کر آئے تھے۔ چوتھا گن مین اس علاقہ کی ایک پختہ سڑک پر ایک ویگن میں ان کا منتظر تھا۔ واردات کے وقت وہاں سے ایکشن میں آنے والا تھا۔

انہوں نے طے کر لیا تھا کہ صمدو کے گھر سے نکل کر کون کس سمت سے دلہن کے گھر آئے گا۔ ایسے وقت صمدو کی بیوی، بہن اور بیٹیاں، ماروی کو ان کے آگے کر دیں گی پھر وہ ایک لحہ بھی ضائع کیے بغیر اسے گولی مار کر فائر کرتے ہوئے وہاں سے فرار ہونے لگیں گے تو گولیوں کی بوچھار میں کوئی انہیں روکنے نہیں آئے گا۔

محبوب ایک پرانی سی گاڑی میں آیا تھا۔ واردات کرنے والوں کے لیے اندھیری رات موافق تھی۔ صرف دلہن کے گھر کے آس پاس روشنیاں تھیں۔ وہ ایک جگہ تاریکی میں آکر رک گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر لنگڑے کا انتظار کرنے لگا۔

اس کے ساتھ والی سیٹ پر ہیلمٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ منہ چھپانے کے لیے ضروری تھا۔ ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ میمن گوٹھ کا بچہ بچہ مراد کو صورت سے پہچانتا تھا۔ اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو شور مچتا کہ مراد جیل سے آگیا ہے۔ یوں دشمن سمجھ لیتے کہ وہ ارب پتی عاشق اپنی ماروی کی خاطر ان سے ٹکرانے اور جان پر کھیلنے آیا ہے۔

اس نے فون کی آواز بند کر دی تھی۔ اس کی اسکرین روشن ہوئی تو کالنگ ٹون سنائی نہیں دی۔ وہ معروف جتلی کی کال تھی۔ اس وقت اٹینڈ کرنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنے اس بزرگ کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کی بہتری کی باتیں کرتا تھا۔

اس نے آواز بڑھا کر فون کو کان سے لگایا۔ پھر کہا۔

"معروف صاحب! میں ابھی مصروف ہوں۔ ایک گھنٹے بعد آپ سے بات کروں گا۔"

"ابھی تم کہاں ہو؟"

"ایک پرانا دوست مل گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم اور ماروی کو بھول کر کسی دوست کے ساتھ رہو گے......؟ نہیں، تم اس وقت میمن گوٹھ میں ہو۔"

"بعض اوقات آپ میرے بارے میں وہ سوچنے لگتے ہیں جو میں نہیں سوچتا۔ بھئی وہ سہیلی کی شادی میں گئی ہے۔ آجائے گی۔ میں وہاں نہیں ہوں۔ پلیز پھر کسی وقت کال کروں گا۔"

اس نے فون کا سوئچ آف کر دیا۔ لنگڑے جانی نے کار کی کھڑکی کے پاس آکر سلام کیا۔ پھر کہا۔ "آپ وہاں لائٹیں دیکھ رہے ہیں۔ باجی (ماروی) اس گھر میں ہیں۔ وہاں اندر اور باہر پچاس عورتیں ضرور ہوں گی۔ ان میں ہماری دو عورتیں ہیں۔ وہ باجی کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔"

"میں اس گھر کے قریب کیسے رہ سکتا ہوں؟"

"ادھر روشنی ہے۔ آپ میرے ساتھ پچھلی گلی میں چلیں۔ وہاں نہ کوئی دیکھے گا نہ آپ کو پہچانے گا۔"

وہ آگے کار میں برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ محبوب اسے دھیمی رفتار سے ڈرائیو کرتا ہوا پچھلی گلی میں اس جگہ آکر رک گیا، جہاں سے ایک پتلی گلی کو پار کرتے ہی رومانہ کا مکان تھا۔

ایسے ہی وقت عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ محبوب اچھل پڑا۔ گاڑی سے نکلتے ہوئے، ہیلمٹ پہنتے ہوئے اس نے دوڑ لگائی پھر دو مکانوں کے درمیان پتلی گلی سے گزرتا ہوا رومانہ کے گھر تک پہنچ گیا۔ لنگڑا اس سے پہلے چھلانگیں لگاتا ہوا گیا تھا۔ کئی عورتیں اپنے بچوں کو سمیٹے مکان سے باہر نکل کر ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں۔

پھر ایک فائر کی آواز ابھری۔ محبوب کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ ماروی......!

وہ دوڑتا ہوا مکان کے اندر گھس گیا۔ ماروی ابھی سلامت تھی اس پر جو گولی چلائی گئی تھی اس سے ایک عورت زخمی ہوئی تھی۔ وہاں تین چار عورتیں اور تین چار مرد ایک دوسرے سے ہاتھا پائی میں الجھے ہوئے تھے۔

ان میں صمدو کی عورتیں اور لنگڑے جانی کی عورتیں شامل تھیں۔ وہ گن مین تھے جو صمدو کے مہمان بن کر آئے تھے۔ ان سے لنگڑے جانی کے ساتھی مقابلہ کر رہے تھے اور انہیں گولی چلانے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔

محبوب پارٹی کے غنڈوں کو پہچانتا تھا۔ انہیں دیکھ کر پہچان گیا کہ ان میں سے کتنے دشمنوں کی طرف سے آئے ہیں۔

وہ دو غنڈوں پر گولیاں چلاتا ہوا ماروی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سہمی ہوئی ایک دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔ "میں محبوب ہوں، چلو یہاں سے۔"

وہ اسے کھینچ کر لے جانے کے لیے سامنے آیا تو ایک گولی اس کے بازو کا گوشت اُدھیڑتی ہوئی گزر گئی۔ لنگڑے نے پلٹ کر فائر کرنے والے پر فائر کیا۔ محبوب بھول گیا تھا کہ موت کیا ہوتی ہے اور گولی لگنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے۔ وہ یکبارگی ماروی کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر لاد کر وہاں سے دوڑتا ہوا باہر آگیا۔

گولیاں چل رہی تھیں۔ لنگڑا اور اس کے ساتھی محبوب کو شیلٹر دیتے ہوئے فائر کرتے جا رہے تھے۔ اس نے پتلی گلی سے گزر کر گاڑی کے پاس آکر ماروی کو کاندھے سے اتارا پھر دروازہ کھول کر اسے اندر کی طرف دھکا دیتے ہوئے بولا۔ "فوراً سیٹ کے نیچے دبک جاؤ۔ جلدی کرو۔"

وہ دروازہ بند کر کے تکلیف سے کراہتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں وہ گاڑی دوڑتی ہوئی اس علاقہ سے دور ہوتی چلی گئی۔

ماروی اگلی سیٹ کے نیچے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی ہلکی ہلکی سی کراہیں سن رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ باہر اور اندر تاریکی تھی، پہلے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر اس نے گزرتی ہوئی اسٹریٹ لائٹس میں محبوب کا بایاں بازو دیکھا تو ایکدم سے لرز گئی۔ بے اختیار چیخ پڑی۔

اس کی آستین لہو سے بھیگی ہوئی تھی اور بازو کی اُدھڑی ہوئی جگہ سے لہو بہہ رہا تھا۔ وہ فوراً ہی اُٹھ کر سیٹ پر آکر بولی۔ "گاڑی روکیں۔ ڈاکٹر کے پاس چلیں۔"

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "دشمن ہمارے تعاقب میں ہوں گے۔ ہمیں سب سے پہلے چھپنا ہے۔"

وہ سیٹ پر آکر اس کے بازو کو تھام کر بولی۔ "نہیں چھپنا ہے۔ پہلے علاج ہوگا۔ آنے دیں دشمنوں کو...... مر جانے دیں مجھے۔ گاڑی روکیں۔ اسپتال چلیں۔"

وہ گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔ "چلاؤ مت۔ میں نہیں مروں گا۔ جو کہتا ہوں کرتی رہو ابھی خون بند ہوجائے گا۔"

"میں ایسا کیا کروں۔ جلدی بتائیں۔"

"پیچھے سیٹ پر فرسٹ ایڈ باکس ہے اسے اٹھا کر لاؤ۔ اس میں دوائیں ہیں۔"

وہ فوراً ہی جھک کر پیچھے گئی پھر ابتدائی طبی امداد کا سامان اٹھا کر لے آئی۔ ان لمحات میں محبوب کی طرف دل کھنچا جا رہا تھا۔ وہ اس کے لیے کیا نہیں کرتا آ رہا تھا۔ آج اس نے زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ ماروی نے صاف دیکھا تھا کہ اس کی طرف گولی چلائی گئی تھی اور اسی لمحہ میں وہ ڈھال بن گیا تھا۔

اس نے تھوڑی دیر کے لیے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک کر اپنی پوری آستین پھاڑ دی۔ پھر اسے بتایا کہ کون سی دوا زخم پر پہلے لگا کر بہتے ہوئے خون کو روکنا ہے اور کس طرح کاٹن سے زخم کو صاف کرنا ہے۔ وہ اس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔

وہ وہاں زیادہ رُک نہیں سکتا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ پیچھے دشمن آ رہے ہیں۔ وہ شاید ٹریفک کے ہجوم میں پیچھے رہ گئے تھے۔ اس نے گاڑی کو دھیمی رفتار سے آگے بڑھا دیا۔

ماروی نے اس کی ہدایت کے مطابق دوائیں اس پر استعمال کرتے ہوئے التجا کی۔ "یا اللہ......! بہت خون بہہ چکا ہے۔ گاڑی روک دیں پولیس کو فون کریں۔ پولیس آئے گی تو پیچھا کرنے والے دشمنوں کو گرفتار کرلے گی۔"

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "دشمن گرفتار نہ ہوئے تو ہمیں گولی مار کر چلے جائیں گے۔ ہمیں چلتے رہنا ہے۔ میں پیچھے دیکھ رہا ہوں۔ وہ آ تو رہے تھے۔ اب نظر نہیں آ رہے ہیں۔ مجھے محفوظ جگہ پہنچنے تک اطمینان نہیں ہوگا۔"

حالات اچانک ایسے بدلتے ہیں جن کی توقع پہلے نہیں کی جاتی۔ وہ محبوب سے ہمیشہ فاصلہ رکھتی تھی۔ اس کی حیا کا تقاضا بھی تھا کہ اسے چھونے کا بھی موقع نہیں دے گی اور اب وہ بڑی دیر سے خود ہی اسے چھو رہی تھی۔

اسے یاد آیا۔ وہ ایک بار ٹھوکر کھا کر گری تھی۔ گھٹنے پر معمولی سی خراش آئی تھی تو اس کی جلن برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے زخم کو ہاتھ نہیں لگا رہی تھی۔ جب اس خراش پر مرہم لگایا گیا تو وہ تکلیف سے چیخنے لگی تھی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ محبوب گولی کے زخم کی تکلیف کیسے برداشت کر رہا ہوگا اور اس کے اپنے ہاتھ دوائیں لگاتے وقت کانپ رہے تھے۔ کسی اور کا زخم ہوتا تو وہ چھونے سے انکار کر دیتی۔

زندگی میں پہلی بار نرس کا کام کر رہی تھی۔ اپنے محسن کے احسانات کا صلہ دینے کی یہ صورت نکل آئی تھی۔ وہ اس کے زخم پر مرہم رکھ رہی تھی۔ اس کی مسیحا بن گئی تھی۔

وہ ڈیڑھ گھنٹے بعد ایسے علاقے میں پہنچے۔ جہاں بڑی بڑی کوٹھیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ماروی نے کبھی پورا کراچی شہر نہیں دیکھا تھا۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ کہاں آ گئی ہے؟

محبوب تکلیف سے نڈھال ہو رہا تھا۔ ماروی نے اناڑی پن سے ہی سہی، مرہم پٹی کر دی تھی۔ اس نے ایک کوٹھی کے بڑے گیٹ کے سامنے گاڑی روکی۔ ایک مسلح گارڈ نے قریب آ کر محبوب کو دیکھا پھر سیلوٹ کرتے ہوئے دوسرے گارڈ سے بولا۔ "گیٹ کھولو۔"

ماروی نے پوچھا۔ "آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟"

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "یہاں فی الحال کوئی دشمن نہیں آ سکے گا۔ میں دیکھتا آ رہا ہوں کوئی ہمارا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔"

گیٹ کھل گیا۔ وہ احاطے کے اندر ڈرائیو کرتا ہوا پورچ میں آیا۔ وہاں ایک ملازم کو چابیاں دیں۔ کوٹھی کے اندر تاریکی تھی۔ تھوڑی دیر میں ملازم نے دروازے کھول کر روشنی کر دی۔ اس نے ماروی سے کہا۔ "آؤ۔ اندر چلو۔"

وہ دونوں گاڑی سے باہر آئے۔ محبوب ایک گارڈ کے سہارے چلتے ہوئے بیڈ روم میں آیا۔ گارڈ نے کہا۔ "سر! آپ زخمی ہیں۔ یہ پولیس کیس ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کچھ نہیں کرو گے اور کسی سے ذکر نہیں کرو گے کہ میں اس حالت میں یہاں آیا ہوں۔"

"سر! کیا ادھر حملے کا خطرہ ہے؟"

"نہیں ہے۔ میں پوری طرح محتاط ہوں۔ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا ہے۔"

ماروی اس مہنگی کوٹھی کی اندرونی سجاوٹ کو دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ میں ان کے ساتھ یہاں تنہا آئی ہوں۔ آئی نہیں لائی گئی ہوں۔ وہ بیڈ روم کے باہر کھڑی سوچ رہی تھی۔ "مجھے خواب گاہ میں ان کے پاس جانا چاہیے یہ زخمی ہیں اور میری خاطر زخمی ہوئے ہیں۔ بہت خون بہہ چکا ہے۔ ڈاکٹر کا علاج ضروری ہے۔ اور کسی ڈاکٹر کے آنے تک مجھے ہی ان کے پاس تیمارداری کے لیے رہنا ہوگا۔ یہ میرا فرض ہے۔

میں کیا کروں؟ اندر ایک ہی جوان ملازم ہے۔ کوئی بوڑھی عورت بھی نہیں ہے۔

میں اب سے پہلے ان سے دور رہ کر بدنام ہوتی رہی۔ اب تو فاصلے مٹ گئے ہیں۔ یا اللہ......! میں ان کے پاس ایک ہی چھت کے نیچے آ گئی ہوں۔

یہ فیصلہ تو کر چکی ہوں۔ چاچا چاچی کے ساتھ یہاں سے سیکڑوں میل دور چھپنے چلی جاؤں گی اور مراد سے جیل میں ملاقات کرنے کے بعد تو ضرور جاؤں گی۔"

وہ کوٹھی کے در و دیوار کو دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹ کر شکست خوردہ ہو کر زیرِ لب بولی۔ "میں جتنی دور جانے والی تھی۔ اتنی ہی قریب آ کر مجبور اور بے بس ہو گئی ہوں۔ ایک زخمی کو تنہا چھوڑ کر جانے کی بات نہیں کر سکوں گی۔

میرے مقدر میں کسی وجہ کے بغیر رسوائی ہے۔ کیا میں کبھی ان سے دور نہیں جا سکوں گی؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ ایسے وقت کالنگ ٹون نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے فون کی اسکرین کو دیکھا۔ سمجھ میں نہیں آیا، کس کا نمبر ہے۔

اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ چاچی منتی کی آواز سنائی دی۔ وہ پریشان تھی۔ رونے کے انداز میں بول رہی تھی۔ "بیٹی ماروی! تو کہاں ہے؟ اپنی آواز سنا دے۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔ ہائے بیٹی! تجھے کون اٹھا کر لے گیا ہے؟"

"چاچی! پریشان نہ ہو۔ میں ٹھیک ہوں۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ کیا رومانہ کی رخصتی ہو گئی؟"

"کیا رخصتی ہوگی؟ شادی کا گھر میدانِ جنگ بن گیا تھا۔ ایک عورت اور دو مرد زخمی ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں وہ دونوں زخمی غنڈے بدمعاش ہیں۔ پولیس انہیں لے گئی ہے۔ تم کہاں ہو؟ کیا ہم یہاں انتظار کریں۔"

"نہیں چاچی! وہاں کسی سے نہ بولو کہ مجھ سے فون پر بات کر چکی ہو۔ دشمنوں کو معلوم ہوگا تو میرا پتا پوچھنے کے لیے وہ تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ تم چاچا کے ساتھ کوٹھی میں جاؤ۔ میں کسی وقت آ جاؤں گی۔ یہ تم کس کے فون سے بول رہی ہو؟"

"میں پی سی او سے بول رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے یاد رکھنا۔ کسی سے نہ کہنا کہ تم میری خیریت معلوم کر چکی ہو۔"

اس نے فون کو بند کر دیا پھر وہاں سے اٹھ کر خواب گاہ کے دروازے پر آئی۔ وہ دوسری طرف منہ کیے فون پر بول رہا تھا۔ "آپ ہی میرے معالج ہیں۔ میں آپ پر بھروسا کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ میرے بازو میں گولی لگی تھی۔ بازو کا تھوڑا سا گوشت اُدھڑ گیا ہے۔ خون بہت بہہ چکا ہے۔ میں جہاں بلا رہا ہوں وہاں آپ رازداری سے علاج کرنے آئیں گے۔"

ماروی کو اطمینان ہوا کہ وہ کسی ڈاکٹر کو بلا رہا ہے۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں ابھی آؤں گا۔ آپ کہاں ہیں؟"

"میں ابھی مکمل پتا فون پر Send کر رہا ہوں۔ مجھے خون کی ضرورت ہے۔ آپ میرا بلڈ گروپ جانتے ہیں۔ خون پہنچانے کے تمام سامان کے ساتھ آئیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ایک اسسٹنٹ لازمی ہوگا۔"

"بھروسے کے آدمی کو لے آئیں۔ میں بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ جلدی آنے کی کوشش کریں۔ آپ کے آنے تک مجھ پر بے ہوشی طاری ہو سکتی ہے۔"

"میں جلد سے جلد آنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

محبوب نے فون بند کر کے سر گھما کر ماروی کو دیکھا۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ نظریں ملتے ہی سر جھکا کر اندر آ گئی۔ پریشان ہو کر بولی۔ "آپ بیہوش ہونے والے ہیں؟"

"ہوسکتا ہے۔ لیکن تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھو کہ تم اور زیادہ بدنام ہونے کے لیے یہاں تنہائی میں ایک چھت کے نیچے آگئی ہو۔"

"میں کیا کہوں۔ اپنی تقدیر سے نہیں لڑسکوں گی۔"

"میں تمہارے لیے لڑتا رہوں گا۔ اطمینان رکھو، یہاں تمہیں بدنام ہونے نہیں دوں گا۔"

وہ فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں دشمنوں کی کیا پوزیشن ہے اور وہ کیا کررہے ہیں۔ تمہارے ہاتھ نہ آنے سے تلملا رہے ہوں گے۔"

رابطہ ہوتے ہی سمیرا کی آواز سنائی دی۔ وہ حیرت سے اور مسرت سے بول رہی تھی۔ "سر! آپ نے مجھے فون کیا ہے؟ آپ خیریت سے ہیں نا؟"

"خیریت سے نہیں ہوں۔ تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہارے آس پاس کوئی ہے؟"

"میں اپنے بیڈروم میں تنہا ہوں۔"

"جو کہہ رہا ہوں اسے توجہ سے سنو۔ مجھے گولی لگی ہے۔"

وہ چیخ پڑی۔ "کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ بات تمہارے کمرے سے اور تمہارے منہ سے باہر نہ نکلے اور تم چیخ رہی ہو۔"

"معافی چاہتی ہوں۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ آپ کہاں ہیں۔ میں ابھی آؤں گی۔"

"اپنے والدین کو بھی نہیں بتاؤ گی کہ یہاں آرہی ہو۔"

"نہیں بتاؤں گی مجھ پر بھروسا کریں۔"

"بھروسا ہے اسی لیے تمہیں بلا رہا ہوں۔ یہاں ایک کوٹھی میں ماروی میرے ساتھ ہے۔ یہ بیچاری پھر بدنام ہونے والی ہے۔ ہم دونوں اسے بدنامی سے بچا سکتے ہیں۔ یہاں تم موجود رہو گی تو اس پر الزام نہیں آئے گا کہ وہ میرے ساتھ تنہا ہے۔"

سمیرا نے کہا۔ "بے شک صرف اسے ہی نہیں آپ کو بھی بدنامی سے بچانا میرا فرض ہے۔ آپ میرا مشورہ مانیں تو کہتی ہوں میرے والدین بھی آئیں گے تو ماروی کی نیک نامی کے لیے پوری ایک فیملی وہاں رہے گی۔"

"مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن ہم دشمنی اور خون خرابے سے گزر رہے ہیں۔ تمہارے والدین پریشان ہوجائیں گے۔"

"نہیں ہوں گے۔ آپ ان کی فکر نہ کریں۔"

"تو پھر ان کے ساتھ آؤ۔ خون زیادہ بہنے کے باعث میں کمزوری محسوس کررہا ہوں۔"

اس نے فون بند کرکے وہاں کا پتا Send کردیا۔

ماروی بے اختیار اسے دیکھے جارہی تھی۔ اس سے نظریں چراتا، اس سے کتراتا بھول گئی تھی۔ دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا، کتنا عظیم انسان ہے۔ زخمی ہے۔ شاید بے ہوش ہوجائے گا۔ ایسی حالت میں میری عزت، آبرو اور نیک نامی کی فکر میں مبتلا ہے۔ آج میں اعتراف کرتی ہوں۔ یہ میرا سچا عاشق ہے۔

☆☆☆

وڈیرا حشمت علی، چیئرمین بابر بشیر اور ببلو شاہ سب ہی تلملا رہے تھے۔ نہ ماروی ہاتھ آئی تھی۔ نہ اسے قتل کیا جاسکا تھا۔ اسے کوئی اور لے اُڑا تھا۔

غنڈا پارٹی کے لیڈر گامے نے چیئرمین سے کہا۔ "وہاں ہمارے مقابلے میں لنگڑا جانی تھا۔ ہم نے اس کے ساتھیوں کو بھی دیکھا ہے۔ انہوں نے ہم سے پہلے وہاں مورچے بنا رکھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم سے مقابلہ ہوگا اور ہم انجان تھے اس لیے ان پر حاوی نہ ہوسکے۔"

چیئرمین نے کہا۔ "ہمیں بہت پہلے اطلاع ملی تھی کہ لنگڑا جانی چانڈیو کے لیے کام کررہا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ لنگڑے نے ماروی کو چانڈیو کے پاس پہنچا دیا ہے۔"

گامے نے کہا۔ "جناب......! پولیس نے ہمارے زخمی ساتھیوں کو گرفتار کرلیا ہے۔"

چیئرمین نے کہا۔ "پولیس کو اپنی ڈیوٹی کرنے دو۔ ہم بعد میں انہیں چھڑا لیں گے۔ وہ ماروی اب ہماری ضد بن گئی ہے۔ اسے ہر حال میں اوپر پہنچا کر چانڈیو کو جھٹکا پہنچانا ہے۔"

اُدھر ببلو شاہ اپنے غنڈوں سے کہہ رہا تھا۔ "اسے اوپر نہیں نیچے ہمارے پاس لانا ہے۔ اس پر نظر رکھو۔ چانڈیو اسے بار بار نہیں بچا پائے گا۔"

اور حشمت علی تو جیسے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اپنی پارٹی کے غنڈے آسانی سے اسے اٹھا لائیں گے۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دے گئے۔ گامے نے یہ پہلے طے کرلیا تھا کہ وڈیرے سے اچھی رقم کھائے گا بعد میں اسے ناکامی کی خوش خبری سنائے گا۔

اب وہ سننے کے بعد گامے پر شبہ نہیں کررہا تھا۔ محبوب کو گالیاں دے رہا تھا۔ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی گالیاں سنا رہا تھا کہ وہ کسی کام کے نہیں ہیں۔ نہ شریف ہیں نہ بدمعاش ہیں۔ بدمعاش ہی ہوتے تو اپنے باپ کے لیے ماروی کو اٹھا لاتے۔

اس ہنگامے کے بعد سب ہی کو یہ کھوج لگی تھی کہ چانڈیو ماروی کو کہاں لے گیا ہے؟

اس چیز کی طلب کتنی شدید ہوجاتی ہے جو بار بار گرفت سے پھسل جاتی ہے۔ اب تو سب ہی کے لیے آسمان سے تارے توڑ لانے والی بات تھی۔

ان کی طرف سے سراغرساں چھوڑے جارہے تھے۔ سب ہی کا خیال تھا کہ ماروی کو اسی شہر میں کہیں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ آج نہیں تو کل اس کا سراغ مل جائے گا۔ فی الحال وہ محفوظ تھی۔

ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ علاج معالجے کا تمام سامان لے آیا تھا۔ اس وقت محبوب پر نیم بیہوشی طاری تھی۔ وہ ابتدائی ٹریٹمنٹ کے بعد اسے خون پہنچانے لگا۔

محبوب کی آنکھیں بند تھیں۔ ماروی ایک طرف کھڑی اسے بڑی اپنائیت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا جی کررہا تھا کہ اس کے قدموں کے پاس جاکر بیٹھ جائے۔ وہ متاثر کرنے کی اور دل جیتنے کی انتہا کرچکا تھا۔

وہ بیڈروم سے باہر آکر سوچنے لگی۔ اس نیک انسان سے دور ہونا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ میں نگاہوں کے سامنے رہوں گی تو یہ اور زیادہ پاگل ہوتا چلا جائے گا پھر کسی دن اپنی جان سے بھی جائے گا۔

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی پھر اپنے دل میں جھانک کر بولی۔ "میں اعتراف کرتی ہوں۔ اب اس سے کتنی ہی دور چلی جاؤں۔ اسے کبھی بھلا نہیں سکوں گی۔ مراد میری رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ آج پہلی بار یہ دیوانہ بھی میرے اندر لہو کی طرح دوڑ رہا ہے۔

یہ نئی بات کیا ہورہی ہے؟ دل ایک ہے اور دھڑکنیں دو طرفہ ہیں۔ دل ترازو ہوگیا ہے۔ دو پلڑے ہوگئے ہیں۔

آہ! ایسا لگ رہا ہے کہ گولی مجھے لگی ہے۔ ایسی لگی ہے کہ کبھی نہیں نکلے گی۔ اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ میرا دل دماغ، میرا بدن میری روح صرف مراد کے لیے تھی۔ یہ کیا ہوگیا ہے کہ یہ سب اچانک ہی تقسیم ہورہے ہیں؟

بے شک محبت میں بڑی گنجائش ہے۔ یہ ہمیشہ تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ جب بھی انسانوں کے درمیان پھیلتی ہے تو پھلتی پھولتی رہتی ہے لیکن عشق......؟

عشق کسی ایک سے ہوتا ہے۔ یہ تقسیم نہیں ہوتا۔ عورت سے پیار کرو یا عشق کی انتہا کرو۔ وہ ہر حال میں حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

آج تک کسی عاشق نے عورت کو سامنے بٹھا کر صرف اس کی پوجا نہیں کی ہے۔ میرے دونوں چاہنے والے بھی میری صرف پوجا نہیں کریں گے۔ ان میں سے ہر ایک کے اندر میرے حصول کی تمنا مچلتی رہے گی اور ایک عورت کی فطرت بھی چاہے گی کہ وہ کسی ایک کے وجود میں سما جائے۔

یا اللہ......! مسئلہ کو سلجھنا چاہیے تھا۔ یہ اور الجھ گیا ہے۔"

کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے میڈم روزی کی آواز سنائی دی۔

"ماروی! تم خیریت سے ہو؟"

وہ بولی۔ "ابھی تک خیریت سے ہوں۔"

"تمہاری چاچی اور چاچا رو رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ اس شادی کے گھر میں تمہیں اغوا کیا گیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں سچ ہے۔ آج میمن گوٹھ میں رومانہ کے گھر میں خوب گولیاں چلی ہیں۔"

"تم کہاں ہو، جلدی بتاؤ۔ محبوب صاحب پریشان ہوں گے۔ میں انہیں اطلاع دوں گی۔"

"میں نہیں جانتی کہ یہ کون سی جگہ ہے اور یہ بھی نہیں جانتی کس نے اغوا کیا ہے۔ یہاں کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔"

"اچھا میں ابھی محبوب صاحب سے بات کرتی ہوں۔"

"میڈم......! میں چاچی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ ان کے پاس فون نہیں ہے۔"

"میں ابھی اپنے فون سے بات کراؤں گی انتظار کرو۔"

کال ختم ہوگئی۔ روزی نے محبوب کے فون پر رابطہ کیا ہوگا۔ اس کا سوئچ آف تھا۔ پھر اس نے معروف بجلی کو اطلاع دی۔ اسے بتایا کہ میمن گوٹھ میں کیا ہوچکا ہے۔ یہ قیامت ہوئی ہے کہ ماروی کو اغوا کیا گیا ہے اور محبوب صاحب کا فون بند پڑا ہے۔ ان سے رابطہ نہیں ہورہا ہے۔

معروف نے کہا۔ "میرا خیال ہے محبوب نے اپنے فون کو بند رکھا ہے۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود میمن گوٹھ گیا ہوگا۔ پتا نہیں یہ دیوانہ کیا کرتا پھر رہا ہے؟! اگر دشمنوں نے ماروی کو اغوا نہیں کیا ہے تو پھر وہی اسے کہیں لے گیا ہے۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محبوب صاحب ماروی کو کہیں لے گئے ہیں۔ لیکن ماروی تو ایسی نہیں ہے۔"

"جو ایسی نہیں ہوتیں ویسی ہوجاتی ہیں۔ مانتا ہوں کہ وہ مراد کی دیوانی ہے۔ محبوب کی آنچ سے نہیں پگھلے گی۔ لیکن حالات انسان کو اس کے مزاج کے خلاف بدل کر رکھ دیتے ہیں۔"

"آپ جیسا سمجھ رہے ہیں ویسا نہ ہو۔ سر......! یہ بھی تو سوچیں کہ ماروی کو واقعی اغوا کیا گیا ہو اور محبوب صاحب کا

فون کسی مجبوری یا مصیبت کی وجہ سے بند ہو تو؟"

"تو ہم کیا کر سکیں گے؟ اس کے دوستوں اور شناساؤں سے پوچھتے پھریں گے کہ وہ کہاں ہے؟ شاید کسی کے ذریعے ہم اس کے پاس پہنچ جائیں۔"

"میں ابھی ان کے شناساؤں کو فون کرتی ہوں۔"

"کرو اور یہ سوچو کہ وہ اگر کوئی ناٹک کر رہا ہے تو ہم اس کی بہتری چاہنے والوں میں سے ہیں۔ وہ ہمیں اتنی رات کو خوامخواہ کیوں دوڑا رہا ہے؟"

روزی نے چاچی منتی سے کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟ ماروی تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ میرا فون ابھی بزی رہے گا۔ تم پی ٹی سی ایل سے بات کرو۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر ماروی کے نمبر پنچ کر کے ریسیور منتی کو دیا پھر اپنے فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ رابطہ ہونے پر منتی نے کہا۔ "بیٹی! میں بول رہی ہوں۔ یہاں میڈم روزی اور معروف صاحب سب ہی پریشان ہیں۔ مجھے تو چپ چاپ بتاؤ، تم کہاں ہو؟ کب آرہی ہو؟"

ماروی نے پوچھا۔ "کیا تمہارے آس پاس کوئی ہے؟"

"نہیں۔ میں اکیلی ہوں۔"

"مجھے اتنا ہی کہنا ہے کہ ہم یہاں کسی حال میں نہیں رہیں گے۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ مراد سے جیل میں ملاقات کرتے ہی تمہارے اور چاچا کے ساتھ وہ کوٹھی اور یہ شہر چھوڑ دوں گی۔"

"یہ تو ہم پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں۔ تم پریشان کیوں ہو؟"

ماروی نے اس بیڈ روم کی طرف دیکھا جہاں محبوب کو خون پہنچایا جا رہا تھا۔ اس عاشق نے لہو کا نذرانہ دیا تھا۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ "چاچی! سائیں کی محبتیں اور مہربانیاں حد سے گزر گئی ہیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ میرے بس میں ہو تو آج ہی یہاں سے بھاگ جاؤں۔"

"پریشان کیوں ہوتی ہے؟ میں ہوں نا۔ تُو جب چاہے گی تیری چاچی ساتھ ہو جائے گی۔"

"اور ایک بات سنو۔ جتنی رقم ہے اسے اپنے ساتھ باندھ کر رکھو۔ جیسا کہ رکھتی تھیں۔ حالات نے سمجھا دیا ہے کہ کسی وقت بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"سمجھ گئی بیٹی! فکر نہ کرو۔ تم اپنی چاچی کو ہر دم تیار پاؤ گی۔"

ماروی نے فون بند کر دیا۔ اچانک ہی سمیرا دروازہ کھول کر آئی تھی۔ اس کے والدین بھی تھے۔ اس نے ایک نظر ماروی پر ڈالی پھر تیزی سے چلتے ہوئے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔

محبوب بیڈ پر آنکھیں بند کیے چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ اسے خون پہنچایا جا رہا تھا۔ اسسٹنٹ جاگ رہا تھا اور ڈاکٹر ایک ایزی چیئر پر سو رہا تھا۔ اس نے ایک ذرا سخت آواز میں مخاطب کیا۔ "ہیلو ڈاکٹر!"

وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔ "میں مسٹر چانڈیو کی پی اے بھی ہوں اور بی اے بھی۔ پرسنل اسسٹنٹ اینڈ بزنس اسسٹنٹ۔ آپ یہاں سو رہے ہیں؟"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ "اور میں ان کا فیملی ڈاکٹر ہوں۔ اپنی ذمے داریاں پوری کر چکا ہوں۔ مرہم پٹی ہو چکی ہے۔ انجکشن اور دوائیں دی جا چکی ہیں۔ خون دیا جا رہا ہے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ دو اہم دوائیں بازار سے منگوائی ہیں۔ ایک گارڈ لینے گیا ہے۔"

وہ بولی۔ "تھینک یو ڈاکٹر! یہ بتائیں کہ یہ سو رہے ہیں یا بیہوشی کی حالت میں ہیں؟"

"میں نے کہا نا...... تشویش کی بات نہیں ہے۔ کمزوری کے باعث دواؤں کے اثر سے سو رہے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ یہاں باتیں نہ کی جائیں۔ خاموشی رہے تو بہتر ہے۔"

وہ باہر چلا گیا۔ سمیرا نے بیڈ کے قریب آکر محبوب کو گہری سنجیدگی سے اور اپنایت سے دیکھا۔ دل میں کہا۔ "آپ کیسے ضدی ہیں۔ ایک لڑکی کو پا لینے کی ضد میں تمام کاروبار ڈبو رہے ہیں اور زندگی کو بھی داؤ پر لگا رہے ہیں۔"

اس نے ایک سرد آہ بھر کر سوچا۔ "کاش! یہ محبتیں مجھے دیتے۔ میں تو ہر پل خوشی سے مرتی رہتی، خوشی سے جیتی رہتی۔ کوئی میرے جیسی خوش نصیب نہ ہوتی۔ پھر بھی خوش نصیب ہوں کہ آپ اپنے دوسرے تمام اہم معاملات میں مجھے اہمیت دیتے ہیں۔ آج اتنے سنگین معاملے میں بھی پہلے مجھ پر بھروسا کیا ہے۔ مجھے یہاں بلایا ہے۔"

اسی وقت فون بولنے لگا۔ اس نے فوراً ہی اسے خاموش کر دیا۔ رنگ ٹون کی آواز سے محبوب کی آنکھ کھل سکتی تھی۔ وہ فون لے کر باہر آگئی۔

باہر لاؤنج میں ماروی اور اس کے والدین بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ماں سے کہا۔ "ممی! وہ خیریت سے ہیں۔ گہری نیند سو رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔"

پھر اس نے ماروی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم یقیناً ماروی ہو۔ میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔"

ماروی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "ہاں۔ میں ہی ماروی ہوں۔ میں بھی تمہیں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔"

سمیرا نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "محبوب صاحب کی ذاتی دنیا سے لے کر کاروباری دنیا تک تمہارا ہی ذکر ہوتا رہتا ہے۔"

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "میں نہیں جانتی، یہ عذاب کب تک مجھ پر نازل رہے گا۔"

سمیرا کچھ کہنا چاہتی تھی پھر کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ معروف تجلّی کال کر رہا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "السلام علیکم معروف صاحب!"

معروف نے کہا۔ "وعلیکم السلام۔ تم نے ابھی کال کاٹ دی تھی۔ کہاں ہو تم؟ پتا ہے محبوب پھر مجھے پریشان کر رہا ہے۔ پتا نہیں کہاں گم ہو گیا ہے؟ وہ کبھی نہیں سدھرے گا۔ کہیں آرام سے ہوگا۔ میری نیند حرام کر رہا ہے۔"

وہ بولی۔ "محبوب صاحب! آپ کو باپ کی جگہ مانتے ہیں۔ آپ کی سخت باتیں بھی سن لیتے ہیں۔"

"اسی لیے کوئی غلطی کر کے چھپ گیا ہے تاکہ میں اسے باتیں نہ سنا سکوں۔"

"آپ درست سمجھ رہے ہیں۔ وہ غلطی کرنے کے بعد ایک کوٹھی میں دشمنوں سے چھپے ہوئے ہیں۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تم جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے؟"

"جی ہاں۔ میں ان کے ساتھ ہوں۔"

معروف نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ "یا خدا......! تیرا شکر ہے۔ تم اس کے ساتھ ہو۔"

وہ بولی۔ "ماروی بھی ہے۔"

پھر اس کا اطمینان غارت ہوا۔ وہ چونک کر بولا۔ "تم بھی ہو۔ وہ بھی ہے؟"

اس نے کہا۔ "میرے ممی اور ڈیڈی بھی ہیں۔"

"یہ توڑ توڑ کر باتیں کیوں کر رہی ہو؟ سیدھی بات بولو...... محبوب ماروی کو تمہارے گھر لے آیا ہے۔"

سمیرا نے کچھ سوچا پھر کہا۔ "معروف صاحب! آپ تمام پریشانیاں ذہن سے نکال دیں۔ آرام سے سو جائیں۔ محبوب صاحب کل صبح آپ سے بات کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں آرام سے سو جاؤں گا...... وہ تمہارے گھر میں ہے...... مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ سر گھما کر ماروی کو دیکھا پھر اپنے والدین سے کہا۔ "آپ کسی کمرے میں جا کر سو جائیں۔ صبح محبوب صاحب سے باتیں ہوں گی۔"

وہ دونوں اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ وہ ماروی کے پاس آکر بیٹھ گئی پھر بولی۔ "ہماری پہلی ملاقات ہے۔ ویسے تمہارے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں۔"

وہ بولی۔ "میں کیا؟ میری حیثیت کیا؟ ایک غریب لڑکی کی باتیں کیچڑ کی طرح اچھالی جا رہی ہیں۔"

سمیرا نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "یہ دنیا کا دستور ہے۔ لڑکی تنہا ہو۔ کوئی یار و مددگار نہ ہو تو چٹخارے لے لے کر اسے بدنام کیا جاتا ہے۔"

ماروی نے بیڈ روم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور کوئی مددگار ہو تو اسے بھی نہیں بخشتے۔"

"مراد کا جیل جانا۔ تمہارا تنہا رہ کر محبوب صاحب کی امداد قبول کرنا۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ لوگوں کی الزام تراشی درست لگتی ہے۔ جبکہ ہم جانتے ہیں تم بہت ہی حیا والی ہو اور بے داغ ہو۔"

"شکریہ۔ دو چار سے جو نیک نامی ملتی ہے۔ وہ رسوائیوں کے ہجوم میں گم ہو جاتی ہے۔ ہمیں تو ہر حال میں پتھر مارنے والی دنیا میں جینا پڑتا ہے۔"

"ابھی میمن گوٹھ میں کیا ہوا تھا؟"

"میں سہیلی کی شادی میں گئی تھی۔ اندیشہ تھا کہ دشمن میری تاک میں ہیں لیکن سوچا بھی نہیں تھا کہ وہاں گولیاں چلیں گی اور میری خاطر محبوب صاحب زخمی ہو جائیں گے۔"

"یہی دیکھو کہ وہ تمہاری خاطر جان پر کھیلنے کو تیار رہتے ہیں۔ کیسے چاہنے والے ہیں۔ تمہارے ساتھ نیکیاں کرتے ہیں اور بدنامیاں مول لیتے ہیں۔"

"جب سے ان کی نیکیاں شروع ہوئی ہیں۔ تب سے بدنامیاں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ میں کیا کروں؟ سمجھ میں نہیں آتا بھاگ کر کہاں جاؤں؟"

سمیرا نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ تم پر کروڑوں لٹا رہے ہیں۔ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ ان کی منکوحہ بن جاؤ تو اربوں کی جائداد کی مالکہ بن جاؤ گی؟"

"بہت بڑی مالکہ بن کر بھی تین ہی وقت کی روٹیاں کھاؤں گی۔ چوتھے وقت کھاؤں گی تو بدہضمی ہو جائے گی۔ پھر یہ کہ میں صرف اپنے ضمیر کی سنتی ہوں اور ضمیر کہتا ہے میں ایک غریب سے اس کی محبت چھین کر دولتمند کو نہ دوں۔

دوسری طرف یہ سچ ہے کہ محبوب صاحب جیسی مہربانیاں کر رہے ہیں اور جیسی قربانیاں دے رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر دل ان کی طرف مائل ہو چکا ہے۔"

یہ ایسی بات تھی کہ سمیرا پریشان ہوگئی۔ ماروی نے کہا۔ ”آخر میں انسان ہوں۔ میرے سینے میں عورت کا دل ہے اور عورت بے لوث محبت کرنے والوں سے متاثر ہوتی ہے۔ میں محبوب صاحب کی محبت اور انسانیت کا صلہ دینے پر آئندہ مجبور ہوسکتی ہوں۔ اس سے پہلے ہی ان سے بہت دور چلی جانا چاہتی ہوں۔“

سمیرا نے قائل ہوکر کہا۔ ”تمہارے سامنے یہی ایک راستہ ہے کہ محبوب صاحب سے دور چلی جاؤ۔ ان کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے چھپ جاؤ۔ لیکن......“

وہ ذرا چپ ہوئی پھر بولی۔ ”تم کہیں جاؤ گی تو تمہارا مراد یہاں مقدمہ بھگتنے کے لیے رہ جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں تم صرف محبوب صاحب سے ہی نہیں، مراد سے بھی دور ہو جاؤ گی۔“

وہ بولی۔ ”مجھے یہ امید رہے گی کہ مراد رہائی پاتے ہی جہاں میں رہوں گی، وہاں چلا آئے گا۔“

سمیرا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”عورت وہی ہے جو شرم وحیا سے جیتی ہے اور کسی ایک چاہنے والے پر مرتی ہے۔ تمہیں دولت کی ہوس نہیں ہے۔ مجھے تم سے مل کر خوشی ہورہی ہے۔ تم بہت اچھی، بہت سچی لڑکی ہو۔“

پھر وہ اس کی طرف جھک کر دھیمی سرگوشی میں بولی۔ ”محبوب صاحب کو ان کی نیکیوں کا صلہ اسی طرح دے سکتی ہو۔ ان کے کاروبار کی سلامتی کے لیے دور چلی جاؤ۔ جانے کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ ہوگی تو میں دور کروں گی۔“

سمیرا نے اس کا ہاتھ مانگا۔ ماروی نے ہاتھ بڑھایا۔ پھر دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے سہیلیوں کی طرح مل گئے۔

☆☆☆

اس دنیا میں سیدھی سادی پیار بھری زندگی گزارنے والے کثیر تعداد میں ہیں لیکن ایسے معصوم لوگوں کی سماجی زندگی میں شرپسند اور مجرمانہ زندگی گزارنے والے کسی نہ کسی بہانے سے آہی جاتے ہیں۔

ان دنوں سمندر پار سے ایک سیکریٹ ایجنٹ پاکستان آیا ہوا تھا۔ ایک بہت ہی اہم فوجی راز چرا کر لے جانے کی خوش فہمی میں تھا۔ جلد ہی اسلام آباد کے سراغرسانوں کی نظروں میں آگیا تھا۔ ان سے جان چھڑا کر فرار ہونا چاہتا تھا۔ ایسے وقت اس نے فائرنگ کی تو دو سراغرساں مارے گئے اور وہ گرفتار ہوگیا۔

اس پر غیر ملکی ایجنٹ ہونے، جاسوسی کرنے اور دو سراغرسانوں کو ہلاک کرنے کا مقدمہ چلنے لگا تو بڑی طاقتیں اس کی حمایت میں مداخلت کرنے آگئیں۔

حکمران ان طاقتوں کے زیر اثر تھے۔ انہوں نے ان حضرات کو حکم دیا کہ کسی بھی طرح سیکریٹ ایجنٹ کے خلاف مقدمہ کو کمزور بنایا جائے اور کسی طرح اسے رہا کر کے اس کے ملک اسے واپس جانے دیا جائے۔

پاکستانی سراغرساں اسے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ پوری قوم چاہتی تھی کہ اس دشمن ایجنٹ کو سزائے موت ملے لیکن حکومت کی اہم کرسیوں پر بیٹھنے والے چند سیاست دان بیرونی طاقتوں کی جی حضوری میں لگے رہتے تھے اور آثار بتا رہے تھے کہ پاکستانی اس ایجنٹ کو یہاں سے زندہ جانے نہیں دیں گے۔ اس کے حامیوں نے فیصلہ کیا کہ ناکامی کی صورت میں اس ایجنٹ کو بڑی رازداری سے جیل سے نکال کر فرار کرایا جائے گا۔

اس مقصد کے لیے انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کی کرائم برانچ سے تین پاکستانی جاسوسوں کا انتخاب کیا گیا۔ وہ تینوں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے وفادار تھے اور اپنے ہی ملک پاکستان کے خلاف کچھ بھی کرسکتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام دارا اکبر، دوسرے کا نام بہرام اور تیسری کا نام مرینہ تھا۔

کس ملک میں ضمیر فروش نہیں ہوتے؟ ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ پاک وطن میں بھی ہیں۔ یہاں پولیس اور انٹیلیجنس ڈپارٹمنٹ سے بھی ایسے افسران کو ترقی دی گئی جو سیکریٹ ایجنٹ برنارڈ کے فرار ہونے کا راستہ ہموار کرسکتے تھے۔

ابھی کوششیں کی جارہی تھی کہ مقدمہ کو کمزور بنا کر اسے عدالت سے رہائی دلائی جائے۔ اس دوران میں مرینہ، دارا اور بہرام رازداری سے فرار کے راستے ہموار کر رہے تھے۔

ان دنوں برنارڈ، سکھر جیل میں تھا۔ جب اسے کراچی سینٹرل جیل میں منتقل کیا گیا تو مرینہ اس روز وردی پہن کر جیلر باپ کے آفس میں آئی۔ اس کے ساتھ دارا اور بہرام بھی تھے۔ انہوں نے اپنے کاغذات جیلر کے آگے رکھے۔ وہ کاغذات اعلیٰ حکام کی جانب سے تھے۔

جیلر کو حکم دیا گیا تھا کہ غیر ملکی انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ سے آنے والوں سے تعاون کیا جائے۔ ان کے کسی معاملہ میں مداخلت نہ کی جائے اور ان کی تمام ضروری ہدایات پر عمل کیا جائے۔

جیلر ان تینوں کو جیل کے اس حصے میں لے گیا جہاں برنارڈ کو رکھا گیا تھا۔ پہلے ہی اوپر سے آنے والے احکامات کے مطابق اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا گیا تھا۔ اسے جس

کمرے میں رکھا گیا تھا، وہاں آرام دہ بیڈ، صوفے، ریفریجریٹر اور ٹی وی جیسی آرام وآسائش کی چیزیں موجود تھیں۔

انہوں نے برنارڈ کو اس کے ملک سے آیا ہوا ایک خفیہ خط دیا۔ برنارڈ کا تعلق ایک خطرناک تنظیم سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ سے تھا۔ وہ خط پڑھ کر اسے یقین ہوا کہ وہ تینوں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ یارڈ سے اس کی سلامتی اور رہائی کے لیے آئے ہیں۔

اس نے خوش ہوکر ان سے مصافحہ کیا اور کہا۔ ”مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں قانون کے پھندے سے نکل جاؤں گا۔“

بہرام نے پوچھا۔ ”تمہیں اور کس چیز کی ضرورت ہے؟“

وہ بولا۔ ”امپورٹڈ وہسکی ختم ہوگئی ہے۔“

دارا نے جیلر سے کہا۔ ”مسٹر دلاور! شام سے پہلے اس کی ضرورت پوری کردیں۔“

مرینہ نے پوچھا۔ ”اور تمہیں کچھ چاہیے۔“

برنارڈ نے مسکرا کر کہا۔ ”تم بہت حسین اور دل نشین ہو۔ پوچھتی کیا ہو، شراب کے ساتھ شباب لازمی ہوجاتا ہے یہاں رک جاؤ۔ ان دونوں کو جانے دو۔“

جیلر باپ نے اسے غصہ سے دیکھا۔ مرینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بچے! میں جس کے بیڈ پر جاتی ہوں۔ اسے چار کاندھے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”اور جس پر میری نیت آجاتی ہے۔ اسے میں ہر قیمت پر حاصل کرکے رہتا ہوں۔ یوں بھی تم تینوں کی ڈیوٹی ہے کہ میری ضرورتیں پوری کرتے رہو۔“

دارا نے کہا۔ ”اپنے دماغ سے یہ خناس نکال دو کہ ہم تمہاری غلامی کرنے آئے ہیں۔“

بہرام نے کہا۔ ”ہماری ڈیوٹی ہے تمہیں صحیح سلامت اس ملک سے لے جانا۔ ہم تمہیں ملک عدم میں بھی پہنچا سکتے ہیں۔“

مرینہ فون پر نمبر پنچ کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”برنارڈ! اگر تم مجھے ہر قیمت پر حاصل کرلو گے تو تمہاری ماں کو دودھ پلانے کا انعام دوں گی۔“

اس نے فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ ”سر! آپ نے برنارڈ کو زندگی دینے کے لیے بھیجا ہے اور یہ میرے بیڈ پر آکر مرنا چاہتا ہے۔ کیا حکم ہے سر؟“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اسے فون دو۔“

مرینہ نے برنارڈ کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ڈائریکٹر جنرل آف ایس او ففٹن اینٹی ٹررا سکواڈ لندن......“

برنارڈ کا منہ حیرانی سے کھل گیا۔ اس نے فون لے کر کان سے لگا کر کہا۔ ”سر! برنارڈ اسپیکنگ۔“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ”کیا تمہیں مرنے کے لیے پاکستان کی زمین پسند آگئی ہے؟“

”نو سر......! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ فیڈرل بیورو آف انٹیلی جنس میں میری ہر ضرورت پوری کی جاتی مجھے تاج کی طرح سر پر پہنا جاتا ہے۔“

”بے شک ہم نے تمہارے کارنامے سنے ہیں۔ اس کے باوجود تمہیں سمجھاتے ہیں۔ مرینہ سے دور رہنا۔“

اس نے مرینہ کو گھور کر دیکھا پھر پوچھا۔ ”کیا ہے یہ؟ آپ کیوں ڈرا رہے ہیں؟“

”ہم سمجھا رہے ہیں۔ ایف بی آئی اور سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ سے ہمارا معاہدہ ہے کہ تمہیں وہاں سے بخیریت نکال لائیں گے۔ میں تمہارے اعلیٰ افسران سے ابھی بات کرتا ہوں۔ تمہارے بڑے جانتے ہیں۔ تم بھی یہ جان لو کہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں تھری مونسٹرس (تین بلائیں) ہیں۔ ان میں سے ایک بلا ابھی تمہارے سامنے کھڑی ہے۔“

وہ سن رہا تھا اور بے یقینی سے مرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ فون پر کہا جارہا تھا۔ ”تمہاری سلامتی اور واپسی اسی میں ہے کہ اس بلا سے دور رہو۔ ورنہ وہ تمہیں واپس نہیں آنے دے گی۔“

وہ ٹالنے کے انداز میں بولا۔ ”او کے۔ میں سوچوں گا۔“

مرینہ نے اپنا فون واپس لے کر جیلر سے کہا۔ ”پاپا! آپ ہمیں ایسے قیدی سے ملائیں جو بہت ڈینجرس ہیں۔ ہم ان سے الگ الگ باتیں کریں گے اور ان سے کام لیں گے۔“

وہ سب برنارڈ کے سیل سے باہر آگئے۔ اس دروازے کو لاک کر دیا گیا۔ جیلر نے اسسٹنٹ جیلر سے کہا۔ ”ان تینوں کو بدنام قیدیوں کے پاس لے جاؤ اور محتاط رہو، کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔“

مرینہ نے دارا اور بہرام سے کہا۔ ”تم جاؤ ان سے ملاقاتیں کرو۔ میں ابھی آکر جوائن کروں گی۔“

وہ اسسٹنٹ جیلر کے ساتھ چلے گئے۔ بیٹی نے کہا۔ ”پاپا! میں مراد سے ملوں گی۔“

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”اس سے کیوں ملو گی؟“

وہ بولی۔ ”ہم ابھی باپ بیٹی نہیں ہیں۔ ہمارے سلسلے میں اوپر سے جو احکامات آئے ہیں۔ آپ ان پر عمل کریں۔“

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو میری بیٹی نہیں

ہو۔ لندن سے آئی ہوئی بلائے جان ہو۔“

وہ اس کے رخسار کو تھپکتے ہوئے بولا۔ ”کہاں ملو گی؟ آفس میں یا سیل میں؟“

”جہاں پرائیویسی ہو اور آپ بھی نہ ہوں۔“

وہ گھور کر بولا۔ ”اے لڑکی! تو کوئی گڑبڑ تو نہیں کرے گی؟“

”نو پاپا......!“

وہ جیل کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے مراد کے پاس آئے۔ محبوب بھاری رشوتیں دے رہا تھا۔ اس لیے اسے بھی ایک الگ سیل میں رکھا گیا تھا۔ اس نے باپ بیٹی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ مرینہ نے کہا۔ ”پاپا! دروازہ کھلوائیں۔“

وہ بولا۔ ”سوری۔ میں تمہارے لائے ہوئے کاغذات کے مطابق عمل کر رہا ہوں لیکن جیل کے قانون کے خلاف سیل کا دروازہ نہیں کھولوں گا۔“

”میں اس سے آفس میں ملنا چاہتی تو آپ اسے وہاں بلاتے تب ہمارے درمیان یہ تالا نہ ہوتا۔“

”مجھ سے بحث نہ کرو۔ باپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ تم سر پھری ہو۔ وہاں اینٹی ٹررا سکواڈ میں تمہیں خطرناک بلا کسی وجہ سے ہی کہا جاتا ہے۔“

”پلیز یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ میں اپنے پاپا کی ملازمت کو خطرے میں نہیں ڈالوں گی۔“

وہ باپ کی گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔ وہ بولا۔ ”کچھ معلوم تو ہو اس سے ملنے کیوں آئی ہو۔ یہ ایک معمولی سا دیہاتی عاشق مزاج الو کا پٹھا ہے۔ جھوٹے الزام میں آیا ہے اور پھانسی پر چڑھنے والا ہے۔ ایسے گدھے سے کیوں ملنے آئی ہو؟“

وہ کان کے پاس منہ لے جا کر بولی۔ ”جوان بیٹیوں سے نہیں پوچھتے کہ وہ کسی گدھے سے کیوں ملنے جا رہی ہیں؟“

وہ بے بسی سے بولا۔ ”تم لندن سے کیوں آئی ہو؟“

”اپنے پاپا کو پیار کرنے۔“

اس نے باپ کے گال پر بوسہ لیا۔ وہ بے بسی سے سپاہی کو دیکھ کر بولا۔ ”دروازہ کھول دو۔“

وہ باپ سے الگ ہو گئی۔ سپاہی نے آ کر دروازہ کھول دیا۔ ”تھینک یو پاپا!“

وہ بولا۔ ”میں آدھے گھنٹے کے اندر آؤں گا۔“

”پلیز پاپا! بیٹی کے لیے جیلر نہ بنیں۔ میں کال کروں گی۔ تب آئیں گے۔“

اس نے بے بسی سے سر ہلایا۔ بڑی شفقت سے مسکرایا پھر بیٹی کے گال پر ہلکی سی تھپکی دی اور چلا گیا۔ جیل کے اس حصے میں کوئی دوسرا سیل نہیں تھا۔ وہاں خاموشی اور ویرانی تھی۔ مراد اسے بڑی دیر سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”یہ مجھ سے کیوں ملنے آئی ہے اور آج تو اس نے پولیس والوں جیسی وردی پہنی ہے۔ کوئی بڑی افسر لگ رہی ہے۔“

وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ سیل کا جائزہ لینے لگی۔ وہاں فرش پر بچھونا تھا۔ بیٹھنے کے لیے ایک چھوٹی سی چٹائی تھی اور دیوار کے ساتھ لگی ہوئی سیمنٹ کی ایک بنچ بنی ہوئی تھی۔

وہ مراد کے چاروں طرف آہستہ آہستہ چکر لگاتے ہوئے اسے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ میں آئی ہوں۔ عقل کیا کہتی ہے؟ کیوں آئی ہوں؟“

اس نے پوچھا۔ ”آپ کوئی سرکاری آفیسر ہیں؟“

”ہاں۔ میری رشتے داری مجرموں سے رہا کرتی ہے۔“

”میں نے اپنے ملک میں ایسی وردی کسی کی نہیں دیکھی۔“

”میں لندن سے آئی ہوں۔ تم نے دس جماعتیں پڑھی ہیں۔ کنویں کے مینڈک ہو۔ اپنے ملک سے باہر کی باتیں نہیں جانتے ہو۔ مجھے بھی سمجھتے سمجھتے ہی سمجھو گے۔“

وہ متاثر ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بالکل روبرو ہو کر کہا۔ ”اتنا سن لو کہ ایک ڈینجرس مشن پر آئی ہوں اور تین ماہ کی چھٹی بھی لی ہے۔ شادی کرنے اور بر ڈھونڈنے میں کچھ وقت لگے گا۔ یہ معاملات تین ماہ میں نمٹا لوں گی۔“

پھر اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”تین مہینے بہت ہیں نا؟“

”میں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

”تم ہی تو سب کچھ ہو۔ یہاں تمہارا منہ دیکھنے نہیں آئی ہوں۔ میرا لائف پارٹنر تم ہی لاؤ گے۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”میں...... کہاں سے لاؤں گا؟ میں تو اس کوٹھری سے باہر نہیں نکل سکتا۔“

وہ سلاخوں والے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”تم دیکھ رہے ہو۔ دروازہ کھل گیا ہے۔ آئندہ بھی کھلتا اور بند ہوتا رہے گا۔“

”ہاں۔ آپ باپ بیٹی ہیں۔ یہاں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”میں باپ کی بھی محتاج نہیں رہتی ہوں۔ اپنے معاملات خود نمٹاتی ہوں۔ اپنے معصوم دماغ پر بوجھ نہ ڈالو۔ یہ نہ سوچو کیا کرنے والی ہوں۔“

”مجھے معلوم تو ہو کہ میں تمہارا لائف پارٹنر کہاں سے لاؤں گا؟ کیسے لاؤں گا؟“

”ایک موٹی عقل سے سمجھ سکتے ہو کہ یہاں سے باہر

جاؤ گے تو میرا کام کر سکو گے۔“

”میں باہر جا سکوں گا......؟“ اس نے تصور میں دیکھا، وہ جیل سے باہر نکلتے ہی ماروی کو گلے لگا رہا تھا۔

وہ بولی۔ ”ہاں۔ میں تمہیں یہاں سے نکالوں گی۔“

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”کیا عدالتی فیصلہ ہوتا رہے گا اور تم مجھے یہاں سے باہر لے جاؤ گی؟“

”میں قانون کو جیب میں رکھتی ہوں اور جب چاہتی ہوں، خود عدالت بن جاتی ہوں۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”میں قانون کے خلاف یہاں سے نہیں نکلوں گا۔ پکڑا گیا تو بے موت مارا جاؤں گا۔“

”قانون بے بس ہو جائے گا تو تم کیا کرو گے؟ ٹھیک ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔ لیکن حالات تمہیں یہاں سے اٹھا کر باہر پھینک دیں گے تو تم واپس کیسے آؤ گے؟“

”آں...... یہ۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ قانون بے بس کیسے ہوگا؟ اور میں یہاں سے باہر کیسے پھینکا جاؤں گا؟“

”کیا تم جانتے تھے کہ کبھی قتل کے الزام میں اندر آؤ گے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”نہیں۔“

”اسی طرح آگے کی بات نہیں جان سکو گے کہ یہاں سے اچانک ہی باہر کیسے نکل جاؤ گے۔“

وہ اس کے کشادہ سینے پر دونوں ہتھیلیاں رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم پر بڑا پیار آ رہا ہے۔ بدمعاشوں اور مجرموں کے ایسے دور میں ایسی سادگی اور معصومیت مجھے لوٹ رہی ہے۔“

اس نے اپنی ہتھیلیاں ایسے انداز سے، ایسے جذبے سے اس کے سینے پر رکھی تھیں کہ وہ گڑبڑا گیا۔ ایسا بھی بھولا اور نادان نہیں تھا۔ مرینہ کی گوری اور گلابی رنگت دھیمی دھیمی سلگ رہی تھی۔ تمتماتے ہوئے رخسار بڑے ہی جاذب نظر تھے۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی اپنائیت بھر گئی تھی۔ ایسی اپنائیت، جو ایک دوجے کو نئے رشتے میں پرو دیتی ہے۔

وہ ہچکچاتے ہوئے ذرا پیچھے ہوا۔ وہ ساتھ ساتھ آگے چلی آئی۔ سینے کی کائنات پر ہتھیلیاں سلگتی رہیں۔ پھر کیا ہوا کہ خود ہی چونک گئی۔ اس سے ایک قدم دور ہو گئی۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا پھر پلکیں اٹھا کر مراد کو دیکھا اور دونوں مٹھیاں بند کر لیں۔ جیسے گرفتار کر لیا ہو۔ وہ بڑی خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ سمجھنے کے باوجود کچھ اور سمجھ کو رہ گیا تھا۔ وہ انتظار کر رہا تھا، کچھ بولے گی۔

بعض حالات میں بولنا ضروری نہیں ہوتا۔ سمجھنا لازمی ہوتا ہے۔ وہ سر جھکا کر دوسری طرف گھوم گئی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آہنی سلاخوں والے دروازے سے گزر کر باہر چلی گئی۔ مراد نے آگے بڑھ کر سلاخوں کو تھام کر اسے دیکھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر جاتے جاتے کوریڈور کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

☆☆☆

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے فوراً یاد نہیں آیا کہ کہاں آ کر سونے کے بعد آنکھ کھلی ہے؟ وہ چاروں شانے چت پڑا تھا۔ خواب گاہ کی چھت دکھائی دے رہی تھی۔ پنکھا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر سمیرا نظر آئی۔ وہ ایک ایزی چیئر پر گہری نیند میں تھی۔

تب اسے یاد آیا کہ وہ اپنی ایک پرائیویٹ کوٹھی میں ہے۔ پچھلی رات زخمی ہو کر ماروی کے ساتھ وہاں آیا تھا۔

اس نے دوسری طرف سر گھما کر زخمی بازو کو دیکھا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح مرہم پٹی کی تھی۔ بیڈ کے قریب خون کی خالی بوتل اسٹینڈ سے لٹک رہی تھی۔ وہ آرام سے تھا کسی طرح کی تکلیف نہیں تھی۔

اس نے پھر سر گھما کر سمیرا کو دیکھا۔ وہ وہاں آ کر تیمار دار بن گئی تھی اور تیمار داری کرتے کرتے وہیں سو گئی تھی۔ نیند کی حالت میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ بڑی عقیدت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

بے شک اسے دیکھ رہا تھا لیکن اسے دیکھتے وقت بھی ہرجائی پن تھا۔ وہ ماروی کو سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟

پتا نہیں کیا وقت ہوا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ باہر دن تھا یا ابھی تک رات تھی؟ یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے سوچا کاش وہ میری تیمار داری کرتے کرتے یہاں تھکی ہوئی سی سو جاتی تو مجھے کتنی اپنائیت سی مل جاتی۔

یہ سوچ کر تکلیف ہوئی کہ اس کے لیے خون بہایا اور وہ جا کر سو گئی۔ ایسی بھی کیا بے حسی اور لاتعلقی؟

وہ مایوس ہو رہا تھا پھر بھی تصور کی آنکھ سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا۔ آہستگی سے دروازہ کھلا۔ وہ جھانک کر اسے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملیں تو وہ ذرا ٹھٹک گئی پھر دروازہ پوری طرح کھول کر اندر آ گئی۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ سوئی نہیں ہے۔ بے حس نہیں ہے۔ جاگ رہی تھی اور شاید پہلے بھی آ کر اسے سوتے ہوئے دیکھ گئی ہے۔

اور محبت کیا ہوتی ہے؟ یہی تو ہوتی ہے۔ محبوب کا دل مسرتوں سے بھر گیا۔ اس نے سمیرا کی موجودگی کے باعث دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''تم جاگ رہی ہو؟''

وہ بھی قریب آکر دھیمی آواز میں بولی۔ ''آپ بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ بھوکے سو گئے تھے۔ میں نے سوچا کسی وقت بھی آنکھ کھلے گی۔ ڈاکٹر کہہ گیا ہے آپ کو مکھن توس اور ہاف فرائی انڈا ضرور دیا جائے۔ ابھی تیار کرکے لے آتی ہوں۔''

وہ پہلی بار اس کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانے والا تھا۔ خوش ہوکر بولا۔ ''ہاں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

وہ کمرے سے چلی گئی۔ اسے پہلی بار ماروی سے ایک گھریلو عورت کی اپنائیت اور توجہ مل رہی تھی۔ بازو کا زخم خاموش تھا کسی طرح کی تکلیف نہیں تھی۔ اس نے فون کو آن کرکے وقت دیکھا۔ صبح کے چھ بجنے والے تھے۔ وہ بیڈ سے اتر کر واش روم میں چلا گیا۔

پچھلی رات خطرات سے کھیلنے کے بعد دوسری صبح بڑی خوشگوار ہوگئی تھی۔ آنکھ کھلنے کے بعد ماروی کی قربت اور خدمت گزاری مل رہی تھی۔ وہ واش روم سے واپس کمرے میں آیا تو وہ بڑی سی ٹرے میں ناشتا لے آئی تھی۔ اس نے ٹرے کو بیڈ پر رکھ کر پوچھا۔ ''یہ ناشتا کہاں کریں گے؟''

وہ بولا۔ ''یہیں رہنے دو اور میرے ساتھ شروع ہوجاؤ۔''

وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ماروی نے کہا۔ ''آپ کھائیں۔ میں سمیرا کے ساتھ ناشتا کروں گی۔''

اسی وقت سمیرا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دونوں کو دیکھا۔ پھر جلدی سے کرسی پر سیدھی ہوکر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''او گاڈ......! میری آنکھ لگ گئی تھی۔''

محبوب نے کہا۔ ''تم میری خاطر کرسی پر پڑی رہی تھیں۔ آرام سے بیڈ پر سونا چاہیے تھا۔''

وہ ماروی کو دیکھ کر بولی۔ ''یہ تم نے اچھا کیا۔ انہیں جاگتے ہی کھانے کو دے رہی ہو۔ میں ابھی واش روم سے ہوکر آتی ہوں۔''

وہ اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کے واش روم میں آئی۔ وہ رات کو محبوب کے پاس جاگتی رہی تھی۔ اس کی آنکھ کسی وقت بھی کھلتی تو وہ دیکھتا کہ سمیرا اس کی خدمت کے لیے جاگ رہی ہے۔ لیکن وہ سوتا رہا تھا۔ اور وہ جب جاگا تو یہ سوگئی تھی۔ ماروی نے خدمت گزاری کا اعزاز حاصل کرلیا تھا اور یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔

اس نے ناگواری سے سوچا۔ ''پچھلی رات ماروی نے کہا تھا' وہ بدنامی سے گھبرا گئی ہے۔ اب یہاں نہیں رہے گی۔ جلد ہی محبوب سے دور کہیں چلی جائے گی۔''

وہ منہ ہاتھ دھوتے ہوئے زیرلب بولی۔ ''اونہہ! سب دکھاوا ہے۔ دل تو صاحب پر اٹکا ہوا ہے۔ اپنی خدمت گزاری دکھانے کے لیے ایک ٹانگ پر کھڑی تھی۔

اب وہاں کھڑی ناشتا کرا رہی ہے۔ دل جیتنے کا کام کررہی ہے اور کہتی ہے صرف اپنے مراد کی ہے۔ کسی اور کا منہ نہیں دیکھے گی۔ جھوٹی کہیں کی۔''

اس نے واش بیسن کے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بڑے انتظار کے بعد محبوب نے اپنے قریب بلایا ہے یہاں صرف مجھے ہی ان کے قریب رہنا چاہیے۔ ایسا کیا کیا جائے کہ ماروی یہاں سے چلی جائے؟''

وہ تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے بولی۔ ''مشکل تو یہ ہے کہ محبوب اسے نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ دونوں ایسے بدنام ہورہے ہیں۔ جیسے بدنامی ان کے لیے دلچسپ مشغلہ بن گئی ہو۔''

وہ کمرے میں آئینے کے سامنے آکر خود کو دیکھنے لگی۔ لباس پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ چہرے پر بھی لائٹ میک اپ ضروری تھا۔ یہی تو موقع تھا کہ زیادہ سے زیادہ پرکشش بن کر رہے۔

اور وہاں جانے کی جلدی بھی تھی۔ ماروی کو ادھر تنہائی اور قربت زیادہ سے زیادہ مل رہی تھی۔ ایسے وقت ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟

اچھا پہننا اور اوڑھنا تو ضروری تھا۔ وہ بڑے سے بیگ میں ملبوسات اور دیگر ضروری چیزیں لے آئی تھی۔ لباس پر استری پھیرنے اور پہننے میں وقت لگا پھر لائٹ میک اپ نے اسے نکھار دیا یوں کسی حد تک جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا تاج محل بن گئی پھر محبوب کی خواب گاہ میں آئی تو وہ نہیں تھا۔

اچانک یوں لگا جیسے ماروی اسے لے اُڑی ہو۔ اگرچہ یہ محض حاسدانہ سوچ تھی۔ وہ کیا کرتی؟ دل کہہ رہا تھا کہ محبوب کے ساتھ لگے رہنے کا یہی موقع ہے۔ وہ جب تک اس کوٹھی میں چھپا رہے گا اسے بھی اس کے ساتھ دن رات رہ کر اسے جیت لینے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ محبوب وہاں بیٹھا فون پر کہہ رہا تھا۔ ''میں مانتا ہوں' سمیرا نے میرے کاروباری معاملات کو بڑی ذہانت سے کیری آن

رکھا ہے۔اب وہ غیر حاضر رہے گی تو مسائل پیدا ہوں گے لیکن معروف صاحب مسئلہ یہ ہے کہ سمیرا میرے ذاتی معاملات میں بھی اہم ہے۔موجودہ حالات میں اس کے سوا کسی پر بھروسا نہیں کروں گا۔"

یہ ایسی باتیں تھیں کہ وہ سن رہی تھی اور خوشی سے لہرا رہی تھی۔اسے اپنی کوششوں کا انعام مل رہا تھا۔

محبوب فون پر کہہ رہا تھا۔"پلیز آپ ایک آدھ روز دفتری معاملات سنبھالیں۔میں ماروی کے لیے مکمل حفاظتی انتظامات کرنے کے بعد سمیرا کے ساتھ آجاؤں گا۔"

اس نے نظریں اٹھا کر سمیرا کو دیکھا پھر کہا۔"ہاں میں ابھی سمیرا سے باتیں کرتا ہوں۔پھر یہ آپ سے باتیں کریں گی۔"

اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔"معروف صاحب ہم دونوں کی غیر حاضری سے پریشان ہیں اور ان کی پریشانی بجا ہے۔تم نے بہت سی ذمے داریاں سنبھالی ہیں اور میں نے تمہیں بھی یہاں بلا لیا ہے۔وہ اکیلے ہوگئے ہیں۔"

ماروی نے ایک چھوٹی سی ٹرے میں دودھ سے بھرا ہوا گلاس لاکر محبوب کے سامنے رکھا۔پھر سمیرا کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔محبوب نے کہا۔"معروف صاحب یہاں آنا چاہتے ہیں۔میں نے کہا دشمن آپ کے پیچھے یہاں چلے آئیں گے۔میں نہیں چاہتا کسی کو اس کوٹھی کا پتا معلوم ہو۔تم یہاں سے آفس اٹینڈ کرنے جاؤ گی تو ماروی کو اور مجھ کو ڈھونڈنے والے تمہارے بھی پیچھے لگ جائیں گے۔"

سمیرا نے کہا۔"ہم دشمنوں سے بے خبر ہیں لیکن اتنا تو سمجھ رہے ہیں کہ وہ ماروی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے اور یہ جانتے ہوں گے کہ آپ اسے کہیں لے گئے ہیں۔"

ماروی نے کہا۔"میری چھوٹی سی عقل میں ایک بات آرہی ہے،کیا میں بولوں؟"

سمیرا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"یہ تمہارا معاملہ ہے تم بھی الجھی ہوئی ہو۔تمہیں بولنا چاہیے۔"

وہ بولی۔"دشمنوں کو یقین دلانا چاہیے کہ کل رات سائیں میمن گوٹھ میں نہیں تھے۔یہ مجھے وہاں سے کہیں نہیں لے گئے ہیں۔میں پتا نہیں کہاں گم ہوگئی ہوں۔"

وہ محبوب سے بولی۔"آپ ابھی دفتر جائیں گے تو اپنوں کو اور غیروں کو سب ہی دشمنوں کو معلوم ہوگا کہ آپ میرے ساتھ نہیں ہیں۔وہ چھپ کر آپ کی نگرانی کرتے رہیں گے۔آپ میری طرف نہیں آئیں گے اپنے کاروبار میں مصروف رہیں گے تو انہیں یقین ہوجائے گا کہ واقعی آپ بھی میرے لیے پریشان ہیں اور مجھے تلاش کررہے ہیں۔"

"میں تمہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"تنہائی کیسی؟یہاں سمیرا اور ان کے والدین رہیں گے۔یہاں مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔آپ فون کے ذریعے میری خیریت معلوم کرتے رہیں گے۔"

وہ بڑی ذہانت سے مشورہ دے رہی تھی۔محبوب کا دل نہیں مان رہا تھا۔قسمت سے ایک چھت کے نیچے چھپ کر رہنے کا موقع ملا تھا۔وہاں وہ دن رات ایک دوسرے کے قریب رہتے یوں ماروی اس کی قربت سے اور اس کی طرف مائل ہوتی رہتی۔

وہ اپنے جذبات کے مطابق سوچ رہا تھا کہ ماروی کو وہاں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔سمیرا کو ماروی پر پیار آرہا تھا۔وہ اس کے دل کی بات کہہ رہی تھی۔محبوب کو اپنے سے دور کر رہی تھی۔

اگر یہی مشورہ وہ دیتی تو محبوب سمجھتا کہ وہ حسد اور جلاپے سے ماروی کو اس سے دور کر رہی ہے۔

محبوب نے کہا۔"میں زخمی ہوں،مجھے آفس نہیں جانا چاہیے۔جب تک زخم نہ بھرے،گھر میں آرام کرنا چاہیے اور میں یہاں آرام سے رہوں گا۔"

ماروی نے کہا۔"ڈاکٹر نے کہا ہے کہ زخم گہرا نہیں ہے۔جلد ہی بھر جائے گا۔آپ آرام سے یہاں ہیں تو آفس میں بھی وقت گزار سکتے ہیں۔اس طرح کئی مسئلے حل ہوجائیں گے۔آپ کے کاروبار کو نقصان نہیں پہنچے گا۔دشمنوں کو یقین ہوجائے گا کہ میں آپ کی پناہ میں نہیں ہوں۔

ذرا سوچیے،انہیں میری ضرورت ہے وہ صرف مجھے تلاش کرتے رہیں گے۔آپ کو نظر انداز کردیں گے۔آپ کا زخم لباس میں چھپا رہے گا کسی کو نظر نہیں آئے گا اور......"

وہ ذرا چپ ہوئی۔محبوب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔وہ بولی۔"اور آپ مجھ سے دور رہیں گے تو کوئی مجھے آپ کے ساتھ بدنام نہیں کرے گا۔عارضی طور پر ہی سہی۔آپ بھی نیک نام رہیں گے۔"

موجودہ حالات کے مطابق اس کی تمام باتیں درست تھیں۔محبوب نے سمیرا کو دیکھا۔اس نے سر جھکا لیا۔وہ بولا۔"ماروی!یہاں میری موجودگی ضروری ہے۔دو روز بعد مراد سے تمہاری ملاقات ہوگی۔یہ ایک بڑا چیلنج ہے کہ یہاں سے کیسے نکلوگی اور جیل تک کیسے چھپ کر جاؤ گی؟تم

جانتی ہو۔یہ سارے انتظامات مجھے ہی کرنے ہوں گے۔"

وہ بولی۔"انتظامات ہوجائیں گے۔آپ فکر نہ کریں۔میں مراد سے مل کر آجاؤں گی۔"

"کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو؟کیا اکیلی ملنے جاؤ گی؟"

اس نے سمیرا کو دیکھا پھر کہا۔"میں ساری رات سوچتی رہی ہوں اور اب اچھی طرح سوچ سمجھ کر بول رہی ہوں۔میں بیس تاریخ کو سمیرا کے ساتھ جاؤں گی۔ہم دونوں برقع میں رہیں گی۔کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکے گا۔"

محبوب تھوڑی دیر تک کچھ بول نہ سکا۔اس کا منہ تکتا رہ گیا۔سمیرا نے دل میں کہا۔"جیو ماروی!تم بہت دور تک سوچتی ہو اور سمجھتی ہو۔اپنے مراد کی خاطر بڑی ذہانت سے بول رہی ہو۔تم محبوب کی طرف کبھی نہیں جھکو گی۔"

وہ بولا۔"تم دو لڑکیاں کسی مرد کے بغیر جیل جاؤ گی۔وہ کیسی جگہ ہے۔جانتی ہو۔میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

وہ بولی۔"میں نے پچھلی ملاقات میں وہاں دیکھا ہے۔تنہا عورتیں اپنے قیدی مردوں سے ملنے آئی تھیں۔وہ جگہ عورتوں کے لیے بہت محفوظ ہے۔وہاں تو کوئی بدمعاشی ہو نہیں سکتی۔کیونکہ تمام بدمعاش سلاخوں کے پیچھے ہوتے ہیں۔"

وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ چپ رہنے والی ایسی مدلل گفتگو کرتی ہوگی۔وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔"پھر بھی میرا دل نہیں مانے گا۔میں تمہاری سیکیورٹی کا انتظام خود کروں گا۔تب میری تسلی ہوگی۔"

"سیکیورٹی والے کیا کرلیں گے؟پچھلی رات آپ دیکھ چکے ہیں۔آپ میری بات نہیں مانیں گے تو میں بھی نہیں مانوں گی۔"

محبوب نے چونک کر اسے دیکھا۔وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔"میں یہاں نہیں رہوں گی۔"

"پاگل ہوئی ہو؟"

"پاگل ہوجاؤں گی۔کچھ سوچے سمجھے بغیر یہاں سے نکل جاؤں گی۔آپ کے گارڈ بھی مجھے روک نہیں سکیں گے۔"

وہ قریب آئی اس نے جھک کر دودھ کا خالی گلاس اور ٹرے اٹھائی اور کوئی جواب سنے بغیر چلی گئی۔محبوب گم صم سا اس دروازے کو دیکھتا رہ گیا جہاں سے وہ گئی تھی۔اس کے فیصلہ کن لہجے نے اسے فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔

اس نے سمیرا سے کہا۔"یہ گھبرا گئی ہے۔ہماری لاعلمی میں کہیں جائے گی تو بری طرح پچھتائے گی۔اسے سمجھاؤ۔"

"بدنامیوں نے اسے توڑ کر رکھ دیا ہے۔کل رات رو رہی تھی۔میرے سمجھانے سے نہیں سمجھے گی۔"

"پھر بھی کوشش تو کرو۔"

"آپ کہتے ہیں تو ایک بار نہیں بار بار اسے سمجھاؤں گی۔لیکن آپ اس کے مزاج کو دیکھیں اور سمجھیں،یہ اوپری دل سے مان جائے اور پھر وہی کرے جو اس کے دماغ میں سما گیا ہے تو پھر آپ اسے کہاں ڈھونڈتے پھریں گے؟"

وہ پھر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔سمیرا نے کہا۔"میری ایک بات مان لیں۔اس کی تسلی کے لیے اس کی بات عارضی طور پر مان لیں۔ابھی یہاں سے آفس جائیں۔دوستوں اور دشمنوں کی نظروں میں آئیں۔اور ماروی کی تلاش میں اپنے لوگوں کو دوڑاتے رہیں۔یہ ثابت کریں کہ آپ ماروی کے ساتھ نہیں ہیں۔

دشمن دیکھیں گے کہ آپ خود اسے تلاش کررہے ہیں تو انہیں یقین ہوجائے گا کہ یہ آپ کے پاس نہیں ہے۔آپ دو چار روز ادھر نہ آئیں۔اس میں آپ کا اور ماروی کا فائدہ ہے۔جب آپ کا دل نہ مانے تو کسی رات چھپ کر یہاں آجائیں۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ابھی منظر عام پر آکر دشمنوں کو دھوکا دیا جاسکتا تھا۔اس بدنامی سے بچ سکتا تھا کہ ماروی کے ساتھ کہیں دن رات گزار رہا ہے۔اس بیچاری کو بھی بدنامیوں سے بچا سکتا تھا۔

اور......اس نے سوچا۔"جب میرا دل نہیں مانے گا۔ماروی کو قریب سے دیکھنا چاہوں گا تو کسی وقت بھی یہاں چلا آؤں گا۔"

وہ صوفہ کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔"ٹھیک ہے ماروی سے بولو۔میں ابھی جا رہا ہوں اور اس لیے جا رہا ہوں کہ وہ خوش ہوجائے گی۔میں اس کی خوشی چاہتا ہوں۔"

یہ خوش خبری پہلے معروف تجلی کو سنائی گئی پھر یہ خبر پورے کاروباری حلقے میں پھیلی کہ چانڈیو صاحب آفس اٹینڈ کریں گے۔ان کے اہم کلائنٹ فون پر رابطہ کرسکیں گے۔یوں یہ خبر دشمنوں تک پہنچی کہ محبوب نے نہ ماروی کو اغوا کیا ہے نہ کرایا ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ کہیں روپوش ہے۔وہ تو خود ہی اس کے گم ہونے سے پریشان ہے۔اس کے آدمی اسے تلاش کررہے ہیں۔

چیئرمین بابر بشیر،بلو شاہ اور حشمت جلالی حیران ہو کر

گامے سے پوچھ رہے تھے۔ ''اگر ماروی کو محبوب علی چانڈیو نہیں لے گیا ہے تو پھر کون لے گیا ہے؟''

گامے نے کہا۔ ''دلہن کے کمرے میں کئی عورتیں اور مرد لڑ پڑے تھے۔ ہمارا ٹکراؤ لنگڑے اور اس کے ساتھیوں سے ہوا تھا۔ میں نے ماروی پر گولی چلائی تھی۔ ایسے وقت ایک شخص سامنے آ گیا تھا۔ گولی اسے لگی تھی۔''

بابر بشیر نے پوچھا۔ ''وہ کون تھا؟''

''اس کا چہرہ ہیلمٹ میں چھپا ہوا تھا۔ وہاں زندگی اور موت کا کھیل جاری تھا۔ کسی نے اسے نہیں پہچانا۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود ماروی کو کاندھے پر لاد کر لے گیا۔''

''پھر تو اس شخص کی یہ پہچان ہے کہ وہ زخمی ہے۔''

''ہاں بدن کے کسی حصے میں گولی لگی ہے۔''

انہوں نے اپنے مخبر سے پوچھا۔ ''کیا چانڈیو کے بدن کا کوئی حصہ زخمی ہے؟'' جواب ملا۔ ''نہیں۔ شاید اس کے بدن پر خراش بھی نہیں آئی ہوگی۔ اگر اسے گولی لگتی تو وہ تن کر نہیں چلتا۔

وہ اپنی کار خود ڈرائیو کرتا ہے۔ زخمی ایسے چاق و چوبند نہیں ہوتے جیسا وہ نظر آ رہا ہے۔''

یہ یقین ہو گیا کہ ماروی چانڈیو کے پاس نہیں ہے۔ پھر کہاں ہے؟ اسے کون لے گیا ہے؟ اس کا کوئی نیا عاشق کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟ اور وہ ہیلمٹ والا کون تھا؟ اب وہ لوگ اُلجھ گئے تھے۔ ماروی کے سائے کے پیچھے بھاگتے رہنے والے تھے۔

☆☆☆

خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ بیس تاریخ کو ماروی گرفت میں آنے والی تھی۔ اس واردات سے پہلے ہی حشمت جلالی کے وکیل نے اسے بتایا تھا کہ بیس تاریخ کو ماروی اور مراد کی جیل میں ملاقات منظور ہو گئی ہے۔ اب وہ باپ اور دونوں بیٹے سر جوڑ کر سوچ رہے تھے۔ کیا وہ مراد سے ملنے آئے گی؟

رحمت جلالی نے کہا۔ ''جب کوئی اسے اٹھا کر لے گیا ہے تو کیسے آئے گی؟''

برکت جلالی نے کہا۔ ''اغوا کرنے والا اتنا شریف آدمی نہیں ہوگا کہ اسے مراد کے پاس جانے کے لیے آزاد چھوڑ دے گا۔''

حشمت نے دونوں بیٹوں کو دیکھا۔ سوچا پھر کہا۔ ''چانڈیو زخمی نہیں ہے۔ وہ ہیلمٹ والا چانڈیو نہیں تھا۔ لیکن اس کا کوئی آدمی ہو سکتا ہے۔ وہ صنعت کار ارب پتی بہت مکار ہے۔ میں نہیں مانتا کہ وہ ماروی سے محروم ہو کر آفس جا کر کاروبار سے لگ گیا ہے۔''

بیٹوں نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ ایک نے پوچھا۔ ''کیا اس نے کسی دوسری جگہ اسے چھپا کر رکھا ہے؟''

''ہاں، اس مکار دشمن نے یہی کیا ہے۔ تب ہی آرام سے ہے۔ ہمیں اُلّو بنانے کے لیے محض دکھانے کے لیے اپنے آدمیوں کو اس کی تلاش میں دوڑا رہا ہے۔''

''وہ بہت محتاط ہے۔ ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ اسے کہاں چھپا کر رکھا ہے؟''

حشمت نے کہا۔ ''ایک ہی امید ہے۔ اگر ماروی کہیں عزت آبرو سے محفوظ ہے اور اس کا محافظ چانڈیو ہے تو وہ جیل میں مراد سے ملنے ضرور آئے گی اور کل بیس تاریخ ہے۔''

بیٹوں نے دیوار سے لٹکے ہوئے کیلنڈر کو دیکھا پھر برکت جلالی نے کہا۔ ''ابا...... ! چھپی ہوئی چیز ایک ہی بار باہر آئے گی۔ ایک ہی موقع ملے گا۔ ہم کیا کر سکیں گے؟''

حشمت نے پریشان ہو کر کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں؟ میمن گوٹھ سے اغوا نہیں کرا سکے۔ یہ ہماری پارٹی کے غنڈے بھروسے کے قابل نہیں ہیں۔ ہم سے رقم لی اور کوئی کام نہ کر سکے اور ہم دوسرے غنڈوں بدمعاشوں کو نہیں جانتے ہیں۔ کل کچھ نہ کیا تو پھر پتا نہیں کب موقع ملے گا۔''

''ابا... ! ہمارے گوٹھ کے بدمعاش یہاں بڑی واردات نہیں کر سکیں گے لیکن اسے دور سے گولی مار کر تو بھاگ سکیں گے۔''

''ہاں وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی تو اسے چانڈیو کے پاس بھی رہنے نہیں دیں گے۔ کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ اس بار اپنے ہی آدمیوں سے کام لیں گے۔''

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تو وہ تینوں چپ ہو گئے۔ رابعہ اپنے بھائی عظمت شاہ کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے ان باپ بیٹوں کو دیکھ کر کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کوئی بہت ہی اہم میٹنگ چل رہی ہے۔''

حشمت نے کہا۔ ''نہیں۔ کوئی اور معاملہ نہیں ہے تمہاری بیماری نے ہی ہمیں فکر میں مبتلا کیا ہے۔ ابھی میں ان سے تمہاری ہی باتیں کر رہا تھا۔''

برکت نے کہا۔ ''آپ ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں۔ وہ علاج کر رہا ہے۔ کیا کہہ رہا ہے؟''

عظمت شاہ نے کہا۔ ''لیبارٹری سے رپورٹ آئے گی تو باقاعدہ علاج شروع کرے گا۔ ابھی آرام پہنچانے کے

لیے دوائیں دی ہیں اور مرچ مسالے کے کھانوں سے پرہیز کرنے کو کہا ہے۔''

رحمت نے کہا۔ ''یعنی امی کے لیے آج سے الگ پرہیزی کھانے پکوائے جائیں گے۔''

رابعہ نے کہا۔ ''فکر نہ کرو بیٹے! مجھے پکانا آتا ہے۔ میں اپنا کھانا خود پکایا کروں گی۔''

حشمت نے کہا۔ ''نہیں ربی آ...... ! باورچی کس لیے رکھا ہے۔ جو کہو گی' وہ تیار کرے گا۔ آؤ بیٹھو۔ باتیں کرو۔''

''پھر کسی وقت باتیں ہوں گی۔ میں کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ ذرا کمر سیدھی کروں گی۔''

وہ جواب سنے بغیر بھائی کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ تینوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر برکت نے کہا۔ ''یہ کہنے کو تو ایک ہی چھت کے نیچے رہتی ہیں مگر ایک کمرے کی دو دیواروں کی طرح ہم سے دور دور رہتی ہیں۔''

''جب سے زلیخا بھاگی ہے۔ تمہاری ماں کا مزاج بدل گیا ہے۔ ہمیں دشمن سمجھتی ہے۔''

ابا...... ! یہ عدالت میں وہی بولیں گی نا' جو آپ نے اور وکیل نے انہیں سمجھایا ہے۔''

''ہاں ہماری حمایت میں نہیں بولیں گی تو ہم سے دشمنی کر کے جائیں گی کہاں؟''

''ہمارے نانا ایسی وصیت لکھ کر مرے ہیں کہ ہم ان کے مرنے تک ان کی زمینوں کے لیے ترستے رہیں گے۔''

''ہم بھی اس عورت کی بدمزاجی مجبوراً برداشت کر رہے ہیں۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ ڈاکٹر نے اسے پرہیزی کھانے کو کہا ہے۔ ہماری مشکل آسان ہو گئی ہے۔''

ان تینوں نے ایک دوسرے کو گہری سازشی نظروں سے دیکھا۔ پھر برکت نے باپ سے دھیمی سرگوشی میں پوچھا۔ ''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟''

حشمت نے کہا۔ ''نہیں۔ میں نے اپنے ڈاکٹر سے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ایک وقت کے کھانے میں صرف ایک قطرہ ٹپکایا جائے۔ پھر تین چار مہینوں کے بعد نتیجہ سامنے آئے گا۔''

رحمت نے کہا۔ ''تین چار مہینوں میں مقدمہ کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔ مراد کو پھانسی ہوگی۔ پھر امی کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

وہ تینوں پھر خاموش ہو گئے۔ سر جھکا کر اپنے اپنے طور پر یوں سنجیدگی سے سوچنے لگے جیسے سر جھکائے رابعہ خاتون کے لیے چتے پڑھ رہے ہوں۔

وہ اپنی خوابگاہ میں آ گئی تھی۔ بھائی نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بات کی ہے۔ ٹھیک دس بجے کال آئے گی بس دو منٹ رہ گئے ہیں۔''

وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھ گئی اپنے خاموش فون کو دیکھ کر بولی۔ ''جمال فون پر بولتا ہے تو ایسا لگتا ہے اس کے پیچھے میری زلیخا بول رہی ہے۔ ہائے میری بچی کیسے گھر سے بے گھر ہو کر دنیا سے گئی ہے۔ میں ان باپ بیٹوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

''آپا! ڈاکٹر نے آپ کو سمجھایا ہے' جو بھی صدمات ہیں انہیں بھلانے کی کوششیں کریں۔ ان باپ بیٹوں پر مٹی ڈالیں۔ ایسے لوگوں کو اسی دنیا میں سزائیں ملتی ہیں۔ دیکھ لینا انہیں عبرتناک سزائیں ضرور ملیں گی۔''

کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ رابعہ نے سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے فون کا بٹن دبایا۔ پھر اسے کان سے لگا کر دھیمی آواز میں بولی۔ ''ہیلو بیٹے جمال! میں بول رہی ہوں۔''

وہ نہیں چاہتی تھی کہ آواز کمرے کے باہر ان باپ بیٹوں تک پہنچے۔ وہ بند دروازے کے پاس آ کر بھی سن سکتے تھے۔ وہ داماد سے باتیں کرتے وقت بہت محتاط تھی۔

دوسری طرف سے جمال نے سلام کرتے ہوئے خیریت دریافت کی پھر کہا۔ ''مجھے چار ماہ بعد ایک ماہ کی چھٹی ملنے والی ہے۔ میں پاکستان آؤں گا۔ وہاں مجھے اپنے سسر اور دونوں سالوں سے چھپ کر رہنا ہوگا۔ آپ سے نہ حویلی میں ملاقات کر سکوں گا نہ شہر والے مکان میں آ سکوں گا۔ مگر ہاں ماموں عظمت شاہ کے گھر جا کر آپ سے مل سکوں گا۔''

''ہاں بیٹے! جس دن تم آؤ گے۔ میں عظمت شاہ کے مکان میں رہوں گی۔ تمہارے پاس زلیخا کی اور بچوں کی جتنی تصویریں ہیں' انہیں لے آنا۔''

وہ بولا۔ ''میرا بچہ تو ہوتے ہی ماں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ مراد سے ہونے والا بیٹا میرے پاس ہے۔ اس بچے کی پرورش میرے لیے مسئلہ بن گئی ہے۔ میرے دس گھنٹے کی ڈیوٹی ہوتی ہے، ایک بوڑھی خاتون کو کچھ رقم دیتا ہوں تو وہ اسے سنبھالتی ہے۔''

رابعہ نے کہا۔ ''تمہیں ایک شریک حیات کی ضرورت ہے۔ شادی کر لو۔ بچے کو ماں مل جائے گی۔''

''وہ سوتیلی ماں ہوگی۔ زلیخا نے مجھ سے وعدہ لیا تھا

کہ میں اس پر سوتیلی ماں نہیں لاؤں گا۔ دوسری شادی کرنے سے پہلے بچے کو اس کی نانی کے پاس یا اس کے باپ کے پاس پہنچا دوں گا۔"

رابعہ نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "وہ میری بیٹی کا جگر گوشہ ہے۔ میں اسے کلیجے سے لگا کر رکھنا چاہوں گی لیکن دشمنوں سے کیا کہوں گی کہ وہ کس کی اولاد ہے؟"

وہ بولا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ آپ پانی میں رہ کر مگرمچھوں کے درمیان اس کی پرورش نہیں کر سکیں گی۔ زلیخا بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں دوسری شادی کرنے سے پہلے بچے کو مراد کے پاس پہنچا دوں گا۔"

وہ ذرا چپ ہو کر سوچنے لگی۔ بچے کو مراد کے پاس پہنچانے کا مطلب ہوتا کہ مراد کسی شک و شبہ کے بغیر بے گناہ ثابت ہو جاتا۔ ایک برس کے بچے کو دیکھ کر حساب لگایا جاتا کہ جو لاش کھیت میں ملی تھی وہ زلیخا کی نہیں تھی۔ اس کے بعد بھی وہ زندہ تھی اور آٹھ ماہ بعد اس نے بچے کو جنم دیا تھا۔

اور جدہ کے جس اسپتال میں زچگی ہوئی تھی، وہاں زلیخا کی ولدیت و زوجیت اور پاکستانی شہریت کا ریکارڈ موجود تھا۔ اس نے کھیتوں میں ہونے والی ہلاکت کے آٹھ ماہ بعد وہاں کے اسپتال میں مراد کے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اس کا مقدمہ آئینے کی طرح صاف تھا۔ وہ پہلی پیشی میں ہی باعزت طور پر بری کر دیا جاتا۔ اگر مخالفین کا ضمیر بیدار ہوتا اور رابعہ کے دل میں مراد سے نفرت نہ ہوتی۔

وہ اپنی بیٹی زلیخا کے حوالے سے مظلوم تھی اور شوہر اور بیٹوں کے سائے میں رہ کر اس کی بھی شامت آنے والی تھی۔ پھر بھی وہ ایک بہت بڑے وڈیرے کی مغرور بیٹی تھی۔ مراد جیسے حویلی کے نوکر نے اس کی بیٹی کی جو توہین کی تھی اسے وہ بھلا نہیں سکتی تھی۔

اس کے خیال کے مطابق مراد کے ٹھکرانے کے باعث زلیخا گھر سے بے گھر ہوئی تھی۔ اگر وہ اس کے ساتھ گناہ گار بن کر رہتا۔ بات پردے میں رہتی۔ ایک نوکر حویلی کی عزت سے کھیلتا رہتا۔ کسی کو خبر نہ ہوتی تو پھر توہین کا احساس نہ ہوتا۔ وہ مراد کو اپنی بیٹی کا معالج سمجھ کر برداشت کر لیتی۔ جھوٹے غیرت مند ایسے ہی ہوتے ہیں۔ برتری قائم رکھنے کے لیے اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں۔ اب مسئلہ تھا کہ مراد کے ننھے سے بچے کو کہاں رکھا جائے؟

رابعہ نے کہا۔ "اگرچہ وہ مراد کا لہو ہے لیکن میری بیٹی کے خون میں نو ماہ تک پرورش پاتا رہا ہے۔ میری بچی نے اس کے لیے اپنا لہو بھی نچوڑا ہے اور اسے دودھ بھی پلایا ہے۔ میں اسے سینے سے لگا کر رکھ سکتی ہوں۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ تم اسے کسی یتیم خانے میں داخل کر دو۔"

جمال نے کہا۔ "زلیخا نے سختی سے منع کیا ہے۔ اس نے آپ کے نام ایک خط لکھا ہے اور جو لکھا ہے اسے ایک ویڈیو کیسٹ میں ریکارڈ بھی کیا ہے۔ میں ایک ماہ کے لیے آؤں گا تو یہ چیزیں لے کر آؤں گا۔ آپ بیٹی کو اسکرین پر دیکھیں گی اس کی باتیں سنیں گی تو رو پڑیں گی پھر وہی کریں گی جو وہ کہہ گئی ہے۔"

جمال سے تھوڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ بچہ آئندہ مسئلہ بننے والا تھا۔ رابعہ بھی نہ چاہتی کہ وہ اپنے باپ تک پہنچے اور اس کی بے گناہی ثابت کرے۔ جمال اپنی جگہ ضرورت مند تھا۔ وہ دوسری شادی کرنے کے لیے اس بچے سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ ننھا اپنے قیدی باپ کی طرح بدنصیب تھا۔ اپنی ماں کی طرح تمام رشتوں سے ٹوٹ کر بے سہارا ہونے والا تھا۔

ویسے آدمی جو کرتا ہے اس کا اچھا یا بُرا نتیجہ اس کے سامنے ضرور آتا ہے۔ اس رات رابعہ کا پرہیزی کھانا تیار ہوا تھا۔ وہ کھانے سے پہلے منہ ہاتھ دھونے واش روم میں گئی۔ اس وقت باپ بیٹے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حشمت نے محتاط نظروں سے واش روم کی طرف دیکھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی اس نے جیب سے ایک شیشی نکال کر پرہیزی کھانے میں ایک قطرہ ٹپکا دیا۔

☆☆☆

مرینہ نے مراد کی زبان سے اس کی پوری روداد سنی تھی۔ ایک غریب آدمی کی سیدھی سادی سی روداد تھی کوئی ہیرا پھیری نہیں تھی۔ وہ قاتل نہیں تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وڈیرے حشمت جلالی نے بڑی چالبازی سے ایک غریب منشی کو پھنسایا ہے۔ اور حشمت جلالی جس طرح ماروی کو حاصل کرنے کے لیے اس کے پیچھے پڑ گیا تھا، اس سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ مراد کو اپنا رقیب بھی سمجھتا ہے۔ اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا کر ہی ماروی کو حاصل کر سکے گا۔ ماروی کو مردہ یا زندہ دیکھنے والے طلبگار اور بھی تھے۔ محبوب اس کے پیچھے پاگل ہو چکا تھا۔ مرینہ کو ان پاگل دیوانوں اور سازشیں کرنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ ماروی اس وجہ سے اہم تھی کہ وہ مراد کی چہیتی تھی اور مرینہ کو یہ منظور نہیں تھا۔

یہ مراد کی بدنصیبی تھی کہ مرینہ اس پر مرمٹی تھی۔ اس بلا کی فطرت میں چھیننے جھپٹنے والی محبت تھی۔ اس کی چاہت کا تقاضا تھا کہ جسے وہ چاہتی ہے اسے کوئی دوسرا نہ چاہے۔ وہ ایسی ضدی تھی کہ آئندہ ماروی کو اس کے قریب سے گزرنے بھی نہ دیتی۔

وہ برنارڈ کو قانون کے شکنجے سے نکال کر لے جانے آئی تھی اور اپنے دل کے معاملے میں الجھ گئی تھی۔ اپنا ایک الگ گیم کھیلنے والی تھی۔ اس کے دماغ میں مراد کے لیے ضد سما گئی تھی۔ وہ چپ چاپ پلاننگ کر چکی تھی کہ جس دن جیل توڑ کر برنارڈ کو وہاں سے لے جائے گی۔ اسی دن مراد کو بھی ساتھ لے جائے گی۔

وہ اپنے ساتھیوں دارا اور بہرام کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے دن جیل میں آتی تھی اور ان خطرناک قیدیوں سے ملتی تھی جو سنگین جرائم کے باعث عمر قید کی سزا پا رہے تھے یا پھر انہیں سزائے موت ملنے والی تھی۔ ایسے قیدی جیل کی آہنی دیواروں سے نکل کر بھاگنا چاہتے تھے۔

مرینہ اور اس کے ساتھی ان سے ملتے تھے اور بڑی رازداری سے جیل توڑ کر فرار ہونے کے منصوبے پکاتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں باہر سے ڈالرز اور پونڈز آ رہے تھے۔ جیل کا عملہ خریدا جا رہا تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ ان کا منصوبہ ناکام نہیں ہوگا۔

مرینہ کے ذاتی منصوبے میں یہ باتیں تھیں کہ پہلے تو مراد ماروی کو دل و دماغ سے نکال کر صرف اس کا ہو جائے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اسے جیل سے نکال کر لے جائے۔

یہ پلاننگ ذہن میں تھی کہ اسے برنارڈ کے ساتھ کیسے نکالے گی اور کہاں پہنچائے گی لیکن اس سے پہلے چاہتی تھی کہ اس پر سے جھوٹا الزام ختم ہو جائے اور وہ عدالت سے باعزت طور پر بری کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ وہ ایک آزاد عزت دار شہری کی طرح رہے گا۔

اور ایسا اسی وقت ممکن تھا جب حشمت جلالی کا جھوٹ اور فریب پکڑا جاتا۔ اس سلسلے میں دشمن کا محاسبہ کرنا اور کسی بھی طرح اس کے منہ سے سچ اگلوانا ضروری تھا۔ وہ سینٹرل جیل تو جیسے اس کے باپ کا گھر تھا۔ وہ روز ہی کسی وقت مراد سے ملنے آتی تھی اور اس سے کہتی تھی۔ "زندگی کی طرف آؤ موت کی طرف نہ جاؤ۔ میں تمہیں یہاں سے نکال کر نئی زندگی دینے والی ہوں تم باہر آ کر میرے ساتھ رہو گے۔"

"میں ماروی کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔"

"کیا وہ تمہیں سزائے موت سے بچا سکے گی۔ وہ تمہارے بعد دوسرے عاشق کی گود میں کھیلے گی اور کیڑے تمہیں قبر میں کھاتے رہیں گے۔ کیا تم یہی چاہتے ہو؟"

"میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہے وہی ہوگا۔"

"جب تم آسانی سے تقدیر بدل سکتے ہو۔ سزائے موت سے بچ سکتے ہو اور اپنی باقی زندگی مجھے دے سکتے ہو تو تقدیر کا رونا کیوں رو رہے ہو؟

صرف اس لیے کہ یہاں رہ کر ماروی کے نام سے سانسیں لے کر پھانسی پر چڑھ جاؤ گے تو سچے عاشق کہلاؤ گے کیا بعد میں وہ معشوقہ تمہارے نام سے کنواری رہے گی جس کا پہلے سے ایک ریڈی میڈ عاشق موجود ہے۔"

مرینہ کے جانے کے بعد وہ تنہا کوٹھری میں بیٹھ کر سوچتا تھا۔ یہ درست کہتی ہے۔ ماروی محبوب صاحب کے احسانات تلے دبی ہوئی ہے۔ میرے بعد انہیں قبول کر لے گی اور یہ غلط نہیں ہوگا۔ اصولاً اپنی سلامتی کے لیے اسے یہی کرنا چاہیے۔

میں لوہے کی سلاخوں کو تھام کر سوچتا رہتا ہوں انہیں توڑ کر باہر چلا جاؤں۔ اگر یوں کبھی چلا بھی گیا تو مفرور کہلاؤں گا اور ماروی کے ساتھ کبھی نیک نامی سے زندگی نہیں گزار سکوں گا۔

میں خوامخواہ جیل سے بھاگنے کی احمقانہ باتیں سوچتا تھا۔ مگر یہی باتیں مرینہ کے لیے احمقانہ نہیں ہیں۔ اسے یہاں جیسی آزادی ہے اسے دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ وہ مجھے یہاں سے کہیں دور لے جائے گی۔ کوئی اسے روک نہیں پائے گا۔ مرینہ نے کسی حد تک اس کے سوچنے کا انداز بدل دیا تھا۔ وہ سوچنے لگا تھا۔ میں مقدمہ ہار سکتا ہوں پھر مجھے سزائے موت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ صرف مرینہ بچا سکتی ہے۔

وہ کوٹھری کی نیم تاریکی میں گھورتے ہوئے سوچنے لگا۔ میرے سامنے دو ہی منظر ہیں۔ ایک منظر یہ ہے کہ میں پھانسی پا کر مر چکا ہوں۔ سائیں، چاچا چاچی اور ماروی مجھے قبر میں سلا کر کچھ روز سوگوار رہنے کے بعد پھر معمول کے مطابق ہنستے بولتے زندگی گزار رہے ہیں۔

دوسرا منظر یہ ہے کہ مرینہ نے مجھے جیل سے نکال کر ایسی زندگی دی ہے کہ میں چھپ کر ماروی کو اور سائیں محبوب کو ایک ساتھ زندگی گزارتے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اس دوسرے منظر میں عشق کے نام پر موت قبول نہیں کی۔ اپنی زندگی نہیں ہاری۔ میرے بعد

دوسرے جی رہے ہیں تو میں بھی جی رہا ہوں۔ مرینہ عقل کی باتیں سمجھاتی ہے۔ یوں جینا اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی زندگی نہ ہارنا دانشمندی ہے۔

مرینہ نے کہا۔ ”کل ماروی تم سے ملنے آئے گی۔ اسے میرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے اور یہ بھولے سے بھی نہیں کہو گے کہ اس جیل سے باہر نکلنے والے ہو۔“

”میں کہوں گا تو اسے یقین نہیں آئے گا۔ ویسے وعدہ کرتا ہوں یہ بات اس سے نہیں کہوں گا۔“

”اس سے پہلے میں کوشش کر رہی ہوں کہ سیدھے راستے سے تمہاری بے گناہی ثابت ہو جائے۔ کسی طرح حشمت جلالی کا جھوٹ سامنے آ جائے۔“

”ایسا ہو جائے تو مجھے عزت سے رہائی ملے گی میں مفرور نہیں کہلاؤں گا۔“

”تم کبھی اس کے منشی تھے۔ تمہیں اس کی حویلی کا اور اس کا ذاتی فون نمبر معلوم ہوگا۔“

”ہاں۔ میں تینوں باپ بیٹوں کے فون نمبر جانتا ہوں۔“

وہ اپنے فون کی سم بدلتے ہوئے بولی۔ ”مجھے نمبر بتاؤ۔ پھر میں جو کہتی ہوں، وہی تم ان سے کہو گے۔“

اس نے باپ بیٹے کے نمبر اپنے فون میں Save کیے پھر کہا۔ ”ان سے بولو کہ تم سے دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔ تم جانتے ہو کہ زلیخا زندہ ہے اور کہاں ہے؟ اور جہاں ہے وہاں ابھی مجبور ہے۔ ابھی آ نہیں سکے گی۔ تم جانتے ہو کہ وہ دوسری پیشی میں ضرور عدالت میں حاضر ہوگی۔“

مراد نے کہا۔ ”وہ وڈیرا ابھی یقین نہیں کرے گا۔“

”نہ کرے۔ میں فون پر اس کی جوابی باتیں سننا چاہتی ہوں پھر اس کے خلاف کوئی چال چلوں گی۔“

اس نے حشمت کے نمبر پنچ کیے۔ پھر فون کو کان سے لگایا۔ رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ اس نے آواز کو بھاری بھر کم بناتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

مراد نے کہا۔ ”تیرا داماد بول رہا ہوں۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ کون ہو تم؟“

”کہا نا، داماد ہوں۔ تجھے ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔ تیری بیٹی زلیخا زندہ ہے۔“

حشمت نے سوچنے کے انداز میں کہا۔ ”تیری آواز تیرے بولنے کا انداز مراد جیسا ہے۔ لیکن وہ تو جیل میں ہے۔ فون پر کیسے بول رہا ہے؟“

”دیکھ لے کہ کیسے بول رہا ہے اور تو سن رہا ہے۔“

”میں سمجھ گیا، محبوب علی چانڈیو نے وہاں رشوت دی ہے۔ تب ہی تجھے فون سے بولنے کی اجازت مل گئی ہے۔“

”تو کچھ بھی سمجھ لے۔ میں ایسی طاقت حاصل کر رہا ہوں کہ آئندہ جیل کی دیواریں مجھے باہر جانے سے نہیں روک سکیں گی میں کسی دن بھی تیری گردن دبوچنے آ رہا ہوں۔“

”تیرا باپ بھی قانون کے شکنجے سے نکل نہیں پائے گا۔“

مرینہ نے فون پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا کہ کیا کہنا چاہیے۔ پھر اس نے فون پر کہا۔ ”تجھے یقین دلانا ہی ہوگا کہ میں جب چاہوں، جیل سے باہر آ سکتا ہوں۔ کل سے اپنے بیٹوں کو کہیں چھپا کر رکھ۔ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچنے والا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ مرینہ نے سم بدل دی۔ مراد نے کہا۔ ”تمہارے کہنے سے میں نے بچوں جیسی دھمکیاں دی ہیں۔ وہ دھونس میں نہیں آئے گا۔“

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”کل اس کے کسی بیٹے پر آفت آئے گی تو تم اس کے لیے خطرناک دشمن بن جاؤ گے۔

تم ایک سیدھے سادے لات جوتے کھانے والے نمک خوار ملازم رہے۔ آئندہ جوتے مارنے والے بن جاؤ گے۔

یہ دنیا صرف اسی کی ہے جو لات جوتے مارنے کی طاقت رکھتا ہے۔ تمہیں ایک بھاری بھر کم حیثیت والا اور منہ توڑ جواب دینے والا دشمن بن کر رہنا ہوگا۔

میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہاری زندگی کا رخ بدل دوں گی۔ تم گدھا گاڑی والے مراد کو بھول جاؤ۔ تم بہت جلد اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے بن جاؤ گے۔

تم آئندہ ہاتھ جوڑ کر کسی کو سائیں نہیں کہو گے۔ یہ جلد ہی دیکھو گے کہ لوگ تمہیں سائیں مراد کہیں گے اور اپنی سلامتی کے لیے نذرانے پیش کیا کریں گے۔“

مراد سن رہا تھا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا اور وہ اپنے اندر چیخ رہا تھا۔ ماروی......! میں آؤں گا۔ صرف تیرے لیے شہزور بن کر آہنی سلاخوں کو توڑ کر آؤں گا......

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

جوان

سلیم انور

میدانِ جنگ ہو یا زندگی کے رستے... معرکہ آرائی اور طویل مسافت کوئی نہ کوئی کہانی رقم کر جاتی ہے... ان چہروں میں بھی کئی چہرے چھپے تھے لیکن موت کا سامنا انسان اپنے اصل چہرے کے ساتھ کرتا ہے... جس کے پاس غضب کی ذہانت تھی حساب کتاب کی ذرا سی چوک نے اسے موت سے ہمکنار کر دیا اور وقت نے بھی بساط کچھ اس طرح پلٹی کہ اس کا اصل روپ سامنے آگیا... مگر اس چہرے پر تو بلا کی معصومیت تھی کہ موت کو بھی پیار آگیا۔

اعداد و شمار سے زندگی کے لمحات چرانے والے ایک عقلمند کا قصہ

آپ شاید حیران ہو رہے ہوں گے کہ جو کچھ ہوا اس کے باوجود میں کیونکر زندہ ہوں۔ یہ ایک خاصی اہم کہانی ہے۔

میری زندگی کے پچیس برس کوسٹا نیرا کے شہروں، قصبوں، جنگلوں اور دیہاتوں میں گزرے تھے۔ یہ میرا وطن تھا اور اس کے چپے چپے کی خاطر جنگ کرنا اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے ایک ایک انچ کا دفاع ہمارا فرض بنتا تھا۔

جلاوطنوں کے ساتھ میری ٹریننگ کو دو سال ہو چکے تھے۔ ہم حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ سب ہی لوگوں کی طرح ہم بھی جانتے تھے کہ ناکامی کی صورت میں ہمیں کیا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ ہم نے مہینوں تک لڑائی، پیرا ٹروپر ٹریننگ اور دھماکوں کی مشق کی تھی۔ ہم اب اس عظیم دن کے لیے تیار ہو چکے تھے جب ہمیں کوسٹا نیرا واپس جانا تھا۔

جنرل ڈیام کی آمد کے ساتھ ہی ہم نے کوسٹا نیرا چھوڑ دیا تھا لیکن اب ہم واپس جا رہے تھے۔ ہمارا پلان

رات کی تاریکی میں پیراشوٹس کے ذریعے دارالحکومت کے نواح میں اترنا تھا جہاں اینٹی ڈیام ملٹری ہماری منتظر تھی پھر ہمیں فاتحانہ انداز میں دارالحکومت میں داخل ہوجانا تھا۔

منصوبہ یہی تھا بہرحال کسی نہ کسی بنا پر ہمارا منصوبہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکا۔ ملٹری نے اس فوجی بغاوت کے معاملے میں اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس لیے کہ جب ہم نے اپنے جہازوں سے پیراشوٹس کے ذریعے نیچے چھلانگیں لگائیں تو ہمیں مختلف سمتوں سے جنرل ڈیام کی فوجوں کی گولہ باری کا سامنا کرنا پڑگیا۔

ہمارے زمین تک پہنچنے سے قبل ہماری پینسٹھ افراد پر مشتمل حریت فوج کے نصف سے زیادہ افراد جان سے ہاتھ دھو چکے تھے اور جو باقی زندہ بچ رہے ان پر جنرل ڈیام کی فوج نے تیزی سے قابو پالیا۔ رات ڈھلنے تک ہم ان کے قیدی بن چکے تھے۔

انہوں نے ہمیں خلیج ایزل کے قدیم عظیم الشان قلعے میں قید کردیا۔ اس روز ہم گرفتار ہونے والوں کی کل تعداد تئیس تھی اور ہم میں سے ایک قیدی جس کا نام تھامس تھا، شدید زخمی تھا اور اس کی حالت تشویش ناک تھی۔ قلعے میں ہمیں ایک بڑی سی کوٹھری میں ایک جگہ اکٹھا رکھا گیا تھا جہاں ہم اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔

اس کوٹھری میں بے حد گرمی تھی اور ہمارے جسموں سے خارج ہونے والے پسینے اور کمرے میں پھیلی ہوئی سیلن کی بساند سے میرے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے اور سانس اٹکنے لگا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنی گول چپٹی سیاہ ٹوپی اور قمیص اتار پھینکوں اور سخت پتھریلے فرش پر دراز ہوجاؤں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے بقیہ ساتھیوں کے مانند یہ سب کچھ برداشت کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

اس ملک میں ایک رواج تھا۔ یہ رواج صدیوں سے قائم تھا اور انقلاب کے موقعوں پر اس کی پوری طرح سے پاس داری کی جاتی تھی۔ اس رواج کا سامنا ہمیشہ شکست خوردہ حریف کو کرنا پڑتا تھا۔ ہر حکومت کے دور میں یہ حکم نامہ روایتی طور پر جاری کیا جاتا تھا جو باغیوں کے لیے ہوتا تھا۔ حکم نامہ یہ تھا۔

”ہر پانچویں جوان کو قتل کردو اور باقیوں کو رہا کردو۔“ یہ انصاف کا ایک سسٹم تھا جس میں رحم کی ایک بڑی گنجائش رکھی گئی تھی۔ یہ قانون کے خلاف ایک قسم کی مزاحمت تھی تاکہ ملک میں ایک اپوزیشن پارٹی کسی حد تک قائم رہ سکے اور ملک میں مخالفین کا صفایا نہ ہوجائے۔

یقیناً جو اسّی فیصد باغی رہا ہوجاتے تھے ان میں سے اکثر دوبارہ متحد ہوکر ایک بار پھر انقلاب لانے کی کوشش کرتے تھے لیکن موت کے گھاٹ اتارے جانے کا خوف بعض اوقات ان کی سرگرمیوں کو معدوم کرنے کے لیے کافی رہتا تھا اور وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہتے تھے۔

خلیج کے نیلے پانیوں کے پاس اس اندھیرے قلعے میں ہم تئیس قیدی بھی اپنی قسمت کے فیصلے کے منتظر تھے۔ ہم سب کو زندگی کی آس بھی تھی۔ اس لیے کہ ہم میں سے بیشتر کے زندہ بچ جانے کے امکانات ہمارے حق میں تھے لیکن ہمارا یہ قیاس جنرل ڈیام کے سفاکانہ حساب کتاب سے کسی طور مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

حکم نامہ اگلے روز صبح سویرے موصول ہوگیا۔ یہ ہمیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے پڑھ کر سنادیا گیا۔ حکم نامہ وہی تھا جس کی ہمیں توقع تھی۔

”ہر پانچویں جوان کو فوری طور پر شوٹ کردیا جائے۔ بقیہ قیدی چوبیس گھنٹوں میں رہا کردیے جائیں گے۔“ لیکن پھر ہمیں ایک حیرت انگیز جھٹکا لگا۔ جس افسر انچارج نے یہ حکم نامہ پڑھ کر سنایا تھا۔ وہ اسے دوبارہ بھی پڑھنے لگا۔ اس نے رکنے پر اکتفا نہیں کیا اور یہی حکم نامہ چار مرتبہ پڑھ ڈالا۔

جنرل ڈیام نے ایک جیسے مضمون کے پانچ حکم نامے ارسال کیے تھے۔ یہ ایگزیکٹیو آرڈرز تھے اور ان حکم ناموں کی رو سے ہم تمام قیدیوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

مجھے احساس تھا کہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا اور جلد ہی۔ جب گارڈز نے ہماری کوٹھری کے دروازے کا قفل کھولا تو میں نے سیدھا افسر انچارج کی جانب رخ کیا۔ اپنی بھرائی ہوئی آواز کا سہارا لیتے ہوئے میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم ہم سب کے سب تئیس قیدیوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتے۔ یہ حکم نامے کے برعکس ہوگا......“

اس افسر انچارج نے حقارت سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”بہادر بنو، چھوٹے سپاہی!! اور ایک سپاہی کے مانند موت کو گلے لگاؤ۔“

”لیکن پہلے حکم نامے میں کہا گیا ہے کہ ہر پانچویں جوان کو فوری طور پر شوٹ کردیا جائے۔ اس کا مطلب بس یہی ہے جو لکھا ہوا ہے۔ انہیں دوسرا حکم نامہ پڑھنے سے پہلے

شوٹ کرنا ہوگا۔“ یہ سن کر اس افسر انچارج نے ایک آہ بھری اور بولا۔

”اس سے کیا فرق پڑے گا اور دن بھی گرم ہے۔ بھلا کون کڑی دھوپ میں مرنا چاہتا ہے؟ اس وقت کم از کم ٹھنڈی سمندری ہوا تو چل رہی ہو۔“

”تمہیں احکامات کی پابندی کرنا ہوگی۔“ میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ہر حکم کی لازمی طور پر علیحدہ علیحدہ تعمیل ہونی چاہیے۔“

یقیناً آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ میرے اس اصرار کی وجہ کیا تھی۔ اگر ان پانچوں ایگزیکٹیو آرڈرز کو یکجا کرکے ان کی فوری طور پر تعمیل کی جاتی جیسا کہ بلاشبہ جنرل ڈیام کا مقصد تھا تو ہم سب کے سب تئیس قیدی موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے۔

لیکن اگر ہر حکم کی باری باری علیحدہ سے تعمیل ہوتی تو پھر ہم میں سے نو افراد زندہ بچ سکتے تھے۔ میری ریاضی ہمیشہ سے اچھی رہی تھی اور میں نے اپنے طور پر حساب لگایا تھا، وہ کچھ یوں تھا۔

جب ہم تئیس قیدیوں میں سے ہر پانچویں قیدی کو علیحدہ کردیا جائے گا تو ان کی تعداد چار بنے گی اور انیس باقی رہ جائیں گے۔ جب یہ عمل دہرایا جائے گا تو مرنے والوں کی تعداد تین ہوگی اور سولہ باقی بچ رہیں گے۔ تیسرے راؤنڈ میں مزید تین موت کے منہ میں پہنچ جائیں گے اور تیرہ باقی رہ جائیں گے پھر دو کو شوٹ کردیا جائے گا اور گیارہ باقی بچیں گے۔ آخر میں دو کا مقدر موت ہوگی اور ہم نو قلعے سے آزاد ہوکر باہر کی فضا میں سکون کا سانس لے سکیں گے۔

آپ کہتے ہیں کہ بچ نکلنے کا امکان اب بھی میرے حق میں نہیں تھا؟ قطعی نہیں بشرطیکہ افسر انچارج میرے مطالبے سے اتفاق کرلے۔ تب میرا بچ نکلنا یقینی تھا اس لیے کہ آپ خود سوچیں ہر مرتبہ پانچویں جوان کا انتخاب کس طرح کیا جائے گا؟

یقیناً قرعہ اندازی سے نہیں اس لیے کہ یہ ملٹری کا معاملہ تھا جہاں اصولوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ ہمیں ایک قطار میں کھڑا کردیا جائے گا اور پھر گنتی ہوگی اور ہم کس ترتیب میں قطار بند ہوں گے؟ حرف تہجی کے لحاظ سے؟ یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ ہمارے ناموں سے واقف نہیں تھے۔

ہماری قطار بندی قدیم ملٹری رواج کے مطابق ہوگی، ہماری قامت کے لحاظ سے اور رات کال کوٹھری میں گزارنے کے دوران میں نے پہلے ہی اس بات کی تصدیق

کر لی تھی کہ ہم تیئس قیدیوں میں سب سے چھوٹا قد میرا تھا۔
اگر وہ سب سے چھوٹے قد کی جانب سے گنتی شروع کرتے ہیں جس کا امکان کم ہی تھا تو تب میری زندگی لازمی محفوظ تھی کیونکہ اس طرح میرا نمبر پہلا پڑتا۔

زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ گنتی لانبے قد کی جانب سے شروع کرتے ہیں۔ اس صورت میں ہر پانچویں فرد کی گنتی پر ہماری تعداد اس ترتیب سے گھٹتی جاتی۔

23,19,16,13,11 اور 9

اور ان میں سے کوئی بھی ہندسہ پانچ سے تقسیم نہیں ہوتا تھا۔ یوں میرا ان شامت زدہ قیدیوں میں شمار نہیں ہوتا تھا۔

وہ افسر انچارج مجھے دیر تک گھورتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔ انتظار کی گھڑیاں کبھی ختم نہ ہونے والی لگ رہی تھیں۔ تب بالآخر اس افسر انچارج نے ان ایگزیکٹو آرڈرز پر ایک بار پھر نظریں دوڑائیں جو اس نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے عیاں ہو گیا کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہے۔

”آل رائٹ!“ وہ گویا ہوا۔ ”ہم پہلے حکم کی تعمیل کریں گے۔“

ہم صحن میں قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ قامت کے لحاظ سے۔ ہمارے دو ساتھیوں نے زخمی تھامس کو سہارا دیا ہوا تھا پھر گنتی شروع ہو گئی۔

ہم تیئس میں سے چار کو سمندر کے ساتھ کی دیوار کی جانب مارچ کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہیں شوٹ کر دیا گیا۔ ہم باقیوں سے کسی کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ ان کی طرف دیکھ سکیں۔

پھر مزید تین کو ہم میں سے علیحدہ کیا گیا اور سمندری دیوار کے پاس کھڑا کر کے گولیاں مار دی گئیں۔

اب جو باقی سولہ بچے تھے ان میں سے ایک نے رونا شروع کر دیا۔ اسے قطار میں اپنی پوزیشن کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اگلی باری اس کی ہے۔ افسر انچارج نے رسماً تیسرا ایگزیکٹو آرڈر پڑھ کر سنایا اور ہم میں سے مزید تین سمندری دیوار کی طرف چلے گئے۔

قطار میں میری باری اب بھی سب سے آخر میں تھی۔ چوتھے ایگزیکٹو آرڈر کے پڑھنے کے بعد تیرہ میں سے دو اپنی موت کو گلے لگانے کے لیے سمندری دیوار کی جانب مارچ کر گئے۔ اب تو فائرنگ اسکواڈ بھی گرمی سے پریشان اور بور ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سورج ہمارے سر پر پہنچ چکا تھا۔

اب گنتی گن کر قطار میں سے موت کا سامنا کرنے کے لیے قیدی کو نکالنے کا آخری مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔

قطار میں اب ہم گیارہ باقی رہ گئے تھے اور ترتیب کے مطابق ہر ایک نے اپنا اپنا نمبر پکارنا تھا۔ ابھی قطار کے سب سے پہلے قیدی نے اپنا نمبر پکارا تھا کہ افسر انچارج بلند آواز سے بولا۔ ”ٹھہر جاؤ۔“

میں نے گردن گھما کر دیکھا تو خوف و دہشت سے میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

قطار میں کھڑا زخمی تھامس جو خوش قسمتی سے اب تک بچ جانے والوں میں شامل تھا اچانک ہی زمین پر گر پڑا تھا اور اس کے پہلو سے خون ابل رہا تھا، اس کا جسم کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ وہ مر چکا تھا اور اب اچانک ہی ہماری تعداد گیارہ سے گھٹ کر دس ہو گئی تھی۔ اب میرا نمبر دسواں تھا۔ تب آخری گنتی شروع ہو گئی۔

پانچواں آدمی قطار میں سے نکل کر ایک قدم آگے بڑھ گیا پھر سب اپنا نمبر پکارنے لگے چھ...... سات...... آٹھ...... نو...... دس۔ میں نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی جب کہ میرا نمبر دسواں تھا۔

”آگے بڑھو چھوٹو۔“ افسر انچارج نے کہا۔ ”اب تمہاری باری ہے۔“

آپ پوچھیں گے کہ میں یہاں زندہ سلامت کیوں موجود ہوں جبکہ موت یقینی میرا مقدر بن چکی تھی۔ اس لیے کہ میں نے اپنی پوری احتیاط کے ساتھ اپنی زندگی کی بچت کے بارے میں جو تخمینہ لگایا تھا وہ اب رائگاں ہو گیا تھا۔

اس لمحے موت مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رقص کرتی دکھائی دینے لگی اور تب میں نے قطار سے قدم باہر نکالنے کے بجائے وہ کر ڈالا جس سے میں نے رات بھر اور پھر صبح سے اب تک گریز کیا تھا۔

مجھے علم تھا کہ افسر انچارج جنرل ڈیام کے حکم پر جزواً جزواً عمل کرے گا اور وہ حکم یہ تھا۔

”ہر پانچویں جوان کو مار ڈالو۔“ اور اسی حکم نے میری جان بخشی کروا دی۔ اس کے باوجود کہ قطار میں میرا نمبر دسواں تھا۔

میں نے اپنے سر پر سے گول چپٹی سیاہ ٹوپی اتار دی اور اپنی زلفوں کو اپنے شانوں پر بکھیر لیا۔

تب میں نے یہ ظاہر کر دیا کہ میں کوئی جوان نہیں بلکہ ایک لڑکی ہوں۔

شیخ محمدؒ

ضیا تسنیم بلگرامی

دنیا کے اندھیروں میں نور کی کچھ کرنیں اب بھی اس کائنات کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں اور ان کا ثبوت ولیوں کی وہ گراں قدر شخصیات ہیں جنہوں نے اپنی زندگی عبادتِ الٰہی اور خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دی، اس کے باوجود تشنگی سے دوچار رہے۔ اپنے مقصد حیات کے ادھورے پن کا احساس انہیں مضطرب رکھتا اور اسی اضطراب نے انہیں کبھی یادِ الٰہی سے غافل نہ ہونے دیا۔

پیدائش انسان کے رمز کو پانے والے ولیوں میں سے ایک انتخاب

شیخ محمد حضرت ولی اللہ شاہ دہلویؒ کے جد مادری تھے۔ اپنے آبائی وطن نارنول میں کچھ عرصہ رہ کر شیخ ابوالرضا کی خدمت میں چلے گئے۔ وہیں ان کی ملاقات حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد شیخ عبدالرحیمؒ سے ہوئی اور ان دونوں نے شیخ محمدؒ کی تعلیم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ نارنول چھوڑ کر دہلی کی سکونت اختیار کی اور شب و روز تحصیل علم میں مشغول رہے۔ چونکہ شیخ ابوالرضا پر استغراق کا عالم طاری رہتا تھا اس لیے وہ اپنے نوعمر شاگرد اور مرید شیخ محمدؒ پر تعلیم و تربیت کے سلسلے میں زیادہ وقت نہیں دیتے تھے اور اسباق تھوڑے تھوڑے ہوتے تھے جبکہ شیخ محمدؒ میں ہوسِ علم اور تشنگی عرفان کی یہ شدت تھی کہ زیادہ کی فکر میں ہر وقت مضطرب اور پریشان رہتے تھے۔ کئی بار جی میں آئی کہ اپنے پیر و مرشد اور استاد سے کہیں کہ ”حضرت! اس طرح تو یہ خاکسار برسوں معلق رہے گا اور یہ عاجز ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہے گا۔ خدا کے لیے جو بتانا سکھانا ہے اس میں عجلت اور شدت اختیار کیجیے ورنہ تاخیر اور تعویق تو اس ناچیز کے لیے برداشت سے باہر ہے۔“ شیخ ابوالرضاؒ نے مئے عرفان سے مخمور آنکھوں سے اپنے مضطرب شاگرد و مرید کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔ شیخ محمدؒ ڈر گئے کہ کہیں

وہ ناراض تو نہیں ہوگئے۔ لیکن شیخ ابوالرضاؒ نے بڑی نرمی اور ملائمت سے کہا۔ ”شیخ محمدؒ! تو کس عجلت اور ہوس کی بات کر رہا ہے؟ وہ عجلت جو تجھے اور ہر انسان کو اپنے دادا حضرت آدم علیہ السلام سے ورثے میں ملی ہے، اور وہی عجلت جو انسان کو شرمندہ و خجل کر دیا کرتی ہے، ہوس عرفان بڑی اچھی چیز ہے مگر بیگانا ہوس نا قابل توجہ ہوتی ہے۔ میں تیرا مرشد بھی ہوں اور استاد بھی، میں جانتا ہوں کہ تو کتنے دنوں میں فارغ التحصیل ہو جائے گا۔ بس اس مدت کو ذہن میں رکھ کر تجھ پر محنت کی جا رہی ہے اور توجہ دی جا رہی ہے۔“

اس جواب نے شیخ محمدؒ کو مطمئن نہیں کیا، وہ بہ دستور اس خلجان میں مبتلا رہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو جلد از جلد فارغ التحصیل ہو لیا جائے لیکن فی الحال اپنے پیر و مرشد اور استاد سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور سکوت اختیار کیا۔ بے چینی اور اضطراب میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ وہ آتش زیر پا شخص کی طرح دہلی کے گلی کوچوں اور بازاروں کی شاہراہ نوردی میں مشغول رہے۔

ایک دن وہ شہر کے ایک ایسے مکان کے پاس سے گزرے جہاں طالب علموں کی بھنبھناہٹ بڑی دور تک گونج رہی تھی۔ شیخ محمدؒ اس مکان کے دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے، اور اندر کی آوازیں سننے لگے۔ استاد اپنے شاگردوں کو بڑی توجہ سے پڑھانے میں مشغول تھا۔ کچھ دیر اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد ان پر وفور شوق نے غلبہ کیا اور یہ اجازت لیے بغیر مکان میں داخل ہو گئے۔ اندر کا منظر بڑا دل نشین اور سحر انگیز تھا۔ شیخ محمدؒ پر اس کا خاص اثر ہوا۔ انہوں نے اپنی زبان سے تو ایک لفظ بھی نہ ادا کیا۔ بس شاگردوں اور...... طلب علموں کے سامنے ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ باریش نورانی چہرے والے استاد نے ایک اجنبی نوجوان کو درس گاہ میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ بھی بس دیکھتا رہا۔ استاد کی نظر میں یہ عجیب نوجوان جس پر اس کی درس گاہ کے طالب علموں کی کیفیت نے ایک نشہ سا طاری کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ...... وہ بالآخر ان سے کوئی درخواست کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور کچھ دیر بعد جب محویت ٹوٹی اور شیخ محمدؒ ہوش میں آئے تو اپنے آس پاس گھبرائی گھبرائی نظریں ڈال کر مکان سے باہر نکل گئے۔ درس گاہ کے استاد نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا۔ ”یہ کون شخص ہے، کہاں سے اور کیوں آیا تھا؟ چاہتا کیا ہے؟ اس کو روکو اور اس سے یہ ساری باتیں کر کے جواب حاصل کرو۔“

تیز طرار شاگردوں نے باہر نکل کر دوڑ لگائی اور دم کے دم میں شیخ محمدؒ کو پکڑ لیا۔ آپ بہت پریشان ہوئے پوچھا۔ ”دوستو! کیا بات ہے؟ یہ تم کس کے حکم پر مجھے گرفتار کر رہے ہو؟“

ایک شاگرد نے ہنس کر جواب دیا۔ ”ہم اپنے استاد محترم کے حکم پر تجھے پکڑنے آئے ہیں۔ تو ہمارے ساتھ اپنے پیروں سے چل دے تو بہتر ہے ورنہ ہمیں دوسرا طریقہ بھی آتا ہے۔“

شیخ محمدؒ نے جواب دیا۔ ”بھائیو! تمہیں زبردستی اور جبر کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں یوں ہی چلا چلوں گا۔ لیکن جانے سے پہلے میری چند باتیں ضرور سن لو۔ اگر ان کے جوابات ممکن ہوں تو ان سے بھی شاد کام کر دو ورنہ تمہاری مرضی!“

اسی شاگرد نے اپنے بقیہ ساتھیوں کی طرف دیکھا، کئی نے اپنی گردن کو خفیف سی جنبش دی، گویا کہہ رہے ہوں، کوئی حرج نہیں اس کے سوالوں کے جواب ضرور دیے جائیں۔

شاگرد نے آپ کو جواب دیا۔ ”صاحبزادے! ہماری یہ عادت تو نہیں کہ استاد محترم اگر کسی کو ہم سے بلوائیں تو ہم اس سے فضول سوال جواب کر کے خوامخواہ وقت ضائع کریں لیکن ہم تمہارے سوالوں کا جواب ضرور دیں گے اور تم بھی اس کا خیال رکھو کہ سوالات زیادہ اور طویل نہ ہوں۔“

شیخ محمدؒ نے پوچھا۔ ”تمہارے استاد ہمیں کیوں بلوا رہے ہیں؟“

شاگرد نے جواب دیا۔ ”یہ سوال چونکہ استاد محترم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کا جواب بھی وہی دیں گے۔“

شیخ محمدؒ نے دوسرا سوال کیا۔ ”اس مدرسے میں کیسی پڑھائی ہوتی ہے؟“

شاگرد نے جواب دیا۔ ”جناب! یہ ایک مثالی ادارہ ہے، یہاں کی پڑھائی کا دور دور شہرہ ہے۔“

شیخ محمدؒ نے پوچھا۔ ”یہ پڑھائی باقاعدہ جلدی جلدی ہوتی ہے یا رک رک کر وقفوں سے؟“

شاگرد نے چڑ کر کہا۔ ”فضول سوالات میں وقت نہ ضائع کر جو کچھ پوچھنا ہے استاد محترم کے سامنے چل کر پوچھ۔ وہیں جوابات مل جائیں گے۔“

شیخ محمدؒ شاگردوں کے ساتھ استاد کی خدمت میں پہنچا دیے گئے، استاد کے چہرے سے غضب اور پریشانی ہویدا تھی۔ شیخ محمدؒ کو دیکھتے ہی غصہ میں کہا۔ ”تو کون ہے؟ اور یہاں کیا لینے آیا تھا؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں ان فضول سوالوں کے جواب اگر نہ دوں تو......؟“

استاد نے غصے میں کپکپاتے ہوئے کہا۔ ”نالائق! یہ تو کیسی بحثیں کر رہا ہے مجھ سے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”بحث کرنا کوئی بری بات نہیں، اس کے دل و دماغ کے بنجر اور فضول حصوں میں بہت ساری بے کار باتیں جمع ہو گئی ہوں۔“

استاد نے مشتعل ہو کر سوال کیا۔ ”کس کے بنجر اور فضول دل و دماغ میں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جو بے کار سوال و جواب میں وقت ضائع کر رہا ہو۔“

استاد نے گرمی سے پوچھا۔ ”میں پوچھتا ہوں کہ تو یہاں کیا لینے آیا تھا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! میں آپ کے مدرسے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اب بھی ہوں۔ یہی میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں تدریس باقاعدہ ہوتی ہے یا بے قاعدہ؟“

استاد نے کہا۔ ”صاحب زادے! ہم وقت برباد کرنے کے قائل نہیں، یہاں کا سند یافتہ نوجوان کہیں مار نہیں کھا سکتا۔“

شیخ محمدؒ کی حریص طبیعت نے انگڑائی لی، پوچھا۔ ”حضرت! اگر میں پڑھنا چاہوں تو؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”اگر اس مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کی لیاقت رکھتے ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہیں مایوس کیا جائے!“

شیخ محمدؒ نے پوچھا۔ ”تو کیا میں کل سے حاضر ہو جاؤں؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”بالکل، کسی مزید اجازت کے بغیر۔“

شیخ محمدؒ مکتب سے گھر چلے آئے۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے شیخ ابوالرضاؒ سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے لمحہ بھر کے لیے شیخ محمدؒ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کے بعد ایک کاغذ پر چند الفاظ لکھ کر شیخ محمدؒ کو دے دیا۔ شیخ محمدؒ نے اس پرزے کو نہایت احترام سے رکھ لیا۔ جب یہ پرزہ تنہائی میں کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔

”آج تم کہاں گئے ہوئے تھے؟ کیونکہ میں تمہارے اندر ایک ظلمت دیکھ رہا ہوں۔“

شیخ محمدؒ پرزہ پڑھ کر لرز گئے اور پیر و مرشد کے قدموں میں گر گئے، بولے۔

”حضرت! غلطی ہوئی میں اس پر نادم اور شرمسار ہوں۔“

مرشد نے جواب دیا۔ ”شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں اب تو وہاں نہیں جائے گا۔“

شیخ محمدؒ اپنے مرشد کے قدموں میں سر رکھے دیر تک روتے رہے اور شیخ ابوالرضاؒ انہیں تسلیاں دیتے رہے۔

☆☆☆

شیخ ابوالرضاؒ کے آس پاس اور سامنے مریدوں کا ہجوم تھا۔ آپ فضائل ذکر بیان فرما رہے تھے۔ جب اس سے فراغت ملی تو ایک تنومند مرید کو اپنے پاس بلا کر حکم دیا۔ ”دیکھو حجرے کے باہر ایک بکری بندھی ہوئی ہے اس کو کھولو اور میرے اس عزیز کو پہنچا دو جو مسجد کے سامنے رہتے ہیں۔“

مرید کو تامل ہوا، رک رک کر پوچھا۔ ”کون سے عزیز؟ جو یہاں سے تقریباً نصف میل دور مسجد کے سامنے رہتے ہیں؟“

مرشد نے جواب دیا۔ ”ہاں، انہی عزیز کے گھر۔“

مرید نے کچھ پس و پیش کیا اور کہا۔ ”حضرت، بکری تو خاصی وزنی ہے اور شاید اس کا ایک پاؤں زخمی بھی ہے اس حالت میں اس کو نصف میل چلا کر لے جانا شاید مشکل کام ہے۔“

مرشد نے فرمایا۔ ”لیکن اس کا لے جانا بہت ضروری ہے، جس طرح چاہو لے جاؤ۔“

مرید نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ایک مزدور کر لیا جائے۔“

شیخ ابوالرضاؒ نے ناگواری سے کہا۔ ”میں نے کہہ تو دیا کہ جس طرح چاہو لے جاؤ۔“

مرشد اور مرید کی باتیں دوسرے مریدوں نے بھی سنیں۔ شیخ محمدؒ بھی گوش بر آواز ہی رہے۔ آخر مریدوں میں وہ پہلے شخص تھے جو اس مرید کے ساتھ باہر چلے گئے۔ مرید مذکور باہر نکل کر بکری کے پاس پہنچا۔ اسے کھڑا کر کے زبردستی چلایا پھرایا۔ وہ اچک اچک کر چلتی اور گر جاتی، مرید نے اسے کھینچنا شروع کیا۔ رسی کی رگڑ نے بکری کو احتجاج پر مجبور کر دیا۔ وہ بھیں بھیں کرنے لگی۔

شیخ محمدؒ نے مرید سے کہا۔ ”بھائی! اس پر اتنا ظلم نہ کرو کہ یہ چیخنے چلانے لگے۔“

مرید نے جھنجلا کر شیخ محمد کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”جناب! اس بکری کو جہاں تک لے جانا ہے، وہ یہاں سے نصف میل دور ہے! یہ

اگر نخرے کرے گی تو میں اس کو کھینچتا ہوا لے جاؤں گا۔"

شیخ محمدؒ نے فرمایا۔ "تم اگر اس طرح لے گئے تو یہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے یا تو مرجائے گی یا ادھ مری ہوجائے گی اور وہ عزیز حضرت شیخ مرشد سے تمہاری شکایت کریں گے۔ اس وقت تم کیا جواب دو گے؟"

مرید نے لال پیلے ہوکر جواب دیا۔ "اس وقت میں پیرو مرشد سے کہوں گا کہ حضرت! آپ کو معلوم نہیں تھا کہ بکری لنگڑی بھی ہے اور وزنی بھی، وہ اپنے پیروں سے جانے کے لائق تھی ہی کب؟ چنانچہ اس کو مجبوراً کھینچ کر لے جانا پڑا۔ اب وہ مرے یا جیئے، میں کیا کرسکتا ہوں؟"

شیخ محمدؒ نے مشورہ دیا۔ "کوئی طاقتور مزدور لے آؤ۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر پہنچادے گا۔"

مرید نے خونخوار نظروں سے شیخ محمدؒ کی طرف دیکھا۔ "مزدور لے آؤں؟ کہاں سے مزدور لے آؤں، مزدوری کون دے گا؟ میرے پاس تو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔"

شیخ محمدؒ نے جواب دیا۔ "مزدوری میں دے دوں گا، آخر پیرو مرشد کی رضا حاصل کرنی ہے۔"

مرید کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، بولا۔ "آدمی دلچسپ بھی ہو اور مرشد کے وفادار اور محب بھی۔" اس کے بعد ایک طرف جاتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی آیا مزدور لے کر۔"

مرید جیسے ہی گیا۔ شیخ محمدؒ نے بکری کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی، بکری کلبلائی اور اچھلنے کودنے لگی۔ دو کوششیں بیکار گئیں۔ لیکن تیسری کوشش میں کامیاب ہوگئے اور اس کو گود میں اٹھا کر ایک طرف بھاگنے لگے۔ بھاری بکری، طویل مسافت، شیخ محمدؒ پسینا پسینا ہوگئے۔ ہر دو ڈھائی سو قدم پر وہ سستانے لگتے۔ کافی دیر بعد انہوں نے شیخ ابوالرضا کے عزیز کے گھر بکری پہنچادی۔

مرید مزدور لے کر واپس آیا تو وہاں بکری ملی نہ شیخ محمدؒ۔ وہ پریشان ہوکر ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ شیخ محمدؒ اس بکری کو اپنی گود میں اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔ وہ پریشان، حواس باختہ اندر مرشد کے پاس پہنچا اور سارا ماجرا بیان کردیا، بولا۔ "اب آپ فرمائیں کہ شیخ محمدؒ کو کہاں تلاش کروں۔"

مرشد نے جواب دیا۔ "تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اطمینان سے یہیں میرے پاس بیٹھے رہو۔ شیخ محمدؒ جہاں کہیں بھی ہوں گے بالآخر یہاں آئیں گے۔"

مرید نے عرض کردیا۔ "حضرت! مشکل تو یہ ہے کہ میں اس مزدور کا کیا کروں جو باہر کھڑا ہوا ہے، اس سے کیا کہوں؟"

مرشد نے فرمایا۔ "اس سے کہہ دو کہ واپس چلا جائے، اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔"

مرید نے عرض کیا۔ "لیکن حضرت! آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں اس کو مزدوری طے کرکے لایا تھا، کیا وہ مجھے شرمندہ نہیں کرے گا کہ کیا مذاق لگا رکھا ہے؟"

مرشد نے مسکرا کر نرمی سے حکم دیا۔ "مزدور کو اس کی مزدوری دے دو، وہ خوشی خوشی واپس چلا جائے گا۔"

مرید نے شرما کر عرض کیا۔ "حضرت! اس وقت تو میرے پاس ایک حبہ بھی نہیں میں مزدور کو مزدوری کہاں سے دوں گا؟"

مرشد نے چبھتا ہوا اعتراض کیا۔ "جب پاس ایک حبہ بھی نہیں تھا تو مزدور کو لائے ہی کیوں تھے؟"

مرید نے جواب دیا۔ "حضرت مجھ سے شیخ محمدؒ نے وعدہ کیا تھا کہ مزدور لے آؤں۔ وہ مزدوری دے دیں گے۔"

مرشد نے مزدوری کے پیسے اپنے پاس سے دے دیے اور مرید سے کہا۔ "تم مزدور کو رخصت کردو اور میرے پاس موجود رہو۔" مزدور کو اس کی اجرت دے کر رخصت کردیا گیا، مرید، مرشد کے پاس دیر تک بیٹھا شیخ محمدؒ کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شیخ محمدؒ بکری کو لے کر کہاں چلے گئے؟

کافی دیر بعد جب شیخ محمدؒ واپس آئے تو مرید بے چینی سے کھڑا ہوگیا، پوچھا۔ "بھائی! کہاں چلے گئے تھے؟ وہ بکری کہاں ہے؟"

شیخ محمدؒ نے بتایا۔ "وہ بکری میں نے پہنچادی۔"

مرید نے پوچھا۔ "کہاں پہنچادی؟"

جواب دیا۔ "جہاں پہنچانا تھی۔"

مرید نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن کس طرح؟ میں تو مزدور لایا تھا اس کے لیے!"

شیخ محمدؒ نے جواب دیا۔ "میں نے بکری کو گود میں اٹھا کر پہنچادیا۔"

شیخ ابوالرضا نے دونوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "اے شخص! میں نے بکری کو اپنے عزیز کے گھر پہنچانے کا حکم تجھے دیا تھا تو نے تساہل سے کام لیا لیکن شیخ محمدؒ نے یہ کام اپنی خوشی سے کردیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ شیخ محمدؒ کو اس کے حسن خدمت کی وجہ سے مقربین میں شامل فرمالے گا۔ لیکن تجھے تیرے قصور کی وجہ سے مقام سے محروم رکھے گا۔"

اس دن ان کے مرشد پر عجیب سی کیفیت طاری رہی، مرید تو دل برداشتہ ہوکر چلا گیا لیکن شیخ محمدؒ ان کے پاس ہی موجود رہے۔ رات ہوگئی لیکن ان کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخر نصف رات گزرنے کے بعد شیخ ابوالرضا کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے اس کے بعد شیخ محمدؒ سے فرمایا۔ "شیخ محمدؒ میں تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے ذرا غور سے سن لے۔"

شیخ محمدؒ نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ "آپ کی ہر بات میرے لیے ایسی ہے کہ میں دنیا جہاں کو فراموش کرکے پوری توجہ سے سنوں، فرمائیں! میں سننے کو تیار ہوں۔"

مرشد نے فرمایا۔ "شیخ محمدؒ! خدا نے تجھے اس لائق کردیا ہے کہ تو اس کے انسانوں کی رہبری کرے۔ اگر کوئی طالب راہ سلوک تجھ سے رجوع کرے تو یہ تیرا فرض ہوگا کہ تیرے پاس میرا دیا ہوا جو کچھ بھی ہو تو اس کی تلقین کرے، تجھے اس کی اجازت دے رہا ہوں۔"

شیخ محمدؒ ذرا پریشان ہوگئے۔ وہ اس لیے پریشان ہوئے تھے کہ ان کے دل میں کسی قسم کا ایسا ویسا خیال تک نہیں آیا تھا۔ پھر پیر و مرشد نے ایسی بات کیوں کہی۔

شیخ ابوالرضا اپنے فرمانبردار اور سعادت مند مرید کے تمام دلی وسوسوں کو بھانپ گئے، فرمایا۔ "دیکھ شیخ محمدؒ! میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ اس وقت میرے رب نے ان تمام لوگوں کے نام مجھے بتادیے ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ تجھ سے بیعت کریں گے۔ اگر تو کہے تو میں ان کے نام تک تجھے بتادوں۔"

شیخ محمدؒ نے جواب دیا۔ "حضرت! میں تو آپ کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔ آپ سے یہ درخواست نہیں کروں گا کہ آپ ان سب کے نام بتادیجیے۔"

شیخ ابوالرضا نے بھی نام نہیں بتائے اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

☆☆☆

اللہ گو درویشوں کی جماعت آپ کے پاس آئی اور خواہش کی کہ اپنا کچھ وقت ہمیں دیں۔ یہ درویش چونکہ اللہ اللہ بہت زیادہ کرتے تھے اس لیے ان کا نام اللہ گو مشہور ہوگیا۔ ان کے بے حد اصرار پر آپ ان درویشوں کے ساتھ چلے گئے۔ درویش گلیوں کوچوں میں اللہ اللہ کرتے پھر رہے تھے۔ یہ درویش جب ایک محلے میں پہنچے جہاں امرائے سلطنت رہتے تھے تو ایک امیر کا دروازہ اچانک کھلا اور اس میں سے ایک شخص نکل کر درویشوں کے پیچھے دوڑا۔ اس نے درویشوں سے پوچھا۔ "میں ایک غرض مند انسان ہوں، بتاؤ میں تم میں سے کس شخص سے بات کروں؟"

ایک درویش شیخ محمدؒ کی طرف اشارہ کردیا۔ "ان سے، کیونکہ ہم میں سے ان جیسا ایک بھی نہیں۔"

وہ شخص شیخ محمدؒ کے پاس پہنچا اور دوزانو بیٹھ کر آپ کا دامن پکڑلیا، بولا۔ "حضرت! اب یہ دامن اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ آپ میری مشکل حل نہ فرمادیں گے۔"

شیخ محمدؒ نے پوچھا۔ "اپنی مشکل تو بتاؤ یوں دامن پکڑنے سے کیا حاصل؟"

اس نے عرض کیا۔ "حضرت! یہ جو محل نظر آرہا ہے میں اس کا ادنیٰ سا ملازم ہوں، میرا آقا انتہائی نیک اور شریف النفس ہے، وہ آج کئی دن سے پیشاب بند ہوجانے کی بیماری ... میں مبتلا ہے دنیا کے معالجوں نے مایوسی کا اظہار کردیا ہے۔ بس ایک آپ ہی کی ذات ہے جو مستجاب الدعوات ہیں، آپ چاہیں گے تو میرا آقا صحت یاب ہوجائے گا ورنہ بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "دہلی میں بڑے بڑے معالجین موجود ہیں ان کے پاس جاؤ اور اپنے آقا کا علاج کرا۔"

اس شخص نے عرض کیا۔ "حضرت! اگر ایسا ممکن ہوتا تو اس وقت میں آپ کو ہرگز تنگ نہ کرتا۔ اب تو آپ ہی میرے آقا کو صحت یاب کریں گے۔"

آپ نے پوچھا۔ "کیا تیرا آقا بہت اچھا آدمی ہے جس کی صحتیابی کے لیے تو اتنا بے چین ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "حضرت! اس سے کہیں زیادہ اچھا۔ جتنا خیال کیا جاسکتا ہے، اگر میرا آقا نہ رہا تو میں بھی اس قصر سے نکل جاؤں .... کیونکہ میرے آقا کے بعد اس قصر میں ایک بھی جوہر شناس نہیں رہ جائے گا۔"

آپ نے فرمایا۔ ”تو چلو، میں چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں اسے کیا بیماری ہے اور وہ کیوں نہیں اچھا ہوتا۔“
آپ اس شخص کے ساتھ قصر میں داخل ہو گئے۔ اس شخص نے انہیں بیمار امیر کے سرہانے کھڑا کر دیا۔ امیر کی آنکھوں میں حسرت و یاس ... اور مجبوری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے اپنے سرہانے ایک درویش کو کھڑے دیکھا تو دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے
آپ نے پوچھا۔ ”تیرا کیا حال ہے؟“
امیر نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ ”اللہ کے شکر کے سوا کیا عرض کروں، اگر وہ اسی مرض میں اٹھانا چاہتا ہے تو میں راضی بہ رضائے الٰہی ہوں۔“
آپ نے پوچھا۔ ”کیا تو صحت یاب ہونا چاہتا ہے؟“
امیر نے جواب دیا۔ ”آپ سے رجوع کرنے کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“
آپ نے فرمایا۔ ”خدا کی راہ میں کچھ دینا پڑے گا!“
امیر نے کہا۔ ”آپ جو فرمائیں، حاضر کر دیا جائے گا۔“
آپ نے سکوت فرمایا اور کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔ ”فی الحال ایک ہزار روپے فراہم کر دے۔“
امیر نے حکم دیا اور اسی وقت ایک ہزار روپیہ آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ نے ملازم سے کہا۔ ”جا اور اعلان کر دے کہ حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کی جائیں گی، امیر کے دروازے پر جمع ہو جائیں۔“
ملازم نے اسی وقت بازاروں اور گلی کوچوں میں یہ اعلان کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حاجت مندوں کا مجمع لگ گیا۔ آپ نے یہ روپیہ ان میں تقسیم کر دیا۔ لیکن یہ رقم ناکافی رہی اور حاجت مندوں کا ہجوم پھر بھی موجود رہا۔
آپ اندر امیر کے پاس گئے اور پوچھا۔ ”اب تیرا کیا حال ہے؟“
اس نے جواب دیا۔ ”کوئی افاقہ نہیں ہوا، میرا پیٹ پھولتا جا رہا ہے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”تب پھر ایک ہزار روپے اور دلوا دے۔“
امیر نے کہا۔ ”یہ کون سی بڑی بات ہے ابھی لیجیے۔“
اس کے بعد اس نے ایک ہزار روپے اور دلوا دیے۔ آپ نے یہ روپے بھی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیے اور اندر جا کر مریض سے دریافت کیا۔ ”کچھ افاقہ ہوا؟“
امیر نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ”کوئی افاقہ نہیں ہوا۔“
آپ نے فرمایا۔ ”تب پھر ایک مصلّٰی لایا جائے۔“
خدمت گار نے اسی وقت مصلّٰی آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ اس پر بیٹھ کر دعا گو ہوئے۔ ”اے میرے رب! میں نے اس بیمار سے دو ہزار روپے لے کر غرباء میں تقسیم کر دیے۔ میرا خیال تھا اس کے اثر سے امیر کے مرض میں کمی واقع ہو جائے گی لیکن اس کا مرض جوں کا توں موجود ہے۔ اب میں اس سے روپے بھی نہیں مانگ سکتا۔ کیونکہ مجھے مانگتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے تو ہی میری شرم کی لاج رکھ لے اور اس شخص کو صحت یاب کر دے۔ میں اس وقت تک اس مصلّٰی سے نہیں اٹھوں گا جب تک کہ یہ صحت یاب نہ ہو جائے گا۔“
آپ سجدے میں گر گئے اور سجدہ گاہ کو رو رو کر تر کر دیا۔
امیر کو اپنے پیٹ سے کوئی شے نیچے رینگتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پیشاب کی دھار جاری ہو گئی اور وہ خوشی سے چیخ پڑا۔ ”ہوا، ہوا، اثر ہوا، حضرت مرشد آپ کی دعا کا اثر ہو گیا۔ آہ اب میں صحت یاب ہو جاؤں گا، اب میں اچھا ہو جاؤں گا۔“
آپ نے اس کی آواز سنی اور بہ دستور سجدے میں پڑے رہے، سر نہیں اٹھایا۔
کچھ دیر بعد وہ بالکل صحیح ہو گیا۔ گھر والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ پورا قصر خوشیوں سے جگمگا اٹھا۔ خدمت گار آپ کے پیچھے بیٹھ گیا اور نہایت ادب سے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ کی دعا قبول ہو گئی، خدا نے آپ کی سن لی، سجدے سے سر اٹھائیے!“
کچھ توقف کے بعد آپ نے سر اٹھایا اور یہ منظر بھی نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ رونے کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔
امیر کو بستر سے اٹھا کر غسل خانے پہنچا دیا گیا۔ اس نے غسل کیا اور لباس بدل کر آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے پوچھا۔ ”اب تیرا کیا حال ہے؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں، مجھے دوبارہ زندگی ملی ہے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”میرا نہیں، اپنے رب کا شکر ادا کر جس نے تجھے دوسری زندگی عطا فرمائی۔“
امیر نے کہا۔ ”لیکن میں آپ کا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔ کیونکہ اگر آپ وسیلہ نہ بنتے اور دعا نہ فرماتے تو شاید میں صحت یاب نہ ہوتا، اس سے پہلے میرا پورا خاندان میری صحت یابی کی دعائیں مانگ چکا تھا لیکن میں صحت یاب نہیں ہوا تھا۔“
آپ نے جانے کی اجازت مانگی۔ ”اچھا اب میں چلا، اپنے رب کو ہمیشہ یاد رکھو۔“
امیر نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں آپ کو ابھی نہیں جانے دوں گا، آپ چند دن میرے مہمان رہیے۔“
قصر کے در پر اللہ گو درویش اس وقت بھی موجود تھے۔ انہوں نے اللہ اللہ کی صدائیں لگانا شروع کر دیں۔
آپؒ نے فرمایا۔ ”دیکھو مجھے وہ بلا رہے ہیں۔“
امیر نے روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن آپ نہیں رکے اور باہر نکل کر درویشوں کے ساتھ چل دیے۔

☆☆☆

قریہ سرائے کا رئیس آپ کا بے حد معتقد تھا۔ شیخ محمد جب بھی قریہ سرائے جاتے، یہ رئیس چوبیس گھنٹے کی حاضری دیتا۔ آپ بھی اس پر بڑی شفقت فرماتے۔ اس رئیس کو ہر طرح کا اطمینان حاصل تھا مگر ایک کانٹا ایسا بھی تھا جو ہر وقت چبھتا رہتا۔ رئیس کا بیٹا سید علی سخت نافرمان تھا۔ شراب اس کی گھٹی میں پڑی تھی، جوئے کا وہ رسیا تھا۔ دنیا بھر کی برائیاں اس میں جمع ہو گئی تھیں۔ نیکی اور بھلائی سے اسے چڑ تھی۔ باپ سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ چکا تھا۔ رئیس نے سوچا کہ اگر اس کو شیخ محمدؒ کی خدمت میں پہنچا دیا جائے تو شاید ان کی صحبت کچھ اثر کر جائے اور یہ سدھر جائے۔ لیکن سید علی کا یہ حال تھا کہ اسے درویشوں کے ذکر سے چڑ تھی۔ جب بھی ذکر چھڑتا وہ اٹھ کر باہر چلا جاتا۔
ایک بار آپ کا قریہ سرائے میں قیام ہوا اور رئیس بھی ان کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے رئیس کے چہرے سے اس کی پریشانی محسوس فرمالی، پوچھا۔ ”کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟“
رئیس نے جواب دیا۔ ”حضرت! کیا عرض کروں مجھے میرے بیٹے نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔“
آپ نے پوچھا۔ ”کیوں، وہ کیا کہتا ہے؟“
رئیس نے جواب دیا۔ ”حضرت! وہ کہتا تو کچھ بھی نہیں، لیکن دنیا کی جتنی بھی برائیاں ہیں اس میں موجود ہیں۔ میں تو اس کے ذکر تک میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں اس کو میرے پاس لے آؤ۔“
رئیس نے کہا۔ ”میں اس کو آپ کے پاس کس طرح لے آؤں، وہ تو نیکی کے ذکر سے بھاگتا ہے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”جاؤ اس سے کہو، میں اس کو یاد کر رہا ہوں وہ نہیں بھاگے گا۔ میرے پاس ضرور آئے گا۔“
رئیس نے بے دلی سے عرض کیا۔ ”آپ فرماتے ہیں تو کہہ دوں گا لیکن مجھے یقین نہیں کہ وہ یہاں تک آ بھی جائے گا کیونکہ میں بارہا کہہ چکا ہوں اور اس نے ہر بار انکار کیا ہے۔“
آپ نے نرمی سے فرمایا۔ ”چلو ایک بار اور سہی۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟“
رئیس امید و بیم میں گھر پہنچا، اس کا لڑکا سید علی کہیں جانے کے لیے بنا سنورا کھڑا تھا۔ رئیس نے جاتے ہی پوچھا۔ ”کہاں چلے؟“
سید علی نے مذاق میں جواب دیا۔ ”آپ کے پیر و مرشد شیخ محمدؒ کے پاس۔“
باپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہاں چل، کیونکہ تجھے شیخ صاحب نے یاد فرمایا ہے، میں تجھ کو لینے آیا ہوں۔“
سید علی نے جو بات غیر ارادی طور پر مذاق میں کہیں تھی اب وہ سنجیدہ ہو چکی تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ باپ سے کہہ دے کہ یہ تو میں نے مذاق میں کہا تھا۔ میں نہیں جاؤں گا لیکن وہ نہیں کہہ سکا اور خود کو باپ کے ساتھ جانے پر مجبور محسوس کرنے لگا، آہستہ سے بولا۔ ”میں تیار ہوں، چلیے!“
رئیس حیرت زدہ، اپنے لڑکے کو لے کر روانہ ہو گیا۔ شیخ کی یہ کیسی کرامت تھی؟ ماورائے عقل، بالائے خرد، برتر از وہم و گمان۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ شیخ محمدؒ کی خدمت میں پہنچ گیا، وہاں اور بہت سے لوگ بھی موجود تھے۔ آپ نے اس وقت تو سید علی پر کوئی توجہ نہ دی۔ دوسرے افراد سے باتیں کرتے رہے۔ لیکن ایک بار آپ اچانک اپنی جگہ سے اٹھے اور سید علی کے پاس پہنچ گئے، پوچھا۔ ”میاں

صاحبزادے، اب ہم اتنے برے ہیں کہ تمہیں ہمارا ذکر تک پسند نہیں۔"

سید علی نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کو برا کون کہہ سکتا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "پھر کیا وجہ ہے کہ تمہیں میرے پاس لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور تم ادھر ادھر بھاگنے کی سوچنے لگتے ہو۔ آخر جب میں نے تمہیں زبردستی پکڑ کر بلوایا تو تم آگئے، ورنہ شاید آج بھی نہ آتے۔"

باپ کو خدشہ تھا کہ کہیں نالائق بیٹا شیخ سے گستاخی سے نہ پیش آئے لیکن بیٹے کو بھیگی بلی بنا دیکھا تو سرتاپا حیرت میں ڈوبا رہا۔ بیٹا سید علی شیخ کو جواب دے رہا تھا۔ "حضرت! آپ نے جیسے ہی یاد فرمایا میں حاضر ہو گیا۔ مجھ سے ایسی گستاخی کبھی نہیں ہوئی کہ آپ نے یاد فرمایا ہو اور میں نے ٹال مٹول سے کام کیا ہو۔"

شیخ نے پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ اب تک تم کہاں تھے اور کہاں نوکر ہو؟"

سید علی کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے اپنے اندر ایک انقلاب محسوس کیا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش کچھ سوچتا رہا۔

آپ نے پھر پوچھا۔ "ہاں سید علی تم نے میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا!"

سید علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نظریں جھکا کر جواب دیا۔ "میں آپ کے سوالوں کا جواب واپس آ کے دوں گا۔ آپ ذرا توقف فرمائیں۔"

وہ غصے اور جوش میں محفل سے نکل گیا۔ گھر پہنچا، شراب بہادی، آلات مے کشی توڑ دیے۔ غسل خانے میں گیا۔ غسل کیا اور لباس تبدیل کیا۔ اس کے بعد دوبارہ شیخ محمد کی محفل میں پہنچ گیا۔ اور پوچھا۔ "ہاں جناب شیخ! آپ نے مجھ سے کیا پوچھا تھا؟"

شیخ نے اپنا سوال دُہرایا۔ "اب تک تم کہاں تھے اور کہاں نوکر ہو؟"

سید علی نے جواب دیا۔ "اب تک میں جہاں کہیں بھی تھا رسوائے زمانہ اور بدنام عصر تھا لیکن اب آپ کا نوکر ہوں جیسا حکم دیں گے بجالاؤں گا۔ میں نے شراب بہادی اور آلات مے کشی توڑ دیے۔ میں نے غسل کیا اور ساری نجاست پانی میں بہادی۔ میں نے اپنا پرانا لباس اتار کر پھینک دیا اور اب یہ نیا لباس پہن کر آ گیا ہوں اور آپ سے عہد کرتا ہوں کہ اس لباس کی عزت اور حرمت کا ہمیشہ خیال رکھوں گا۔"

شیخ محمدؒ نے مسکرا کر سید علی کے باپ کی طرف دیکھا جسے ان تبدیلیوں اور اعلانات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسا انقلاب تھا جو اتنی آسانی سے آ گیا تھا۔ سید علی نے اس محفل میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ کی صحبت میں صبح و شام گزارنے لگا۔

کچھ عرصہ بعد سید علی کو کاروبار کے سلسلے میں کابل جانے کا منصوبہ بنانا پڑا۔ پہلے تو وہ اس کو ٹالتا رہا لیکن جب مجبور ہو گیا تو آپ سے عرض کیا۔ "پیرومرشد! میری پوری کوشش یہ تھی کہ اپنی پوری زندگی آپ کی صحبت اور محبت میں گزار دوں لیکن ایک اہم ضرورت سے کابل کا سفر درپیش ہے۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو چلا جاؤں گا ورنہ ٹال دوں گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تم کابل ضرور جاؤ لیکن اپنا عہد یاد رکھنا کہ تم نے برائیوں سے توبہ کر لی ہے اور اب ان سے بچتے رہو گے۔"

سید علی نے عرض کیا۔ "حضرت! میں نے جو بیعت کی ہے اور آپ سے جو عہد کیا ہے اس پر زندگی کے آخری لمحوں تک قائم اور پابند رہوں گا یہ میرا مکرر عہد ہے۔"

شیخ نے فرمایا۔ "جواب میں میں ایک شعر سناتا ہوں اس کو لکھ لو اور ہمیشہ یاد رکھنا۔" اس کے بعد آپ نے فارسی کا مشہور شعر سنایا۔

گر در یمنی چو بامنی پیش منی
در پیش منی چو بے منی در یمنی

(چاہے تم یمن میں رہو لیکن مجھے اپنے ساتھ رکھو تو یہ یوں ہے جیسے تم میرے سامنے ہو اور اگر تم میرے ساتھ بھی رہو مگر میرے تصور کے بغیر رہو تو یہ ایسا ہے جیسے تم یمن میں ہو)

شعر سنا کر پوچھا۔ "کیا تم میرا مطلب سمجھ گئے۔"

سید علی نے کہا۔ "اللہ نے چاہا تو آپ میرے ساتھ ہی رہیں گے، چاہے میں کابل میں رہوں، کاشغر میں رہوں یا خراسان اور ماوراء النہر میں۔"

آپ نے فرمایا۔ "اور یہ وعدہ بھی کرو کہ میری موجودگی میں تم کوئی بری حرکت نہیں کرو گے؟"

سید علی نے جواب دیا۔ "میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ آپ کی موجودگی اور عدم موجودگی میں، میں کوئی بری حرکت نہیں کروں گا۔"

آپ نے کابل جانے کی اجازت دے دی۔ "اب تم کابل جا سکتے ہو۔"

سید علی نے سامان سفر تیار کیا اور کابل روانہ ہو گیا۔ کابل میں سید علی کو ایک سال گزر گیا۔ عبادت و ریاضت اور شیخ کے حضور نے ہر برائی کو مغلوب کر رکھا تھا۔ کبھی کبھی اگر کوئی برائی ذرا سا سر اٹھاتی تو سید علی لاحول پڑھ کر اس پر غلبہ حاصل کر لیتا لیکن ایک سال بعد سید علی کے خیالوں میں عورت آنے لگی۔ اس بھوک نے پہلے تو کسی وقت تھوڑا بہت ستایا اور سید علی نے لاحول کے وار سے اس کو زیر کر لیا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد عورت کی خواہش پھر بیدار ہو جاتی۔ کسی خطرناک اور سریع الاثر مرض کی طرح پہلے تو یہ خیال وقفے وقفے سے آتا رہا لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے پوری طرح قبضہ جما لیا۔ اور ذہن و دل پر عورت ہی عورت چھا گئی۔ سید علی کی پریشانی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ابھی عورت ذہن و دل پر مستور ہی تھی کہ ایک حسین ترین نوجوان لڑکی کی سید علی سے ملاقات بھی ہو گئی۔ اس لڑکی کا باپ کوئی ہندوستانی تاجر تھا جو اسے اور اس کی ماں کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کی ماں کا چند ماہ پیشتر انتقال ہو گیا تھا۔ اس لڑکی کو جب یہ معلوم ہوا کہ ایک ہندوستانی مسلمان تاجر کابل آیا ہوا ہے اور وہ کام ختم کر کے ہندوستان واپس چلا جائے گا تو اس نے سید علی سے اپنے سلسلے میں مدد چاہی۔ لڑکی کی خواہش تھی کہ اسے ہندوستان میں اس کے باپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔

لڑکی اتنی حسین اور شباب میں چور تھی کہ سید علی اس کو دیکھ کر کانپ گیا اور گناہ کی خواہش طوفان کی طرح سرکشی دکھانے لگی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جواب دیا۔ "لڑکی میں تیرے باپ کو ہندوستان میں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ اگر اس کا کوئی پتا نشان ہوتا تو میں تیری مدد ضرور کرتا۔"

لڑکی نے سید علی کے دونوں شانے پکڑ لیے اور جھنجوڑ کر کہا۔ "یہ تم نے اپنی آنکھیں کیوں بند کر لیں؟ میں یوں تو نہیں مانوں گی، تمہیں ایک مسلمان کے ناتے میرا ساتھ دینا پڑے گا۔"

سید علی نے ہمت کی اور آنکھیں کھول دیں۔ لیکن جیسے ہی لڑکی پر نظر پڑی، تمام شیطانی خواہشیں عود کر آئیں۔ اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "لڑکی! اس وقت تو، تو چلی جا، پھر کسی وقت آجانا۔ میں سوچ کر جواب دوں گا۔"

لڑکی تن کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ "لیکن یہ تو بتاؤ کہ میں جاؤں تو کہاں؟ میرا کوئی ٹھکانا بھی تو نہیں۔"

سید علی نے جواب دیا "اب میں کیا بتاؤں کہ تم کہاں جاؤ، کہیں بھی جاؤ لیکن یہاں سے چلی جاؤ۔"

لڑکی نے شوخی سے مسکرا کر کہا۔ "میں یہاں سے نہیں جاؤں گی کیونکہ میں تم پر تو اعتبار کر سکتی ہوں کسی اور پر نہیں۔"

سید علی نے ایک بار پھر لڑکی کے سراپا کا جائزہ لیا اور منہ میں پانی بھر آیا، کہا۔ "لڑکی! تم ایک بار پھر غور کر لو، کہیں اور ٹھکانا کر لو تو بہتر ہے ورنہ پھر میرے ہی پاس رہ جانا۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں کہیں اور ٹھکانا نہیں کر سکتی۔ مجھے چند دن تمہارے ہی پاس رہنا ہے، تم مانو یا نہ مانو۔ میں زبردستی رہ پڑوں گی۔"

سید علی میں شیطنیت بیدار ہو گئی، بولا۔ "بہتر ہے تم میرے ہی پاس رہ جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس کا خاص خیال رکھنا کہ میں زیادہ بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتا۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتی کہ زیادہ بے تکلفی سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ویسے میں کیا کوئی بھی لڑکی پہل کرنا پسند نہیں کرتی، یہ مرد ہی ہے جو اسے ورغلاتا اور گمراہ کرتا ہے۔"

سید علی نے کہا۔ "لیکن میں وہ مرد نہیں ہوں جو عورتوں اور لڑکیوں کو ورغلاتے اور گمراہ کرتے ہیں۔ میں نے اپنے مرشد سے عہد کیا تھا کہ میں برائیوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ مجھے اپنا یہ وعدہ ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔"

لڑکی نے شوخی سے پوچھا۔ "میں کہاں رہوں؟ کس کمرے میں۔"

سید علی نے اپنے کمرے سے ملحق کمرے میں لڑکی کو ٹھہرا لیا۔

رات کو سید علی نے بڑی پریشانی محسوس کی۔ اس کی نظریں بار بار لڑکی کے کمرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو دوسری طرف سے بند تھا۔ کئی بار جی میں آیا کہ دروازے پر دستک دی جائے لیکن پھر معلوم نہیں کیا سوچ کر ایسا نہیں کیا۔

رات کا پچھلا پہر آ گیا، مگر سید علی کو نیند نہیں آئی، اس کی بڑی بری حالت تھی۔ سید علی نے مصلیٰ بچھایا اور جلدی جلدی دو رکعتیں پڑھ کر سجدے میں گر گیا۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔ "اے میرے مولیٰ! تو نے مجھے یہ کس آزمائش میں ڈال دیا؟ میں اس سے کس طرح نکلوں؟ میری مدد کر، کیونکہ تیری مدد کے بغیر آگے کے اس دریا کو عبور کرنا ناممکن ہے۔"

وہ سجدے میں پڑا رو رہا تھا اور گڑگڑا رہا تھا کہ کسی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا اور بڑی نرمی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ یہ رونا

کیسا؟ یہ پریشانی کس بات کی؟"

سید علی نے لرزتے ہوئے سجدے سے سر اٹھایا اور اپنے سامنے لڑکی کو دیکھ کر بہت زیادہ پریشان ہوا، اس نے لڑکی کو ڈانٹ دیا۔ "لڑکی! یہ کیا بدتمیزی ہے، جب میں نے تجھے ایک الگ کمرا دے دیا ہے تو تیرا رات کی تاریکی میں میرے پاس آجانا کیا معنی رکھتا ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "مجھے اس کمرے میں ڈر لگتا ہے، میں وہاں اکیلی نہیں رہ سکتی میرے ساتھ کسی اور کو بھی رہنا پڑے گا۔"

سید علی کو طیش آگیا، کہا۔ "لڑکی! اب زیادہ تنگ نہ کر اور اسی وقت میرے کمرے سے نکل کر جہاں جی چاہے چلی جا، لیکن میرا پیچھا چھوڑ دے۔"

مگر لڑکی پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہو رہا تھا، اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "تم کچھ بھی کہو میں نہ تو اس کا برا مانوں گی اور نہ ہی کہیں اور جاؤں گی۔ میں کوئی احمق تو نہیں۔"

سید علی نے عاجز آکر کہا۔ "اچھا بابا تو یہیں میرے ہی مکان میں رہ لیکن اس وقت تو اپنے کمرے میں چلی جا کیونکہ اگر کسی نے یہاں دیکھ لیا تو معلوم نہیں کس غلط فہمی کا شکار ہو جائے۔"

لڑکی سید علی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اٹھلا کر بولی۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ میں تنہا نہیں رہ سکتی۔ مجھ کو ڈر لگتا ہے۔ اب یا تو تم بھی میرے ہی کمرے میں چل کر آرام کرو۔ یا پھر مجھ کو اپنے کمرے میں سو جانے کی اجازت دے دو۔"

سید علی نے بڑی کمزور آواز میں کہا۔ "یہ کیسی ضد کر رہی ہے لڑکی، خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میں صحرا کو نکل جاؤں گا۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "اگر تم صحرا کو نکل جاؤ گے تو تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی آجاؤں گی کیونکہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔"

سید علی ایک بار پھر ڈانواں ڈول ہو گیا، بولا۔ "تو تو نے واقعی یہ فیصلہ کر لیا ہے تو میرا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں نے یہ بات کہہ جو دی۔"

سید علی نے پوچھا۔ "تو نے اپنی بات کے معانی اور مطلب پر بھی غور کیا؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں جو بات کہتی ہوں پہلے اس پر اچھی طرح غور کر لیتی ہوں۔"

سید علی کو ان باتوں میں بڑا مزہ آرہا تھا، پوچھا۔ "تب پھر اپنی بات کے معانی اور مطلب مجھے بھی بتا، تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

لڑکی سید علی سے بھڑ کر بیٹھ گئی، بولی۔ "تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں؟ میں بتاؤں کیا چاہتی ہوں؟ کیا تم واقعی اتنے بھولے بھالے ہو کہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکے یا معصوم بن کر دھوکا دے رہے ہو؟"

سید علی نے دور ہٹنے کی کوشش کی، کہا۔ "لڑکی! تو میری بات پر یقین کر، میں تیری بات کا مطلب نہیں پا سکا۔"

لڑکی نے کالی کالی مخمور آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔ "اے شخص! جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے، تمہیں اپنا لینے کی خواہش اپنے دل میں محسوس کر رہی ہوں۔ جیسے جیسے تم سادگی اور بھولے پن کا اظہار کرتے ہو، میرا دل اور زیادہ گھائل ہو جاتا ہے۔"

سید علی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، حیرت سے پوچھا۔ "لڑکی! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں نے جو کچھ کہا، اب بار بار نہیں دُہراؤں گی۔"

سید علی نے مصلیٰ چھوڑ دیا اور لڑکی سے کہا۔ "لڑکی! تو خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں تجھ سے جتنا بھاگنا چاہتا ہوں تو اسی قدر مجھ سے قریب ہوتی جا رہی ہے۔"

لڑکی اٹھلا کر اٹھی اور سید علی سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "میں نے جو فیصلہ کر لیا، کر لیا۔ اب تم بھی بے جا ضد نہ کرو، ہندوستان میں میرا باپ ملے یا نہ ملے، میں رہوں گی تمہارے ہی پاس۔"

سید علی پر جو مصیبت نازل ہوئی تھی وہ اس چھت کے مانند تھی جو اپنے مکین پر آگری ہو۔ کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ "لڑکی! مجھے تیری بات منظور ہے، میں تیری خواہش کے مطابق تجھے اپنی بیوی بنالوں گا مگر یہ بات اس وقت تو ممکن نہیں۔ اب تو آرام کر، صبح یہ کام باقاعدہ انجام پا جائے گا۔"

لڑکی سید علی سے چمٹ گئی، بولی۔ "سچ؟ کیا تم نے میری بات مان لی؟"

سید علی نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ جو دیا۔"

لڑکی نے بے اختیار کئی بوسے لیے اور کہا۔ "آج میں اپنے خدا سے جو مانگتی مل جاتا۔ بہرحال اب تم میرے ہو اور میں تمہاری، ابھی

اسی وقت سے۔"

سید علی تو پہلے ہی بے چین تھا، لڑکی کی رضامندی اور اجازت نے بالکل بے بس کر دیا۔ لیکن اسی وقت شیخ محمدؒ کا خیال آگیا۔ اس نے لڑکی کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی آیا، تو میرا انتظار کر، مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے۔"

لڑکی نے اجازت دے دی۔ سید علی نے باہر نکل کر دروازے کو بند کر دیا اور باہر ہی سے بہ آواز بلند کہا۔ "لڑکی، جو کام جائز طریقے پر ممکن ہے اس کو حرام کیوں کر دیا جائے۔ اب تو آرام کر، کل صبح ملاقات ہوگی۔"

لڑکی کو بڑا غصہ آیا، بپھر کر بولی۔ "تم نے مجھے دھوکا دیا ہے یہ برا کیا۔ میں تمہیں سچا سمجھتی تھی۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ تم جھوٹے بھی ہو۔ میں تم پر آیندہ اعتبار نہیں کروں گی۔"

سید علی نے باہر ہی سے جواب دیا۔ "نہیں اعتبار کرتی تو نہ کر۔ لیکن میں نے اپنے شیخ سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ میں منکرات سے باز رہوں گا، میں اپنے اس عہد کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

لڑکی نے ناگواری سے پوچھا۔ "تمہارا پیر کون ہے اور کہاں ہے، مجھے وہاں پہنچا دو۔ پھر میں دیکھوں گی کہ ان کا زہد و تقویٰ کدھر چلا گیا ہے۔ میں جس سے ایک بار مل لوں۔ وہ مجھ سے بار بار ملنے کی خواہش کرے گا۔"

سید علی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے تو اپنے دعوے میں سچی ہو لیکن میری مثال تیرے سامنے ہے۔ میں جس شیخ کا مرید ہوں۔ اس کے حکم کا پابند ہوں۔ اس نے مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں عورتوں سے بچوں گا چنانچہ میں بچ گیا۔ جس کے مرید کا یہ حال ہو اس کے شیخ کا کیا جواب۔"

لڑکی خاموش ہو گئی اور سید علی اپنے دوسرے کمرے میں بند ہو گیا۔

☆☆☆

لڑکی سید علی سے ناراض ہو گئی۔ وہ روٹھی روٹھی، دور دور رہی لیکن مکان نہیں چھوڑا۔ سید علی اسے جب بھی دیکھتا شوق کی تحریک شدت اختیار کر جاتی۔ لڑکی بھی بڑی ہنرمند تھی، اب وہ بھی سید علی سے دور دور رہ کر سید علی کی آتش شوق کو ہوا دے رہی تھی۔ لڑکی کا یہ ایسا خطرناک حربہ تھا کہ اس نے سید علی کو زیر کر لیا۔ اب سید علی کو یہ بے چینی تھی کہ لڑکی اس کو نظر انداز کیوں کر رہی ہے۔ کئی بار جی میں آئی کہ لڑکی کو دونوں شانوں سے پکڑ کر گرا دیا جائے اور پوچھا جائے کہ۔ "اے لڑکی، تو اتنی مغرور کیوں ہو گئی ہے؟"

سہ پہر کو اس نے محسوس کیا کہ لڑکی اپنے کمرے سے اسے دیکھ رہی ہے لیکن جیسے ہی سید علی سے نظر ملی وہ منہ پھیر کر سامنے سے ہٹ گئی۔

سید علی طیش میں لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا لیکن وہ اندر سے بند تھا، سید علی نے غصے میں کہا۔ "لڑکی! دروازہ کھولو؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "سید علی! واپس جاؤ۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

سید علی نے دروازے کو زور سے دھکا دیا اور دھمکی دی۔ "اگر تو شرافت سے دروازہ نہیں کھولے گی تو میں دروازہ توڑ کر اندر آجاؤں گا۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں دروازہ نہیں کھولوں گی، چاہے تم دروازہ توڑ دو۔"

سید علی غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے زور زور سے دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ دروازے ہل رہے تھے۔ بالکل اس طرح گویا دروازے ٹوٹ کر گر جائیں گے۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا اور اندر سے لڑکی کا ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ شوخی سے بولی۔ "تم تو بلا کے شریر۔ اپنی مرضی پر تو دروازے تک توڑنے پر تیار ہو گئے اور جب میں بضد تھی تو تم حاجت محسوس کرنے لگے تھے۔"

سید علی نے جواب دیا۔ "اب اس کا ذکر چھوڑ دے، میں تیرے شباب اور حسن کا شیدائی اپنی آتشِ شوق کو جلد از جلد بجھانا چاہتا ہوں ادھر آ، میرے گلے سے لگ جا۔"

لڑکی نے شوخی سے کہا۔ "اجی ایسی غلطی کرنا بھی نہیں، اپنے پیر و مرشد سے پوچھ لیا یا نہیں۔"

سید علی جواب دیا۔ "میں کسی سے بھی نہیں پوچھتا۔ کیونکہ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں، جو جی میں آئے گا کروں گا پیر و مرشد کا میرے اعمال اور افعال سے کیا تعلق؟"

لڑکی سید علی کے قریب آگئی۔ سید علی نے جیسے ہی...... فرط شوق میں نظریں اٹھائیں اور دروازے کی طرف دیکھا کہ وہ بند ہے یا کھلا اس نے دروازے کے اندر اپنے پیر و مرشد کو کھڑے دیکھا جو کلمہ طیبہ والی انگلی کو بند مٹھی میں سے نکالے ہوئے منع کر رہے تھے کہ خبردار کیا تو

نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تو برائیوں سے بہر قیمت بچے گا لیکن اب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تو میری پروا کیے بغیر من مانی کیے جارہا ہے۔

اس کے بعد مرشد نے فارسی کا شعر پڑھا جس کا مفہوم تھا۔

''چاہے تم یمن میں رہو لیکن مجھے تم اپنے ساتھ رکھو، تو یہ یوں ہے جیسے تم میرے سامنے ہو، اور اگر میرے ساتھ بھی رہو مگر میرے تصور کے بغیر رہو تو یہ ایسا ہے جیسے تم یمن میں رہو۔''

سید علی کانپ گیا اور لڑکی کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شیخ کی طرف دیکھا۔ شیخ بہ دستور موجود اسے منع کررہے تھے۔ آخر سید علی لڑکی کو چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اس کا نشہ نفسانی اور خواہش شہوانی یکسر معدوم ہو چکی تھی۔ عورت کے خیال میں کوئی مزہ نہ رہا تھا۔ لڑکی کا تصور پھیکا اور بے مزہ ہو گیا تھا۔ گھنٹوں کی آوارہ گردی کے بعد جب وہ گھر میں واپس آیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ لڑکی کو ذلیل و خوار کرکے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد سید علی تین چار سال تک کابل میں رہا لیکن ہمیشہ یہی محسوس کرتا رہا کہ وہ رجولیت سے محروم ہو چکا ہے لیکن جب وہ ہندوستان واپس گیا اور اپنی بیوی کے پاس گیا تو عورت کی خواہش بڑی شدت سے ابھری اور وہ برسوں کے بھوکے کی طرح بیوی کی آغوش میں دبک کر چھپ گیا۔

☆☆☆

شیخ محمدؒ کے ایک مرید سید بُرہان بخاری آپ کی خصوصی توجہ میں رہتے تھے، ہر روز حاضری دیتے اور جب آپ اجازت دیتے چلے جاتے۔ سید بُرہان بخاری بھی جب تک آپ کی زیارت نہ کر لیتے، سکون نہ ملتا۔ مریدوں کو سامنے بٹھا کر آپ وعظ و تلقین میں مشغول ہو جاتے۔ ایک دن شیخ نے سید برہان بخاری کو مجلس میں نہیں دیکھا تو بے چین ہو گئے۔ مریدوں سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، آج سید بُرہان بخاری نہیں نظر آرہے، کہاں رہ گئے؟''

ایک مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! برہان بخاری بڑی تکلیف میں ہیں۔ آج صبح میں ان کے پاس گیا تھا۔ اس وقت ان کے پاس کئی معالج علاج میں مشغول تھے۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''اسے تکلیف کیا ہے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''حکماء نے دردِ قولنج تشخیص کیا ہے!''

شیخ نے بہت افسوس کیا اور فرمایا۔ ''ہم اسے دیکھنے جائیں گے، ہم سے جو ہو سکا ضرور کریں گے۔''

اس دن شام کو آپ برہان بخاری کے گھر تشریف لے گئے اطباء نے افیون دے کر مدہوش کر دیا تھا۔ آپ نے برہان بخاری کے پاس بیٹھ کر دریافت کیا۔ ''بخاری! کیا حال ہے؟''

بخاری نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نیم وا ہو کر رہ گئیں۔ انہیں ایسا لگا جیسے بڑی دور سے آواز آرہی ہو، وہ کوئی جواب نہ دے سکے، آپ نے پھر پوچھا۔ ''بخاری کچھ بتاؤ تو سہی کیا حال ہے؟ درد کس جگہ ہوتا ہے؟''

بخاری پھر کوئی جواب نہ دے سکے۔ گھر کے کسی تیماردار نے جواب دیا۔ ''جناب شیخ! انہیں دردِ قولنج اٹھا تھا۔ اس نے انہیں ہلکان کر ڈالا ہے۔ اطباء علاج سے عاجز آچکے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کیا علاج کیا جائے؟''

آپ برہان بخاری کے سرہانے بیٹھ گئے اور فرمایا۔ ''ذرا دیر خاموش رہو اس کا مرض سلب کیے لیتا ہوں۔''

آپ نے آنکھیں بند کرلیں اور کچھ پڑھ پڑھ کر اپنا داہنا ہاتھ۔ پورے جسم پر پھیرتے رہے۔ تقریباً نصف پون گھنٹا اس طرح کرتے رہے، درد کے خاتمے پر آپ نے فرمایا۔ ''میں نے اس درد کو سلب کر لیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اب کبھی بھی یہ درد نہیں اٹھے گا۔''

آپ ذرا دیر اور رکے اس کے بعد چلے آئے۔ دوسرے دن علی الصباح برہان بخاری نے آپ کی خانقاہ میں حاضری دی، اب وہ بالکل صحت یاب ہو چلے تھے۔ برہان بخاری نے شیخ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! میں زندگی بھر آپ کا یہ کرم نہیں بھلا سکتا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''برہان بخاری! جب میں نے مراقبے میں تیرے جسم میں مرض کی مدت دیکھی تو وہ تا زندگی نظر آیا۔ چنانچہ میں نے اس کو اپنی زندگی میں داخل کر لیا اور تجھے اس سے محفوظ کر دیا۔''

اس واقعے کے بعد دردِ قولنج کبھی کبھی آپ کو پریشان کرنے لگا۔ میر عبداللہ آپ کے مرید ہی نہیں، دوست بھی تھے اور یہی وہ شخص تھے جس نے برہان بخاری کی بیماری کی اطلاع آپ کو دی تھی۔

آپ ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ منزل پر پہنچنے کے بعد میر عبداللہ بخار میں مبتلا ہو گئے اور بخار اتنا تیز چڑھا کہ ان کی واپسی محال ہو گئی، انہوں نے شیخ سے کہہ دیا۔ ''حضرت آپ میری وجہ سے کیوں رکیں، تشریف لے جائیں میں بعد میں آجاؤں گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں ایسا نہیں ہوگا، تجھ کو ہمارے ساتھ ہی چلنا ہوگا۔''

میر عبداللہ نے عاجزی سے کہا۔ ''حضرت! بخار اتنا تیز ہے کہ اگر میں چلا تو چکرا کے ڈھیر ہو جاؤں گا۔''

کسی دوسرے مرید نے کہا۔ ''میں ان کے لیے سواری کا انتظام کرتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''سواری کی کیا ضرورت ہے۔ ہم سب کے پاس سواری تو موجود ہے یہ اگر پیدل چلیں تو زیادہ بہتر ہے۔''

میر عبداللہ نے عرض کیا۔ ''میں پیدل کس طرح چلوں گا مجھ سے تو گھوڑے کی پشت پر بیٹھا بھی نہیں جائے گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''لیکن انہیں سواری ملے گی کہاں؟ انہیں تو پیدل ہی چلنا پڑے گا۔''

مریدوں نے عرض کیا۔ ''ہم کوشش کرتے ہیں، شاید مل جائے۔''

وہ لوگ کافی دیر تک سواری کے لیے سرگرداں رہے لیکن ناکامی رہی، آخر واپس آکر عرض کیا۔ ''سواری تو نہیں ملی۔ اب جیسا آپ فرمائیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''انہیں پیدل چلاؤ!''

میر عبداللہ نے خوشامد کی۔ ''حضرت! مجھے یہیں رہنے دیں، بعد میں آجاؤں گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں ہمارے ساتھ ہی چلنا ہوگا۔'' آپ کے اصرار نے سب کو لاجواب اور خاموش کر دیا۔

آپ نے میر عبداللہ سے فرمایا۔ ''عبداللہ! آج میں تجھے ایک مزے کا تماشا دکھاؤں گا۔ بخار نے تجھے کمزور اور بے حال کر دیا ہے، تیرا تو کھڑا ہونا بھی مشکل ہے اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھ کو اپنے گھوڑے کے آگے رکھوں تاکہ میرا گھوڑا تیری رہنمائی میں اپنا سفر کرے۔''

میر عبداللہ نے حیرت سے عرض کیا۔ ''میں آپ کے گھوڑے کے آگے پیدل چلوں! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟''

آپ کی یہ بات بعض دوسرے مریدوں نے بھی سنی، ایک نے آہستہ سے کہا۔ ''آج شیخ یہ باتیں کیسی کر رہے ہیں؟ کیا یہ مریض کو ہلاک کر دینا چاہتے ہیں؟''

آپ نے بہ آواز بلند فرمایا۔ ''حکم ربی یہی ہے اور اسی میں اس کے مرض کی شفا ہے۔''

میر عبداللہ نے عرض کیا۔ ''شیخ کا حکم سر آنکھوں پر، میں پیدل چلنے پر تیار ہوں۔''

میر عبداللہ نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے، نقاہت نے انہیں بالکل بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔

آپ نے میر عبداللہ کو سہارا دیا۔ اور بہ مشکل اپنے گھوڑے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ پھر اپنے گھوڑے کی طرف واپس آتے ہوئے فرمایا۔

''عبداللہ، میں جیسے ہی کہوں چلو، تم سب چل پڑنا اور میر عبداللہ تمہارا قدم سب سے پہلے اٹھے گا۔''

آپ اپنے گھوڑے پر بیٹھ چکے...... تو میر عبداللہ کو حکم دیا۔ ''ہاں عبداللہ! اب کوچ ہونا چاہیے۔''

میر عبداللہ نے اپنے پاؤں اٹھائے تو ابھی انہوں نے چلنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی کہ پاؤں خود بخود اٹھنے لگے۔ عبداللہ نے پہلے ہی مرحلے پر تیز تیز چلنے کا معیار قائم کر دیا۔ مریدوں کو حیرت ہو رہی تھی کہ جو شخص بیماری اور بخار کی شدت کی وجہ سے کھڑے ہونے کی طاقت بھی نہ رکھتا تھا، وہ گھوڑے کے آگے آگے چل کس طرح رہا تھا۔

کسی مرید نے پوچھا۔ ''عبداللہ! کیا حال ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟''

میر عبداللہ نے جواب دیا۔ ''کمزوری رخصت ہو گئی، بخار بھی جاتا رہا، اب میں خود کو توانا محسوس کر رہا ہوں۔''

میر عبداللہ نے چلنے میں گھوڑے کی رفتار کو پیچھے چھوڑ دیا۔ جب یہ لوگ منزل مقصود پر پہنچے تو میر عبداللہ بالکل صحت یاب ہو چکے تھے۔ شیخ نے مریدوں کو متحیر دیکھ کر فرمایا۔ ''میں جانتا تھا کہ اس بخار کا علاج ہی یہ ہے کہ میر عبداللہ میرے گھوڑے کے آگے آگے پیدل چلے۔''

لیکن مریدوں کو اس پر یقین نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں شیخ محمد کی دعائیں شامل ہیں۔

آپ نے مریدوں کو منع کیا کہ وہ ذکر و فکر میں مشغول ہونے والے ہیں کسی کو حجرے میں نہ آنے دیا جائے۔ لیکن آپ نے جیسے ہی حجرے کا دروازہ اندر سے بند کیا، ایک شخص دروازے سے [illegible] کھڑا ہو گیا۔ اور مریدوں سے کہا۔ ''شیخ سے کہو، تمہارے چچا کا بیٹا عبدالوہاب تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

مریدوں نے جواب دیا۔ ''لیکن ہم اس وقت اندر نہیں جا سکتے، مجبوری ہے!''

چچا کا بیٹا عبدالوہاب مشتعل ہو گیا۔ ''کیا مجبوری ہے، میں گھر سے بے گھر ہوا جا رہا ہوں اور تم لوگ مجھے میرے بھائی سے ملنے نہیں دیتے۔''

یہ آوازیں اندر بھی پہنچ گئیں۔ آپ نے حجرے کا در کھول دیا۔ پوچھا۔ ''کیا بات ہے عبدالوہاب؟ کیسے آنا ہوا؟''
عبدالوہاب فوراً حجرے میں داخل ہو گیا اور گڑگڑا کر عرض کیا۔ ''بھائی صاحب! میں برباد ہو گیا، تباہ ہو گیا۔ میں کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''ہوا کیا، یہ تو بتاؤ، کس نے برباد کر دیا، کیونکر تباہ ہو گئے؟''

عبدالوہاب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، کہا۔ ''بھائی صاحب! میں جس جگہ رہتا ہوں، اس کا رئیس رستم میری عدم موجودگی ... میں میرا مکان گرا دینا چاہتا ہے، میں اتنی جلدی گھر پہنچ نہیں سکتا۔ آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟''

آپ نے فرمایا ''واقعی یہ تو بڑی نامناسب بات ہے، رستم میرے بھائی کا مکان گرا دے، یہ نہیں ہو سکتا۔ جنگ و جدل تو ہم فقراء کا شیوہ نہیں البتہ میں دیکھتا ہوں کہ وہ جائے موقع پر کس طرح پہنچتا ہے، میں اسے پہنچنے ہی نہیں دوں گا۔''

ادھر آپ یہ فرما یا رہے تھے، دوسری طرف رئیس رستم کے لشکر میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور وہ لوگ آپس میں ہی لڑ پڑے، اس علاقے کے عامل کا بھائی اس تنازعے میں مارا گیا اور مواخذے میں رستم گرفتار کر لیا گیا اور بالآخر تہ خانے میں ہی جاں بحق ہوا۔

اپنے آخری دنوں میں فرمایا۔ ''لوگو، مجھے خدا نے اتنا زیادہ کمال عطا فرمایا ہے کہ میں اگر چاہوں تو میں یہاں سے ہلے بغیر متشکل ہو کر دنیا کے دوسرے کنارے پہنچ جاؤں۔''

پاس ہی ایک عمر رسیدہ خاتون بیٹھی تھی۔ آپؒ کی بات سن کر بولی۔ ''شیخ صاحبؒ! اس وقت جو چاہو کہہ لو لیکن ان باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، مرنے کے بعد کوئی کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔ اگر میں مر گئی تو آپ میری مدد ضرور کیجیے اور اگر مجھ سے پہلے آپ چلے گئے تو متشکل ہو کر آیئے گا اور میں دیکھوں گی کہ میں نے آپ کو پہچانا بھی یا نہیں۔''

اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔ آپ کا 8 جمادی الاول 1225ھ میں وصال ہو گیا۔ عورت کو آپ کا وعدہ یاد تھا۔ اس نے آپ کا انتظار شروع کر دیا۔ لیکن آپ نہیں پہنچے۔ اسی انتظار میں وہ بیمار پڑ گئی، تپ لرزہ نے اس کی حالت خراب کر دی۔

رات ہوئی تو اس تنہا عورت کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اس کی تیمارداری کون کرے گا۔ اس دن گھر میں کوئی دیا جلانے والا بھی نہ تھا، عورت کراہ رہی تھی اور اندھیرے گھر میں آنکھیں کھولے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رات کو پچھلے پہر اس کو پیاس محسوس ہوئی لیکن اس میں اٹھنے کی طاقت ہی نہیں تھی۔ ابھی پیاس تو تنگ کر ہی رہی تھی کہ سردی لگنے لگی۔ لحاف پائنتی پڑا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اسے اوڑھ ہی لیتی۔ آخر نیم غنودگی میں اس نے دیکھا، کوئی شخص دیا روشن کر رہا تھا۔ جب دیا جل گیا اور گھر میں روشنی ہو گئی تو اس نے اس شخص کو پہچان لیا۔ یہ شیخ محمدؒ تھے۔ دیا جلانے کے بعد وہ ایک پیالے میں پانی لے آئے اور عورت کو پلایا۔ اس کے بعد لحاف کو جسم پر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد جب عورت کی حالت سنبھلی تو اس نے لحاف الٹ دیا اور شیخ محمدؒ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اب وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

شیخ محمدؒ کے انتقال کے بعد شاہ ولی اللہؒ دہلوی کے والد نے ان کے مزار پر حاضری دی۔ اس وقت ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی تھے۔ شاہ عبدالرحیمؒ والد شاہ ولی اللہؒ نے ساتھیوں کو حکم دیا کہ ذکر بالجہر کیا جائے۔ حکم کی دیر تھی کہ زور زور سے ذکر کیا جانے لگا۔ شاہ عبدالرحیم خود بھی اس میں شامل تھے۔

ذکر بالجہر سے فارغ ہونے کے بعد شاہ صاحب نے حاضرین سے فرمایا۔ ''حاضرین! ابھی ابھی میں نے کچھ دیکھا ہے، اگر اس کو ظاہر کر دوں تو تم سب حیران ہو جاؤ گے۔''

حاضرین میں سے چند نے خواہش ظاہر کی کہ آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اس کو ظاہر ضرور فرمائیں۔

شاہ عبدالرحیمؒ نے فرمایا۔ ''لوگو! ابھی ابھی میں نے شیخ کی روح کو اپنے سامنے دیکھا، وہ مجھ سے فرما رہے تھے کہ۔ ''عبدالرحیمؒ! میں چاہتا تھا کہ اپنے جسم سمیت آپ کے پاس آؤں، کیونکہ خدا نے اس وقت بھی اتنا اختیار دے رکھا ہے لیکن یہ بات مصلحت کے خلاف ہے اس لیے میں نہیں آیا۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے مزید فرمایا۔ ''اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حیات اولیاء ایک حقیقت ہے۔''

یہ شیخ محمد بجن کا ذکر کیا گیا، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے جدِ مادری تھے، وہی شاہ ولی اللہ دہلوی جن سے آج دنیائے اسلام بہت اچھی طرح واقف ہے اور جنہیں امام وقت کا خطاب عطا ہوا۔

ماخذات

الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ روضتہ الریاحین، ابی محمد عبداللہ۔ سفینتہ الاولیاء، شہزادہ دارا شکوہ۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار

اگر غور کیا جائے تو ظلم حد سے بڑھ جانے کا مطلب ظالم کی رسّی کے لپٹنے کا آغاز ہوتا ہے یہ اور بات کہ اس کا دورانیہ کتنا طویل یا مختصر ہو اور دوسری اہم بات یہ کہ جب ظالم رفتہ رفتہ ہر رشتے کی قید سے آزاد ہوتا جاتا ہے تب ہی قدرت اسے انتقام کا نشانہ بناتی ہے۔ انسان چاہے کتنی ہی کشمکش کا شکار رہے، قدرت اگر چاہے تو انصاف کے تقاضے اتنی ہی سفاکی سے پورے کرتی ہے جتنا ظالم ظلم ڈھاتا ہے۔

انصاف

ثمر عباس
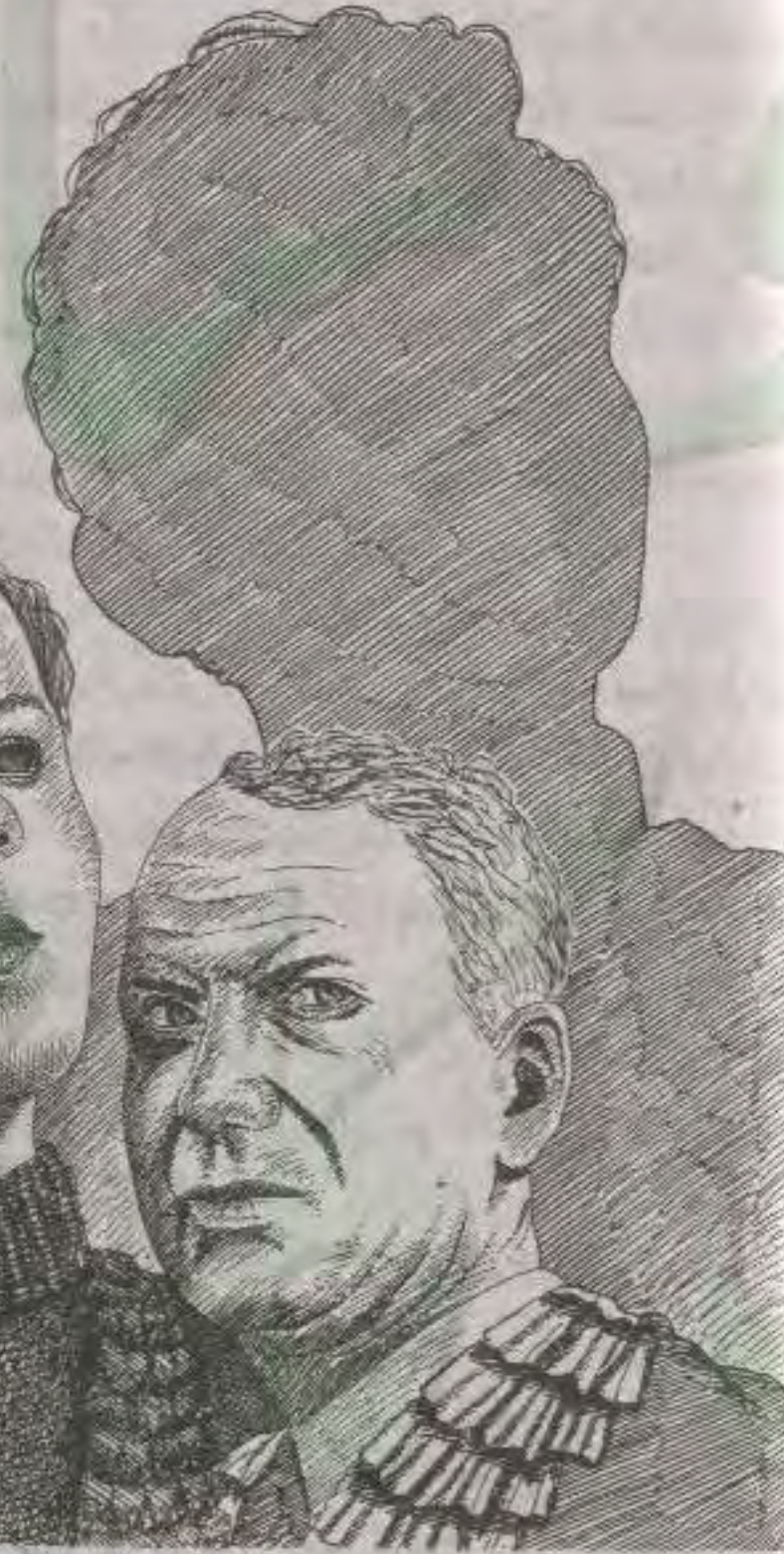
اپنے ہاتھوں اپنا ہی خون بہانے والے ایک منصف کا انتقام

تین پولیس کاروں اور میکلنز کی اکلوتی ایمرجنسی ریسپانس وہیکل کی نیلی اور سرخ فلیش کرتی ہوئی لائٹوں نے تنگ رہائشی سڑک کے اندھیرے کو رنگ برنگی نیون ڈبلے میں تبدیل کر دیا تھا۔ اطراف کے گھروں کی کھڑکیوں سے تیز روشنی چھن کر آ رہی تھی اور ایسی ہی چمک اس چھوٹے سے مجمع کی آنکھوں اور چہروں پر تھی جو لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔
لیونارڈو نے اس چمک دمک کی جانب سے اپنی

نگاہیں پھیر لیں۔ اس نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ ایمرجنسی لائٹس جیسی گردشی روشنیوں کے اثرات مرگی کے دورے کا سبب بن سکتے ہیں۔

ایک ہلچل مچادینے والے سائرن اور پاورفل ڈیزل انجن کی زبردست گڑگڑاہٹ اس بات کا اعلان تھی کہ اس چھوٹے سے قصبے کی دوسری رسپانس وہیکل بھی موقع پر آن پہنچی ہے جو کہ دو ہزار گیلن کا ایک ٹینکر تھا۔ اس کے رکتے ہی ائر بریکس کی پھنکار سی فضا میں بکھر گئی۔ اس شور نے مجمع کی چہ میگوئیوں اور چنگاریاں چٹخنے کی آوازوں کو دبا دیا تھا جو اس بھڑکتی آگ کے شعلوں سے بلند ہو رہی تھیں جو سڑک پر الٹی ہوئی پولیس کار میں لگی ہوئی تھی۔ اس کار نے بجلی کے لکڑی کے ایک کھمبے کو بھی توڑ دیا تھا جو سڑک کے کنارے نصب تھا۔

پیلے رنگ کے سیفٹی جیکٹوں میں ملبوس فائر کے عملے کو اپنے پانی کے پائپ کھول کر بچھانے اور انہیں قریب ترین ہائیڈرینٹ سے منسلک کرنے میں صرف چند منٹ لگے۔

جلتی ہوئی پولیس کار کے شعلوں پر پانی کی بوچھاڑ پڑتے ہی متجسس تماشائی جائے حادثہ کی جانب کھسکنا شروع ہو گئے۔ جو دو پولیس مین جائے حادثہ کا احاطہ کرنے کے لیے سیکیورٹی ٹیپ تان رہے تھے انہوں نے اپنی کوششیں تیز کر دیں تاکہ مجمع زیادہ قریب نہ آسکے۔

”یقیناً یہ بلی رے تھر مین ہے۔“ کسی نے چیخ کر کہا۔

”اس کے زندہ بچ رہنے کی بس امید ہی کی جاسکتی ہے۔“ مجمع کے عقب سے کسی نے جواب دیا۔

لیونارڈو نے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیوں سے بچاؤ کی خاطر اپنی آنکھوں پر ایک ہاتھ سے ڈھال سی بناتے ہوئے اپنے اطراف کے لوگوں کے چہروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اسے اس شخص کی تلاش تھی جو اس موقع کا عینی گواہ ہو۔ ایک ایسا گواہ جس کا چناؤ اس جیسا تجربہ کار رپورٹر ہمیشہ کر لیا کرتا تھا اور گواہ ایسا فرد ہوتا تھا جو حادثے کی مکمل روداد من وعن بیان کر سکتا تھا۔

اس وقت بھی اسے ایسے ہی عینی گواہ کی تلاش تھی لیکن اسے ایسا کوئی چہرہ اپنے آس پاس چہروں کے سمندر میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ تقریباً مایوس ہو چکا تھا اور اس موٹی سی عورت سے سوال کرنے ہی جا رہا تھا جو ایک بچے کو اپنی کمر پر لٹکائے ہلکے ہلکے جھکولے دے رہی تھی کہ اس کی نظریں مخالف سمت میں سڑک پار ایک تنہا شخص پر جا پڑیں جو لکڑی کے بنے ہوئے ایک خستہ حال گھر کے چبوترے نما دالان پر بیٹھا ہوا تھا۔

لیونارڈو نے مجمع سے نکل کر سڑک پار کی اور فٹ پاتھ پر چڑھ گیا پھر رکا اور پلٹ کر اس جگہ سے جائے حادثہ کا نظارہ کرنے لگا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اگر وہ شخص حادثہ سے قبل اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا تو اس نے حادثے کا پورا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ اس سے بہتر حادثے کا عینی گواہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

لیونارڈو پلٹ کر بیرونی لان کی خشک جھاڑ جھنکاڑ گھاس پر چلتا ہوا ان سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر رک گیا جو برآمدے تک اوپر جا رہی تھیں۔

برآمدے میں بیٹھا ہوا شخص اتنا عمر رسیدہ نہیں تھا جیسا کہ فاصلے سے دکھائی دیا تھا۔ اس کے سر کے رہے سہے بالوں کی رنگت چاندی کی سی تھی۔ لیونارڈو کے اندازے کے مطابق اس شخص کی عمر پینسٹھ اور ستر برس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس گرم رات کی نسبت سے اس شخص نے کوئی قمیص نہیں پہن رکھی تھی۔ صرف ایک میلا کچیلا سا بنیان اوپری بدن کو نیم ڈھانپے ہوئے تھا۔ نیچے ایک بگی نما سیاہ رنگ کی ٹراؤزر تھی۔

اس شخص کا چہرہ مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ اس وہیل چیئر تک محدود ہوتا تھا جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا لیکن ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک استقلال بھی عیاں تھا۔ لیونارڈو کو یہی امید تھی کہ اس شخص کی روزانہ رات کو یہی عادت ہوگی کہ یہاں برآمدے میں بیٹھ کر باہر کی دنیا کی رونقوں کا نظارہ کر سکے۔

”گڈ ایوننگ سر! میرا نام لیونارڈو ہے۔ میں میکلن لیڈر اخبار کا رپورٹر ہوں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

اس شخص نے اپنی ٹھوڑی کے بڑھے ہوئے شیو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی سرخ عینک کے شیشوں کے پیچھے جہاندیدہ آنکھوں سے بہ غور لیونارڈو کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ”ویل، میرا خیال ہے میں بتا سکتا ہوں لیکن جو کچھ ہوا ہے یہ اس کی حقیقی عکاسی نہیں ہوگی، اگر میں نے تمہیں صرف اس حادثے کے بارے میں بتانے تک اکتفا کیا۔“

لیونارڈو نے اپنی نوٹ بک اور پین جیب سے نکال لیے تھے لیکن اب اسے گمان ہوا کہ انٹرویو کے لیے اس کا یہ انتخاب درست نہیں ہے۔ اس لیے اس نے اپنی نوٹ بک اور پین واپس جیب میں رکھ لیے۔

تب اس بوڑھے نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اپنا

کھردرا سا ہاتھ لیونارڈو کی جانب لہراتے ہوئے بولا۔ ”مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، میں نے یہ حادثہ پورا دیکھا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جو انجام تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے اس کی ایک مکمل داستان ہے۔ اگر تم میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو۔“

لیونارڈو کو واقعی بوڑھے کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن اس کا تجسس مزید بڑھ گیا تھا۔ وہ بے ساختہ بول پڑا۔ ”وہ کیسے؟“

”اوپر آجاؤ اور میرے پاس بیٹھ جاؤ، بیٹے۔ اس طرح ہم وہ سب کچھ دیکھتے رہیں گے جو سامنے ہو رہا ہے اور اس دوران میں تمہیں کلارنس اور بلی رے کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دوں گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ لوگوں کو سب کچھ پتا چل جائے۔“

لیونارڈو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر لکڑی کے بنے ہوئے برآمدے میں آگیا اور موسموں کے اثر سے بدرنگ بید کی بنی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے اپنی نوٹ بک اور پین دوبارہ باہر نکال لیے۔ اس مرتبہ وہ پُرامید تھا اور اسے یہ عجیب سا احساس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک بڑا ہاتھ مارنے جا رہا ہے اور اس خبر کی اشاعت میں حریف پرچوں سے بازی لے جائے گا۔

”ہمیں ماضی سے ابتدا کرنی ہوگی۔“ بوڑھے نے کہا۔ سڑک کی تیز روشنیوں میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور اس کے چہرے کی سلوٹیں اور خدوخال نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔

لیونارڈو نے ایک اچٹتی نگاہ جائے حادثہ کی جانب ڈالی۔ جلتی ہوئی کار کے شعلوں کی شدت میں کمی آگئی تھی اور جلتے ہوئے گوشت کی کراہت آمیز بو علاقے میں پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ تماشائیوں کی ایک بڑی تعداد نے اب پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا اور بیشتر نے اپنی ناک اور منہ کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپا ہوا تھا۔

لیونارڈو ایک تجربہ کار رپورٹر تھا اور اس قسم کے ماحول کا عادی تھا۔ اس نے نظریں جماتے ہوئے اپنے مقابل بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اگر کراہت آمیز بو کا اثر اس پر بھی ہو رہا تھا تو اس نے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کا عالم تھا اور وہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

”ہمیں واپس اس دور میں جانا ہوگا جب بلی رے کی عمر آٹھ یا نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ کلارنس نے اس لڑکے میں اس وقت بھی بدی کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اس وقت بھی

آلو

3 چور پولیس سے چھپ کے 3 بوریوں میں گھس گئے۔

پولیس والا آیا اس نے پہلی بوری کو لات ماری۔ اندر سے آواز آئی ”بھوں بھوں“۔ پولیس والا بولا۔ ”اندر کتا ہے۔“

دوسری بوری کو لات ماری اندر سے آواز آئی۔ ”میاؤں، میاؤں“۔ پولیس والا بولا۔ ”اندر بلی ہے۔“

تیسری بوری کو لات ماری۔ ”مگر کوئی آواز نہیں آئی۔“

25، 20 لاتیں ماریں تو اندر سے تیسرا چلایا۔ ”اے ظالم کے بچے آلو ہوں آلو۔“

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

اپنے برآمدے میں بیٹھا بلی رے اور دوسرے بچوں کو اسکول سے آتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ بلی رے کسی کام کا نہیں تھا وہ کنچے چراتا تھا، ہر ایک پر پتھر پھینکتا تھا اور چھوٹوں سے مار پیٹ کیا کرتا تھا اور لڑکیوں کو بھی نہیں بخشتا تھا۔“

لیونارڈو یہ سب کچھ اپنی نوٹ بک میں شارٹ ہینڈ میں لکھتا جا رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ یہ تفصیل جلد ختم ہو جائے گی تاکہ وہ فائر چیف اور پولیس کے بیانات بھی بروقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

”بے شک کلارنس کو ہمیشہ یہی توقع تھی کہ بڑا ہو کر بلی رے بچپن کی بری عادتوں کو پیچھے چھوڑ دے گا اور سدھر جائے گا۔ نوعمر لڑکے بڑے بلند حوصلہ ہوتے ہیں لیکن بلی رے میں کچھ ایسی بات تھی کہ برائیاں اس کے اندر رچتی جا رہی تھیں۔ جب وہ بڑا ہوا تو اور بھی کمینہ ہو گیا۔ اب وہ مار پیٹ میں جبر و تشدد سے کام لینے لگا تھا۔ اس نے اپنے لڑکوں کا ایک گینگ بنا لیا تھا۔ کلارنس کو بس یہی معلوم تھا کہ یہ لڑکا مشکلات میں گھرنے والا ہے۔“

پھر اس بوڑھے نے آگ بجھانے والے ٹرک کے عقب میں روڈ پار ایک خالی بلاک کی جانب اشارہ کیا۔ ”ایک روز ایک سیاہ فام فیملی وہاں آن بسی۔ وہ لوگ ہمیشہ کلارنس کو دیکھ کر ہاتھ لہرا دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ اس کے لیے چکن پاٹ پائی بھی بیک کر کے بھیجی۔ اچھے

نفیس لوگ تھے لیکن بلی رے نے فیصلہ کرلیا کہ وہ یہاں رہنے کے قابل نہیں ہیں۔ اس نے ان کا گھر جلا دیا۔ کلارنس کو علم تھا کہ اس کا ذمے دار بلی رے تھا۔ اس نے اپنے برآمدے سے اسے یہ سب کچھ کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ وہیں بیٹھا ہوا تھا جہاں ہر رات بیٹھا کرتا تھا۔ اس کا الزام اس بے چارے شخص کے سر منڈھ دیا گیا تھا جو دو بلاک دور رہتا تھا لیکن کبھی کسی نے کلارنس سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ سب کچھ کس طرح ہوا تھا اور کلارنس کو محسوس ہوا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں کرسکتا لہٰذا بلی رے اس الزام سے صاف بچ نکلا۔" یہ کہہ کر بوڑھا سر ہلانے لگا۔ "وہ ایک مکمل برائی تھا جیسا کہ میں نے کہا سرتاپا بدی ہی بدی۔"

"ان سب باتوں کا اس حادثے سے کیا تعلق ہے؟" لیونارڈو نے پوچھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ یہ کہانی کس رخ پر جارہی ہے۔

تب بوڑھے نے اسے گھور کر دیکھا جیسے لیونارڈو کی دخل اندازی پر خفا ہوگیا ہو۔ "جیسا کہ میں نے کہا یہ سب کچھ کسی کے وہم و گمان سے بھی زیادہ ہے۔"

لیونارڈو نے سر ہلا دیا اور اپنی توجہ بوڑھے کی داستان سننے پر مرکوز کردی۔ اگر بوڑھا جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سچ تھا تو پھر بلی رے کا ماضی نیک آدمی کا ہرگز نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس بات کو کس طرح لکھ پائے گا۔

بوڑھے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بے شک کلارنس اس سیاہ فام فیملی کے بارے میں خاصا اپ سیٹ ہوا تھا۔ وہ لوگ یہ علاقہ چھوڑ کر چلے گئے لیکن کلارنس انہیں نہیں بھول سکا۔ ادھر بلی رے بد سے بدتر اور حقیر سے حقیر تر ہوتا چلا گیا۔ اس نے اپنے لیے پرانی سیاہ شیورلیٹ کاروں میں سے ایک کار خرید لی۔ اس نے اس کار کے انجن کی طاقت بڑھالی، اس کے سامنے کے حصے پر سرخ رنگ کے بڑے شعلے پینٹ کروالیے۔ پہیوں پر کروم کے ہب کیپس چڑھادیے اور ایسی ہی دیگر فٹنگس کروالیں۔ اب وہ کار بھی بلی رے کے مانند گھٹیا اور کمینی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس دوران بلی رے نے اپنے بالوں کا اسٹائل بھی تبدیل کرلیا۔ اب اس کے تیل میں بھیگے ہوئے بال پیچھے کو جمے رہتے تھے اور وہ ہر وقت چمڑے کی جیکٹ پہننے لگا تھا۔ اس نے اپنی شیورلیٹ کار سڑکوں پر فضول ادھر سے ادھر دوڑانا شروع کردی۔ ہر وقت کسی نہ کسی کو خوف زدہ کرنا اس کا مشغلہ بن گیا تھا۔ کلارنس کو کبھی انجن کا شور سنائی دیتا تو کبھی لیٹر بکس اور کوڑے دان روندنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ بلی رے یہ سب کچھ تفریحاً کیا کرتا تھا۔" بوڑھے نے یہ کہہ کر سانس لینے کے لیے قدرے توقف کیا۔

پھر وہ دوبارہ گویا ہوا۔ "پھر اس کی حرکتیں مزید بدتر ہونے لگیں چند سال قبل بلی رے نے خود کو پولیس میں بھرتی کروالیا پھر تو اسے روکنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اب وہ لوگوں کو اپنی ربر کی سیاہ چھڑی سے پیٹنے لگا تھا۔ ایلموز کے ڈائنر سے مفت کافی اور کھانے کے تقاضے کرتا تھا اور اس طرح کے وہ تمام کام جن میں وہ ملوث رہتا تھا، اب ان کاموں کو اس نے اپنی عادت بنالیا تھا لیکن ساتھ ہی بلی رے اپنی ان کارروائیوں کا کوئی نشان، کوئی سراغ نہیں چھوڑتا تھا اور کوئی بھی اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں کرسکتا تھا اور نہ کسی کی ہمت ہوتی تھی کہ اس کی ان حرکتوں کا کوئی ثبوت پیش کردے۔ کلارنس ان تمام باتوں سے عاجز آگیا تھا لیکن وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟"

لیونارڈو نے ہمدردی سے سر ہلا دیا، وہ پین سنبھالے بوڑھے کے مزید آگے بولنے کا انتظار کررہا تھا۔

"پھر معاملہ اس وقت نازک مرحلے میں داخل ہوگیا جب سیرینا ایڈمز اس محلے میں آگئی۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ اس کا شوہر جنوب میں کہیں کسی حادثے میں مارا گیا تھا لہٰذا وہ اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کرنے کی خاطر اپنے بچے کو لے کر یہاں آگئی تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی اور سب ہی اسے پسند کرنے لگے تھے۔ وہ ہم بوڑھوں کی مدد بھی کیا کرتی تھی۔ کسی کا کھانا بنادیتی تو کسی کے پیغامات پہنچانے ہوتے تو پہنچا دیا کرتی تھی اور ایسے ہی دوسرے کئی کاموں میں ہاتھ بٹانے سے گریز نہیں کرتی تھی۔ کلارنس اسے بیٹی کے مانند سمجھتا تھا۔ وہ اس لڑکی اور اس کے بچے کا گرویدہ ہوچکا تھا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات بچے کی بے بی سٹنگ بھی کرلیا کرتا تھا۔" بوڑھا یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

لیونارڈو اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

قدرے توقف کے بعد بوڑھے نے اپنی بات جاری رکھی۔ "پھر جب بلی رے نے اس دلکش نوجوان بیوہ کے بارے میں سنا تو اس کے گھر جانا شروع کردیا۔ یہ بات کلارنس کے لیے باعث پریشانی تھی اور پھر زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب سیرینا نے کلارنس پر بھروسا کرتے ہوئے بلی رے کے بارے میں اسے سب کچھ بتادیا کہ وہ کس طرح اس کے ساتھ مار پیٹ اور زور زبردستی کیا کرتا ہے اور اس کو اس کے بچے کے حوالے سے ڈراتا دھمکاتا رہتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟" بوڑھے نے لیونارڈو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی بات کا مدعا سمجھ گیا۔" لیونارڈو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ گو اس حادثے میں بلی رے مرچکا تھا لیکن اس کی یہ باتیں سن کر لیونارڈو کو اس سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔

"ویل، بلی رے ہر رات کلارنس کے گھر کے سامنے سے فراٹے بھرتا گزرا کرتا تھا۔ وہ اپنی بڑی سی پرانی پولیس کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر اس شان سے بیٹھا ہوتا تھا جیسے پوری دنیا اس کی ملکیت ہو۔ رعونت اس کے چہرے سے ٹپک رہی ہوتی تھی۔ کلارنس کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ کدھر جارہا ہے اور کیا ہونے والا ہے پھر ایک رات اس نے اپنے ذہن کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ اب وہ بے چاری سیرینا پر مزید کوئی ظلم نہیں ہونے دے گا کیونکہ سیرینا کے لیے بلی رے کو برداشت کرنا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ بلی رے ایک مکمل شیطان ہوچکا تھا۔ جی ہاں اور کلارنس نے اس معاملے میں کچھ نہ کچھ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔"

وہ بوڑھا شخص اب قدرے تن کر بیٹھ گیا اور لیونارڈو کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "جنگ کے دنوں میں کلارنس ایک ماہر نشانہ باز رہ چکا تھا۔ میں نے تمہیں اس بارے میں نہیں بتایا، واقعی؟"

لیونارڈو نے نفی میں سر ہلا دیا اور حادثے کے منظر پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالنے کا موقع ملنے پر نظریں اس جانب اٹھادیں۔

آگ بجھانے والا عملہ اپنے پانی پھینکنے والے پائپ لپیٹ رہا تھا اور دیگر عملہ پانی کو خشک کرنے کے لیے پوچا لگا رہا تھا۔ رسپانس ٹیم کے ممبر الٹی ہوئی پولیس کار کا دروازہ کھولنے میں مصروف تھے۔

لیونارڈو سوچ رہا تھا کہ بلی رے تھرمین کا کیا بچا ہوگا پھر اس نے اپنی توجہ دوبارہ بوڑھے پر مرکوز کردی۔

بوڑھے نے اب پھر اپنی وہیل چیئر کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے تاثرات تھے۔

"ویل، کلارنس جنگ کے دوران کافی تمغے جیت چکا تھا۔ اس جیسا ماہر نشانے باز ان کے پاس کبھی نہیں رہا تھا۔ وہ اب بھی تھری ناٹ تھری رائفل اپنے پاس تیار رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کی باقاعدگی سے صفائی کیا کرتا تھا اور اس کو تیل بھی دیتا رہتا تھا۔ اس رات اس نے اپنی وہ رائفل نکال لی اور اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر بلی رے کے آنے کا انتظار کرنے لگا جو فراٹے بھرتا ہوا روزانہ وہاں سے گزرتا تھا۔ جلد ہی اسے بلی رے کی کار کی آواز سنائی دی۔ ہمیشہ کی طرح اسی مخصوص وقت پر وہ وہاں سامنے سے گزرنے والا تھا۔ تب کلارنس نے اس تیز رفتار پولیس کار کی پیٹرول کی ٹنکی کو اپنا ہدف بنالیا۔"

یہ سنتے ہی لیونارڈو کا قلم چلتے چلتے رک گیا اور وہ ناقابل یقین نظروں سے بوڑھے کی صورت تکنے لگا۔ "کیا آپ مجھے یہ بتا رہے ہیں کہ کلارنس نے بلی رے کی پولیس کار کی پیٹرول کی ٹنکی کو نشانہ بنا کر گولی چلائی تھی اور یہ کوئی حادثہ نہیں تھا؟"

بوڑھے نے شانے اچکا دیے۔ "تم جاننا چاہتے تھے کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔"

لیونارڈو نے حیرت سے سر ہلا دیا۔ "میں اس کلارنس کو کہاں تلاش کرسکتا ہوں، میں اس کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔"

"وہ تمہارے سامنے موجود ہے، بیٹے۔"

لیونارڈو نے نظریں اٹھائیں اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ "آپ......آپ کلارنس ہیں؟" بوڑھے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو آپ نے ابھی ابھی خود کو مجرم ٹھہرا دیا ہے؟"... لیونارڈو نے کہا۔

بوڑھا یہ سن کر مسکرا دیا۔ "وہ میرے ساتھ کیا کریں گے؟ آخری درجے کے کینسر میں مبتلا ایک اپاہج شخص کو لاک اپ میں ڈال دیں گے؟ میرے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بیٹے۔ میں نے وہی کچھ کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔" اس نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ سب کچھ برسوں پہلے کرلینا چاہیے تھا۔"

لیونارڈو نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اپنی نظریں اپنی نوٹ بک پر جمادیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس انٹرویو کے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتادے؟ "آپ کا پورا نام کیا ہے پلیز؟"

"کلارنس تھرمین۔" بوڑھے نے نرمی سے جواب دیا۔

لیونارڈو نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور بوڑھے کو پھٹی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "لیکن...... بلی رے؟"

کلارنس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس مرتبہ وہ بے حد بوڑھا اور غمزدہ لگ رہا تھا۔ "ہاں، بلی رے میرا اکلوتا بیٹا تھا۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

اسما قادری

ببول

کسی نے کیا خوب کہا ہے انسان روپ سے نہیں اپنے کرم یعنی نصیب سے کھاتا ہے... اگر حسن اتنا ہی دیرپا ہوتا تو وہ بھی یوں صحرا صحرا آبلہ پائی کا سفر نہ کررہی ہوتی۔ اس نے کبھی کسی کتاب میں پڑھا تھا، انا کے ہیں حصار میں... جلے ہیں اعتبار میں... اجڑ گئے بہار میں... بھلا یہ کیا حصول ہے، یہ زندگی ببول ہے۔ فریب تھا کہ تھا گماں... سمجھ رہے تھے سائباں... وہ پھر رہے ہیں بے مکاں... نہ حاصل نہ وصول ہے، یہ زندگی ببول ہے... اور اب وقت کی چال نے حرف بہ حرف زندگی کے اس مفہوم کو اس پر یوں منکشف کیا کہ وہ دلبری کا ہر انداز بھلا بیٹھی... ستاروں کے جھرمٹ میں اس کی قسمت کا ستارہ جانے کہاں ٹوٹ کر گرا کہ محبت ببول بن کر اس کے چکاچوند حسن کو گہنا گئی اور وہ اعتبار کی دھوپ میں تنہا جھلستی رہ گئی۔ وہ جو ہواؤں کی شوخی، آبشاروں کا ترنم اور مہکے گلابوں کا حصار بن کر کسی کے دامن میں گری تھی، کیا خبر تھی وہی چاہت ٹھوکر میں ڈھل جائے گی اور وہ منزل کی تلاش میں ڈگر ڈگر اپنے نقشِ پا چھوڑتے ہوئے اپنی شناخت بھی کھو بیٹھے گی... جسے اس نے اپنی زندگی کا سنگِ میل سمجھا اسی نے اسے رستے کا پتھر بنا دیا۔ ایک ایسی بھول نے اس کے ہر رشتے کو ببول بنا ڈالا تھا جس کی تلافی وہ اپنی موت کی صورت میں بھی نہ کرپائی اور آخری لمحات میں زیست کی سولی پر وہ ایک اور عزیز ترین ہستی کو تنہا چھوڑ گئی... شاید یہی اس کی زیست کا حاصل اور وصول تھا۔ بہت آخر میں اسے یہ بات سمجھ آئی تھی کہ... اجڑ گیا مِرا وطن... اِدھر اُدھر جلے بدن... خزاؤں میں ڈھلا چمن... دھواں ہے اور دھول ہے، یہ زندگی ببول ہے۔

سازشوں اور خواہشوں کے درمیان رشتوں اور رستوں کے انتخاب کی کشمکش میں مبتلا ایک مومی پیکر کا اضطراب

''اللہ اکبر۔'' دونوں ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے اس نے نماز کا آغاز کیا ہی تھا کہ ایک جھٹکا سا لگا اور وہ بہ مشکل خود کو لڑکھڑانے سے بچا کر اگلے رکن کی ادائیگی کرنے لگی۔ اس کے جسم کو لگنے والا یہ جھٹکا نماز کے لیے اوڑھی گئی چادر کے کونے کو زور سے پکڑ کر کھینچے جانے کے باعث لگا تھا اور وہ اپنے گلے پر چادر کھینچے جانے کی رگڑ قرات کے دوران بھی محسوس کرتی رہی تھی لیکن پھر تکلیف کے اس احساس پر دوسری تکلیف غالب آگئی۔ یہ تکلیف رکوع میں جاتے ہوئے اسے اپنی دائیں پنڈلی پر دھنسائے گئے باریک دانتوں کی وجہ سے برداشت کرنی پڑی تھی اور اس کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس کے لیے اپنی سسکی کو روکنا مشکل ہوگیا تھا لیکن بہرحال وہ نماز جاری رکھنا چاہتی تھی اس لیے رکوع ادا کر کے سیدھی کھڑی ہوگئی اور تسبیحات ادا کرنے کے بعد سجدے کے لیے بیٹھنے لگی۔ سجدے میں جاتے ہوئے اسے پیچھے سے اتنی زور سے دھکا دیا گیا کہ اس کی خواہش سے پہلے ہی سر زور سے زمین سے جا لگا شکر تھا کہ نیچے مخملیں جائے نماز بچھی ہوئی تھی۔ اس لیے چوٹ زیادہ شدید نہیں آئی پھر بھی لمحہ بھر کے لیے سر چکرا ضرور گیا تھا۔ چکر کی اس کیفیت سے سنبھل کر اس نے دورانِ سجدہ پڑھی جانے والی تسبیحات کو ادا کیا لیکن جب تیسری بار تسبیح پڑھ کر اٹھنا چاہا تو احساس ہوا کہ وہ اپنی کمر پر لدے وزن کی وجہ سے فی الحال سجدے سے اٹھنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اپنی کمر کے اس بوجھ سے آزاد ہونے کا دورانیہ اس نے بہت صبر سے تسبیحات پڑھتے ہوئے گزارا اور جیسے ہی بوجھ اٹھا سیدھی ہونے کے بعد دوسرے سجدے میں جانے کی تیاری کرنے لگی۔ حسب قاعدہ اس نے پہلے اپنے دونوں ہاتھ مقام سجدہ پر رکھے اور سر بھی رکھنا ہی چاہتی تھی کہ اپنے ہاتھوں پر قدرے گرم سے پانی کی دھار سی گرتی محسوس ہوئی۔ اس پانی کی حقیقت کو سمجھنے میں اسے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا اور حلق سے بے اختیار ایک چیخ نکلی۔ نماز کو مزید جاری

رکھنا ویسے ہی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس چیخ نے پہلے ہی کام تمام کر دیا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے بھیگ جانے والی جائے سجدہ کو دیکھنے لگی۔ وہ اس کے ڈھائی سالہ بیٹے کا پیشاب تھا جس نے اسے نماز ادا کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ پیشاب سے گیلی ہو جانے والی جائے نماز کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

''میرے رب...... اتنی نفرت...... اتنی نفرت کہ تو مجھے اپنے آگے سربسجود بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔'' خوف سے لرزتے ہوئے اپنے جسم کو سنبھالنے کی کوشش میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اسی پل اسے اپنے گالوں پر نرم سانس محسوس ہوا۔ اس نے اپنی پلکیں اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا۔ اس کی پوری نماز کو درہم برہم کر دینے کا ذمے دار آنکھوں میں بے پناہ معصومیت لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے یکدم ہی اس پر تاؤ آ گیا اور کچھ سوچے سمجھے بغیر پے در پے کئی تھپڑ اس کے پھول سے رخساروں پر دے مارے۔ ننھا بچہ اس زیادتی پر احتجاجاً چیخ چیخ کر رونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز نے اسے اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس دلایا۔ وہ کہاں قصوروار تھا وہ تو کب ابھی اس لائق ہوا تھا کہ اسے اس کی کسی غلطی پر سزا دی جا سکے۔ وہ تو شاید یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس سے کیا کچھ سرزد ہو چکا ہے بظاہر تو وہ اپنے بچپن کی ناسمجھی والی حرکات کرتا رہا تھا لیکن حقیقتاً اسے یہ احساس دلا گیا تھا کہ وہ اپنے رب کی کتنی ناپسندیدہ ہستی ہے کہ نماز کو خود سے ملاقات قرار دینے والا رب اسے اس حاضری کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

''معاف کر دے میرے مالک، معاف کر دے مجھ گناہ گار، خطا کار کو تیرے در سے ٹھکرا دی گئی تو یہ زندگی تو ہے ہی برباد، میں موت کے بعد بھی کہیں سکون نہیں پاؤں گی۔'' دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کو پکارتے ہوئے اس نے حلق پھاڑ کر روتے بچے کو اپنے قریب کیا اور اس کے طمانچوں سے سرخ ہو جانے والے رخساروں پر بوسے ثبت کرتے ہوئے اس تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگی جو اس کے جنونی تھپڑوں نے اس نازک جان کو پہنچائی تھی۔ عجیب ستم تھا کہ اپنے گناہوں کی نشانی اور اعمال کی سزا محسوس ہونے والے اس بچے سے محبت کرنے پر اس نے ہمیشہ خود کو مجبور پایا تھا اور تمام تر کوشش کے باوجود بھی اس سے نفرت نہیں کر سکی تھی اور اسے لگتا تھا کہ اس سے نفرت کیے بغیر وہ کبھی اپنے رب سے معافی حاصل نہیں کر سکے گی اور وہ اس جرم میں ہر بار اسے مایوس لوٹا دے گا کہ وہ اپنی نافرمانی کی نشانی کو سینے سے لگا کر اس سے معافی طلب کرتی ہے لیکن وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھی اور در توبہ کھلنے کی التجائیں کرتی تب بھی اس گناہ، جرم، غلطی یا جو کچھ بھی کہا جائے ...... اسے خود سے الگ کرنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔

☆☆☆

ٹرین دہلی ریلوے اسٹیشن پہنچ کر رکی تو ڈبے میں موجود پانچ افراد پر مشتمل خاندان کے چہروں کی چمک کچھ اور بھی بڑھ گئی اور وہ سب ہی اپنے اپنے حصے کا سامان اٹھا کر بڑے جوش اور پھرتی کے ساتھ اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے۔

''دیکھ کر بیٹا، ذرا احتیاط سے بھیڑ بھاڑ میں کہیں ادھر اُدھر مت ہو جانا، ہمارے ساتھ ہی رہنا۔'' خاندان کے سربراہ نجم الدین نے حسب معمول اپنے تینوں بچوں کو جو درحقیقت اب بچے نہیں نوجوان کہلائے جانے کے قابل تھے شفقت پدری کے ساتھ نصیحت کی۔

''جی اچھا ابا جان۔'' ان تینوں نے بھی حسب معمول فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔ پچھلے بائیس سالوں میں نجم الدین کوئی آٹھ بار دہلی آئے تھے پہلی بار تقریباً اکیس سال قبل جب ان کی بڑی بیٹی صباحت جسے سب پیار سے صبا پکارتے تھے محض دو ماہ کی تھی اور اس کی ماں آمنہ اسے اپنی آغوش میں لیے یوں اسٹیشن پر موجود اپنی والدہ کی بانہوں میں سما گئی تھیں کہ بچی کا وجود درمیان میں ہی کہیں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ دوسری بار انہیں تین سال کے وقفے سے دہلی آنے کا موقع ملا تھا اور اس وقت ان کے ساتھ صباحت کی بہن راحت کا اضافہ ہو گیا تھا۔ تیسری بار وہ دونوں ایک ننھے منے بھائی کو اپنے سنگ لیے نانا نانی کے آنگن میں اتری تھیں اور بس یہ کل تین بچے ہی نجم الدین اور آمنہ کی کل کائنات ٹھہرے تھے۔ جنہیں وہ وقفے وقفے سے ننھیالی رشتے داروں سے ملانے کے لیے بھارت یاترا کرتے رہے تھے۔ ان کا اس بار کا یہ چکر ذرا زیادہ عرصے بعد لگا تھا اور وہ لگ بھگ پانچ سال بعد دہلی آ سکے تھے لیکن دہلی اسٹیشن پر قدم رکھنے سے قبل نجم الدین کی طرف سے ملنے والی ہدایت نے انہیں پچھلے دورے کی یاد دلا دی تھی اور لب خود بخود ہی کھلکھلا اٹھے تھے۔ خوشی نے یوں بھی سفر کے آغاز سے ہی ان کے دلوں میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ ننھیال جاتے ہوئے تو وہ بچے بھی خوش ہوتے ہیں جنہیں ہفتہ پندرہ دن میں ننھیال یاترا کا موقع ملتا ہے پھر ان بچوں کی خوشی کیونکر دیدنی نہ ہوتی جو برسوں کے وقفے سے اپنے ننھیال آتے تھے اور نانا،

نانی، ماموں اور خالاؤں سمیت ہر ایک کو اپنے انتظار میں پلکیں فرشِ راہ کیے دیکھتے تھے۔ آمنہ اور نجم الدین کی شادی ان بہت سی شادیوں میں سے ایک تھی جو تقسیم کے بعد دو الگ الگ ملکوں میں بٹ جانے والے خاندانوں نے خود کو باہم جوڑے رکھنے کی کوشش میں انجام دی تھیں۔ نجم الدین کے سسر ان کے والد کے چچازاد بھائی ہوتے تھے جنہوں نے اپنے کزن کی خواہش پر اپنی پیاری بیٹی کو سرحد کے اس پار بھیجنے کے لیے سب کو راضی کر لیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک الگ الگ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آمنہ کو ایک باپ کے گھر سے دوسرے باپ کے آنگن میں ہی جانا ہے۔ ان کا یہ خیال اتنا غلط بھی ثابت نہیں ہوا تھا۔ آمنہ نے اپنے سسرال میں بے پناہ محبتیں، عزت و احترام پایا تھا لیکن اس سب کو پا کر بہرحال اپنے خونی رشتوں سے دور ہونے کی خلش تو ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ انہیں ہر ہر موقع پر ماں باپ اور بہن بھائی یاد آتے اور جب بھی ان سے ملنے کی سبیل پیدا ہوتی وہ پھول کی طرح کھل اٹھتیں۔ نجم الدین ان کی اس کیفیت کو سمجھتے تھے۔ اس بار بھی پانچ سال کا وقفہ اس وجہ سے آ گیا تھا کہ بچے سارے پڑھنے لکھنے والے تھے اور ہر ماہ موسم گرما کی تعطیلات میں ان میں سے کسی نہ کسی کی تعلیمی مصروفیت آڑے آ جاتی تھی۔ چنانچہ پانچ سالوں تک ان کا دہلی آنا ٹلتا رہا۔ اس عرصے میں ان کے میکے سے بھی کوئی مرد پاکستان نہیں آ سکا کہ بہنیں شادی شدہ اور اپنے گھروں میں مصروف تھیں اور دونوں بھائی گورنمنٹ ملازم ہونے کی وجہ سے پاکستان نہ آنے کے پابند تھے۔ والدین عمر کے اس حصے میں تھے کہ اب تنہا بغیر کسی سہارے کے سفر کے لیے نکلنے کی ہمت نہ پاتے تھے۔ البتہ دوریوں کی اس خلیج کو فون اور انٹرنیٹ نے کسی حد تک پاٹ رکھا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کی آوازیں بھی سن لیتے تھے اور ویب کیم پر دیکھ کر صورت آشنا بھی تھے۔ رابطوں کی آسانی نے اتنی سہولت پیدا کر دی تھی کہ دونوں طرف والوں کے پاس ایک دوسرے سے متعلق مکمل تفصیلات موجود تھیں لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک جگہ اکٹھے نہ ہونے کی جو خلش تھی وہ اپنی جگہ تھی۔ اسکرین پر اماں کی تصویر دیکھ کر آمنہ یہ تو کہہ سکتی تھیں کہ اماں آپ کتنی کمزور ہو گئی ہیں لیکن ماں کے کمزور سینے سے لگ کر جو دل کو تقویت ملتی ہے وہ کیسے حاصل ہوتی؟ دنیا میں نئے وارد ہونے والے بچوں کی شکل دیکھ کر ان کی دور سے بلائیں لینے اور انہیں گود میں لے کر بانہوں میں بھینچنے میں بڑا فرق تھا۔ ان کے لرزتے ہاتھوں کو اپنے سر پر محسوس کرنے کے لیے دل مچل مچل جاتا تھا۔ ان محفلوں کی یاد خوب خوب رلاتی تھی جب وہ سارے بہن بھائی بغیر اونگھے اور جماہی لیے پوری پوری رات گپوں میں گزار دیا کرتے تھے۔ تینوں بچوں کے ذہنوں پر پانچ سال قبل دہلی میں گزرے روز و شب کی بہت سی یادیں نقش تھیں اور اب وہ تینوں بچے بھی یہاں آنے پر بے حد خوشی محسوس کر رہے تھے حالانکہ واثق کے ذہن پر تو یہ فکر بھی سوار تھی کہ یہاں سے واپس جاتے ہی اسے اپنے میٹرک کے پرچے دینے ہیں اور اتنے نمبر حاصل کرنے ہیں کہ دونوں بہنوں کی نمایاں کامیابیوں کا سابقہ ریکارڈ ٹوٹ جائے اور واثق میاں اپنے اکلوتا اولاد نرینہ ہونے کے علاوہ سب سے زیادہ ذہین ثابت ہونے پر بھی اترا سکیں۔

''نانا جان۔'' معمول کی کارروائی سے نمٹ کر جب وہ لوگ اسٹیشن پر عزیز و اقارب کو لینے کے لیے آئے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں اپنے رشتے داروں کو تلاش کر رہے تھے، صباحت نے بلند آواز سے بولتے ہوئے ایک نحیف وجود کی طرف اشارہ کیا لیکن پھر خود ہی یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی کہ پچھلے کئی ماہ سے گھٹنوں میں درد کی شکایت کرنے والی اس کی والدہ ماجدہ ہجوم کو چیر کر بہت پہلے ہی اس نحیف وجود تک پہنچ چکی ہیں اور ان کے سینے سے لگی زور و شور سے رونے میں مصروف ہیں۔

''اتنی حیران نہ ہو بٹیا رانی اپنی ماں کی صحیح کیفیت تم اس وقت سمجھو گی جب باپ کا گھر چھوڑ کر سسرال جاؤ گی۔'' نجم الدین نے حیران بیٹی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک بڑی حقیقت سے آگاہ کیا اور بچوں کو لے کر خود بھی اس طرف بڑھ گئے جہاں ان کے سسر کے علاوہ دوسرے عزیز و اقارب بانہیں وا کیے منتظر کھڑے تھے۔

☆☆☆

اس نے سامنے لگے قدآدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھا اور دنگ رہ گئی۔

''کیا سچ مچ میں اتنی خوب صورت، اسمارٹ اور اسٹائلش ہوں کہ'' نظر نہ ٹھہرنے والے شعلہ جوالہ وجود کو دیکھ کر وہ بے ساختہ ہی خود سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ خوش شکل ہے اس بات کا تو اسے علم تھا۔ چھوٹی تھی تو اجنبی لوگ بھی ایک بار پیار ضرور کرتے تھے بعد میں اسکول اور کالج کی سہیلیوں نے بھی اس کے حسن کو خوب سراہا لیکن آج جو آئینہ اسے دکھا رہا تھا وہ کبھی اسے نظر نہیں آیا تھا۔ ہمیشہ ڈھیلے ڈھالے قمیص شلوار کے ساتھ بڑا سا دوپٹا اوڑھنے والی

کو بھلا کیسے اس بات کی خبر ہوسکتی تھی کہ اس کے جسمانی نشیب و فراز اتنے خوب صورت ہیں کہ کسی مجسمہ ساز کا شاہکار قرار دیے جاسکیں۔ اس راز پر سے تو اس سیاہ جھلملاتی شیفون کی باریک ساڑی نے پردہ اٹھایا تھا جو ماہر بیوٹیشن نے نہایت مشاقی سے اس طرح اس کے تن پر لپیٹی تھی کہ مجال ہے جو ساڑے چھ گز کی یہ ساڑی اس کے جسم کی خوب صورتی کو چھپاسکے۔ وہ تو کچھ اس طرح اس کے وجود سے چپٹی تھی کہ سارے خدوخال اور نمایاں ہوکر سامنے آگئے تھے۔ ساڑی سے کئی انچ اونچے مختصر بلاؤز سے جھانکتی اس کی پتلی کمر اپنی سفیدی کی وجہ سے سیاہ رنگ پر کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوکر دکھائی دے رہی تھی۔ بلاؤز کی آستینیں سلیولیس تھیں اور ان سے نکلتے گورے گورے بازو اس لیے بھی زیادہ خوب صورت اور قابل توجہ لگ رہے تھے کہ آج پہلی بار ہی ان پر ویکس، بلیچ، مینی کیور اور نہ جانے کون کون سے نسخے آزمائے گئے تھے۔ وہ تو سچ تھا کہ ان ساری چیزوں سے واقف ہی نہیں تھی اور کسی کی ہدایت پر نہایت تابعداری سے خود کو اس بیوٹی سیلون کی ماہرین کے حوالے کردیا تھا۔ جہاں اسے صبح ناشتے کے بعد پہنچایا گیا تھا اور تب سے اب تک نہ جانے وہ کتنے اور کون کون سے مراحل سے گزر کر آئینے کے سامنے اس عالم میں کھڑی تھی کہ خود ہی یہ یقین کرنے سے قاصر تھی کہ آئینے میں نظر آتا عکس اسی کا ہے۔

اسے تو یوں لگ رہا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے اور پھر آنکھ کھلے گی تو پھر اسی عام سے مڈل کلاس گھر میں موجود ہوگی جہاں اس کے سارے کے سارے کپڑے ایک الماری میں اس کے لیے مختص کیے گئے کل دو خانوں میں سماجاتے تھے اور وہ جوڑے بھی اتنے معمولی تھے کہ ان کی کل قیمت بھی اس کے جسم پر اس وقت موجود ساڑی کی قیمت سے کئی گنا کم تھی۔ ایسی ساڑی تو اسے حقیقت میں کبھی قریب سے دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی وہ جانتی تھی کہ ساڑی پر جن مختلف قسم کے ترشے ہوئے ننھے پتھروں کے ساتھ نفاست سے کام بنا ہوا ہے ان کے نام کیا کیا ہیں، ہاں البتہ اس بات کا اسے خوب اندازہ تھا کہ وہ اتنے قیمتی اور بیش قیمت ہیں کہ اپنے والدین کے منتخب کیے گئے کسی رشتے پر ہامی بھرنے سے وہ زندگی بھر کبھی ان کا دیدار بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس اعتبار سے وہ نہایت خوش قسمت تھی کہ من چاہا زندگی کا ہم سفر بھی پالیا تھا اور ساتھ ہی زندگی کی بے شمار ایسی نعمتیں بھی جن کا اس سے قبل شاید وہ تصور کرنے کی بھی قابل نہیں تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی میں نہایت نازک ایک بریسلٹ تھا جن میں ننھے ننھے ہیرے جڑے ہوئے تھے اور بائیں ہاتھ میں باریک باریک سی درجن بھر وائٹ گولڈ کی چوڑیاں۔ اس نے دائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں صرف ایک انگوٹھی پہن رکھی تھی لیکن اس انگوٹھی میں جڑا اکلوتا ہیرا اتنا چمک دار تھا کہ دور ہی سے نظروں کو خیرہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی ستواں ناک میں بھی ہیرے کی لونگ پڑی تھی جو اس کی ذرا سی جنبش پر یوں جھلملاتی تھی کہ چہرے پر شعاعیں سی... بکھرتی محسوس ہوتی تھیں۔ ہیئر اسٹائلسٹ نے اس کے ریشمی بالوں کا اونچا سا جوڑا کچھ اس انداز میں بنایا تھا کہ اس کی راج ہنس جیسی لمبی گردن مزید نمایاں ہوگئی تھی اور ساتھ ہی گردن میں پہنایا گیا نازک سا نیکلس اور کانوں میں لٹکتے قدرے لمبے آویزے بھی۔ وہ سرو قد تھی اور اس وقت پیروں میں موجود نازک، قیمتی اور اونچی ایڑھی کی سینڈل میں کچھ اور نمایاں ہو رہی تھی۔

اپنے لباس، جیولری، میک اپ، ہیئر اسٹائل سے لے کر سینڈل تک ایک ایک شے کا سراہنے والی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے اس کے ذہن نے ان شادیوں اور دلہنوں تک اڑان بھری جنہیں اب تک کی زندگی میں دیکھتی آئی تھی۔ وہ دلہنیں جو بھی اسے اچھی لگا کرتی تھیں یکدم ہی اس کی نظروں سے گرگئیں اور اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر ایک تفاخر بھری نظر ڈالی۔ دلہن وہ بھی تھی لیکن اس سے کسی کا بھلا کیا مقابلہ تھا۔ پھولوں کے نام پر جوڑے میں اگی انگریزی پھولوں کی دو کلیوں کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن امپورٹڈ پرفیوم اور باڈی اسپرے کے چھڑکاؤ کی وجہ سے اس کا وجود مہک رہا تھا۔ سیدھی مانگ میں افشاں ضرور جھلملا رہی تھی لیکن روایتی ٹیکا، جھومر سب غائب تھا پھر بھی وہ دلہن تھی۔ ایک امیر اور مشہور آدمی کی دلہن جو بہت خوب صورت، اسٹائلش اور منفرد تھی۔ اپنے اس روپ کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ دھیمے سے مسکرائی، اسی وقت اس کی نظر اپنے بلاؤز کے گلے پر جا پڑی۔ گلا آگے اور پیچھے دونوں طرف سے کچھ زیادہ ہی گہرا تھا اور گہرے گلے نے آئینے میں اسے ایک ایسا نظارہ کروایا تھا کہ پہلی بار اسے حیا سی آگئی اور بے ساختہ ہی اس کا ہاتھ ساڑی کا پلو درست کرنے کے لیے اٹھا۔

''نو میڈم پلیز ساڑی کو اس طرح مت چھوئیں۔ ساری سیٹنگ آؤٹ ہوجائے گی۔'' ابھی اس کی انگلیوں نے جنبش بھی نہیں کی تھی کہ پیچھے کھڑی بیوٹیشن یوں چلائی گویا وہ اس کی گھنٹوں کی محنت کو برباد کرنے چلی ہو۔ اس نے بوکھلا کر اپنا ہاتھ پیچھے ہٹالیا۔ اسے اس کی دید کا بھرپور جائزہ

لینے کے لیے آئینے کے سامنے لا کھڑا کرنے والی بیوٹیشن نے آگے بڑھ کر گویا پلو کی سیٹنگ کی طرف سے ایک بار پھر اطمینان حاصل کیا۔

''یہ گلا بہت زیادہ ہی گہرا ہے اس لیے میں پلو ذرا سا اوپر کرنا چاہ رہی تھی۔'' اس نے ذرا کھسیانے انداز میں وضاحت پیش کی۔

''آپ ایسے ہی کانشس ہو رہی ہیں میڈم۔ سب کچھ بالکل پرفیکٹ ہے۔ دیکھیں یہ ساری بڑی بڑی ہیروئنیں بھی ایسے ہی ساڑی پہنتی ہیں اور آپ کا فگر تو ان سب سے زیادہ زبردست ہے پھر کیوں آپ پریشان ہو رہی ہیں۔'' بیوٹیشن نے اس کی توجہ بڑے سے ڈریسنگ روم میں آویزاں پوسٹرز کی طرف مبذول کروائی۔ وہ کئی بڑی ہیروئنز کے ہوش ربا پوز تھے۔

''مگر میں کوئی فلمی......'' وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں کوئی فلمی ہیروئن تو نہیں ہوں لیکن پھر اپنی زبان روک لی۔ وہ فلمی ہیروئن نہ سہی فلمی دنیا کی ایک اہم شخصیت سے وابستہ تو ہوچکی تھی اور ظاہر ہے اب اسے رواج کے مطابق وہیں کے طور طریقے اختیار کرنے تھے اور میڈیا کی مہربانی سے وہ اتنا تو جانتی تھی کہ بالی وڈ کی دنیا میں طرح دار ہیروئنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے فلمی دنیا کے مردوں سے وابستہ ان کی بیویوں کو بھی ٹکر کی ڈریسنگ کرنی پڑتی ہے ورنہ یہ شوہر اچک کرلے جاتی ہیں اور وہ اپنے اس شوہر کو کھونے کا رسک نہیں لے سکتی تھی جس کے لیے اس نے ساری دنیا چھوڑ دی تھی۔ چنانچہ بیوٹیشن سے اختلاف کا خیال دل سے نکال کر ایک بار پھر ہر زاویے سے اپنا جائزہ لینے لگی۔ اسی وقت ڈریسنگ روم میں رکھا انٹرکام بجا اور اس کے ساتھ آنے والی بیوٹیشن ریسیور اٹھا کر دوسری طرف کی بات سننے لگی۔

''آپ کی گاڑی آگئی ہے میڈم۔'' بیوٹیشن نے دوسری طرف سے ملنے والا پیغام اس تک پہنچایا تو اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے بلاخیز حسن پر آخری نظر ڈالی اور اونچی ہیل پر ٹک ٹک کرتی باہر نکل گئی۔

''آر یو سیٹسفائی میڈم؟'' استقبالیہ پر موجود سیلون کی انچارج نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''شیور۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔ باہر سیاہ رنگ کی ہی چمچاتی کار اس کی منتظر تھی۔ کار کے شیشے ٹنڈڈ تھے اس لیے وہ اندر بیٹھے افراد کو نہیں دیکھ سکتی تھی البتہ باہر مستعد کھڑا مسلح سیکیورٹی گارڈ فوراً نظر میں آگیا۔ سیکیورٹی گارڈ نے اس کے قریب پہنچنے پر پچھلی جانب کا دروازہ کھولا تو وہ اندر بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی اسے خوش گوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں بلیک، گرے اور ریڈ لائننگ والی ٹائی لگائے اس کا ہینڈسم شوہر اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس کے اندر بیٹھتے ہی اس کے شوہر نے ایک خوب صورت سا بکے اسے پیش کیا۔

''مجھے امید نہیں تھی کہ آپ خود مجھے لینے آئیں گے۔'' بکے تھام کر اس نے مسرور لہجے میں اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ میں خود تمہیں لینے نہیں آتا۔ اصولاً تو مجھے گاڑی سے باہر نکل کر تمہیں ویلکم کرنا چاہیے تھا لیکن صرف اس ڈر سے باہر نہیں نکلا کہ پھر لوگوں کا رش لگ جائے گا اور ہمارا ٹائم پر ہوٹل پہنچنا مشکل ہوجائے گا۔'' وہ اسے وارفتگی سے تکتے ہوئے بولا تو وہ تھوڑا سا شرما گئی اور تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دے کر مسکرانے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا ہے۔ وہ اتنا ہی مقبول اور ہر دل عزیز تھا کہ اگر کوئی اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیتا تو وہاں لوگوں کا ہجوم لگ جاتا۔ اسی لیے تو اتنی احتیاط برتی گئی تھی کہ بیوٹی سیلون والوں تک کو تنبیہ کردی گئی تھی کہ کسی کو اس بات کی خبر نہ ہونے پائے کہ اس کی دلہن وہاں تیار ہو رہی ہے۔ وہ کوئی عام بیوٹی سیلون نہیں تھا۔ شوبز کی دنیا کی بڑی بڑی شخصیات خاص تقریبات کے لیے وہاں سے تیار ہونا پسند کرتی تھیں اور سیلون کی مغرور تنک چڑھی مالک جو اپنے اسٹاف کو سیلون سے ہٹ کر کہیں اور بھیجنے کی قائل نہیں تھی کسٹمرز کی خواہش پر اس امر کو یقینی بناتی تھی کہ جو نہ چاہے اس کی یہاں موجودگی کا کسی کو علم نہ ہونے پائے چنانچہ وہ بھی نہایت رازداری سے یہاں سے تیار ہوکر روانہ ہو رہی تھی۔

''تم اتنی حسین لگ رہی ہو کہ میرا دل چاہ رہا ہے کہ آج کی پارٹی کینسل کروں اور تمہیں ساتھ لے کر کہیں غائب ہوجاؤں۔'' اپنا بایاں بازو اس کی کمر کے گرد حائل کرکے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے وہ مخمور سے لہجے میں بولا تو وہ اگلی نشستوں پر موجود ڈرائیور اور گارڈ کی موجودگی کے باعث ذرا سا گھبرا گئی لیکن وہ دونوں تو یوں بیٹھے تھے جیسے پتھر کے دو مجسمے ہوں اور انہیں پیچھے موجود افراد کی حرکات و سکنات کا سرے سے علم ہی نہ ہو۔ ان کا یہ انداز دیکھ کر وہ قدرے مطمئن ہوگئی اور خود سپردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے محبوب شوہر کے شانے سے سر ٹکالیا۔

☆☆☆

''آپ مجھے ہرا نہیں سکتے شکیل بھائی۔ میں اسکول

کے زمانے سے بیڈمنٹن کھیل رہی ہوں اور اس وقت بھی اپنے کالج میں سب سے بہترین کھلاڑی ہوں۔'' شکیل کو ایک خوب صورت ریٹرن دیتے ہوئے اس نے چہکتی ہوئی آواز میں اسے چیلنج کرنے کے انداز میں کہا تو اس کے لہجے میں ہمواریت کے باعث شکیل کو تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی وہ درست کہہ رہی ہے اور اس کا اسٹیمنا غضب کا ہے جبکہ خود اس کا یہ حال تھا کہ سانس بری طرح پھولنے لگا تھا اور اسے جیتنا تو دور اسکور برابر کرنے کا بھی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔

شکیل، صباحت کے بڑے ماموں کا بیٹا تھا۔ وہ ایم اے صحافت کررہا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر سجی بڑی بڑی آنکھیں اس کی ذہانت کا اعلان کرتی تھیں۔ اس کے بارے میں گھر والوں کا کہنا تھا کہ وہ گھر سے زیادہ باہر پایا جاتا ہے لیکن ان لوگوں کی بھارت آمد کے بعد سے یہ رائے غلط ثابت ہورہی تھی اور وہ اپنی یونیورسٹی کے اوقات کے علاوہ مہمان داری کے تقاضے نبھانے کے لیے زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزارتا تھا البتہ اس حقیقت سے بھی وہ خود ہی واقف تھا کہ یہ مہمان داری کے تقاضوں سے زیادہ اس کشش کا تقاضا تھا جو وہ صباحت کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ پسندیدگی کا یہ جذبہ کوئی آج کا نہیں تھا۔ ویب کیم پر صباحت کو دیکھ کر ہی وہ اسے پسند کرنے لگا تھا لیکن کبھی اس پسندیدگی کے اظہار کی جسارت نہیں کی تھی۔ اسے کسی اظہار کے لیے وہ مناسب وقت کا منتظر تھا اور اس کے خیال میں مناسب وقت وہی ہوسکتا تھا جب صباحت اور وہ ایک دوسرے کے روبرو ہوں۔ ان لوگوں کو دہلی پہنچے ہوئے دو دن ہوگئے تھے اور ان دو دنوں میں دن کا بیشتر حصہ گھر پر گزارنے کے باوجود وہ ایسا کوئی موقع تلاش نہیں کرسکا تھا اور دل کا یہ عالم تھا کہ اسے روبرو پاکر اظہار محبت کے لیے مچلا جارہا تھا۔ اس بار آمنہ اپنے خاندان کے ساتھ پورے پانچ سال بعد دہلی آئی تھیں اس لیے ادھر ادھر بکھرے بہن بھائی ان کے استقبال کے لیے آبائی گھر میں آجمع ہوئے تھے اور اس ہجوم میں دل کی بات کرنے کی گنجائش کیسے نکل سکتی تھی چنانچہ فی الحال وہ دید پر ہی گزارہ کررہا تھا اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ صباحت کو زیادہ سے زیادہ نظروں کے سامنے رکھ سکے۔ کل رات گفتگو کے دوران جب راحت اور واثق کی زبانی اسے اس بات کا علم ہوا کہ صباحت بیڈمنٹن کی ایک اچھی کھلاڑی ہے تو فوراً ہی اسے مقابلے کی دعوت دے دی۔ وہ خود اوسط درجے کا کھلاڑی تھا پھر بھی اس کا خیال تھا کہ ایک نازک سی لڑکی میں بھلا کہاں اتنا اسٹیمنا ہوگا کہ اس کا مقابلہ کرسکے۔ فوراً ہی مقابلے کا وقت طے ہوگیا اور سرشام جملہ نوجوانوں کی ٹولی اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے گھر کے پچھواڑے جمع ہوگئی۔

اس موقع پر شکیل نے ٹراؤزر کے ساتھ ہاف آستینوں والی سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور خاصا وجیہہ لگ رہا تھا۔ صباحت کے پاس کھیل کے حساب سے لباس نہیں تھا چنانچہ اس نے اپنے عام استعمال کے کپڑوں میں سے ہی سفید رنگ کا ایک ایسا لباس منتخب کرلیا تھا جو چست چوڑی دار پائجامے اور گھٹنوں سے قدرے اونچی قمیص پر مشتمل تھا۔ قمیص کی آستینیں ہاف تھیں اور اس کے گلے اور دامن پر آمنہ نے اپنے ہاتھوں سے نازک سی کڑھائی کی تھی۔ یہ لباس صباحت نے چند ماہ قبل ہی کالج کے ایک فنکشن میں شرکت کے لیے ضد کرکے بنوایا تھا اور آمنہ نے دوبارہ اسے نہیں پہننے دیا تھا کہ وہ چاہتی تھی کہ بھارت جاتے ہوئے تینوں بچوں کے پاس معقول ملبوسات کا مناسب ذخیرہ موجود ہو۔ آج اتنے دنوں بعد صباحت نے وہ لباس پہنا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں تھوڑا ابھر گیا ہے جس کی وجہ سے لباس اسے قدرے چست ہورہا ہے لیکن اس کے خیال کے مطابق یہ اتنا بھی چست نہیں تھا کہ پہنا نہ جاسکے۔ ویسے بھی مقابلے کے لیے طے شدہ وقت ہوچلا تھا اور ہر اچھے اسپورٹس مین کی طرح وہ وقت کی پابندی کو اہمیت دیتی تھی۔

شکیل کے مقابل نیٹ کی دوسری طرف کھڑے ہوکر اس نے دوپٹے کو اسٹول کی شکل میں دائیں کندھے پر ڈالا اور اس کے دونوں سرے بائیں جانب کمر پر لے جاکر باندھ دیے۔ دوسرے ہی لمحے وہ کھیل میں بری طرح منہمک ہوچکی تھی اور اسے ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ اس کا سفید رنگ کا چست لباس ایک ردھم کے ساتھ حرکت کرتے اس کے جسم کو کتنا نمایاں کرکے دکھا رہا ہے۔ اس کے بہن بھائی اور دوسرے کم عمر کزنز کی تو خیر اس طرف توجہ نہیں تھی اور وہ صرف اور صرف کھیل سے لطف اندوز ہورہے تھے لیکن جو بالغ اور ہوش مند تھے وہ اپنی تمام تر شرافت کے باوجود نظریں اس کے وجود پر پھسلنے سے خود کو روکنے میں ناکام تھے۔ اس کے مقابل موجود شکیل کو بھی یقین تھا کہ اس کی اتھل پتھل ہوتی سانسوں کے پیچھے زیادہ دخل صباحت کے وجود کی دلکشی و رعنائی کا تھا ورنہ وہ اتنا بھی کچا کھلاڑی نہیں تھا۔

''میں ایک بار پھر آپ کو بتارہی ہوں شکیل بھائی آپ مجھے ہرا نہیں سکتے۔'' شکیل کی ہانپتی سانسوں کو محسوس کرکے وہ

شوخی سے چلائی۔ ویسے کھیل شروع ہوئے اب اتنی دیر ہوچلی تھی کہ خود اس کے مساموں سے بھی پسینا پھوٹنے لگا تھا جو اس کے چست لباس کو مزید جسم سے چپکا رہا تھا۔

''فکر مت کرو میں تم سے ہار کر بھی خوشی محسوس کروں گا۔'' شکیل کو گویا حال دل سنانے کا ایک موقع میسر آیا لیکن وہ اس کی بات کی تہ میں پہنچے بغیر کھلکھلا کر ہنسی اور شوخی سے بولی۔

''یہ تو انقلاب ہے بھئی کہ بھارت، پاکستان سے ہار کر کھلے دل سے تسلیم کرنے کو تیار ہے ورنہ ہار کر تو یہاں والوں کی شکلیں ایسی ماتمی ہوجاتی ہیں کہ لگتا ہے ابھی دھاڑیں مار کر روتے ہوئے سینہ پیٹنا شروع کردیں گے۔''

''یاہو...... صبا آپ جیت گئیں۔'' شکیل شاید اس کی بات سننے میں زیادہ ہی منہمک ہوگیا تھا کہ اس کے شارٹ کے جواب میں ریٹرن نہ دے سکا اور شٹل زمیں بوس ہوگئی۔ اس منظر کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے راحت نے نعرہ لگایا اور پھر باقی چھوٹے بڑے بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ وہاں اچھا خاصا شور وغل مچ گیا۔ آمنہ جو کسی کام سے ڈرائنگ روم میں سجی محفل چھوڑ کر پچھلے کمرے میں ان آوازوں کو سن کر چونکیں اور کھڑکی کھول کر پچھواڑے کے احاطے میں جھانکا۔ شور وغل کرتی نوجوان پارٹی میں ان کی نگاہوں نے تمتماتے چہرے والی صباحت تک فوراً ہی رسائی حاصل کرلی اور ان کا چہرہ بیٹی کے چہرے سے زیادہ تمتما اٹھا۔

''صباحت فوراً اندر میرے پاس آؤ۔'' انہوں نے وہیں سے بلند آواز میں اسے پکار کر حکم صادر کیا۔ ان کے لہجے کی سختی کو صباحت سمیت ہر ایک نے محسوس کیا۔ صباحت تو بوکھلا ہی گئی اور جس حال میں تھی بھاگ کھڑی ہوئی۔ منٹ بھر کے اندر وہ پریشان سی ان کے روبرو تھی۔

''تم میں تھوڑی بہت شرم وحیا ہے یا نہیں؟ بہت اچھا لگ رہا تھا وہاں ننھے بچوں کی طرح کدکڑے لگاتے ہوئے۔'' انہوں نے فوراً ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''وہ...... امی...... شکیل بھائی نے مجھے چیلنج دیا تھا کہ میں اگر اتنی اچھی کھلاڑی ہوں تو انہیں ہرا کر دکھاؤں سو سب کے اصرار پر میں نے ان کے ساتھ ایک میچ کھیل لیا لیکن آپ اتنی خفا کیوں ہورہی ہیں؟ میں تو بچپن سے ہی یہ گیم کھیل رہی ہوں اور آج سے پہلے کبھی آپ نے اعتراض نہیں کیا۔'' اس کے لیے ماں کا رویہ ناقابل فہم تھا چنانچہ وضاحت دیتے ہوئے تھوڑی سی حجت بھی کر بیٹھی۔

''منع اس لیے نہیں کیا کہ تم اسکول اور کالج میں لڑکیوں کے ساتھ کھیلتی رہی ہو اور یہاں کئی جوان لڑکے بھی موجود تھے بلکہ تم کھیل ہی ایک لڑکے کے ساتھ رہی تھیں۔'' آمنہ بیگم نے دانت کچکچا کر اپنی ناراضی کی وجہ ظاہر کی۔

''سو واٹ۔ وہ سارے گھر ہی کے تو لوگ ہیں اور میرے لیے بالکل بھائیوں جیسے ہیں۔'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے...... بے پروائی سے جواب دیا جیسے خود پر عائد کی جانے والی فرد جرم بالکل فضول محسوس ہورہی ہو۔

''تم اب اتنی بچی نہیں رہی ہو صبا کہ معاملات کی نزاکت کو نہ سمجھ سکو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بھائی جیسا ہونے اور بھائی ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے اور تم جس حلیے میں ہو اس میں تو سگے بھائی کے سامنے جاتے ہوئے کوئی باحیا لڑکی حجاب محسوس کرے گی۔'' انہوں نے ایکدم اسے بازو سے تھام کر پرانی وضع کی الماری میں جڑے قد آدم آئینے کے سامنے لے جاکر کھڑا کردیا۔ آئینے کے مقابل کھڑے ہوکر صبا کو احساس ہوا کہ ذرا چست محسوس ہونے والا لباس حقیقت میں اچھا خاصا چست ہورہا ہے اور رہی سہی کسر لباس کو جسم سے چپکا دینے والے پسینے نے پوری کردی ہے۔ جہاں جہاں سے لباس چپکا ہوا تھا وہاں وہاں سے اس کے جسم کی گوری رنگت جھلک رہی تھی۔ اگر دوپٹا پھیلا کر اوڑھا گیا ہوتا تو پھر بھی کچھ بچت ہوجاتی لیکن وہ تو ایک شانے سے نکا کمر پر بندھا ہوا تھا اور اپنا کوئی حق ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے آئینے سے نظر ہٹا کر ماں کی طرف دیکھنا چاہا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھیں اور اسے آئینے کے مقابل شرمندہ ہونے کے لیے تنہا چھوڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

''یہ مسٹر مہتا ہیں، بہت بڑے فلم پروڈیوسر۔ تم نے ان کی فلمیں دیکھ رکھی ہوں گی۔ میرے کئی گیت ان کی فلموں میں شامل رہے ہیں۔ انہیں بالی وڈ میں لک میکر اور فیوچر میکر کے ناموں سے پکارا جاتا ہے کیونکہ جس اداکار، شاعر، گلوکار اور موسیقار کو ایک بار ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے وہ کامیابی کی سیڑھی چڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ مجھے یہاں تک لانے میں ان کا بہت بڑا رول ہے۔'' وہ دونوں استقبالیہ پر کھڑے آنے والے مہمانوں کا خوش دلی سے استقبال کررہے تھے اور اس کا شوہر سندر آنے والوں کی مبارک بادیں قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا اس سے مختصر تعارف بھی کرواتا جارہا تھا۔ کھچڑی ڈاڑھی والے قیمتی لباس میں موجود ادھیڑ عمر شخص کا تعارف کرواتے ہوئے اس نے یہ جملے ادا کیے تو اس نے غور سے اس شخص کو دیکھا۔ اس شخص کا نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کے

لیے دی جانے والی اس رائے سے ناواقف تھی جو ابھی ابھی سندر نے دی تھی لیکن سندر کا برملا اعتراف سن کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ صاف گوئی اور احسان شناسی کی یہ خصوصیات ہر ایک میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ اوصاف صرف ان ہی لوگوں میں ہوتے ہیں جو مضبوط کردار اور شخصیت کے مالک ہوں چنانچہ سندر کو ایسا پا کر اسے بہت اچھا لگا تھا اور اس کے دل میں سندر کی محبت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

''میری تعریفوں کو چھوڑو سندر مجھے وشواس ہے کہ آج کے دن تمہاری پتنی سے زیادہ تعریف سننے کا ادھیکار کسی کو نہیں ہوسکتا۔ اتنی سندر ناری کے ساتھ کھڑے آج تم سچ مچ سندر لگ رہے ہو۔'' مہتا نے اپنی مخمور نگاہوں سے اس کا انگ انگ تولتے ہوئے یہ کمنٹس پاس کیے تو سندر زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ وہ جو آئینے کی گواہی کے بعد لوگوں کی زبانی اپنے حسن کی تعریفیں سن سن کر نازاں ہو رہی تھی۔ ان نگاہوں سے تھوڑی جز بز ہوگئی لیکن اس دنیا کے اخلاقی تقاضے نبھانے کے لیے مسکرانے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ فلم نگری کے لوگ ہیں اور ان کی نگاہیں اور زبانیں اظہار کے معاملے میں عام لوگوں کے مقابلے میں ذرا زیادہ ہی بے باک ہوتی ہیں اس لیے اس کے پاس برا ماننے کی گنجائش نہیں۔ سندر سے شادی کے نتیجے میں اس کی زندگی میں جو انقلاب رونما ہوا تھا اس کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی وہ بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ اگر ایسا نہ کرتی تو یہاں سندر کے پہلو میں کھڑی آنے والے مہمانوں کا استقبال کیسے کرتی کہ اس کی کلاس میں تو ویسے کی دلہن کے یوں کھلے سر کے ساتھ چلنے پھرنے اور پٹر پٹر باتیں کرنے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا اور استقبالیہ پر کھڑے ہونا تو دور کی بات وہ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے بھی کھل کر کسی سے بات نہیں کرسکتی تھی کہ تقریب میں شامل جملہ خواتین کی طرف سے بے حجابی و بے شرمی کا الزام فوراً عائد کر دیا جاتا لیکن یہاں کون تھا جو اسے یہ الزام دیتا۔ یہاں تو وہ کوئین آف دی ایونٹ تھی اور اسے اپنے ہر عمل میں آزادی حاصل تھی۔

''ایسا لگتا ہے مسز سندر کہ آپ بات بہت کم کرتی ہیں۔'' مہتا کی آواز اسے اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر کھینچ لائی۔

''ایسی بات نہیں ہے کہ مہتا صاحب ہم پہلی بار مل رہے ہیں نا اس لیے تھوڑی سی ہیزی ٹیشن ہے۔'' اس نے مسکرا کر فوراً وضاحت دی۔

''یعنی اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں کے بعد۔'' مہتا نے قہقہہ لگا کر ریمارکس پاس کیے اور اس پر ایک اور پرشوق نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی سندر کے ساتھ مزید آنے والے مہمانوں کے استقبال میں مصروف ہوگئی۔

مہمانوں کی آمد کا سلسلہ تھما تو محفل کا اصل رنگ جمنے لگا۔ میوزک، ڈانس، ہلا گلا، شراب کی ایک کے بعد ایک کھلتی بوتلیں یہ سب کچھ کہاں اس کے لیے مانوس تھا۔ ان چیزوں کو اب تک اس نے اسکرین کی حد تک ہی دیکھا تھا اور گمان نہیں تھا کہ ایک دن وہ خود اس دنیا کا ایک حصہ ہوگی۔ عجیب عالم خواب میں وہ یہ سب دیکھ رہی تھی اور خود کو اس ماحول سے ہم آہنگ رکھنے کی بھرپور جدوجہد بھی کرتی جارہی تھی۔ اس کے باوجود اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگی جارہی تھیں اور اسے اعتراف تھا کہ اگر سندر نے اسے اپنے بازو کے حصار میں نہ لے رکھا ہوتا تو اس کے لیے وہاں کھڑا رہنا دشوار ہوجاتا۔ ذرا سی ہمت اور بروقت فیصلے نے اسے کہاں سے کہاں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ سوچتی تو دنگ رہ جاتی۔ آج کی تقریب کے لیے جن ڈیزائنرز نے اس کی جیولری اور لباس تیار کیا تھا ان کے ناموں سے بھی اس کے طبقے کی شاید چند خواتین ہی واقف ہوں گی۔ یہ تقریب جس سیون اسٹار ہوٹل میں ہو رہی تھی اس تک رسائی کا تو کوئی تصور ہی نہیں کرسکتا تھا اور یہ تقریب اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنی خاص تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ سندر نے تقریب کی ویڈیو اور فوٹو گرافس بنانے کے حقوق بھاری معاوضے پر صرف ایک ایسے نیوز گروپ کو دیے تھے جو بیک وقت الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر چھایا ہوا تھا۔

''کل جب اس تقریب کے کلپس اور تصویریں ٹی وی اور نیوز پیپر کے ذریعے منظرعام پر لائیں گے تو ان سب کا کیا حال ہوگا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی یہ خیال اس کے ذہن میں آیا تو دل پر گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی اور کیمرا مین کے اصرار کے باوجود ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیکی پڑگئی۔

''کیا ہوا ہنی تھک گئی ہو کیا؟'' سندر کی نظروں سے اس کی یہ کیفیت چھپی نہ رہ سکی اور وہ فوراً جھک کر سرگوشی میں فکرمندی سے پوچھنے لگا۔

''بس تھوڑا سا لیکن یو ڈونٹ وری، میں مینج کرلوں گی۔'' اس نے فوراً ہی خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ارد گرد پھیلے رنگ و بو کے سیلاب نے جلد اسے اس کوشش میں کامیاب بھی کردیا۔

☆☆☆

''جانے کیا بھید ہے صفائی کو نصف ایمان قرار دینے والی قوم کے ہاں ہی صفائی کا سب سے زیادہ فقدان پایا جاتا ہے۔'' چکن کی سفید چادر اوڑھے جامع مسجد دہلی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے آمنہ بیگم نے نہایت دلسوزی سے تبصرہ کیا۔ ان کے اس تبصرے کے پیچھے وہاں غیر معیاری صفائی کا انتظام تھا۔ سیڑھیوں کے بالکل نیچے اور آس پاس خاصا کوڑا کرکٹ نظر آرہا تھا اور اس کوڑے میں بچی کھچی خوراک کے بھی کئی اجزا شامل تھے جن کے حصول کے لیے وہاں آوارہ کتے گھومتے پھر رہے تھے۔

''یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ وہاں اپنے لاہور میں بھی کتنی تاریخی عمارتیں اور مقامات ہیں جو حکام کی بے توجہی کی وجہ سے شکست و ریخت کا شکار ہیں اور کچھ زیادہ وقت نہیں جاتا کہ ہم اپنے اسلاف کے اس ورثے سے محروم ہوجائیں گے۔'' نجم الدین نے ان کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جوابی تبصرہ کیا۔

''لیکن یہاں ایسا نہیں ہے پھوپا جان۔ انڈین گورنمنٹ تاریخی ورثے کی حفاظت کے لیے خاصی سرگرم رہتی ہے اور ہر سال اسی وجہ سے کثیر زرمبادلہ بھی کماتی ہے۔'' شکیل نے ان کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے گویا بھارت کی بڑائی جتانے کی کوشش کی۔

''جی ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ کی گورنمنٹ سیاحت کے شعبے سے ہر سال کثیر زرمبادلہ کما رہی ہے لیکن اسلامی ورثے سے ان کا متعصب رویہ بھی واضح ہے۔ شاہ جہاں کی تعمیر کردہ اس اتنی بڑی تاریخی مسجد کا ناقص انتظام اس کا ثبوت ہے اور تو اور آپ لوگوں نے تو تاج محل جیسے عجائباتِ زمانہ میں شمار فن تعمیر کے نادر نمونے کو بھی ڈھنگ سے سنبھال کر نہیں رکھا۔ میری معلومات کے مطابق تو تاج کی وہ دودھیا رنگت دن بدن ماند پڑتی جارہی ہے اور بڑھتی ہوئی فضائی آلودگی نے اسے خاصا میلا میلا سا کردیا ہے۔'' یہ صباحت تھی جس نے تیز لہجے میں حقائق کا اظہار کرکے شکیل کی بڑکی کا اثر زائل کردیا تھا۔

''ذرا آہستہ بولیے محترمہ کہیں آپ کا یہ کفن پھاڑ کر بولنا ہمیں کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے یہاں سیکیورٹی کے حساس آلات اور کیمرے وغیرہ لگے ہوئے ہیں۔'' شکیل نے ذرا گھبرا کر اس کا والیوم کم کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں وہ اس پر طنز کا کوئی اور تیر چلاتی اس سے قبل نجم الدین نے بھی تنبیہ کی۔

''شکیل میاں ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا۔ ہم پردیس میں ہیں اور ہمیں اپنے رویوں میں محتاط رہنا چاہیے۔'' ان کے ٹوکنے کے بعد اس کے پاس مزید بولنے کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ منہ بنا کر خاموش ہوگئی۔ اندر سے مسجد اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھنے کے بعد وہ اس کے وسیع صحن میں آگئے جہاں آمنہ بیگم سمیت سب نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کردیے۔ حقیقتاً اس وقت وہ لوگ آمنہ بیگم کی فرمائش پر ہی جامع مسجد دہلی کی زیارت کے لیے آئے تھے۔ انہیں یہ مسجد بہت اچھی لگتی تھی اور ہر بار دہلی آمد پر ان کی خواہش ہوتی تھی کہ مسجد کا ایک چکر ضرور لگائیں لیکن اتفاق سے پچھلی بار ان کا یہاں آنا نہیں ہوسکا تھا اس لیے وہ خاصے طویل وقفے کے بعد اس مسجد کو دیکھ رہی تھیں۔ مسجد سے نکل کر انہوں نے عین مقابل موجود مینا محل کے بازار کا رخ کیا۔ یہ پرانی دہلی کا مصروف ترین بازار ہے جہاں دنیا بھر کا سامان فروخت ہوتا ہے۔ صباحت اور راحت نے مصنوعی زیورات سے اٹاٹ بھری دکانوں میں سے کئی سے اپنے لیے کئی خوب صورت زیورات منتخب کرکے خریدے۔ آمنہ بیگم نے بھی پاکستان میں موجود عزیز و اقارب کے لیے تحفتاً لے جانے کو کچھ چیزیں منتخب کیں۔ واثق کو بھی الیکٹرانک کی چند چیزیں پسند آئیں۔ خریداری کے اس سلسلے نے آمنہ اور نجم الدین کو خاصا تھکا دیا تھا البتہ لڑکیوں کے جوش و خروش میں کچھ خاص فرق نہیں آیا تھا۔ وہ بہ مشکل منہ بسورتی ہوئی قریبی ریستوران جانے کے لیے راضی ہوئیں۔ اس ریستوران کا مالک مسلمان تھا چنانچہ انہوں نے بلا جھجک خوب ڈٹ کر کھایا پیا، کھانے پینے کے بعد آمنہ بیگم نے گھر واپس چلنے کی خواہش کی لیکن لڑکیاں سر ہوگئیں کہ انہوں نے لال قلعہ دیکھنا ہے آخر نجم الدین نے ہی اس مسئلے کا حل نکالا۔

''ایسا کرتے ہیں کہ میں اور آمنہ واپس گھر چلے جاتے ہیں۔ تم لوگ شکیل میاں کے ساتھ جا کر لال قلعہ دیکھ آؤ۔''

''یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔'' شکیل کی چھوٹی بہن مہوش نے سب سے پہلے تائید کی پھر باقی بھی اس کے حق میں اپنا ووٹ ڈالتے چلے گئے یوں ریستوران سے نکل کر آمنہ اور نجم الدین تو گھر کے لیے روانہ ہوگئے جبکہ وہ سب شکیل کی معیت میں ایک آٹو رکشے میں سوار ہوکر لال قلعے کی طرف عازم سفر ہوئے۔ وہ تعداد میں کل چھ تھے جن میں ان تینوں بھائی بہنوں، شکیل اور اس کی چھوٹی بہن مہوش کے علاوہ چھوٹے ماموں کی سنبل بھی شامل تھی۔ سنبل تقریباً صباحت کی ہم عمر ہی تھی اس لیے وہ دونوں زیادہ تر ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ راحت کی مہوش سے اچھی بننے لگی تھی جبکہ واثق بے چارا عمر کے واضح فرق کے باوجود شکیل کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا کہ لڑکیاں تو اسے لفٹ ہی نہیں کرواتی تھیں۔ لال

قلعہ پہنچ کر انہوں نے سرخ اینٹوں سے تعمیر کردہ قلعے کی طویل بیرونی فصیل دیکھی تو مبہوت رہ گئے۔ باقی قلعہ بھی انہیں بے حد پسند آیا۔ خصوصاً قلعے میں قائم کردہ تین عجائب گھروں کو دیکھ کر تو وہ دنگ رہ گئے۔ ان عجائب گھروں میں تاریخی واقعات کو مجسموں کی شکل میں محفوظ کیا گیا تھا۔ کہیں پانی پت کا میدان سجا تھا تو کہیں جنگ آزادی کو مجسم کردیا گیا تھا۔ ان عجائبات کو دیکھ کر صباحت کو دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ بھارتی حکومت اپنے تاریخی ورثے کو سنبھالنے میں اتنی بھی بے پروا نہیں ہے۔ وہ آنکھوں میں بے پناہ اشتیاق لیے یہ سب دیکھ رہی تھی اور ان پرشوق نگاہوں سے بے نیاز تھی جو صرف اور صرف اسی کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ اس نے سرخ چوڑی دار پاجامے پر انگوری رنگ کی کلیوں والی فراک پہن رکھی تھی۔ کلیوں پر سرخ رنگ کے دھاگے سے مشینی کڑھائی کی نازک سی بیل بنی ہوئی تھی اور سرخ اور انگوری رنگوں کے امتزاج کا بڑا سا دوپٹا جو اوڑھا تو سر پر گیا تھا لیکن جانے کب پھسل کر شانوں پر آگرا تھا۔ اسے کسی مغلیہ شہزادی کی یاد دلا رہا تھا۔ شکیل نے فلم جودھا اکبر دیکھ رکھی تھی۔ اس فلم میں ایشوریا رائے نے جودھا بائی کا کردار ادا کیا تھا اور فلم کی زیادہ تر عکس بندی اسی لال قلعے میں ہوئی تھی لیکن وہ شرطیہ کہہ سکتا تھا کہ ایشوریا کے مقابلے میں صباحت زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اب معلوم نہیں یہ اس کا حسن نظر تھا یا حقیقت بہر حال اس کا دل تو صباحت کو ہی سب سے زیادہ خوب صورت قرار دے رہا تھا۔ یہاں اسے اس کی دید کا موقع بھی مل رہا تھا۔ اس کے سارے سراہی عجائبات میں کھوئے ہوئے تھے اور وہ خود اس کی دید میں۔ گھر میں تو بڑوں کی موجودگی کے احترام میں اسے اپنی نظروں کو بھی قابو میں رکھنا پڑتا تھا۔ یہاں اس کے شوق کا یہ عالم تھا اُدھر حسن بے نیاز شکیل سے باتوں میں گم اپنی ذات سے بھی بے پروا تھی۔ شانوں پر دھرا اسکی دوپٹا کب پھسل کر اس حد کو جا پہنچا کہ اس کا ایک پلو زمین پر لڑنے لگا اسے خبر ہی نہیں ہوسکی۔ شکیل چپکے سے آگے بڑھا اور زمین کو چومتے اس کے دوپٹے کو اپنے ہاتھ میں تھاما۔ اسی پل اس نے قدم آگے بڑھائے لیکن دوپٹے کا پلو شکیل کی گرفت میں ہونے کے باعث اسے جھٹکا سا لگا۔ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا اور پلو کو شکیل کی گرفت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خفگی کا تاثر ابھرا۔

"کسی کو روکنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ آپ مجھے آواز بھی دے سکتے تھے۔" آنکھوں کی طرح اس کے لہجے میں بھی خفگی تھی۔ شکیل گویا کسی سحر سے آزاد ہوا اور جواباً خود بھی لہجے میں خفگی سموتے ہوئے بولا۔

"مجھے آپ کو اس طرح روکنے کا کوئی شوق نہیں ہے محترمہ۔ میں صرف آپ کے اس دوپٹے کو میلا ہونے سے بچانا چاہتا تھا جو پورے قلعے کی جھاڑو دینے پر تلا ہوا ہے۔" شکیل کا یہ جواب سن کر وہ تھوڑی سی خفت کا شکار ہوئی اور آہستہ سے شکریہ کہہ کر اپنا دوپٹا سمیٹ لیا۔ وہ شکیل کی ہمراہی میں دو قدم آگے بڑھی تو شکیل نے اپنے دائیں ہاتھ کو بڑی چاہت سے ہونٹوں کے ساتھ لگایا۔

☆☆☆

آنکھ کھلنے پر اس نے اپنے پہلو میں دیکھا۔ سندر وہاں موجود نہیں تھا لیکن تکیے پر رکھا کاغذ سبز رنگ کی مدھم روشنی میں بھی صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور ہاتھ بڑھا کر کاغذ اٹھالیا۔ کاغذ پر درج تحریر پڑھنے کے لیے اسے سائڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ روشن کرنا پڑا تھا۔

"شوٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔ واپسی میں دیر ہوجائے گی، تم ڈنر کرلینا۔" کاغذ پر لکھا یہ مختصر پیغام اسی کے لیے تھا۔ پیغام پڑھ کر اس نے لیمپ بجھا دیا اور کچھ دیر بستر پر کسلمندی سے پڑے رہنے کے بعد آہستہ سے اٹھی اور اپنے ریشمی گاؤن کی ڈوریاں باندھتی کمرے کے اس حصے کی طرف بڑھی جہاں لگی فرنچ ونڈو سے شہر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ کمرے کو تاریک اور پرسکون رکھنے کے لیے ونڈو پر دبیز پردے پھیلا دیے گئے تھے۔ اس نے پردے کھینچ کر ہٹائے تو گویا پیرس کی ساری روشنیاں اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ مبہوت سی دور تک نظر آنے والی ان جگمگاتی روشنیوں کو دیکھتی رہی۔ ابھی کل ہی تو وہ سندر کے ساتھ ہنی مون کے لیے پیرس آئی تھی اور یہاں آتے ہوئے جہاز میں ہی سندر بڑے معذرت خواہانہ لہجے میں اسے بتا رہا تھا کہ اس کی فلم کا یونٹ بھی پیرس پہنچا ہوا ہے۔ اس کے مطابق فلم شیڈول پہلے سے طے شدہ تھا جبکہ ان کی شادی بالکل اچانک انجام پائی تھی اس لیے وہ یونٹ کے ساتھ شوٹنگ پر جانے کے لیے مجبور تھا۔ دوسری طرف اسے اپنے ہنی مون کو لیٹ کرنا اور اس سے دور رہنا بھی گوارا نہیں تھا اس لیے اس نے اسے بھی اپنے ساتھ ہی پیرس لے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ بطور ہیرو یہ سندر کی پہلی فلم تھی۔ اس سے قبل وہ شاعر، گلوکار اور موسیقار کی حیثیت سے اپنے آپ کو اچھی طرح منوا چکا تھا اور شہرت کی بلندیاں تیزی سے طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ فلم ساز اسے بخوشی منہ مانگا معاوضہ ادا کرنے کے

لیے تیار رہتے تھے۔ سندر کی عمر زیادہ نہیں تھی اور وہ تھا بھی خاصا خوش شکل اور اسمارٹ اس لیے اگر مہتا نے اسے اپنی اس فلم میں ہیرو کاسٹ کرلیا تھا تو کچھ ایسا غلط نہیں تھا۔ دیکھا جائے تو یہ فلم پوری طرح سندر ہی کی تھی۔ فلم کے گانے لکھنے سے لے کر گلوکاری اور موسیقی تک ہر کام اسی کو کرنا تھا۔ وہ پریقین تھا کہ بطور ہیرو خود کو منوا لینے میں کامیاب ہوجائے گا۔ اس کے مقابل ہیروئن کا کردار ایک نئی اداکارہ ادا کررہی تھی اس لیے دیکھا جائے تو فلم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا سارا بوجھ سندر کے شانوں پر ہی تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کے سب سے فیورٹ فلم ساز مہتا کا یہ تجربہ کسی طور ناکام نہ ہونے پائے۔ ایک اچھی بیوی کی طرح اس نے شوہر کی ان مجبوریوں کو سمجھ لیا تھا اور اپنے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی بھی کروائی تھی۔ اپنے مہتا سے تعلقات کی بنیاد پر سندر نے اپنے لیے یہ خصوصی رعایت حاصل کرلی تھی کہ فلم یونٹ کے ساتھ ٹھہرنے کے بجائے اس کے ساتھ علیحدہ ہوٹل میں ٹھہرے۔ اس طرح وہ اپنی پرسنل اور پبلک لائف کو الگ الگ رکھ سکتا تھا۔ کل دن کا زیادہ تر حصہ انہوں نے طویل فلائٹ کی وجہ سے تھکے ہوئے ہونے کے باعث آرام کرتے ہوئے گزارا تھا اور سندر بس تھوڑی دیر کے لیے اسے دریا کی سیر کے لیے لے گیا تھا جہاں ایک ریسٹورنٹ میں انہوں نے ڈنر کیا تھا۔ آج صبح ناشتے کے بعد ہی وہ اپنے کام کے سلسلے میں چلا گیا تھا اور سہ پہر کو واپس آیا تھا۔ سارا دن بوریت میں گزارنے کے باوجود وہ اس سے شکوہ نہیں کرسکی تھی کہ یہ تو اسے معلوم تھا کہ ایک پبلک فگر کی لائف پارٹنر ہونے کی اسے یہ قیمت تو ادا ہی کرنی پڑے گی۔ ہوٹل واپس آنے کے بعد سندر نے اس سے تھوڑی دیر ہی بات چیت کی تھی پھر وہ آرام کی غرض سے لیٹ گیا تھا۔ بھارت اور پیرس کے الگ الگ ٹائم زون میں ہونے کی وجہ سے اس کی اپنی بائیولوجیکل کلاک بھی فی الحال پیرس کے ٹائم کے ساتھ مطابقت نہیں پیدا کرسکی تھی چنانچہ دن دیہاڑے وہ بے حد گہری نیند سوگئی اور اب اٹھی تو سندر جاچکا تھا اور رات نے پیرس میں اپنے پر پھیلا لیے تھے۔ کچھ دیر کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے کے بعد اس نے باتھ روم کا رخ کیا اور جب وہاں سے باہر نکلی تو اس کے جسم پر نیلی جینز کے ساتھ ریڈ ٹی شرٹ سجی ہوئی تھی جو اس کی شہابی رنگت پر خوب جچ رہی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اس نے ہلکا سا میک اپ کیا اور لمبے بالوں کو برش کرکے یونہی کھلا چھوڑ دیا پھر فر کا سرخ ہی مفلر اپنی گردن کے گرد لپیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ دوپہر میں اس نے سندر کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا اور وہ آیا تو کھانا کھا چکا تھا۔ اکیلے کھانے کا اس کا موڈ نہیں ہوا اس لیے لنچ گول کرگئی ویسے بھی وقت کی الٹ پھیر نے سب کچھ گڑبڑ کیا ہوا تھا لیکن اس وقت تو شدید بھوک لگ رہی تھی۔ وہ چاہتی تو کمرے میں ہی کھانا طلب کرلیتی لیکن مستقل تنہائی سے بچنے کے لیے اس نے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں جا کر کھانا پسند کیا تھا۔ ڈائننگ ہال میں ایک میز سنبھالنے پر ویٹر نے اس کے سامنے مینیو کارڈ لاکر رکھا تو وہ تذبذب میں پڑگئی۔ مینیو میں درج کوئی بھی ڈش اس کے لیے شناسا نہیں تھی اور اسے ڈر تھا کہ اس نے یونہی تکے سے کام لیا تو کچھ بھی الابلا اس کے گلے پڑسکتا ہے۔

"مے آئی ہیلپ یو؟" اپنی الجھن میں اسے پتا بھی نہیں چلا اور ایک نوجوان اس کے بالکل سامنے والی نشست پر براجمان ہوکر اس سے دریافت کرنے لگا۔ اس نے چونک کر نوجوان پر نظر ڈالی اس کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی پھر بھی وہ فیصلہ نہیں کرسکی کہ اس سے اپنی الجھن شیئر کرے یا نہیں۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ کس الجھن میں ہیں اسی لیے مدد کی پیشکش کی ہے۔" اس بار اس نے اردو استعمال کی اور خود ہی ہاتھ بڑھا کر اس سے مینیو کارڈ لے لیا پھر اس میں درج ڈشز کے بارے میں بریف کرنے لگا۔ اس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں اس نے اپنے لیے کھانے کا آرڈر دیا۔

"تھینک یو سو مچ مسٹر......" ایک مشکل مرحلہ گزر جانے کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے اپنے مددگار کا شکریہ ادا کیا۔

"عاشر انور، مجھے عاشر انور کہتے ہیں۔" اس نے جھٹ اپنا تعارف کروادیا۔ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جو ہر ایک کے ساتھ جلد گھل مل جاتے ہیں۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر عاشر۔ مجھے......"

"میں جانتا ہوں کہ آپ مسز سندر کپور ہیں۔" وہ اپنا تعارف کروانے جارہی تھی کہ اس نے تیزی سے دخل دیتے ہوئے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔

"مجھے امید نہیں تھی کہ یہاں پیرس میں کوئی مجھے پہچان لے گا۔" اس کے لہجے میں وہی خوشی تھی جو نئی نئی شہرت کا مزہ چکھنے والا پبلک میں اپنے اچانک پہچان لیے جانے پر محسوس کرتا ہے۔

"آج کی دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔

نیٹ پر آپ کی شادی کی خوشی میں مسٹر سندر کپور کی طرف سے دی گئی ڈنر پارٹی کی تصویریں دیکھی تھیں۔ میرا اپنا تعلق انڈیا سے ہے اس لیے وہاں کی خبریں دلچسپی سے ڈھونڈتا، پڑھتا اور دیکھتا ہوں۔'' عاشر نے اس کے صبیح چہرے کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسے انداز میں یہ بات کی کہ وہ ہنس دی۔ سندر کے اپنی زندگی میں آنے کے بعد وہ اپنی قوت تسخیر سے بہت اچھی طرح واقف ہو گئی تھی اور ہر پرشوق نگاہ کو اپنا حق سمجھ کر قبول کر لینے کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔

''شاید آپ لوگ ہنی مون ٹرپ پر نکلے ہوئے ہیں لیکن ایسی صورت میں تو مسٹر سندر کو آپ کے ساتھ ہونا چاہیے۔'' اس کی پیرس میں موجودگی کی وجہ کا اندازہ لگا لینے کے بعد اس نے بڑی بے تکلفی سے اعتراض بھی جڑ دیا۔

''اصل میں سندر کو شوٹنگ پر جانا تھا اس لیے میں اس وقت آپ کو تنہا نظر آ رہی ہوں۔'' قدرے کھسیائے ہوئے اس نے اپنے تنہا ہونے کی وجہ بیان کی۔

''گویا ایک تیر سے دو شکار کر رہے ہیں مسٹر سندر۔ ویسے ان جیسے مصروف انسان کے لیے ایسا کرنا ضروری بھی ہے۔ ایک طرف شوبز کی مصروفیت دنیا ہے تو دوسری طرف فائیو اسٹار ہوٹل کا انتظام۔ انہوں نے بیک وقت خود کو ایک اچھا آرٹسٹ اور بزنس مین ثابت کر دکھایا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ آج کل کے اسٹارز اپنے فیوچر کو سیف کرنے کی فکر پہلے کرتے ہیں ورنہ پہلے تو جب تک شہرت ساتھ دیتی تھی عیش کرتے اور بعد میں وقت بدلنے پر برے حالوں میں رہنا پڑتا تھا۔ میں ایسے کئی اسٹارز سے واقف ہوں جو آج لوگوں کو یاد بھی نہیں ہیں۔'' وہ خاصا باتونی تھا اور اپنے اس باتونی پن میں اسے ایک اہم اطلاع دے گیا تھا ورنہ وہ واقف ہی نہیں تھی کہ سندر کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا مالک بھی ہے۔

''آپ تو خاصی معلومات رکھنے والے بندے ہیں۔''

''آج کے دور میں انسان کا باخبر رہنا ضروری ہے ورنہ بے خبری میں اپنا نقصان کر بیٹھتا ہے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا لیکن اس نے توجہ نہیں دی۔ اس کا ذہن سندر کے ہوٹل میں اٹکا ہوا تھا۔

''اچھا تو مسٹر باخبر ذرا یہ تو بتایئے کہ سندر کا یہ فائیو اسٹار ہوٹل کہاں ہے؟'' اسے تجسس نے یہ سوال کرنے پر اکسایا جسے سن کر عاشر مسکرایا اور ذرا آگے کی طرف جھک کر پوچھنے لگا۔

''آپ میری معلومات چیک کر رہی ہیں یا اپنی معلومات میں اضافہ؟''

''آپ جو بھی سمجھ لیں۔'' اس نے شانے اچکا کر خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کی اور ویٹر کو اپنی ٹیبل پر دیا گیا آرڈر سرو کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''مسٹر سندر کا یہ ہوٹل کھنڈالہ میں ہے اور اس سے سالانہ انہیں لاکھوں روپے کی انکم ہوتی ہے۔ اگر آپ جاننا چاہیں گی تو میں آپ کو بالکل ایگزیکٹ فگر بھی معلوم کر کے بتا دوں؟'' اس نے کچھ شریر سے لہجے میں پیشکش کی۔

''نو تھینکس، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اگر کچھ معلوم کرنا ہوگا تو سندر سے معلوم کر لوں گی۔'' ایک اجنبی سے اس موضوع پر گفتگو کرنا اچھا نہیں لگا حالانکہ ایک بیوی کی حیثیت سے اسے اپنی بے خبری بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ خود کو یہ کہہ کر بھی بہلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ابھی ان کی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ سندر کے بارے میں سب کچھ جان لے گی لیکن ساتھ ہی اسے یہ بات بھی کھٹک رہی تھی کہ اس نے ایک دن باتوں باتوں میں سندر سے کسی روز کھنڈالہ چلنے کی فرمائش کی تھی تو وہ اسے ٹال گیا تھا حالانکہ وہاں کے ذکر پر اسے فطری طور پر یہ بتانا چاہیے تھا کہ کھنڈالہ میں اس کا اپنا ہوٹل ہے۔

''میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ مسٹر سندر نے آپ کو ہوٹل کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔'' اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے عاشر نے دعویٰ کیا تو اس کے نیپکن پھیلاتے ہاتھ پل بھر کو رکے۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سندر کے بارے میں اور بھی کئی ایسی باتیں ہوں گی جو میرے علم میں نہیں ہیں اور جنہیں میں وقت کے ساتھ ساتھ جان لوں گی۔ آپ پلیز ڈنر لیجیے۔'' لہجے کو باوقار بنا کر کہتے ہوئے اس کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس بندے کو وہاں سے چلے جانے کو کہے لیکن اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ڈنر کی طرف متوجہ کیا۔

''شکریہ۔'' وہ بے تکلفی سے اس کے ساتھ شامل ہو گیا اور اس کی ناپسندیدگی محسوس کر لینے کے باوجود گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کو بہت سی باتوں کا علم ہو جائے گا لیکن مسز سندر ان میں سے ہر بات ایسی تو نہیں ہوگی جس سے آپ کو فرق نہ پڑے کچھ باتوں سے انسان کو بہت فرق پڑتا ہے۔''

''آپ کی اس بات کا مطلب جان سکتی ہوں میں؟'' اس نے مشروم کو کانٹے میں پھنسایا اور عاشر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذرا کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔ اب اسے یہ

لگنے لگا تھا کہ یہ شخص سندر سے کوئی عناد رکھتا ہے اور اسے اس کے شوہر سے بدگمان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''مطلب بھی آپ کو وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ آتا جائے گا۔'' اس کے لہجے سے متاثر ہوئے بغیر اس نے اسی سابقہ انداز میں جواب دیا اور بڑی رغبت سے کھانے سے انصاف کرنے لگا۔

''آپ کا اپنا تعارف کیا ہے مسٹر عاشر؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کیا کرتے ہیں اور یہاں پیرس میں کس سلسلے میں قیام کر رکھا ہے؟'' وہ کچھ دیر تو اسے کھاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر چبا چبا کر پوچھا۔

''آپ نے یہ سوال ذرا لیٹ کیا۔ بہرحال میں بتا دیتا ہوں کہ میں ایک جرنلسٹ ہوں اور سندر کپور کے فلم یونٹ کے ساتھ ہی یہاں آیا ہوں۔'' عاشر نے گویا اس کے سر پر دھماکا کر دیا۔ اس کا منہ کی طرف کانٹا لے جاتا ہاتھ درمیان میں ہی معلق رہ گیا اور وہ ہکا بکا اس کی صورت دیکھنے لگی۔

''پلیز آپ ڈنر لیجیے۔ میں آپ کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔'' اس کی کیفیت کو بھانپ کر وہ تسلی دینے والے لہجے میں بولا لیکن ایک جملے سے اس کی تسلی کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ تو اپنی بے وقوفی کو کوس رہی تھی کہ کیسے ایک اجنبی سے اتنی آسانی سے بے تکلف ہو گئی حالانکہ سندر کپور کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اسے محتاط رہنا چاہیے تھا۔ میڈیا والے تو چھوٹی سے چھوٹی بات کا ایشو بنانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ اب یہ اس کے سامنے بیٹھا جرنلسٹ نہ جانے کس انداز میں خبر بناتا۔

''سندر کپور کی سندر پتنی ہنی مون ٹرپ پر اکیلی ڈنر کرتی ہوئی۔ سندر کپور کی پتنی اپنے پتی کے رازوں سے نہ آشنا۔ سندر کپور نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر شوٹنگ پر جا نکلے۔'' کئی طرح کی سرخیاں تھیں جو اس کا ذہن اسے بنا بنا کر دکھا رہا تھا۔

''میں نے کہا ہے کہ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔'' اس کے چہرے کے پل پل بدلتے رنگوں کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر تسلی دینے لگا لیکن اسے قرار کہاں تھا اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو نیپکن ہٹا کر ایک طرف ڈالا اور میز پر دھرا اپنا پرس اٹھا کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت اسے اپنے کمرے کے سوا کوئی جائے پناہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

☆☆☆

دونوں پیر سمیٹ کر صوفے کے اوپر رکھے اس نے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائی ہوئی تھی اور ہاتھوں کو پیروں کے گرد اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست تھیں۔ دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں چاندی کی ایک انگوٹھی تھی جس میں بڑا سا عقیق جڑا ہوا تھا۔ اس کی لمبی سنگ مرمری تراشی ہوئی انگلیوں میں سجی یہ واحد انگوٹھی گویا اس کے ہاتھوں کی خوب صورتی کو بڑھانے سے زیادہ شاید اپنی خوش بختی پر نازاں تھی کہ ایسے حسین ہاتھ میں سجنا نصیب ہوا ہے کہ خود اس کی شان بڑھ گئی ہے۔ اپنے اس ملکوتی حسن سے بے نیاز وہ سرخ و سیاہ امتزاج کے شلوار قمیص میں ملبوس بڑی محویت سے ٹیلی وژن کی اسکرین کی طرف متوجہ تھی۔

شانے پر دھرا سرخ و سیاہ ٹائی اینڈ ڈائی کا دوپٹا صوفے سے نیچے زمین تک پہنچا ہوا تھا لیکن اسے ذرا خبر نہیں تھی اور کسی سنگی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی اس طرح اسکرین کی طرف متوجہ تھی کہ مبادا پلک بھی جھپکی تو منظر بدل جائے گا۔

کمرے کے اندر آتے شکیل نے اسے یوں بیٹھا دیکھا تو خود بھی ساکت رہ گیا۔ وہ یوں ساکت بیٹھی کسی سنگ تراش کا شاہکار لگ رہی تھی اور وہ دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتا سوچ رہا تھا کہ آخر اس لڑکی کے کتنے روپ ہیں اور یہ ہر روپ میں اتنی خوب صورت کیوں لگتی ہے کہ دل دھڑکنا بھولنے لگتا ہے؟

اپنے اندر ابھرتے سوالوں سے الجھتا وہ اس سے کچھ فاصلے پر جا بیٹھا لیکن اسے خبر نہیں ہوئی۔ شکیل نے بھی اس کی محویت کو نہ توڑا وہ خود ہی اس ٹرانس سے اس وقت باہر آئی جب اسٹیج پر نغمہ سرا گلوکار تالیوں کی گونج میں لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوا منظر سے غائب ہوا اور گویا مجسمے میں زندگی کی لہر جاگ اٹھی۔ پہلے اس نے پلکیں جھپکیں پھر ہاتھوں کو جنبش دے کر ایک دوسرے سے الگ کیا اور آخر میں ٹانگیں سیدھی کر کے صوفے سے نیچے زمین پر دھریں۔ اسی وقت اسے شکیل کی وہاں موجودگی کا احساس ہوا۔

''ارے شکیل بھائی آپ کب آئے؟'' اس نے قدرے حیرت سے چونک کر دریافت کیا۔

''جب تم ساری دنیا سے بے خبر ٹی وی میں مصروف تھیں۔'' شکیل نے جواب دیا تو وہ جھینپ گئی۔ ''لگتا ہے تمہیں موسیقی کا بہت شوق ہے؟'' شکیل نے اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی اچھی موسیقی کا، کوئی کوئی گلوکار یا موسیقار ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی آواز اور دھن ذہن کو جکڑ لیتی ہے ورنہ میں ہر ایک کو سننا پسند نہیں کرتی۔'' اس نے اپنی فطری بے نیازی کے ساتھ ایک ادا سے جواب دیا۔

''گویا حضرت جو ابھی اسٹیج پر موجود تھے آپ انہیں ماہرِ فن ہونے کی سند دیتی ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے قدرے پُرمزاح لہجے میں پوچھ رہا تھا لیکن صبا بالکل سنجیدہ تھی۔

''یہ تو میرے موسٹ فیورٹ سنگر ہیں۔''

''ارے......'' شکیل حیران ہوا۔ ''اب ایسا بھی نہیں ہے آپ جیسی لڑکیوں نے زیادہ ہی سر چڑھا رکھا ہے۔''

''آپ تو ایسے کمنٹس دے رہے ہیں جیسے وہ آپ کا رقیب ہو۔'' صبا نے اس کا مذاق اڑایا۔

''تم جتنے غور سے اس کی پرفارمنس دیکھ رہی تھیں وہ مجھے اپنا رقیب ہی محسوس ہوا۔'' شکیل نے بڑی بے ساختگی سے اس کی بات کا جواب دیا جس پر وہ منہ کھولے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو، میرے سر پر سینگ تو نہیں نکل آئے ہیں۔ چلو آؤ باہر والا لان میں چلتے ہیں۔ بڑے ماموں کی فیملی آئی ہوئی ہے۔ میں تمہیں یہی اطلاع دینے آیا تھا۔'' اسے ٹوکتے ہوئے شکیل نے گفتگو کا موضوع بدل دیا تو وہ بھی سابقہ بات پر زیادہ غور کرنے کے بجائے اس پر خفا ہونے لگی۔

''اطلاع دینے آئے تھے اور سارے جہاں کی باتیں کرنے کے بعد اتنی دیر سے بتا رہے ہیں۔''

''غلطی ہوگئی، معاف کردو۔'' شکیل نے فوراً ہتھیار ڈال دیے کہ وہ تو پہلے ہی اس سے ہار چکا تھا۔ اس کے اس انداز پر ہنستی ہوئی باہر کی طرف بڑھتی صبا کو خبر نہیں تھی کہ اس کی یہ ہنسی کیسی سحر انگیز ہے جو شکیل کے ساتھ ساتھ کسی اور دل کو بھی اسیر کرسکتی ہے۔

☆☆☆

اس نے بلیو جینز پر پنک کلر کی سلیولیس ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ٹی شرٹ سے نکلتے اس کے عریاں بازوؤں کی رنگت گلابی ٹی شرٹ کی رنگت سے ہم آہنگ تھیں۔ بائیں بازو پر اس نے گلابی اور سفید نگوں سے مرصع ایک بازوبند باندھ رکھا تھا جس پر سورج کی کرنیں پڑتیں تو نگ جھلملا اٹھتے۔ اس کے گھنے سیاہ چمک دار بال پشت پر پھیلے ہوئے تھے اور سر پر تنکوں کا بڑا سا ہیٹ تھا۔ وہاں پھرتے بھانت بھانت کے چہروں میں بھی وہ بے حد نمایاں تھی اور جو نظر ایک بار اس پر پڑتی تھی دوبارہ پلٹ کر ضرور آتی تھی لیکن ہر ایک سے بے نیاز دریا پر نظریں جمائے وہ جانے اس کی لہریں گن رہی تھی یا پھر ڈولتی کشتیوں کا نظارہ کر رہی تھی یا شاید دونوں میں سے کوئی کام نہیں کر رہی تھی۔ اس کی گھور سیاہ آنکھوں میں دریا کے عکس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ شاید ان سوچوں کی پرچھائیاں جو اس کے ذہن میں چکرا رہی تھیں۔ یکایک اس نے کلک کی ہلکی سی آواز سنی تو چونک کر آواز کی طرف پلٹی۔ اس روز ہوٹل میں ملنے والا فوٹو گرافر عاشر انور کیمرا ہاتھ میں لیے ڈھٹائی سے مسکرایا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

''تمہیں بغیر پرمیشن میری تصویر کھینچنے کی ہمت کیسے ہوئی؟'' اس نے غضب ناک لہجے میں اس سے باز پرس کی۔

''سوری میڈم، آئی ایم ریئلی سوری لیکن بات یہ ہے کہ دریا کے پیش منظر میں کھڑی آپ اتنی خوب صورت لگ رہی تھیں کہ میں خود کو روک ہی نہیں سکا۔ میں ایک فوٹو گرافر ہوں اور میرا کیمرا ایسے کسی منظر کو دیکھ کر خود بخود ہی چل پڑتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے ایسے انداز میں صفائی پیش کر رہا تھا کہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اپنے عمل پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔

''میں راہ میں کھلا کوئی پھول نہیں ہوں مسٹر عاشر کہ آپ نے پسند کیا اور تصویر کھینچ لی۔ اخلاقی طور پر آپ مجھ سے اجازت لینے کے پابند تھے۔'' اس کے لہجے کی تختی میں کوئی کمی نہیں آئی۔

''شاید آپ اتنی ہائپر اس لیے ہو رہی ہیں کہ میں سندر کپور جیسا باحیثیت نہیں ہوں جو اپنی دولت کے بل بوتے پر ہر پسند آجانے والے پھول کو اپنے کالر میں سجالیتا ہے۔'' عاشر کا جملہ اسے کسی چابک کی طرح لگا۔

''واٹ ڈو یو مین؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے دولت کے لالچ میں سندر سے شادی کی ہے؟'' غصے کی شدت سے اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔

''ایک دنیا یہ الزام لگاتی ہے آپ کو مجھ سے سن کر برا کیوں لگا؟'' وہ بھی جیسے بدتہذیبی و بے رخی پر اتر آیا تھا۔

''جبکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے تو ڈھنگ سے سندر کے اثاثوں کا بھی علم نہیں ہے۔'' وہ جیسے یکدم ہی نڈھال ہوگئی۔ عاشر کو بھی ذرا شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔ ابھی حال ہی میں تو خود اس نے اسے سندر کے ہوٹل کے بارے میں آگاہ کیا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ سندر کے اثاثوں کی تفصیل نہ جاننے والا بھی یہ تو جانتا ہی تھا کہ وہ روپوں میں کھیلتا ہے اور یہ لڑکی جس نے ساری دنیا کو چھوڑ کر سندر کو اپنایا تھا یونہی تو اس کی نہیں ہوگئی تھی۔ سندر نے اسے اپنے بس میں کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا تھا۔

''آئی ایم سوری، مجھے بس یونہی غصہ آگیا تھا۔ آپ

کو اگر اپنی تصویر کھینچنے پر اعتراض ہے تو میں وہ آپ کو دے دوں گا ویسے بھی یہ تصویر میں نے کہیں چھپوانے کے لیے نہیں کھینچی تھی بس یونہی بے اختیاری میں کھینچ بیٹھا تھا۔'' وہ اس کا نڈھال اور ہارا ہوا انداز برداشت نہیں کرسکا اور معذرت کرنے لگا۔ وہ ایک بار پھر دریا کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپ آج پھر تنہا ہیں جبکہ اس وقت تو شوٹنگ بھی نہیں ہو رہی؟'' وہ فلم یونٹ کی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

''سندر رات بھر کی شوٹنگ سے تھکے ہوئے ہیں اور ہوٹل میں سو رہے ہیں۔'' اس بار اس نے بہت سادگی سے جواب دیا تھا تو عاشر کی آنکھوں میں ہمدردی اتر آئی۔ کل رات شوٹنگ دو بجے رات کو ختم کردی گئی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ سندر اپنی بیوی کے پاس واپس جانے کے بجائے ایک دوسرے ہوٹل میں فلم کی نوخیز ہیروئن کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ وہاں سے وہ یقیناً صبح واپس آیا ہوگا اور فلمی دنیا کے طریقوں سے ناواقف بیوی کو رات بھر شوٹنگ میں مصروف رہنے کا بتا کر اطمینان سے سو گیا تھا لیکن یہ لڑکی جو ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی سندر کی اپنی دیوانگی کے نتیجے میں اس کی زندگی کا حصہ بنی تھی اس سلوک کی حق دار تو نہیں تھی۔

''اوہ تو میڈم اس لیے اداس ہیں لیکن اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ کو سندر صاحب کی مصروفیات کا اچھی طرح اندازہ ہے انہیں ان کی تھکن اتارنے دیں۔ آئیں میں آپ کو پیرس کی سیر کرواتا ہوں۔ اس خوب صورت شہر میں ایک خوب صورت خاتون اداس رہیں یہ مجھے منظور نہیں۔'' سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئے آخر میں وہ قدرے شوخی سے بولا تو وہ بھی بے دلی سے مسکرا دی لیکن عاشر کی پیشکش قبول کرنے سے انکار نہیں کیا۔ اس روز وہ دونوں کئی گھنٹوں تک ساتھ گھومتے رہے۔

''آج میں نے نیٹ پر سندر اور کلپنا کی وہ تصویر دیکھی ہے جو کسی فوٹو گرافر نے تین بجے رات کو انہیں ایک ساتھ کسی ہوٹل میں جاتے دیکھ کر اتاری تھی۔'' وہ چائے اور اسنیکس کے لیے ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں بیٹھے تو اس نے عاشر کو بتایا اور اس کی شرمندگی مزید گہری ہوگئی۔ وہ جس تصویر کا ذکر کر رہی تھی وہ اسی نے تو کھینچ کر اپ لوڈ کی تھی۔

''اور آپ اسی لیے اداس تھیں؟''

''ہاں، کیا مجھے نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے چائے کی پیالی کے کنارے پر اپنی مخروطی انگلی کو پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''میرے خیال میں تو نہیں۔'' عاشر نے اپنے شانے اچکائے۔ ''یہ سب باتیں گلیمر کی دنیا کا حصہ ہیں اور سندر کپور سے شادی کرتے وقت آپ کو اس سب کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے تھا۔'' اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''مجھے غور سے دیکھو عاشر، کیا میں ایسی عورت ہوں کہ میرے شوہر کو مجھ سے بے وفائی کی ضرورت پیش آئے؟'' وہ اپنے زعم حسن میں یہ سوال کرنے کی حق دار تھی لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ جس دنیا سے وابستہ ہوگئی تھی وہاں کئی پری چہروں والیاں بڑی آسانی سے مٹی میں مل جاتی تھیں اور اس کی حیثیت تو سندر کپور کے اس پسندیدہ کھلونے سے بڑھ کر نہیں تھی جسے اس نے منہ مانگی قیمت پر حاصل کیا تھا۔

''اگر آپ میرا مشورہ مانیں میڈم تو ان سب باتوں کو نظر انداز کرنا سیکھ لیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس پر عمل کرکے آپ سندر کپور کے ساتھ کامیاب زندگی گزار سکتی ہیں، دوسری صورت میں آپ کے حصے میں تلخیاں اور اختلافات ہی آئیں گے اور جہاں تک میرا خیال ہے آپ اس کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔'' کرسی پر ذرا پیچھے ہوکر بیٹھتے عاشر نے پورے خلوص اور سنجیدگی سے اسے مشورہ دیتے ہوئے اس پر اس کی پوزیشن واضح کی تو وہ دم بخود رہ گئی۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ واقعی اس کے پاس کوئی دوسرا آپشن موجود نہیں تھا۔ محبت کتنی جلدی سمجھوتے کی راہ پر چل پڑی تھی۔ دکھ کے شدید احساس سے اس کی آنکھ سے بے اختیار ایک آنسو ٹپک پڑا لیکن دوسرے کو اس نے بے قابو ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ایک اجنبی پر وہ اپنا آپ جتنا عیاں کرچکی تھی اس سے زیادہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عاشر نے بھی اس کی اس کیفیت کو محسوس کیا اور اسے اس کا بھرم قائم رکھنے کا موقع دینے کے لیے چپکے سے نظر چرا گیا۔

☆☆☆

''کیا ہوا شکیل بھائی آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟'' سیاہ رنگ کے اسٹائلش سوٹ میں ملبوس ٹک سک سے تیار وہ شکیل کے سامنے آکر کھڑی ہوئی تو وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ جو عام حلیے میں بھی خاص لگتی تھی اتنے اہتمام سے تیار ہونے کے بعد تو کوئی ماورائی مخلوق ہی محسوس ہو رہی تھی جس کے وجود سے گویا کرنیں پھوٹ رہی تھیں لیکن آج پہلی بار ایسا ہوا کہ اسے دیکھ کر شکیل کا دل خوشی کے بجائے اداسی سے بھر گیا۔ وہ جسے بہت خاموشی سے چاہتا رہا تھا کسی اور کی ہونے والی تھی اس کے لیے یہ احساس بہت تکلیف دہ تھا اور وہ تھی کہ اسے احساس ہی نہیں تھا بلکہ اس کی جگمگاتی آنکھوں کو دیکھ کر تو لگتا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔

"آپ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔ جلدی تیار ہو جائیں نا راحت کی بچی مسلسل امی کے کان بھرنے میں لگی ہوئی ہے۔ اگر امی اس کی باتوں میں آگئیں تو مجھے بھی جانے سے روک لیں گی۔" اس کی حالت سے بے خبر وہ اپنی ہی فکروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے موسیقی کے شوق کو دیکھتے ہوئے شکیل نے پتا نہیں کتنی جدوجہد کے بعد آج شام ہونے والے ایک میوزیکل کنسرٹ کے دو ٹکٹ حاصل کیے تھے۔ ٹکٹ صرف دو ہی مل سکے تھے اس لیے کسی تیسرے کا جانا ممکن نہیں تھا اور اسی بات پر راحت ذرا خفا تھی کہ وہ لوگ اسے چھوڑ کر خود انجوائے کرنے جا رہے ہیں۔ آمنہ بیگم کو بھی یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی تھی لیکن وہ بھتیجے کی مروت میں چپ ہو گئی تھیں اور صبا کا بس نہیں چلتا تھا کہ فوراً سے بیشتر روانہ ہو جائے کہ مبادا ذرا سی تاخیر ماں کے ارادے کو بدل ڈالے چنانچہ وہ شکیل کے سر پر سوار ہو گئی، ناچار اسے تیار ہو کر نکلنا ہی پڑا۔ بائیک پر پیچھے بیٹھی صبا کی قربت اس کو مزید بے چین کر رہی تھی اور وہ یہ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے کسی اور کی بنائی جانے والی ہے۔

"کیا بات ہے آج آپ گونگے کا گڑ کھائے کیوں بیٹھے ہیں؟" ہوا سے اڑتی اپنی زلفوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتی وہ اس کے کان کے پاس زور سے بولی تو اس کی آواز میں محسوس کی جانے والی کھنک تھی۔

"لیکن تم تو بہت خوش لگ رہی ہو۔" شکیل بے اختیار شکوہ کر بیٹھا۔

"ہاں خوش تو میں بہت ہوں۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی تو شکیل کے کانوں کے پاس جلترنگ بج اٹھی۔

"شاید تمہیں خوش ہونا بھی چاہیے۔ جاوید کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی کوئی لڑکی خواہش کر سکتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لیے اپنی اداسی پر قابو رکھنا مشکل تھا۔ جاوید اس کا تایا زاد اور صباحت کا ماموں زاد تھا جس کا رشتہ صبا کے لیے آنے کی خبر اسے آج صبح ہی ملی تھی اور وہ مضطرب ہو اٹھا تھا۔ شکل، تعلیم اور اسٹیٹس ہر اعتبار سے جاوید اس سے بہتر تھا اس لیے وہ سمجھتا تھا کہ صبا کے والدین اس رشتے کو رد نہیں کر سکیں گے جبکہ خود اس کی پوزیشن یہ تھی کہ جاوید کا رشتہ آجانے کے بعد وہ اپنے والدین کو صبا کے لیے رشتہ دینے پر بھی راضی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے والد بڑے بھائی کے بیٹے کے مقابل اپنے بیٹے کا رشتہ دینا بدتہذیبی قرار دیتے اور ہرگز یہ بات منظور نہ کرتے کہ بیٹے کی خواہش کے پیچھے اپنے بھائی سے تعلقات خراب کریں جبکہ زیر تعلیم شکیل کا رشتہ جاوید جیسے سیٹلڈ لڑکے کے مقابلے میں قبول کیے جانے کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔

"میرے خوش ہونے کا جاوید بھائی سے کیا تعلق؟" اس کے اندر اٹھتے جوار بھاٹے سے بے خبر وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"کیوں تمہیں معلوم نہیں ہے کیا کہ تمہارے لیے جاوید کا رشتہ آیا ہے؟" وہ جو اس کی خوشی کا سبب جاوید کے رشتے کو سمجھ رہا تھا اس کی حیرانی پر حیران ہوا۔

"معلوم ہے لیکن اس میں خوش ہونے والی کیا بات ہے میرے لیے تو آئے دن کوئی نہ کوئی رشتہ آتا ہی رہتا ہے تو کیا میں ہر رشتے پر خوش ہوتی رہوں گی۔" یہ جملہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں زعم تھا جو ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ شکیل خود بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس جیسی لڑکی کے لیے ڈھیروں کے حساب سے رشتے آتے ہوں گے۔

"میں سمجھا کہ تمہیں جاوید کا رشتہ پسند آیا ہوگا۔" اس کی بے نیازی سے شکیل کی جان میں جان آئی۔

"وہ کوئی ایسے شہزادہ سلیم بھی نہیں ہیں کہ میں ان کے رشتے پر خوش ہو جاؤں۔ میں نے امی سے صاف کہہ دیا ہے کہ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔" اس نے ناک چڑھاتے ہوئے بتایا اور دوپٹے کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی جو ہوا سے اڑ کر شکیل کے شانے پر چلا گیا تھا۔

"تو تم شادی کے لیے کسی شہزادہ سلیم کا انتظار کر رہی ہو؟" اس کے انکار کا سن کر شکیل ہلکا پھلکا ہو گیا اور شوخی سے پوچھا۔

"تو میں کسی شہزادی سے کم ہوں کیا؟" اس نے شوخ ہنسی کے ساتھ سوال کیا تو شکیل نے بریک لگا کر بائیک کو روکا اور اس کی طرف دیکھا۔ اپنی صراحی دار گردن اکڑا کر بیٹھی وہ کسی مغلیہ شہزادی کا پرتو لگ رہی تھی۔

"تم تو انارکلی ہو جسے دیکھ کر ہر سلیم اپنا دل ہار سکتا ہے۔" اس نے بہت جذب سے یہ جملہ کہا تو اس نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا اور شوخی سے بولی۔

"بس اب مجھے بنانا چھوڑیے اور اندر چلیے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ شو شروع ہو جائے اور ہم یہیں کھڑے باتیں کرتے رہیں۔ ایسا ہوا تو یہ آج کی انارکلی آپ کو دیوار میں چنوا دے گی۔"

"یہ انارکلی تو خاصی خونخوار ہے بھئی۔" شکیل ہنسا اور اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو وہاں پہلے ہی ایک جم غفیر موجود تھا۔ وہ بھی اسی کا حصہ بن گئے۔ اس موقع پر شکیل نے صباحت کا بڑا پرجوش روپ دیکھا۔ وہ بے تحاشا خوش تھی۔ خاص طور پر جب سندر

کپور اسٹیج پر آیا اور اس نے پرفارمنس دی تو صبا کا یہ حال تھا کہ لگتا تھا ابھی ناچ اٹھے گی۔ اس کے انگ انگ سے جوش اور خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"مجھے اس کا آٹو گراف لینا ہے شکیل بھائی۔" وہ دو تین گانے گانے کے بعد اسٹیج سے اترا تو دوسروں کی طرح تالیاں پیٹ پیٹ کر ہاتھ سرخ کر لینے والی صبا نے سرخ چہرے کے ساتھ اس سے فرمائش کی۔

"مشکل ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ سندر کپور کی سیکیورٹی خاصی سخت ہوتی ہے اور اس کے گارڈز کسی کو اس کے قریب نہیں جانے دیتے۔" شکیل نے مجبوری کا اظہار کیا۔

"میں کچھ نہیں جانتی، مجھے ہر حال میں سندر کا آٹو گراف چاہیے۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔ یہاں ان دونوں کو ایک دوسرے تک اپنی بات پہنچانے کے لیے بالکل نزدیک ہونے کے باوجود چیخ چیخ کر بولنا پڑ رہا تھا اور شکیل کے لیے تو اس کے چہرے پر موجود خفگی کے تاثرات ہی کافی تھے۔ وہ صباحت کے لیے آسمان سے تارے بھی توڑ کر لا سکتا تھا، سندر کپور کے آٹو گراف کی کیا بات تھی۔

"اچھا آؤ کوشش کرتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر ہجوم سے باہر لے گیا اور اس راستے کی طرف بڑھا جو صرف آرٹسٹوں اور مخصوص لوگوں کی آمدورفت کے لیے مخصوص تھا۔ سندر کپور ڈانس اور گائیکی کی لائیو پرفارمنس دینے کے بعد پیشانی سے پھوٹتے پسینے کو رومال سے صاف کرتا ہوا اپنے گارڈز کے جلو میں چلا آ رہا تھا لیکن گارڈز اس کے فینز کی دیوانگی کو قابو میں کرنے میں ناکام تھے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں پروانوں کی طرح اس پر ٹوٹ رہے تھے۔ گارڈز شاید ان سے سختی سے نمٹتے لیکن سندر نے انہیں اشارہ کیا تو وہ ذرا نرم پڑ گئے۔ سندر مسکراتا ہوا اپنے فینز کو آٹو گراف دینے لگا۔ صباحت بھی شکیل سے اپنا ہاتھ چھڑوا کر اس کی طرف دوڑ پڑی۔ اس وقت اس کا جوش اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس نے ہجوم میں گھس کر بھی سندر تک رسائی حاصل کر لی اور اپنی آٹو گراف بک اس کی طرف بڑھائی۔ سندر کی انگلیاں آٹو گراف بکس پر دستخط کر رہی تھیں اور اسے آٹو گراف لینے والوں کے چہروں پر نظر ڈالنے کی فرصت نہیں تھی لیکن صباحت کی آٹو گراف بک نے اسے چونکا دیا۔ کسی سہیلی کی طرف سے تحفے میں دی گئی اس آٹو گراف بک کے ہر صفحے پر سبز رنگ کے پاکستانی پرچم کا عکس تھا۔ سندر نے نظر اٹھا کر صباحت کی طرف دیکھا۔

"پاکستانی؟" اس کے لبوں سے یک لفظی سوال نکلا۔

"جی ہاں۔" صباحت نے کپکپاتی آواز میں اسے جواب دیا۔ اس ہجوم میں وہ واحد تھی جسے سندر نے یک لفظی ہی سہی گفتگو کا شرف بخشا تھا۔ اس کا جواب سن کر سندر مسکرایا اور اگلے ہی لمحے اس کا قلم صباحت کی آٹو گراف بک پر متحرک ہو گیا۔ اسے آٹو گراف دینے کے بعد وہ کسی اور طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ صباحت کامیابی حاصل کر کے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہجوم سے باہر نکلی اور یہ دیکھنے کہ سندر کپور نے کیا لکھا ہے آٹو گراف بک پر نظر ڈالی۔ یہ دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے رنگ دوڑ گئے کہ وہاں سندر کے دستخط کے علاوہ چند ہندسے جگمگا رہے ہیں۔

"لاؤ بھئی دکھاؤ کہ سندر نے تمہیں کیا آٹو گراف دیا ہے؟" شکیل جو پیچھے ہی رہ گیا تھا اس کے قریب آ کر بولا تو وہ چونک گئی۔

"کچھ نہیں صرف دستخط کیے ہیں۔" اس نے جلدی سے آٹو گراف بک بند کر کے اپنے پرس میں ڈال لی۔

☆☆☆

مسلسل رونے کی آواز پر اس نے بہ مشکل آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک دھندلا سا چہرہ تھا لیکن وہ اس چہرے کے ایک ایک نقش کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے اسے ظاہری آنکھوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے وجود کا حصہ تھا اور اپنے وجود سے کون ناواقف ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنی دھندلائی ہوئی بصارت کے باوجود اس کی خوب صورت آنکھوں سے نکل کر پھولے پھولے گالوں پر پھسلتے آنسوؤں کو دیکھ سکتی تھی۔ اسے اس کے رونے کی وجہ بھی معلوم تھی لیکن اپنی حالت کی وجہ سے ایسی جھنجلاہٹ میں مبتلا تھی کہ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ حقیقتاً اس وقت وہ اتنی شدید تکلیف میں مبتلا تھی کہ اسے خود کسی تیماردار کی ضرورت تھی لیکن ننھا بچہ ان سب باتوں کو کہاں سمجھ سکتا تھا۔ اس کے اپنے تقاضے اور ضروریات تھیں جب ہی اس نے ماں کو دوبارہ آنکھیں بند کرتے دیکھ کر اس کے رخساروں پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اب پتا نہیں بچے نے ہاتھ ہی زور سے مارا تھا یا اس کے روز بروز لاغر ہوتے جسم میں قوت برداشت کی بے حد کمی ہو گئی تھی جو اسے بہت شدت کی چوٹ محسوس ہوئی اور اس نے جھنجلا کر اسے ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔ پہلے ہی سے روتا ہوا بچہ تھپڑ کھا کر مزید گلا پھاڑ کر رونے لگا۔ اس کے رونے سے اپنے سر کے درد میں مزید اضافہ محسوس ہونے لگا لیکن سر سے زیادہ تکلیف کی لہر سینے میں اٹھی

تھی جہاں موجود ایک ماں کا دل بری طرح تڑپ اٹھا تھا اور اسے ملامت کر رہا تھا کہ اس نے بچے پر ناحق ظلم کیا۔ اس چھوٹے سے فلیٹ کی محدود فضا میں کسی بھی توجہ اور تفریح سے محروم وہ بچہ کم از کم اتنا حق تو رکھتا تھا کہ اسے زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کی جائیں اور بھوک...... بھوک تو ایسا عفریت ہے جو بڑوں بڑوں کی چولیں ہلا دیتا ہے اس ننھی جان کی پھر بساط ہی کیا تھی۔ احساس ندامت میں گھری وہ چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی وقت اس نے کی ہول میں چابی گھومنے کی آواز سنی اور پھر کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ یہاں آنے والے واحد فرد سے واقف تھی اس لیے آنے والے کے بارے میں کسی تجسس کا شکار نہیں ہوئی۔

"ارے بھئی یہ ہمارا بیٹا کیوں رو رہا ہے؟" خوشبو کا جھونکا اندر آیا اور پھر آنے والے نے بولتے ہوئے روتے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔

"مما نے مالا۔" بچے نے ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ نے مما کو تنگ کیا ہوگا۔" اس نے بستر پر بیٹھی عورت پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ ہڈیوں کا ڈھانچا بنا جسم، بکھرے بال اور آنکھوں کے نیچے پڑے گہرے حلقے اس کی حالت کا پتا دے رہے تھے۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔" بچے کے جواب سے اس کے رخساروں سے آنسو چنتی انگلیاں ذرا سی ساکت ہوئیں۔ اس نے عورت کو ملامت کرنے کے لیے لب کھولے لیکن پھر کچھ سوچ کر لب بھینچ لیے اور بچے کو گود میں اٹھاتے ہوئے کچن میں پہنچ گیا۔ فریج کھول کر اس میں سے ڈبل روٹی اور جیلی کی بوتل نکالی اور بچے کو وہیں کچن کاؤنٹر پر بٹھا کر اسے ڈبل روٹی لگا کر ایک سلائس تھمایا۔ بچے نے پھرتی سے سلائس کھانا شروع کیا۔ وہ جس رفتار سے کھا رہا تھا اس سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ بھوکا ہے۔ اس کے لیے ایک اور سلائس پر جیلی لگانے کے بعد اس نے فریج سے دودھ کا ٹیٹرا پیک نکالا اور اسے گرم کرنے کے لیے ساس پین میں ڈال کر چولھے پر رکھ دیا۔ اس دوران بچے نے دوسرا سلائس بھی ختم کر لیا تھا۔ اس نے اسے ایک اور سلائس کھانے کے لیے دیا اور نیم گرم دودھ میں اوولٹین ملا کر دو گلاسوں میں نکالا۔ گلاسوں کو ٹرے میں رکھنے کے بعد اس نے ایک ہاتھ سے ٹرے تھامی اور دوسرے سے بچے کو اٹھا کر دوبارہ کمرے میں واپس آیا۔ وہ دوبارہ بستر پر لیٹ چکی تھی اور آنکھیں کھولے چھت کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ٹرے اس کے قریب سائڈ ٹیبل پر رکھی اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"یہ دودھ پی لو۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"دل کی سننا بے کار ہوتا ہے۔ اٹھو اور یہ دودھ پیو۔" اس نے اس کا ہاتھ تھام کر ایک جھٹکے سے اٹھا کر بٹھا دیا اور زبردستی گلاس اس کے ہاتھوں میں تھمایا۔ وہ جیسے مجبور ہو کر گھونٹ گھونٹ دودھ پینے لگی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ بچے کی طرف متوجہ ہوا جو ہاتھ میں موجود سلائس ختم کر چکا تھا۔ پہلے کی نسبت اس نے یہ سلائس قدرے اطمینان سے کھایا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کا پیٹ کافی حد تک بھر گیا ہے۔ اس نے اوولٹین ملے دودھ کا دوسرا گلاس اٹھا کر بچے کے لبوں سے لگایا تو بچہ مزے لے لے کر دودھ پینے لگا۔

"جو کچھ ہوا اس میں اس معصوم کا کوئی قصور نہیں تھا پھر تم اسے کس بات کی سزا دیتی ہو؟" بچے کو دودھ پلاتے ہوئے اس نے عورت کو ملامت کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ کسی ایسی عورت کا بندوبست کر دیتا ہوں جو دن بھر سونو کی دیکھ بھال بھی کرے اور گھر کے کام کاج بھی دیکھ لے لیکن تم راضی نہیں ہوئیں حالانکہ تمہیں خود کسی کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے۔" وہ خفا خفا سا بول رہا تھا۔

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ میں مزید تماشا نہیں بننا چاہتی۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی یہاں آئے اور میرا حال دیکھے۔ میں بس خاموشی سے مرجانا چاہتی ہوں۔" عورت نے پہلی بار لب کھولے اور تلخی سے جواب دیا۔

"اور یہ...... اس کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے۔" اس نے غصے سے ذرا بلند آواز میں کہتے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کیا جو دودھ پینے کے بعد اونگھ رہا تھا۔

"میں اسے ان ہاتھوں میں دے دوں گی جو اس کی صحیح پرورش کر سکیں بس ذرا میں خود میں تھوڑی سی ہمت پیدا کر لوں۔" اس کا لہجہ یکدم شکستہ ہو گیا۔ وہ دل میں اس کے لیے گہرا دکھ محسوس کرنے لگا اور بچے کو صوفہ کم بیڈ پر لٹا دیا تاکہ وہ آرام سے سو سکے۔

"اس نے مجھے پیغام بھیجا ہے، وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔" خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے اپنے لب کھولے۔

"میں دوبارہ یہ غلطی نہیں کرسکتی۔" عورت کی آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے۔ ان لپکتے شعلوں میں جانے ماضی کے کون کون سے مناظر کا عکس تھا کہ وہ اپنے بے حد لاغر وجود کے باوجود ایک آتش فشاں محسوس ہونے لگی۔

"میرے خیال میں تمہیں اس سے مل لینا چاہیے۔ شاید وہ تم سے معافی مانگنا چاہتا ہے اور آریان کے حوالے سے بھی کچھ کہنا چاہتا ہے۔" وہ اسے سمجھانے لگا۔

"معافی......" اس نے اس ایک لفظ کو استہزائیہ انداز میں کھینچ کر ادا کیا پھر بڑبڑائی۔ "معافی تو میں خود اپنے لیے حاصل نہیں کر پائی پھر اسے کیسے دے سکتی ہوں۔ اسے کہہ دو کہ میں اسے قیامت تک نہیں معاف کرسکتی بلکہ اللہ بھی معاف نہیں کرے گا۔ جیسے اس نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی۔" اس کی آواز بتدریج بلند ہوتی چلی گئی۔ "اور رہی آریان کے حوالے سے کچھ کہنے کی بات تو اس سے کہنا ہمیشہ کی طرح آریان کے لیے سارے فیصلے جب تک میں زندہ ہوں خود کروں گی اور میرے مرنے کے بعد بھی کم از کم اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا کہ وہ میرے بیٹے کے حوالے سے کچھ کہہ سکے۔"

"میں تم سے اصرار نہیں کروں گا لیکن بہتر ہے کہ تم اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے سوچ لو۔" اس نے مشورہ دیا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں ضرورت کا سامان لینے اسٹور تک جارہا ہوں۔ واپسی میں میرے ساتھ ایک عورت بھی ہوگی۔ وہ بے سہارا گونگی، بہری عورت ہے جس سے تمہیں کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ تمہارا حال دنیا کو سنا کر تماشا بنانے کی قدرت ہی نہیں رکھتی۔" وہ قدرے سخت لہجے میں بولتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ عورت نے اس کے سخت لہجے کا برا نہیں مانا۔ وہ مان ہی نہیں سکتی تھی، کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ دنیا میں گنتی کے جو چند لوگ اس کے ساتھ مخلص ہیں وہ ان میں سے ایک ہے۔

☆☆☆

آٹوگراف بک کھولے وہ سندر کپور کے دستخط کے نیچے لکھے ہندسوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ ہندسے دراصل ایک موبائل نمبر تھا جو اسے رہ رہ کر حیران کررہا تھا۔

"سندر نے یہ موبائل نمبر میری آٹوگراف بک پر کیوں لکھا؟" اس نے پتا نہیں کون سی بار خود سے یہ سوال کیا۔ حالانکہ مطلب تو بالکل واضح تھا۔ سندر چاہتا تھا کہ وہ اس نمبر پر اس سے رابطہ کرے لیکن کیوں؟ اپنی قوتِ تسخیر سے واقف ہونے کے باوجود وہ اس سوال کا درست جواب حاصل کرنے سے قاصر تھی۔ سندر جس دنیا کا باسی تھا وہاں چاند چہروں کی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے اپنے بے حد حسین ہونے کے باوجود وہ پوری طرح یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ وہ ایک نظر میں اس کے حسن کے آگے دل ہار گیا ہوگا۔ اپنی اس الجھن کو دور کرنے کے لیے بالآخر اس نے سندر سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ ان بے شمار لڑکیوں میں سے ایک تھی جو سندر پر جان چھڑکتی تھیں اور اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے دیوانی رہتی تھیں۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی سندر کو روبرو دیکھ سکے گی لیکن کمال ہوگیا تھا کہ نہ صرف اس نے سندر کو لائیو پرفارم کرتے ہوئے دیکھا تھا، اس سے آٹوگراف لیا تھا اور اب اس کا دیا ایک موبائل نمبر ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ ایسے میں وہ اس سے رابطہ کرنے کا فیصلہ نہ کرتی تو اور کیا کرتی لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ آمنہ بیگم نے کبھی بیٹیوں کو اس بات کی اجازت ہی نہیں دی تھی اور یہاں ماموں کے گھر وہ لینڈ لائن استعمال کرنے کی ہمت نہیں کر پارہی تھی کیونکہ ٹیلی فون سیٹ گھر کے ایسے کمرے میں رکھا ہوا تھا جہاں زیادہ تر کوئی نہ کوئی بیٹھا ہی رہتا تھا۔ خاص طور پر نانی تو اکثر وہیں پائی جاتی تھیں اور ان کی قوت سماعت اس عمر میں بھی بڑی زبردست تھی۔ دو دن سے وہ یوں بھی اس سے تھوڑی سی ناراض تھیں کہ اس نے ان کے لائق فائق پوتے کے رشتے سے انکار کردیا تھا۔ البتہ آمنہ اور نجم الدین نے اس سلسلے میں اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ جاوید کی تمام تر خوبیوں کے باوجود وہ بیٹی کو پردیس بیاہ کر بھیجنے میں تذبذب کا شکار تھے۔ خاص طور پر آمنہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ آمد و رفت اور رابطوں کی تمام تر سہولیات کے باوجود دوری بہر حال دوری ہی ہوتی ہے اور انسان خاص خاص مواقع پر اکثر اپنا دل مسوس کر رہ جانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

"میں شکیل بھائی سے ان کا موبائل مانگ لیتی ہوں۔" وہ اپنے مسئلے پر سوچتی رہی تو آخر ایک حل بھی سوجھ ہی گیا اور فوراً ہی شکیل کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہورہا تھا۔

"آج کا سورج کہاں سے نکلا ہے اور حیرت ہے کہ نکلتے ہی سیدھا میرے کمرے میں اتر آیا ہے۔" شکیل نے اسے دیکھ کر چھیڑا۔ اس کا جاوید کے رشتے سے انکار سب کے علم میں آچکا تھا اس لیے شکیل کا موڈ ایک بار پھر خوش گوار تھا۔

"مجھے آپ کا موبائل چاہیے شکیل بھائی۔" صبا کوئی بچی نہیں تھی جو اس کے جذبات کو سمجھ نہ پاتی بس جان کر بے

نیازی برتتی تھی۔

"خیریت، اتنی صبح صبح موبائل کی کیا ضرورت پڑ گئی؟" شکیل چونکا۔

"آپ موبائل دے سکتے ہیں تو دے دیں اتنی انویسٹی گیشن کیوں کررہے ہیں؟" وہ بگڑی تو شکیل فوراً سنبھل گیا۔

"ارے نہیں بھئی انویسٹی گیشن کی کیا بات ہے۔ یہ لو، سمجھو تمہارا اپنا موبائل ہے۔" شکیل نے فوراً سیٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"تھینک یو۔" وہ مسکراتی ہوئی اس کے کمرے سے باہر نکل گئی اور پچھواڑے کی طرف جانکلی۔ یہ جگہ اپنے مشاغل کے لیے سب نوجوانوں کی پسندیدہ تھی لیکن یہاں عموماً شام کے وقت ہی رونق ہوتی تھی اس وقت تو ہو کا عالم تھا۔ اس نے چوبی تخت پر بیٹھ کر سندر کا نمبر پنچ کیا۔ رات سے اب تک وہ اس نمبر کو اتنی دفعہ دیکھ چکی تھی کہ اسے ازبر ہوگیا تھا۔ کئی گھنٹوں کے بعد کال ریسیو کی گئی اور اس نے سندر کی نیند میں ڈوبی ہوئی ہیلو سنی۔ اسے یکدم ہی احساس ہوا کہ گلیمر کی دنیا سے تعلق رکھنے والی کسی شخصیت کو فون کرنے کے لیے یہ وقت قطعی نامناسب تھا۔ وہ ہیلو کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے جھجک کر چپ سی ہوگئی۔

"اب اگر آپ نے اتنی صبح فون کرکے ڈسٹرب کرہی دیا ہے تو بات بھی کرلیں۔" دوسری طرف سے سندر کی کچھ بیزار سی آواز سنائی دی۔

"سوری، آئی ایم ویری سوری۔ میں رات سے سوچ رہی تھی کہ آپ کے دیے نمبر پر فون کروں یا نہیں اور جب فیصلہ ہاں میں ہوگیا تو انتظار نہیں کرسکی اور وقت کا خیال کیے بغیر نمبر ملالیا۔" اس نے بہت جھجکتے ہوئے دھیمی آواز میں یہ وضاحت پیش کی۔

"کون...... پاکستانی؟" اس بار سندر کی نیند مکمل طور پر غائب ہوچکی تھی اور وہ بہت بے تابی سے پوچھ رہا تھا۔

"جی۔" اس نے صرف ایک لفظ میں تصدیق کی۔

"بہت وقت لیا تم نے فیصلہ کرنے میں۔ میں تو کنسرٹ سے واپس آنے کے بعد سے تمہارے فون کا انتظار کررہا تھا۔" اس کے لہجے سے بے چینی عیاں تھی۔

"لیکن کیوں؟" حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"کیوں کا جواب تو شاید مجھے بھی پوری طرح نہیں معلوم۔ میں نے تمہیں ایک نظر دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اگر اسکینڈل بننے کا ڈر نہ ہوتا تو میں وہاں ہی تم سے پورا تعارف جاننے کی کوشش کرتا بس ایک آس پر تمہاری آٹوگراف بک پر اپنا نمبر لکھ دیا کہ شاید تم مجھے کال کرلو۔ اپنا نام تو بتاؤ پیاری لڑکی۔" اپنی مسحور کن آواز میں بولتا وہ اس کے حواسوں پر چھا رہا تھا اور اسے یوں لگتا تھا کہ اس کا دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ سندر کپور جس پر دنیا مرتی تھی اسے ایک نظر دیکھتے ہی اس کا اسیر ہوگیا تھا یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔

"میرا نام صباحت ہے لیکن زیادہ تر سب مجھے صبا ہی کہتے ہیں۔" اس نے کانپتی آواز میں سندر کو اپنے بارے میں بتایا پھر اس کے استفسار پر بہت کچھ بتاتی چلی گئی۔ درمیان میں شکیل کے موبائل کا بیلنس ختم ہوگیا تو سندر نے خود کال کرلی۔

"یہ میرا پرسنل نمبر ہے صبا جو میں بہت ہی خاص لوگوں کو دیتا ہوں۔ تم اس نمبر پر جب چاہو کال کرسکتی ہو میں نے بھی تمہارا نمبر سیو کرلیا ہے۔ اگر تم پرمیشن دو گی تو میں تمہیں اس نمبر پر کال کرلیا کروں گا۔" وہ تو جیسے اسے آسمانوں پر اڑائے لے جارہا تھا۔

"پلیز آپ کال مت کیجیے گا۔ یہ میرا نمبر نہیں ہے میں نے آپ کو کال کرنے کے لیے ایک کزن سے اس کا موبائل لیا ہے۔" اسے سندر کو حقیقت بتانی پڑی کیونکہ اسے بہرحال اس بات کا اندازہ تھا کہ سندر کپور چاہے کتنی بھی بیلی بریٹی سہی اسے اس سے تعلق رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس کی ماں تو اسے کزنز تک سے بہت زیادہ بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے کسی فرد سے ربط وضبط کا کیا سوال تھا۔ اسے تو کل رات بھی کنسرٹ سے واپس آنے کے بعد ماں سے اچھی خاصی ڈانٹ سننی پڑی تھی۔

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ تم ایسا کرو کسی بہانے سے آج کے دن یہ موبائل اپنے پاس رکھ لو میں کوئی سلوشن نکال کر تمہیں کال کرتا ہوں۔" سندر نے کہا تو اس نے یہ تجویز قبول کرلی اتنا تو وہ جانتی تھی کہ شکیل اسے نہ نہیں کرسکے گا، ہوا بھی یہی۔

"شکیل بھائی آپ برا نہ مانیں تو میں آج آپ کا موبائل اپنے پاس رکھ لوں۔ اصل میں پاکستان سے میری ایک سہیلی کا فون آنے والا ہے۔ میری رول نمبر سلپ کا کچھ مسئلہ ہے وہ کالج پہنچنے کے بعد معلومات کرکے مجھے کال کرے گی۔" اس نے شکیل کے دائیں طرف بیٹھتے ہوئے

اتنی دھیمی آواز میں اس سے یہ بات کہی کہ کچن میں ممانی کے ساتھ ہاتھ بٹاتی آمنہ تک اس کی آواز نہ پہنچ سکے۔

''ٹھیک ہے تم رکھ لو۔'' شکیل نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ جاوید کی طرح ناکامی کا منہ دیکھنے کے بجائے وہ پہلے صباحت کے دل میں اپنی جگہ بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لیے یہ سب کرنا تو ضروری تھا۔

''سو سویٹ آپ بہت اچھے ہیں شکیل بھائی۔'' اس نے بے ساختگی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شکریہ ادا کیا تو چائے کا گھونٹ بھرتے شکیل کے منہ میں مٹھاس سی گھل گئی حالانکہ ابھی تھوڑی دیر قبل وہ ماں سے شکوہ کر رہا تھا کہ آج آپ نے چائے میں چینی کم ڈالی ہے۔

☆☆☆

پیرس سے ان کی واپسی ہو گئی تھی اور واپس آتے ہی مصروفیات کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا کہ اسے سندر سے ڈھنگ سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔ ایک طرف سندر اپنی فلمی مصروفیات میں مگن تھا تو دوسری طرف اس کے لیے بھی بہت سی مصروفیات کا بندوبست کر ڈالا تھا۔

''تم بہت پریٹی ہو ہنی اور مجھے تم سے زیادہ دنیا میں کچھ اچھا نہیں لگتا لیکن میں چاہتا ہوں کہ دیکھنے والے کسی بھی اینگل سے تم پر آبجیکشن نہ کر سکیں۔ تم ایک ہیرا ہو جو ذرا سی تراش خراش کے بعد لوگوں کی آنکھوں کو چکا چوند کر سکتا ہے۔ سندر کپور کی پتنی کو ہر ہر اینگل سے پرفیکٹ نظر آنا چاہیے۔'' اس نے یہ چند جملے بہت محبت سے اس سے کہے تھے اور وہ سمجھ گئی تھی کہ سندر نے اسے اپنے ساتھ پیرس لے جانے کے باوجود دوسرے لوگوں سے الگ کیوں رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی دنیا کے طور طریقے سے آگاہ نہیں ہے پھر آگہی کے لیے تربیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ پڑھی لکھی تھی لیکن انگریزی روانی سے بولنے پر قدرت نہیں رکھتی تھی۔ اسے روزانہ تین گھنٹے اس کی ٹیوشن دی جانے لگی۔ اس کے علاوہ اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا سکھانے کے لیے ایک ٹرینر الگ سے تھی جو اسے جدید فیشن کے تقاضوں سے بھی آگاہ کرتی رہتی تھی۔ اس ٹرینر نے اسے کئی ایسی ویب سائٹس سے بھی متعارف کروایا تھا جہاں سے وہ جدید فیشن کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی تھی۔ اشیائے ضرورت و تعیش کی مختلف برانڈ سے لے کر نامور فیشن ڈیزائنر، جیولرز اور شاپنگ مالز تک نہ جانے کیا کچھ تھا جو اسے اس عرصے میں ازبر کروایا گیا تھا اور وہ ہر بار حیران ہوتی رہتی تھی کہ یہ دنیا کتنی وسیع ہے۔ وہ تو اب تک کنویں کے مینڈک کی سی زندگی گزارتی رہی تھی۔ ایک روز تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس کی ٹرینر نے اسے مختلف اقسام کی شرابوں کے نام، ان کی خصوصیات اور پینے کے صحیح اوقات یاد کروانے کے ساتھ ساتھ ڈرنک کی تیاری کے طریقوں سے آگاہ کرنا شروع کیا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے مس شلپا؟'' وہ الجھ سی گئی۔

''ضرورت ہے میم، مسٹر کپور کے ملنے جلنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہیں اور ان کی مسز کی حیثیت سے آپ کو ہر طرح کے لوگوں کو ڈیل کرنا پڑے گا اس لیے آپ کو یہ سارے مینرز بھی آنے چاہئیں۔ آپ صرف اتنے ہی میں پریشان ہو رہی ہیں حالانکہ مسٹر کپور کی انسٹرکشن ہے کہ میں آپ کو بھی ڈرنک لینے کے طور طریقے سکھاؤں۔ جب آپ مسٹر کپور کے ساتھ پارٹیز اٹینڈ کریں گی تو آپ کو ڈرنک لینی پڑے گی اس لیے بہتر ہے کہ پہلے ہی عادی ہو جائیں۔'' ٹرینر کے جواب نے اسے حیرت سے بھی آگے صدمے کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس رات وہ رات گئے تک سندر کے انتظار میں جاگتی رہی تھی ورنہ تو اب اکثر یہ ہوتا تھا کہ وہ اس کے آنے سے پہلے ہی سو چکی ہوتی تھی۔ اسے صبح جلدی جاگنا ہوتا تھا اور پھر پورا دن وہ اپنی نام نہاد تربیت کی وجہ سے اتنی تھک جاتی تھی کہ رات کو بہت دیر تک جاگ ہی نہیں پاتی تھی اور سندر کا یہ حال تھا کہ وہ آدھی رات سے پہلے کبھی واپس نہیں آیا تھا اور کبھی کبھی تو سرے سے آتا ہی نہیں تھا۔ اس کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کب آؤٹ آف سٹی ہے اور کب آؤٹ آف کنٹری اور بعض اوقات وہ شہر میں موجود ہو کر بھی آؤٹ آف فوکس ہو جاتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ بہت صبر سے وقت گزار رہی تھی کہ بہرحال اسے سندر کپور کی بیوی ہونے کا شرف حاصل ہے اور وہ اس سے محبت بھی کرتا ہے۔ جب ہی اسے تراشنے خراشنے کے لیے اتنی جدوجہد کر رہا ہے لیکن شراب نوشی...... شراب نوشی تو اس کے تصور سے بھی دور کی چیز تھی اس لیے وہ اس مرحلے کے آنے سے پہلے سندر سے بات کر لینا چاہتی تھی۔

''او مائی سوئٹ ہارٹ، آج تم جاگ رہی ہو۔'' گلابی نائٹی میں ملبوس اپنی خوب صورت بیوی کو دیکھ کر وہ بہکنے لگا بلکہ بہک تو وہ پہلے ہی رہا تھا۔ کیوں؟ اس کا جواب اس کی سانسوں سے آتی بدبو دے رہی تھی۔

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اپنی ناگواری پر قابو پاتے ہوئے اس نے بڑے ضبط سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''تو کرو نا میری جان۔'' وہ جوتوں سمیت بستر پر گرا اور اسے بھی ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

''پلیز سندر، میں بہت سنجیدہ ہوں۔'' وہ تھوڑے سے بلند لہجے میں بولی تو وہ شوخی بھول کر اس کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوا۔

''کیا بات ہے؟''

''مس شلپا کہہ رہی تھیں کہ مجھے شراب پینا بھی سیکھنا ہوگا۔'' اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''سو واٹ؟'' جواب میں اس نے بھویں اچکا کر یوں استفسار کیا جیسے اس کا مسئلہ سمجھنے سے قاصر ہو۔

''کیا مطلب؟ کیا آپ میرا مسئلہ نہیں سمجھتے ہیں؟'' وہ شاک کی سی کیفیت میں تھی۔

''تم ایک فضول بات کو مسئلہ بنا رہی ہو۔ ہماری دنیا میں سب پیتے ہیں۔ مہتا سے لے کر ڈیوڈ، عبدالرحمان جاوید، نادرہ اور نرگس تک۔ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر پریشان ہوا جائے اور تھکے ماندے گھر آئے پتی سے تکرار کی جائے۔ دنیا کے جھمیلوں سے بچ کر رات گئے گھر آنے والا مرد اپنی خوب صورت پتنی سے تکرار نہیں کچھ اور چاہتا ہے۔'' اس کا لہجہ بتدریج تبدیل ہوتا چلا گیا اور سانسیں بوجھل ہونے لگیں اپنے اس موڈ کے ساتھ وہ منٹوں میں اس پر چھا گیا۔ اس کی قربت کی دیوانی نے سمجھ لیا کہ اسے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سندر کے سامنے سپر ڈالنی ہوگی کہ محبوب کے حکم سے انکار تو ممکن ہی نہیں ہوتا ورنہ یہ محبت کے ان لکھے قانون کی خلاف ورزی شمار ہوتی ہے۔

☆☆☆

''ہاں بھئی صبا تیار ہو تو چلیں شاپنگ کے لیے؟'' شکیل نے کمرے کے دروازے پر آ کر اسے آواز دی تو وہ سینڈل کا اسٹریپ بند کر کے تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ گورے گورے پیروں میں سیاہ نازک سی سینڈل بہت جچ رہی تھی۔ اس نے سیاہ امبر ائیڈری والا فیروزی سوٹ پہن رکھا تھا جس کے ساتھ جارجٹ کا سیاہ اور فیروزی دھاری دار دوپٹا تھا۔ کانوں میں اس نے میچنگ کے ٹاپس پہن رکھے تھے اور چہرے پر نامحسوس ہونے والا ہلکا سا میک اپ تھا۔ شکیل اسے دیکھ کر حسب معمول مبہوت رہ گیا۔

''نایاب اور راحت کہاں ہیں؟'' شکیل کی محویت کو توڑنے کے لیے اس نے پوچھا۔

''وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ چکی ہیں۔ آپ کے سولہ سنگھار ختم ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔'' شکیل نے جواب دیا تو اس نے اس پر ایک خفا سی نگاہ ڈالی اور ایک ادا سے بولی۔

''کیا سر جھاڑ منہ پھاڑ اٹھ کر چل پڑتی؟''

''اس صورت میں بھی تم بری نہیں لگتیں لیکن اب تو راہ چلتوں کو گرانے کا انتظام کر بیٹھی ہو۔'' شکیل نے برجستگی سے اس کی بات کا جواب دیا پھر اس کے سراپا پر ذرا تنقیدی نظر ڈال کر بولا۔

''تم کوئی چادر لے لو تو اچھا ہے۔'' اس کا مشورہ سن کر صبا نے ذرا سا منہ بنایا پھر کچھ سوچ کر سیاہ رنگ کی چادر نکال کر اوڑھ لی۔ وہ خود بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی قمیص کی فٹنگ ذرا زیادہ ہی چست ہو گئی ہے اور ہاف آستینوں سے جھانکتے بازو بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔ یہ اہتمام اس نے آج دوپہر میں خود ہی کیا تھا۔ اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس کو فٹنگ اور فل آستینوں کو ہاف کرنے میں اسے تھوڑی سی محنت تو کرنی پڑی تھی لیکن اب وہ مطمئن تھی کہ اس کا لباس تھوڑا ماڈرن لگ رہا ہے۔ اس کی یہ کارستانی اس لیے چھپی رہ گئی تھی کہ آمنہ گھر کی جملہ خواتین کے ساتھ کسی عزیز سے ملاقات کے لیے گئی ہوئی تھیں گھر پر ہی موجود نجم الدین ظاہر ہے ان باتوں کا دھیان نہیں رکھ سکتے تھے۔ نایاب اور راحت کو بھی کچن میں مصروف ہونے کی وجہ سے خبر نہیں ہو سکی تھی۔

''آپ بھی نا آپی کمال کرتی ہیں۔ یونیورسٹی سے آتے ہی بے چارے شکیل بھائی کی جان کھالی کہ شاپنگ کے لیے چلنا ہے اور خود تیار ہونے میں اتنی دیر لگا دی۔'' وہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو راحت نے اسے ٹوکا۔ یہ گاڑی شکیل کے کسی دوست کی تھی جو وہ چند گھنٹوں کے لیے مانگ کر لایا تھا۔

''چلو کوئی بات نہیں، مہمانوں کا اتنا تو حق بنتا ہے۔'' شکیل نے بحث کی فضا بننے سے پہلے ہی معاملہ رفع دفع کر دیا۔ راحت اور نایاب پچھلی نشستوں پر بیٹھی تھیں چنانچہ صبا کو اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا پڑا تھا اور یہ اتنی سی بات بھی شکیل کے لیے بڑی خوشی کا سبب تھی۔ وہ ہواؤں میں اڑتا ہوا انہیں شاپنگ سینٹر تک لے گیا۔ صبا اس کے جذبات کو خوب سمجھتی تھی اور اسی کا فائدہ اٹھا رہی تھی البتہ اسے اندازہ تھا کہ شاپنگ سینٹر میں اسے شکیل کی طرف سے ہی سب سے زیادہ ہوشیار رہنا ہوگا۔ اس کی نظریں جس طرح اسے ہر وقت اپنے حصار میں لیے رکھتی تھیں ان سے بچ کر نکلنا آسان نہیں تھا لیکن خود اس کا جذبہ اتنا طاقت ور تھا کہ اس نے راہ نکال ہی لی۔

''شکیل بھائی آپ ذرا اس دکان سے ابو کے لیے کرتے تو دیکھ لیں میں جب تک اپنی خریداری کرتی ہوں۔'' اس نے ایک دکان کے گلاس ڈور کے سامنے رکتے

ہوئے شکیل سے یہ بات کہی جہاں خواتین کی ذاتی ضروریات کا سامان فروخت ہوتا تھا۔ شکیل نے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ اس قسم کی خریداری اس کی موجودگی میں نہیں کرسکتی قدم آگے بڑھا دیے۔ نایاب اور راحت پیچھے جیولری کی ایک دکان پر مصروف تھیں۔ شکیل کی نظروں سے غائب ہوتے ہی وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور پھر چند منٹوں میں ہی شاپنگ سینٹر کی نچلی منزل پر موجود اس ریسٹورنٹ میں پہنچ گئی جہاں آنے کا مشورہ اسے سندر نے دیا تھا۔ سندر کی بتائی ہوئی میز پر سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک شخص اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہوگیا۔

"آیئے میڈم، سر آپ کا انتظار کررہے ہیں۔" وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ احتیاطاً چادر کے پلو سے اپنا آدھا چہرہ بھی چھپالیا۔ وہ شخص اسے ایک قیمتی گاڑی تک لے گیا اور اس کا پچھلا دروازہ کھولا۔ وہ گاڑی میں بیٹھی تو یہ دیکھ کر اس کی سانس رکنے لگی کہ سندر خود بھی وہاں موجود ہے۔ سندر کے اتنے قریب ہونے کا تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

"چادر اتار دو۔ اس گاڑی کے شیشے ٹنٹڈ ہیں۔ باہر سے کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا۔" سندر نے اپنی مسحور کن آواز میں کہا تو وہ چونکی اور آہستہ سے چادر اتار دی۔ اب اس کا حسین سراپا پوری طرح سندر کے سامنے تھا اور وہ پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو اس کی خاطر ہی اتنے اہتمام سے تیار ہوئی تھی شرما سی گئی۔

"مجھے وشواس نہیں ہورہا ہے کہ تم اس سمے میرے ساتھ ہو۔" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ خواب ناک لہجے میں بولا تو صبا خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگی۔ سندر کپور جس کی ایک دنیا دیوانی تھی اس کے لیے ایسے الفاظ ادا کررہا تھا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔

"میں فلمی دنیا کا بندہ ہوں اور دیکھو... میرے ساتھ کیسا فلمی سین ہوا ہے۔ میں پہلی نظر میں تمہارے سامنے اپنا من ہار بیٹھا اور کسی فلمی ہیرو ہیروئن کی طرح ہی ہمیں آپس میں ملنے کے لیے اتنا کشٹ اٹھانا پڑا ہے۔" وہ جیسے اس کے کانوں میں امرت گھول رہا تھا اور وہ ایسی سحرزدہ تھی کہ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ گاڑی کون کون سے راستوں سے گزر کر کہاں جارہی ہے۔

"میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں کم سے کم آپ کے سامنے تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ آپ سچ مچ میرے ساتھ ہیں یا میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔" آخر اس نے بھی اپنے لب کھولے۔ گاڑی کے اگلے اور پچھلے حصے کے درمیان ایک شیشے کا پارٹیشن تھا اس لیے آواز ڈرائیور اور اس شخص تک نہیں جاسکتی تھی جو اسے ریسٹورنٹ سے گاڑی تک لایا تھا۔ وہ شاید سندر کا گارڈ تھا۔

"تم خود کو عام اس لیے کہہ رہی ہو کہ تمہیں آج تک مجھ جیسا چاہنے والا نہیں ملا ہوگا۔ میری نظریں جانتی ہیں کہ تم کتنی خاص ہو اور مجھے اختیار ملے تو میں تمہیں سجا سنوار کر ایسا بنادوں گا کہ دنیا کی نظریں تم پر سے ہٹنا بھول جائیں گی۔" سندر کی اس طرح کی باتوں میں راستہ کیسے تمام ہوا اسے علم نہ ہوسکا۔ وہ اسے اپنے ساتھ ایک سیون اسٹار ہوٹل لے کر آیا تھا۔ گاڑی سے سندر کے کمرے تک وہ دونوں الگ الگ پہنچے تھے۔ اس کی رہنمائی سندر کے گارڈ نے کی تھی۔

"میرا من تو چاہتا تھا کہ تمہارا ہاتھ تھام کر تمہیں اپنے ساتھ یہاں لاؤں لیکن تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ میڈیا والے کیسے ہماری بو سونگھتے پھرتے ہیں۔ مجھے اپنی پروا نہیں۔ میرا من تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارا ہاتھ تھام کر ساری دنیا کو بتادوں کہ یہ ہے میرے سپنوں کی رانی لیکن تمہاری بدنامی سے ڈرتا ہوں۔ تم شاید یہ سب افورڈ نہیں کرسکتیں۔ اسی لیے میں نے اتنی احتیاط کی ہے۔" ہوٹل کے عالیشان سوئٹ میں سندر کے روبرو یہ سب سنتے وہ کسی خواب نگری میں پہنچی ہوئی تھی۔ متوسط طبقے کی اس لڑکی نے اسکرین کے سوا سندر سمیت یہ سب کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھا ہی کب تھا اور ہر شے ہی اسے بہت متاثر کررہی تھی خاص طور پر سندر کا خود پر فدا ہونا۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن سندر کو اس نے ایک نظر میں ہی فتح کرلیا ہے۔ یہ احساس بڑا پرخمار تھا لیکن اس خمار میں بھی اسے ایک بات ضرور یاد رہی تھی کہ اپنی عزت کی حفاظت ہر حال میں کرنی ہے چنانچہ سندر کی وارفتگیوں کو بھی اس نے ایک حد سے زیادہ نہ بڑھنے دیا۔ اسے یہ فکر بھی لاحق تھی کہ وہ سب کی نظروں میں دھول جھونک کر سندر سے ملنے آئی ہے۔ پیچھے اس کے اس طرح غائب ہونے پر اچھا خاصا ہنگامہ مچا ہوا ہوگا۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سندر سے واپسی کا تقاضا کیا۔

"پھر کب ملنے آؤ گی؟ مجھے کل ممبئی واپس جانا ہے لیکن میں تمہاری خاطر سب کام چھوڑ کر یہاں رک سکتا ہوں۔" سندر نے گویا بحالتِ مجبوری اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے بہت بے قراری سے پوچھا۔

"میرا دوبارہ آنا بہت مشکل ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج بھی میں کتنی مشکل سے آئی ہوں اور آج جیسی ترکیب بار

بار نہیں لڑائی جاسکتی۔ ہم پاکستان میں ہوتے تو پھر بھی کوئی چانس تھا۔ وہاں میں کالج یا کسی دوست سے ملاقات کے بہانے گھر سے نکل سکتی تھی، یہاں ایسا کوئی بہانہ نہیں کیا جاسکتا۔" اس نے اپنی مجبوری بیان کی۔ اس وقت حقیقتاً وہ خود کو بڑا بے بس محسوس کررہی تھی۔ دل سندر سے بار بار ملنے اور ملتے رہنے کو مچل رہا تھا لیکن کوئی راہ نظر نہیں آرہی تھی۔

"ٹھیک ہے اس کا بھی کوئی حل سوچتے ہیں فی الحال تم اپنے پاس یہ موبائل رکھو۔ اس سے ہمیں آپس میں کانٹیکٹ رکھنے میں آسانی ہوگی۔" اس نے ایک نہایت مہنگا موبائل سیٹ اس کے حوالے کیا۔ عام حالات میں وہ کسی سے اتنا قیمتی تحفہ کبھی نہ لیتی لیکن اس وقت اس لیے قبول کرلیا کہ سندر سے رابطے کا اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ سندر نے اس کو بہت والہانہ انداز میں بھینچ کر وہاں سے رخصت کیا تو اس کا چہرہ خوشی اور شرم سے سرخ ہورہا تھا۔ وہ اسی گاڑی میں وہاں سے رخصت ہوئی جس میں بیٹھ کر یہاں آئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے خود کو اچھی طرح چادر میں لپیٹ لیا۔ ڈرائیور نے اس کی خواہش پر اس علاقے کے قریب اسے ڈراپ کردیا جہاں اس کا ننھیالی گھر واقع تھا۔ اس جگہ سے وہ ایک آٹو رکشا لے کر نانا کے گھر پہنچی تو سب نے اسے دیکھتے ہی زور زور سے بولنا شروع کردیا۔ شکیل جس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے اسے دیکھ کر سب سے زیادہ جوش میں آگیا۔

"کہاں چلی گئی تھیں تم۔ پچھلے دو گھنٹے سے میں تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہوں۔" اس نے صبا کو دونوں شانوں سے تھام کر تقریباً جھنجوڑ ڈالا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، ہاتھ ہٹائیں اپنا۔" وہ اس سے زیادہ بلند آواز میں چیخی۔ اس وقت وہ جارحیت ہی بہترین دفاع ہے والی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ شکیل بھی باوجود غصے اور پریشانی میں مبتلا ہونے کے اس کے اس طرزِ عمل پر ذرا سا ٹپٹا گیا اور اس کے شانوں پر رکھے ہاتھ تیزی سے ہٹائے۔

"صحیح تو پوچھ رہا ہے بچہ، کہاں تھیں تم اتنی دیر سے؟ کتنی دیر شاپنگ سینٹر میں تمہیں ڈھونڈنے کے بعد ہلکان ہوکر تینوں گھر واپس آئے ہیں کہ تم شاید گھر پہنچ گئی ہو لیکن تم یہاں بھی نہیں پہنچی تھیں۔ تمہارے ابو اور ماموں پریشان ہوکر خود شکیل کے ساتھ نکلنے لگے تھے لیکن تم ہو کہ سیدھی طرح جواب دینے کے بجائے الٹا غصہ کررہی ہو۔" وہ شکیل کو اونچی آواز سے ڈرا سکتی تھی لیکن آمنہ اس کی ماں تھیں۔ انہوں نے بغیر کسی لحاظ کے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

"میں کتنی پریشانی اور خواری کے بعد گھر پہنچی ہوں آپ کو کیا معلوم؟ آپ کو شکیل بھائی کی پریشانی کا احساس ہے لیکن میرا خیال نہیں کہ اتنی دیر میں کن حالات سے گزرتی رہی۔" اس نے فوراً ہی چھکوں پھکوں رونا شروع کردیا۔ ماموں جان فوراً لپک کر اس کے پاس پہنچے اور شفقت سے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"نہیں بیٹا، ایسی بات نہیں ہے ہمیں اصل پریشانی تو تمہاری طرف سے ہی تھی کہ تم نہ جانے کس مشکل میں گرفتار ہوگئی ہو۔ شکیل بھی پریشانی کی وجہ سے ہی تم سے ایسا برتاؤ کرگیا ورنہ یہ ایسا بدتمیز نہیں ہے۔" وہ اس کی دلجوئی کے ساتھ ساتھ بیٹے کی صفائی بھی پیش کرنے لگے۔ بڑی دیر میں جاکر اس نے اپنے آنسو پونچھے۔

"ہاں تو لڑکی اب پھوٹ بھی دے کہ تیرے ساتھ کیا بیتی؟ خدا لگتی کہوں تو مجھ بڑھیا کے تو اتنی دیر میں ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور لگتا تھا کہ دم اب نکلا کہ تب نکلا لیکن تو ہے کہ اصل پتا کہہ کر ہی نہیں دے رہی۔" اس بار نانی اماں میدان میں اتریں اور وہ اس کی ماں کی بھی ماں تھیں جنہیں وہ قطعی ٹال نہیں سکتی تھی چنانچہ پہلے سے ہی سوچی ہوئی کہانی سنا ڈالی۔

"شکیل بھائی کرتوں کی دکان پر تھے اور میں ایک دوسری دکان سے سامان دیکھ رہی تھی۔ وہاں مجھے کچھ پسند تو نہیں آیا لیکن غلطی سے کسی دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی اور بس بھٹک گئی۔ بڑی دیر تک میں ان لوگوں کو وہاں ڈھونڈتی رہی لیکن جب کوئی نہیں ملا تو میں نے سوچا یہاں بھٹکنے سے بہتر ہے گھر واپس چلی جاؤں لیکن گھر کا پتا بتانے میں مجھ سے غلطی ہوگئی اور رکشے والا مجھے کسی اور علاقے میں لے گیا بس پھر میں بھٹکتے بھٹکتے بہت مشکل سے گھر پہنچی۔ سچ پوچھیں نانی تو مجھے اتنا ڈر لگ رہا تھا۔ اکیلی لڑکی کسی اجنبی ملک میں بھٹکتی پھر رہی ہو تو اس کے دل کی کیا حالت ہوگی آپ سمجھ ہی سکتی ہیں۔" وہ لاڈ جتانے کو نانی کے شانے سے جا لگی۔

"اے ہٹو، تمہیں ضرورت ہی کیا پڑی تھی اکیلے سارے شہر میں بھٹکتے پھرنے کی۔ وہیں گیٹ کے پاس کھڑی ہوجاتیں۔ یہ لوگ باہر نکلتے تو تمہیں دیکھ لیتے۔" اس کی لاڈ سے متاثر ہوئے بغیر نانی نے مسئلے کا سادہ سا حل پیش کیا تو وہ دل ہی دل میں انہیں داد دیے بغیر نہ رہ سکی کہ اس عمر میں ان کا دماغ کیا خوب کام کرتا ہے۔ بہرحال وہ بھی ان کی نواسی تھی سو ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے نہایت معصومیت سے بولی۔

"واقعی نانی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن گھبراہٹ میں.... یہ سامنے کی بات مجھے سمجھ ہی نہیں آئی۔"

"تمہارا دماغ تو ہے ہی ایسا ناکارہ۔ ویسے تمہیں دنیا کی باتیں بنانی آتی ہیں لیکن وقت پر کام کی بات بجھائی نہیں دیتی۔" اس بار آمنہ نے اسے گھرکا۔

"بس اب جانے دو اور بچی کا پیچھا چھوڑو۔ جو ہوا سو ہوا۔ اللہ کا شکر ہے یہ صحیح سلامت واپس گھر تو آگئی۔" ماموں نے ایک بار پھر بھانجی کی سائڈلی۔

"ہاں یہ تو خیر اللہ کا احسان ہے کہ بچی خیریت سے گھر آگئی لیکن آئندہ کے لیے احتیاط کرنا۔ اے شکیل...... میں تجھے بتا رہی ہوں کہ خبردار جو آئندہ بڑوں کے بغیر لڑکیوں کو لے کر اکیلا گھر سے نکلا ہو تو۔" انہوں نے روئے سخن فوراً لاڈلے پوتے کی طرف کرلیا۔

"میری توبہ دادی اماں، میں تو خود آئندہ کے لیے کان پکڑتا ہوں۔" خاموش کھڑے شکیل نے سچ مچ کان پکڑ لیے تو سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ان افراد میں نجم الدین شامل نہیں تھے۔ بیٹی کے غیاب کی خبر سن کر وہ جتنے نڈھال ہوئے تھے اس کی واپسی پر شکرانے کے نفل ادا کرنے کی بھی انہیں اتنی ہی فکر ہوئی تھی اور وہ جلد از جلد یہ فریضہ انجام دینے کے لیے کسی تفصیل میں جائے بغیر فوراً ہی وضو کرنے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

"دبئی......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، دبئی۔" سندر نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"لیکن میں وہاں اکیلی جا کر کیا کروں گی؟" وہ الجھی۔

"اکیلی کہاں مس شلپا ہوں گی تمہارے ساتھ۔"

"پھر بھی میں نہیں جا رہی۔ میری طبیعت کچھ ڈل سی ہو رہی ہے۔ میرا کچھ کرنے کا دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا اور اپنی کمر کے نیچے تکیہ لگا کر بیڈ پر نیم دراز ہوگئی۔

"تم بڑے کمال کی عورت ہو یار۔ میرے کولیگز کی پتنیاں تو ہر دوسرے منتھ دبئی جانا چاہتی ہیں اور وہ بڑی مشکل سے انہیں ٹالتے ہیں۔" سندر نے ہنس کر اسے بتایا۔

"تو ان کی شادیوں کو کئی سال بیت گئے ہوں گے ناں ہماری شادی کو تو اتنا سا ہی عرصہ ہوا ہے میں تو سارا وقت آپ کے قریب رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے سندر کے شانے پر اپنا سر ٹکاتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

"ساتھ تو ہمیں ہمیشہ ہی رہنا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اس وقت دبئی ضرور جاؤ۔ وہاں جا کر تمہیں بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔ خوب دل بھر کر گھومنا اور شاپنگ کرنا۔ میں تو ویسے بھی آنے والے دنوں میں بہت مصروف رہوں گا۔ گھر واپس آنے کی فرصت بھی شاید ہی ملے۔" اس کے ریشمی بالوں سے کھیلتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے اسے سمجھانے لگا تو اسے قائل ہونا ہی پڑا۔

"ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں تو میں چلی جاتی ہوں ورنہ میرا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے ہامی بھری۔

"یہ بری بات ہے ہنی، مس شلپا بھی کمپلین کر رہی تھیں کہ آج کل تم کسی بھی چیز میں زیادہ انٹرسٹ نہیں لے رہی ہو۔" سندر نے اسے تنبیہ کی تو وہ خجل سی ہوگئی اور صفائی پیش کرنے لگی۔

"وہ بس...... میں نے کہا نا کہ میری طبیعت تھوڑی ڈل ہو رہی ہے۔"

"اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ تم دبئی جاؤ۔ دیکھنا وہاں جا کر تم کتنی فریش ہو جاؤ گی۔ تم شاید ابھی تک میری اس اچھا کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی ہو کہ میں تمہیں ایک بہت ہی پالشڈ اور گرومڈ پرسنالٹی دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ سندر کپور کی پتنی اس کے اسٹینڈرڈ کی نہیں ہے۔" وہ اس طرح اسے سمجھاتا تھا کہ اس کے پاس بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔

"اچھا نا بابا کہہ تو رہی ہوں کہ چلی جاؤں گی دبئی۔ اب تو خوش ہو جائیں اور آج جو قسمت سے میرے پاس ہیں تو اس وقت کو انجوائے کریں نا۔" وہ سندر کپور کی من پسند بیوی تھی اس لیے اسے ناز و ادا دکھانے کا حق رکھتی تھی۔

"ٹھیک ہے کرتے ہیں انجوائے۔ تم ذرا ڈرنک تو تیار کرو۔" سندر نے جواباً اس کے ساتھ ایک شوخ شرارت کی اور پھر فرمائش کر ڈالی۔ اس فرمائش پر وہ ذرا سی بجھ گئی۔

"کیا سوچنے لگیں یار ڈرنک کے بغیر میں کچھ بھی انجوائے نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں بتاؤں ہر اچھا گیت اور اچھی کمپوزیشن میں نے نشے کی حالت میں ہی تیار کی ہے۔ شراب تو میری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے اور یہ نہ ہو تو میں بالکل بے کار ہو جاتا ہوں۔ کچھ کر ہی نہیں پاتا۔ سچ بتاؤں تو پیے بغیر مجھے اپنی آواز بھی بھونڈی سی لگتی ہے۔" اپنی بات کہہ کر وہ زور سے ہنسا تو اسے ناچار اس کی فرمائش پوری کرنے کے لیے حرکت میں آنا پڑا۔ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ اس کا نتیجہ وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ سندر کو کسی دوسرے کی دلیل سے قائل ہونا آتا ہی

نہیں تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ مس شلپا کے سکھائے ہوئے طریقے کے مطابق ڈرنک تیار کر رہی تھی تو اس کا دل بجھا ہوا تھا لیکن سندر مسکرا رہا تھا۔

"زبردست، تم نے بہت اچھی ڈرنک تیار کی ہے۔" اس کی مرمریں انگلیوں سمیت جام تھام کر سندر نے ایک گھونٹ لیا اور توصیفی لہجے میں بولا تو اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"کہتے ہیں ایک دوسرے کا جھوٹا پینے سے محبت بڑھتی ہے، لو تم بھی پیو۔" یکدم ہی سندر نے جام اس کے ہونٹوں سے لگا دیا اور وہ سندر کی محبت کے لیے زہر بھی پی سکتی تھی، شراب تو کچھ بھی نہیں تھی۔ کم از کم اس لمحے اس نے یہی سوچا تھا۔

☆☆☆

اس نے ڈاکٹر کے خاموش ہونے پر اسے بے یقین نظروں سے دیکھا۔ اسے لگا کہ جو کچھ اس نے سنا اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو وہ سمجھی ہے اور ابھی ڈاکٹر ایسا کوئی جملہ کہے گا جس سے اس کی غلط فہمی دور ہو جائے گی لیکن ڈاکٹر کی نظروں میں موجود ترحم کہہ رہا تھا کہ کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے اور حقیقت وہی ہے جو وہ سن اور سمجھ چکی ہے پھر بھی اس نے دل کی تسلی کے لیے میز پر دھرا وہ لفافہ اٹھایا جس میں اس کی رپورٹس تھیں۔ لفافہ کھول کر رپورٹس نکالتے ہوئے اس نے دیکھا کہ اس کی انگلیاں لرز رہی ہیں۔ کانپتی انگلیوں سے اس نے بہ مشکل کاغذ کی تہ کھولی۔ وہاں وہی بھیانک حقیقت موجود تھی جسے ڈاکٹر کی زبانی سن لینے کے باوجود وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے، حقائق کبھی نہیں بدلتے۔

"میں آپ کے لیے یہ میڈیسنز لکھ رہا ہوں۔ اس اسٹیج پر علاج کی امید دلانا تو مشکل ہے لیکن آپ کی تکلیف میں کمی ضرور ہو جائے گی۔" نرم اور ہمدرد لہجے میں کہتے ہوئے ڈاکٹر نے ایک سفید کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے مشینی انداز میں وہ نسخہ تھام لیا جو اس کے مرض کا علاج نہیں تھا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بے جان انداز میں تھینک یو کہہ کر کرسی سے اٹھ گئی۔ ڈاکٹر کے کمرے سے اٹھ کر اسپتال کے لان تک پہنچنے کے لیے اسے اپنے پیروں کو گھسیٹنا پڑ رہا تھا۔ ایک بینچ تک پہنچ کر وہ گرنے کے انداز میں اس پر بیٹھ گئی۔ موسم سرد تھا اور ٹھنڈ گویا ہڈیوں تک میں اتر رہی تھی لیکن وہ یکدم ہر احساس سے بے نیاز ہوگئی تھی۔ اس کی گرم شال شانے سے پھسل کر بینچ سے نیچے لٹک رہی تھی لیکن اس کی توجہ کا مرکز صرف اور صرف اپنے ہاتھ میں موجود وہ کاغذات تھے جس میں اس کی عمر کا کل گوشوارہ موجود تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ مکمل خسارے میں رہی ہے۔ اپنے نقصان کا حساب کرتے ہوئے وہ بہت دیر تک اس بینچ پر بیٹھی رہی۔ کتنے ہی آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے رخساروں اور گریبان کو بھگو گئے۔ بہت دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ ایک پبلک پلیس پر بیٹھ کر آنسو بہا رہی ہے۔ پرس میں سے رومال نکال کر اس نے اپنے آنسوؤں کو خشک کیا اور پھر بہت تلخی سے سوچا۔

"یہ احساس زیاں، حیرت اور ماتم کیوں؟ میں نے جو زندگی گزاری اس کا حاصل تو یہی نکلنا تھا۔" پھر وہ وہاں سے اٹھ کر پارکنگ کی طرف بڑھ گئی جہاں اس کی قیمتی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی نے نہایت سبک رفتاری سے اسے اس کے محل نما گھر تک پہنچا دیا۔ گھر تک کا مختصر فاصلہ طے ہونے تک وہ اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر چکی تھی۔

"میں گھر چھوڑ رہی ہوں۔ کیا تم میری رہائش کا انتظام کر سکو گے؟" اس نے اپنے قیمتی موبائل سے آخری کال اس شخص کو کی جس کے تعاون کا اپنے سوال سے پہلے بھروسا تھا۔

"ہاں لیکن تم نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیسے کر لیا؟" حسب توقع اس نے فوراً ہامی بھر لی لیکن حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"تمہارے تمام سوالوں کے جواب میں ملاقات پر دوں گی۔ تم بس دس منٹ میں مجھے لینے آجاؤ، آجاؤ گے نا؟"

"ہاں۔" اسے ایک بار پھر اثبات میں جواب ملا تو اس نے موبائل کو پاور آف کر کے ایک طرف اچھال دیا۔ ٹھیک آٹھ منٹ بعد وہ اپنے شاندار گھر کے گیٹ سے باہر نکلی تو اس کے ساتھ اپنے ضروری کاغذات کے علاوہ صرف ایک شے موجود تھی۔ دو منٹ میں وہ پیدل چل کر اپنی اسٹریٹ کے کارنر تک پہنچی تو ایک گاڑی کے ٹائر اس کے قریب چرچرائے اور وہ دروازہ کھول کر اطمینان سے اندر بیٹھ گئی۔ پیچھے گیٹ پر کھڑا چوکیدار ہکا بکا تھا کہ آرام دہ گاڑی کو چھوڑ کر اس کی مالکن پیدل کدھر کو چل پڑی ہے لیکن اس کی اتنی اوقات نہیں تھی کہ اس سوال کو اپنے لبوں پر لا سکتا۔

☆☆☆

سندر کے کہنے پر وہ دبئی پہنچ گئی تھی۔ اس سفر میں مس شلپا اس کے ساتھ تھی اور اس کا ساتھ غنیمت تھا کیونکہ دبئی جیسی اجنبی سرزمین پر وہ خود سے تو انجوائے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ابن بطوطہ مال کدھر ہے اور شیخ زائد شاہراہ کدھر کو جاتی ہے۔ حمرہ اور شیرٹن ہوٹل کا محل وقوع

کیا ہے اور سمندر میں بادبانی کشتی کی طرح نظر آتے برج دبئی ہوٹل تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے۔ شلپا نے اسے پورا دبئی گھمایا۔ بہترین شاپنگ سینٹرز سے خریداری کروائی اور ہر قابلِ ذکر ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گئی۔ ان سارے کاموں کے دوران وہ اس کی معلومات میں اضافے کے ساتھ اس بات کا قرینہ بھی سکھاتی رہی کہ کہاں کس قسم کے رویوں کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ وہ جو دبئی آنے سے پہلے بہت اداس ہورہی تھی یہاں آکر نہ صرف بہل گئی بلکہ پوری طرح مگن ہوگئی۔ بغیر سوچے سمجھے بے تحاشا شاپنگ کرنے اور کرتے چلے جانے کا لطف بھی اس نے زندگی میں پہلی بار اٹھایا تھا۔ سندر سے اس کی کبھی کبھار فون پر بات ہوجاتی تھی اور وہ ننھے بچوں کی طرح اس کو ایک ایک بات تفصیل سے بتانے کی کوشش کرتی لیکن سندر کے پاس عموماً اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ تفصیل سے اس کی باتیں سن سکے۔ وہ وہاں سندر ہی کی ملکیت ایک اپارٹمنٹ میں مقیم تھی جو ہر طرح کی سہولیات سے آراستہ تھا۔ ایک روز سندر نے اسے اطلاع دی کہ مہتا صاحب دبئی آرہے ہیں اور وہ اسی کے اپارٹمنٹ میں قیام کریں گے چنانچہ وہ ان کی مہمان نوازی کا پورا خیال رکھے۔ وہ جانتی تھی کہ مہتا سندر کے لیے بہت اہم شخص ہے اس لیے بہت خیال سے اس کے لیے بیڈروم تیار کیا اور قسم قسم کے پکوان کا بھی انتظام کرڈالا۔ مہتا نے اس کے حسین انتظام کو خوب سراہا اور اسے مہتا کی خوشنودی کے لیے اس کے ساتھ پینے پلانے کی محفل میں بھی شریک ہونا پڑا۔ خود اس نے تو اپنی برداشت کے مطابق حد میں رہتے ہوئے ہی پی لیکن مہتا جام پر جام لنڈھاتا رہا اور نشے میں چور ہوکر آپے سے باہر ہونے لگا۔ ابتدا اس نے اس کی زبانی کلامی تعریف سے کی پھر فحش لطیفے سنانے لگا اور آخر میں دست درازی پر اتر آیا۔ یہ تیسرا مرحلہ ایسا نہیں تھا جو وہ برداشت کرجاتی۔ اس نے پوری قوت سے مہتا کو دھکا دے ڈالا، اس کا سر جاکرٹی وی ٹرالی سے ٹکرایا اور خون بہنے لگا۔ خون بہنے کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی کہ وہ پریشان ہوتی۔ ویسے بھی اسے شدید غصہ آرہا تھا اس لیے پروا کیے بغیر وہاں سے ہٹ کر اپنے بیڈروم میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے لاک کرلیا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ اب تک منظر سے غائب شلپا مہتا کو سنبھالنے کے لیے وہاں پہنچ چکی ہے۔ وہ ساری رات اس نے بہت بے چینی سے سوتے جاگتے گزاری۔ شلپا نے آکر اس کے دروازے پر دستک بھی دی لیکن وہ انجان بن گئی۔ صبح کے قریب جاکر اسے گہری نیند آئی ہی تھی کہ موبائل کی گھنٹی نے جگا دیا۔ یہ سندر کی کال تھی اس لیے وہ نظر انداز نہیں کرسکی اور ریسیو کا بٹن دبادیا۔

”تم نے مہتا صاحب کے ساتھ کیا حرکت کی ہے تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے۔ ابھی ان کا فون آیا تھا میرے پاس۔ وہ سخت ناراض ہیں کہ میری پتنی نے ان کے ساتھ مس بی ہیو کیا اور اس حد تک چلی گئی کہ انہیں زخمی کرڈالا۔“ اس کی ہیلو کے جواب میں سندر نے سخت برہمی سے بولنا شروع کردیا۔

”میں نے ان کا بہت خیال رکھا تھا سندر لیکن انہوں نے مجھ سے بدتمیزی کی تو میں برداشت نہیں کرسکی۔“ اس کے ساتھ سندر نے پہلی بار اس لہجے میں بات کی تھی اس لیے وہ سہم سی گئی اور دبے دبے لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

”میں یہ سب نہیں سننا چاہتا۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مہتا میرے لیے بہت امپورٹنٹ پرسن ہے۔ میرا پورا کیریئر اس پر ڈی پینڈ کررہا ہے اس لیے اس کی ناراضی افورڈ نہیں کرسکتا۔ تمہیں ہر حال میں اسے منانا ہوگا، سن لیا تم نے۔“ وہ پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں چیخا اور لائن کاٹ دی۔ اسے لگا کہ سندر معاملے کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا ہے اس لیے اس پر صورت حال واضح کرنے کے لیے کال بیک کرنے لگی لیکن سندر کا نمبر بند جارہا تھا۔ اس کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ تھک ہار کر اس نے شلپا کو اپنے پاس بلایا اور اس سے مہتا کے بارے میں دریافت کیا۔

”میں نے ان کی ڈریسنگ کردی تھی لیکن میرے بہت انسسٹ کرنے پر بھی وہ یہاں رکنے پر راضی نہیں ہوئے اور رات کو ہی ہوٹل شفٹ ہوگئے۔“ شلپا نے اسے بتایا۔

”اب کیا کروں، سندر کا کہنا ہے کہ انہیں منانا ضروری ہے۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بے چینی سے مسلے۔

”مسٹر کپور غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔ مہتا صاحب کی ناراضی سے ان کا کیریئر برباد ہوجائے گا۔“ شلپا نے اسے مزید ڈرایا۔

”میں ان سے سوری کہہ سکتی ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ شخص صرف میرے سوری کہنے سے بات ختم نہیں کرے گا۔ میں نے اس کی نظروں میں ہوس دیکھی ہے اور اپنی ہوس پوری کیے بغیر وہ کسی طرح راضی نہ ہوگا۔“ بڑبڑانے کے انداز میں اس نے شلپا پر حقیقت واضح کی۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔ سندر عورتوں کو اپنے پتی کی کامیابی کے لیے کبھی کبھی یہ قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔“ شلپا کے جواب نے اس پر واضح کردیا کہ اپنے مسئلے

کے حل کے لیے اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ اسے اپنے بیڈروم سے چلے جانے کا اشارہ کرکے وہ دوبارہ بستر پر ڈھیر ہوگئی۔ رات کی شراب نوشی اور نیند کی کمی کے باعث اس کے سر میں سخت درد ہورہا تھا۔ طبیعت کا بھاری پن جسے وہ کئی دنوں سے نظر انداز کررہی تھی کچھ اور بھی واضح طور پر محسوس ہونے لگا تھا۔ پریشانی اور بے کیفی کے اس عالم میں اسے کچھ سجھائی نہ دیا تو خود کو مدہوش کرلینے کی خواہش میں زندگی میں پہلی بار خالصتاً اپنی مرضی سے شراب نوشی کرنے لگی۔ رات اس نے بہت ڈٹ کر کھانا کھایا تھا اس لیے شراب بالکل خالی پیٹ میں نہیں جارہی تھی لیکن بہرحال وہ نڈھال تو ہو ہی گئی۔ عادی شرابی نہیں تھی کہ شراب کی اتنی زیادہ مقدار سہار جاتی جلد ہی اس کے حواس نے ساتھ چھوڑ دیا اور بستر پر نڈھال ہوکر گرگئی۔ نشے کی زیادتی سے بھاری ہوکر بند ہوجانے والے پپوٹوں نے اسے عارضی طور پر ہی سہی درپیش مسئلے سے نجات بھی دلادی لیکن آخر کب تک؟ چند گھنٹوں بعد ہی سہی اسے ہوش وخرد کی دنیا میں واپس تو آنا ہی تھا۔ ہوش میں آتے ہی اس کا شلپا سے سامنا ہوا۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھی اسے تشویش ناک نظروں سے گھور رہی تھی۔

”مائی گاڈ میم۔ آپ نے یہ ساری شراب ایک وقت میں اکیلے ہی پی ڈالی۔“ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر شلپا نے شراب کی بڑی سی خالی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دے ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کا سر درد سے پھٹا جارہا تھا اور اتنی بری طرح ابکائیاں آرہی تھیں کہ لگتا تھا کہ آنتیں باہر نکل کر آجائیں گی۔ شلپا اس کی کیفیت کو سمجھ گئی اور تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں لیمن جوس سے بھرا ہوا گلاس تھا۔ وہ گلاس اس نے زبردستی اس کے ہونٹوں سے لگایا اور گھونٹ گھونٹ کرکے پلاتی رہی۔ آدھا گلاس جوس پی کر ہی اسے قے ہوگئی۔ شلپا اسے سنبھالنے لگی۔ اسی وقت شلپا کا موبائل بجا، اس نے کال ریسیو کی۔

”میڈم کی حالت بہت خراب ہے سر۔ انہوں نے اوور ڈرنک کرلی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق کل صبح تک ان کی حالت سنبھلنا مشکل ہے۔“ اپنی بے حد خراب ہوتی حالت کے باوجود اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ شلپا سندر سے بات کررہی ہے۔

”مجھے دو موبائل، میں سندر سے بات کروں گی۔“ اس نے شلپا کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا اور تیزی سے بولی۔ ”سندر، سندر کہاں تھے آپ؟ میں نے کتنی بار آپ کا نمبر ڈائل کیا لیکن آپ کا موبائل ہی آف تھا۔“ اپنی بے قراری میں اسے ذرا تاخیر سے احساس ہوا کہ دوسری طرف سے لائن کاٹی جاچکی ہے۔ احساس ہونے پر اس نے شلپا ہی کے موبائل سے دوبارہ سندر کا نمبر ڈائل کیا لیکن فون پاورڈ آف کیا جاچکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فون یوں ہاتھوں سے گر گیا جیسے اب ان ہاتھوں میں کسی بھی شے کا وزن سہارنے کی طاقت باقی نہ رہی ہو۔

☆☆☆

وہ بالکل ساکت بیٹھی شیشے کے پار گرتی برف کو دیکھ رہی تھی۔ بچے اور بڑے اس برف میں ہنستے، کھیلتے، کھلکھلاتے لطف اندوز ہورہے تھے۔ دولت کے بل بوتے پر عربوں کی برف باری کے شوق کو پورا کرنے کے لیے صحرا میں سجایا گیا ایک طلسم لیکن وہ اس طلسم کو دیکھ کر پتھر نہیں ہوئی تھی۔ اسے تو اس طلسمی دنیا نے پتھرا دیا تھا جس کی چمک دمک نے دور سے اسے ایسا مسحور کیا تھا کہ وہ اس دنیا میں داخل ہونے کے لیے مچل گئی تھی لیکن اب سمجھ نہیں آتا تھا کہ خود کو اس دنیا میں کیسے ایڈجسٹ کرے۔ سندر اس سے بدستور ناراض تھا اور ان کی پورے تین دن سے آپس میں بات نہیں ہوئی تھی۔ مہتا دبئی میں دو دن گزارنے کے بعد واپس بمبئی جاچکا تھا۔ اس کے قیام کے وہ دو دن اس نے اپنی بقا کی جنگ لڑتے ہوئے گزارے تھے۔ دوسرے دن بھی اس نے بے تحاشا شراب نوشی کی تھی اور خود کو کمرے میں بند کرلیا تھا یوں مہتا کو منانے کی مشکل سے بچ گئی تھی۔ اپنی دو دن کی بے تحاشا شراب نوشی کا نتیجہ اسے طبیعت کی بے حد خرابی کی صورت میں بھگتنا پڑا تھا لیکن تجربہ کار شلپا کی تدبیروں کی وجہ سے کافی سنبھل گئی تھی اور اب ڈھلتی شام میں یہاں موجود اپنی اداسی کو دور کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس جگہ وہ شلپا کے ساتھ پہلے بھی آچکی تھی لہٰذا اسے بتائے بغیر کیب لے کر اکیلی چلی آئی تھی۔ وہ کچھ وقت اپنی مرضی سے گزارنے کی خواہش مند تھی اس لیے شلپا کا دم چھلا ساتھ لگانا پسند نہیں کیا تھا۔

”آج پھر آپ تنہا ہیں؟“ اپنی سوچوں میں الجھے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کوئی اس کے قریب کھڑا ہوا ہے وہ بولا تو چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مسٹر عاشر انور...... کیا آپ میرا پیچھا کیا کرتے ہیں؟“ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ عاشر کو وہاں پاکر تھوڑی سی خوش کیوں ہوگئی تھی۔

"آپ یوں بھی تو سمجھ سکتی ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" عاشر کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ ابھری۔ وہ خاصی معقول شکل وصورت کا بندہ تھا اور قیمتی پہناوے اسے کچھ اور اسمارٹ بنا دیتے تھے۔ پیرس میں اس کے ساتھ گزارے وقت میں وہ عاشر کے بارے میں اتنا تو جان چکی تھی کہ وہ ایک ویل آف فیملی سے تعلق رکھتا ہے اور فوٹو گرافی وغیرہ بس شغل کے طور پر اپنا رکھی ہے۔

"تو اب تم مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔" اس نے مصنوعی خفگی سے عاشر کو گھورا۔

"تنہا، حسین خاتون کو دیکھ کر تو کسی کا بھی دل بے ایمان ہو سکتا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرا کر بولا لیکن وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کی آنکھیں شفاف ہیں اور ان میں مہتا جیسی غلاظت نہیں بھری ہوئی پھر بھی یکدم ہی اس کی اداسی اس پر حاوی ہو گئی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو جس عورت کے ساتھ اس کا شوہر موجود نہ ہو لوگ اسے لوٹ کا مال ہی سمجھ لیتے ہیں۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں، میں صرف مذاق کر رہا تھا۔" اس نے فوراً صفائی پیش کی۔

"تم بھی غلط سمجھ رہے ہو میرا اشارہ تمہاری طرف نہیں تھا۔ تمہارے معصوم فلرٹ سے میرا کچھ نہیں بگڑنے والا۔"

"کیا کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو آپ کے مزاج پر گراں گزری ہے؟" اس بار عاشر نے اسے ذرا غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور رنگت بھی ذرا زرد محسوس ہو رہی تھی۔ عاشر کے سوال کے جواب میں وہ بس ہونٹ کاٹتی رہی زبان سے کچھ نہ بولی۔

"میں نہیں جانتا کہ آپ کس مسئلے کا شکار ہیں لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ آپ جس کلاس میں شامل ہو گئی ہیں وہاں مرد حسین عورتوں سے ان کے شوہروں کی موجودگی میں بھی آرام سے فلرٹ کرتے ہیں اور شوہر حضرات صرف اس لیے ہنس کر ٹال دیتے ہیں کہ سامنے والے بندے سے ان کا کوئی نہ کوئی مفاد وابستہ ہوتا ہے۔" وہ جیسے اس کے بتائے بغیر بھی اس کا مسئلہ سمجھ گیا تھا۔

"لیکن میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔ میں نے سندر پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے لیکن عزت ...... عزت کی قربانی دینا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔

"اگر آپ یہ جنگ جیت گئیں تو مجھے خوشی ہو گی۔" عاشر کا انداز ایسا تھا جیسے اسے اس کے جیتنے کا یقین نہ ہو۔

"اچھا آئیں، ہم بھی چل کر صحرا کی برف باری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔" وہ یکدم ہی موضوع بدل گیا اور تھوڑی دیر بعد جب وہ...... دبئی میں اس کے ساتھ انجوائے کر رہی تھی تو وقتی طور پر ساری پریشانیاں اس کے ذہن سے نکل گئی تھیں بالکل اسی طرح جیسے یہاں موجود افراد بھولے ہوئے تھے کہ کسی یورپی ملک جیسے برف کے اس ماحول سے باہر وہی دبئی ہے جو اصل میں صحرا میں بسایا گیا ہے اور جہاں کی گرمی کا ائیر کنڈیشنر کے بغیر مقابلہ کرنا نازک مزاجوں کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

☆☆☆

"سندر پلیز، آپ میری بات تو سنیں۔" اس نے دبئی میں تقریباً پورا مہینا گزارا تھا اور اس عرصے میں سندر نے اس سے ایک بار بھی بات نہیں کی تھی۔ وہ سندر کو منانے کے لیے واپس بمبئی آنا چاہتی تھی لیکن بقول شلپا سر کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔ اجازت ملنے تک پورا مہینا گزر گیا تھا اور واپس آنے کے بعد بھی پندرہ دن تک اسے سندر کی شکل دکھائی نہیں دی تھی۔ شلپا کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق وہ فلم یونٹ کے ساتھ مصروف تھا۔ بے قراری سے دن گزارتی وہ سندر کی مصروفیت ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی آخر کار سولہویں دن جا کر اسے سندر کی صورت گھر میں دیکھنے کو ملی وہ بھی اس عالم میں کہ وہ اس کی طرف سے قطعی بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

"میں تمہاری کیا بات سنوں؟ باتیں تو مجھے مہتا نے سنائی تھیں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتی ہو کہ مہتا کی زبانی ہی پتنی کے مس بی ہیو کا سن کر مجھے کتنا برا لگا۔ تم نے تو ایک طرح سے اس پر قاتلانہ حملہ کر ڈالا تھا۔ اگر وہ پولیس کے پاس چلا جاتا تو تمہارا کیا بنتا؟" بہت بلند آواز میں سندر نے اسے لتاڑنا شروع کیا تو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ نہ جانے کیوں آج کل دل کی ایسی ہی کیفیت تھی وہ بار بار اسے ڈوبتا ابھرتا محسوس کرتی اور سوچتی کہ یہ شراب نوشی اور ٹینشن کا نتیجہ ہے۔

"یقین کریں سندر میں نے مہتا کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن جب وہ شراب کے نشے میں دھت ہو کر مجھ سے دست درازی کرنے لگا تو مجھے فوراً اس کے ساتھ وہ سلوک کرنا پڑا۔ میں اسے آپ کی امانت میں خیانت کیسے کرنے دے سکتی تھی؟" اس نے بہت ہمت کر کے اپنی توانائیاں یکجا کیں اور خود ہی سندر کے سامنے وکیل صفائی کا کردار ادا کرنے لگی۔

"ربش...... تمہیں معلوم ہے مہتا نے اپنی اس بے

عزتی کا انتقام لینے کے لیے کیا کیا ہے؟ اپنی اگلی فلم میں وہ کسی اور کو ہیرو لے رہا ہے۔ فلم کے میوزیشن اور سنگر کے طور پر بھی میرا نام شامل نہیں ہے۔ جو فلم شوٹ ہو رہی ہے اس کے میڈیا منیجر نے مجھے بتایا ہے کہ فلم کی پبلسٹی کیمپین چلائی جائے گی اس میں بھی مجھے نظر انداز کرنے کی پلاننگ ہے اور یہ سب صرف اس وجہ سے ہوا کہ تم نے مہتا کو ناراض کر دیا۔'' وہ پہلے سے بھی زیادہ چیخ کر بولا۔

''تو کیا میں اس کی بات مان لیتی؟'' شدید حیرت سے یہ سوال کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

''مان لیتیں، مان لینے سے کوئی تم میں جڑے ہیرے موتی نہیں جھڑ جاتے۔ میں نے تم سے کبھی تمہاری پارسائی کا سرٹیفکیٹ نہیں مانگا ہے۔ کیا کبھی میں نے تم سے پوچھا کہ تم شادی سے پہلے کہاں کہاں منہ مار چکی ہو؟ نہیں نا تو اب بھی کیا فرق پڑ جاتا۔'' سندر کے جو منہ میں آ رہا تھا وہ بولتا جا رہا تھا اور وہ بے ہوش ہونے سے پہلے آخری لمحے تک خود کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ سندر یہ سب کچھ صرف ٹینشن کی وجہ سے کہہ رہا ہے ورنہ وہ اس کے بارے میں اس انداز سے سوچ ہی نہیں سکتا۔

☆☆☆

اس کی دوبارہ آنکھ اسپتال کے کمرے میں کھلی تھی۔ جہاں سفید یونیفارم میں ملبوس ایک نوعمر سی نرس ہونٹوں پر پیاری سی مسکراہٹ سجائے اس کے سرہانے کھڑی تھی۔

''گڈ ایوننگ میم، اب آپ کیسا فیل کر رہی ہیں؟'' نرس نے مسکراتے لبوں سے اس سے پوچھا تو وہ اسے جواب دینے کے بجائے اپنے اوپر غور کرنے لگی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی اور پورا جسم اتنی بری طرح دکھ رہا تھا جیسے اب تک پتھر کوٹنے کی مشقت کرتی رہی ہو۔

''مجھے کیا ہوا ہے؟'' اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ وہ سندر سے باتیں کرتے ہوئے بے ہوش ہوئی تھی۔

''آپ کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا میڈم لیکن اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔'' نرس کے ہونٹوں پر دلاسا دیتی ہوئی پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی لیکن اسے یاد آ گیا کہ وہ کس تلخ تجربے سے گزری تھی۔ سندر کی شراب نوشی، عورتوں سے تعلقات اور بے توجہی کے الزامات اس کی فیلڈ کے سر تھوپ کر اس نے خود کو کسی حد تک مطمئن کر لیا تھا لیکن اس کی بے غیرتی کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔

''پلیز میم خود کو ریلیکس رکھیں۔ آپ کے لیے ٹینشن لینا ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے بے بی پر برا اثر پڑے گا۔''

اس کے چہرے پر تناؤ محسوس کر کے نرس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ چونک گئی۔

''بے بی؟'' اس کے ہونٹوں نے حیرت سے جنبش کی۔

''یس آپ کا بے بی، آپ ایکسپیکٹ کر رہی ہیں نا۔'' نرس نے اس کے کانوں میں امرت سا گھولا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن نرس نے ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ سے اسے اس حرکت سے باز رکھا۔

''حیرت ہے آپ کو اندازہ ہی نہیں تھا حالانکہ اچھا خاصا ٹائم گزر چکا ہے۔'' نرس شوخی سے ہنسی تو وہ بھی دھیرے سے مسکرا دی۔ اسے کیا بتاتی کہ وہ سندر کے مزاج کی دھوپ چھاؤں اور خود کو اس کے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی جدوجہد میں اتنی بری طرح الجھی ہوئی تھی کہ اپنے آپ سے غافل ہو گئی تھی۔

''میرے پتی کہاں ہیں؟'' ہر عورت کی طرح وہ بھی یہ یقین رکھتی تھی کہ بچے کی خوش خبری سن کر سندر اتنا خوش ہوگا کہ اپنے سارے گلے شکوے بھول جائے گا۔

''آئی ڈونٹ نو میم بٹ آپ کی اٹینڈنٹ مس شلپا ویٹنگ روم میں موجود ہیں۔ آپ کہیں تو میں انہیں آپ کے پاس بھیج دیتی ہوں۔'' نرس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے اسے پیشکش کی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اپنی رضامندی دی۔ چند منٹ بعد ہی شلپا اس کے سامنے موجود تھی۔

''مسٹر کپور یونٹ کے ساتھ شملہ گئے ہوئے ہیں لیکن انہوں نے کہا ہے کہ آج شام کسی وقت آپ کو کال کریں گے۔'' شلپا کی اطلاع نے اس کے دل کو اداس کر دیا۔ وہ سندر کو جلد از جلد خوش خبری سنانا چاہتی تھی لیکن وہ تو اسے اس حال میں چھوڑ کر شملہ جا چکا تھا۔ شام تک کا وقت اس نے بہت بے چینی سے گزارا اس کی نرس بہت اچھی لڑکی تھی اسے وقت پر غذا اور دوائیں دیتی رہی۔ وہ بھی دل نہ چاہتے ہوئے نرس سے اس لیے تعاون کرتی رہی کہ اب اسے خود سے زیادہ اپنے وجود میں پلتی دوسری زندگی کا دھیان رکھنا تھا۔

''سندر...... سندر آپ نے سنا آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں ایک ننھا مہمان آنے والا ہے؟'' شام ڈھلنے والی تھی تب جا کر سندر کا فون آیا۔ سندر سے بات کرتے ہوئے اس کی آواز خوشی سے کانپ گئی۔

''سن چکا ہوں میں اس حماقت کے بارے میں اور اسی کے کارن تمہیں کال کی ہے۔'' جواب میں سندر کا لہجہ

بہت روکھا تھا۔

''کیا مطلب...... کیسی حماقت؟'' اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

''یہی بچے والی حماقت۔ میں اتنی جلدی بچہ نہیں چاہتا۔ ابھی تو ہم نے صحیح سے ایک دوسرے کا ساتھ انجوائے بھی نہیں کیا اور تم بچے کی الجھن میں پڑ گئیں۔'' سندر کا لہجہ ذرا نرم ہوا۔

''ایک ساتھ لائف انجوائے کرنے کے لیے تو شاید آپ کو کبھی فرصت ہی نہ ملے۔'' اس کے لبوں پر شکوہ مچل گیا۔

''فضول باتیں مت کرو، میں اتنی جلدی بچہ نہیں چاہتا۔ ختم کرو یہ سلسلہ میں نے شلپا سے کہہ دیا وہ اس سلسلے میں ڈاکٹر سے بات کر لے گی۔'' اس کے لہجے کی نرمی غائب ہو گئی اور سختی سے فیصلہ کن انداز میں کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس ظالمانہ فیصلے پر وہ تڑپ اٹھی۔ ڈیوٹی پر موجود نرس کمرے میں آئی تو اسے سسکتا دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس وقت اسے کسی ہمدرد کی ضرورت تھی اس لیے نرس سے سارا ماجرا کہہ ڈالا۔

''نو پرابلم، آپ کی پرمیشن کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ ڈاکٹر کو ریفیوز کر دینا ویسے بھی میرا خیال ہے کہ اس اسٹیج پر ڈاکٹر خود بھی ابارشن کرنا پسند نہیں کرے گی۔ آپ اتنی ویک ہیں کہ ایسا کرنے سے آپ کی جان بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔'' نرس کے الفاظ نے اسے راہ سجھا دی۔ اس کے انکار کے بعد ڈاکٹر نے بھی انکار کر دیا۔ ویسے بھی وہ خود اسے مناسب نہیں سمجھ رہی تھی۔ شلپا اس کے انکار پر اسے سمجھاتی رہی۔ اسے سندر کی ناراضی سے بھی ڈرایا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ بہت با اختیار ہونے کے باوجود شلپا بہرحال تھی تو ایک ملازمہ ہی اس لیے آخرکار بے بس ہو گئی۔ دو تین دن بعد اسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اس عرصے میں سندر نے بھی اسے فون کیا لیکن اس نے جان کر سندر کی کوئی کال ریسیو نہیں کی۔ گھر واپس آنے کے بعد بھی وہ جو کہ ہر پل سندر کا انتظار کرتی تھی یہی دعا کرتی رہی کہ بہت دنوں تک سندر کو گھر واپس آنے کی فرصت نہ ملے۔ اس کی یہ دعا قبول ہوئی اور مزید ڈیڑھ ماہ گزر گیا تو اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ اگر ابارشن کا کوئی امکان تھا بھی تو اب بالکل نہیں رہا۔ سندر بہت خفا ہوگا یہ جاننے کے باوجود وہ اپنی ممتا کی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب بچہ دنیا میں آئے گا تو سندر کا موڈ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی باپ اپنے خون سے آخر کب تک منہ موڑ سکتا ہے۔

☆☆☆

''حور کے پہلو میں لنگور۔'' موٹی توند، سیاہ رنگت اور ناٹے قد کے مالک شخص نے اس کے لیے اپنی بی ایم ڈبلیو کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ قریب ہی پارک کی گئی مرسڈیز سے اترے بے فکرے نوجوان کے ایک گروپ میں سے کسی نے فقرہ چست کیا اور پھر پورا گروپ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ بی ایم ڈبلیو کے مالک کے چہرے کی رنگت غصے اور شرمندگی کے باعث مزید سیاہ پڑ گئی لیکن اس کے حسین چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا بلکہ یوں محسوس ہوا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو لیکن یہ درست نہیں تھا حقیقت صرف اتنی تھی کہ اسے اس

بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا ورنہ وہ اپنے اور اپنے ساتھی کے مابین فرق سے پوری طرح آگاہ تھی۔ وہ اگر چمکتا ہوا دن تھی تو اس کا ساتھی رات کا گھور اندھیرا۔ اس کے ساتھ کھڑی وہ کچھ زیادہ ہی چمکتی ہوئی لگ رہی تھی۔

”دودھ پیڑے کو مکوڑا۔“ نہ جانے کیوں اسے ماضی میں سنی گئی یہ مثل اس وقت یاد آگئی جو راہ چلتے ایک جوڑے کو دیکھ کر اس کی نانی کی زبان سے بے اختیار پھسل گئی تھی۔ اس وقت اس مثل کو سن کر اس سمیت سارے لوگ بہت ہنسے تھے بلکہ اسے تو ہنسی کا دورہ ہی پڑ گیا تھا اور ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ جوڑا تھا ہی ایسا۔ دودھ ملائی سے بنے پیڑے کی طرح کی گوری عورت کے ساتھ اس کا بہت پکی رنگت والا شوہر واقعی کسی چیونٹے کی طرح محسوس ہو رہا تھا لیکن قسمت کی کیسی ستم ظریفی تھی کہ خود ایسے ہی مرد کے ساتھ کھڑی وہ کچھ بھی محسوس کرنے سے قاصر تھی۔ اس کے سارے احساسات تو عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ وہ جانتی تھی تو صرف اتنا کہ مرد صرف مرد ہوتا ہے۔ اس کا گورا کالا، لمبا ناٹا گنجا کانا کچھ بھی ہونا اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر کچھ اہمیت رکھتا ہے تو وہ ہے اس کی حیثیت۔ عرصہ ہوا اس نے مردوں کو انسان کے طور پر محسوس کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کے لیے صرف ایک ٹارگٹ ہوا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ بی ایم ڈبلیو کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی یہی غور کر رہی تھی کہ اس ناٹے قد مگر اونچے اسٹیٹس والے بلڈر کو کیسے اپنی مٹھی میں لے کہ وہ اس کے اشارے پر اپنے دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے کے لیے تیار ہو جائے۔ یہ بھی اس کی زندگی کا عجیب مذاق تھا کہ اسے اپنے دن رات اس دولت کے حصول کے لیے خرچنے پڑتے تھے جس کی اس کے دل میں کوئی چاہ ہی باقی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

”دیکھ لی تمہاری محبت، تم تو کہا کرتی تھیں کہ میں تمہیں دنیا کی ہر ہستی سے بڑھ کر عزیز ہوں لیکن تم نے ثابت کر دکھایا کہ یہ سچ نہیں ہے۔“ سندر واپس لوٹا تو حسب توقع اس کا موڈ خراب تھا لیکن مزاج کی یہ خرابی اس کے انداز سے کچھ کم ہی تھی۔ بس وہ ناقدانہ نظروں سے اس کے جسم کو ٹٹولتا رہا تھا۔ تبدیلی کے عمل سے گزرتا اس کا جسم ذرا بھرا بھرا سا لگنے لگا تھا۔

”میں اب بھی یہی کہتی ہوں کہ مجھے آپ سے بے حد محبت ہے اور میں آپ کے حکم کی تعمیل بھی صرف اس لیے نہیں کر سکی کہ میں آپ کی دی ہوئی سب سے قیمتی نشانی کو ضائع کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔“ وہ جانتی تھی کہ لڑ کر سندر سے نہیں جیت سکتی سو محبت کا ہتھیار تھامے اسے زیر کرنے کی کوشش میں لگ گئی اور بہت لاڈ سے اس کے شانے پر اپنا سر رکھا۔ سندر نے اس کے سر کو نہیں جھٹکا جس کا مطلب تھا کہ وہ زیادہ غصے میں نہیں ہے اور یہ اس کے لیے بہت اچھا شگون تھا۔ اسے سندر سے ایک بہت اہم موضوع پر گفتگو کرنی تھی جس کے لیے اس کے موڈ کا اچھا ہونا ضروری تھا۔

”سچ مچ اتنا چاہتی ہو مجھے۔“ وہ مسکرایا اور آزمانے والے انداز میں پوچھا۔

”میرے خیال میں تو اس سوال کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ میں اس آزمائش میں پہلے ہی پوری اتر چکی ہوں۔“ سندر کا موڈ خوش گوار پا کر وہ خود بھی خوش ہو گئی۔ کتنے عرصے بعد وہ اس سے ڈھنگ سے بات کر رہا تھا ورنہ تو اس سندر کو بھولنے ہی لگی تھی جو اس پر جان چھڑکتا تھا اور جس کی محبت نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔

”بے شک تم ایک آزمائش میں پوری اتری ہو لیکن یہ مت بھولو کہ محبت انسان کو بار بار آزماتی ہے۔ نہ جانے زندگی کے کس موڑ پر تمہارے سامنے کوئی نئی آزمائش آ کھڑی ہو۔“ سندر کے لب مسکرا رہے تھے اور بظاہر وہ اس سے ہلکے پھلکے لہجے میں بات کر رہا تھا لیکن اگر اس لمحے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی تو اسے وہاں پراسراریت نظر آ جاتی۔

”میں آئندہ بھی ہر آزمائش میں پوری اتروں گی۔“ خوشی کی ترنگ میں وہ مزے سے دعویٰ کر گئی۔

”اپنے اس دعوے کو یاد رکھنا۔“

”بالکل یاد رکھوں گی۔ آپ کا جب دل چاہے آزما لیجیے گا۔“ وہ کھلکھلائی۔

”چلو تو پھر اس خوشی میں کہیں ڈنر کرنے چلتے ہیں تم اچھا سا تیار ہو جاؤ۔“ سندر آج بڑی فرصت میں اس کے پاس آیا تھا۔ وہ نہال سی ہو کر فوراً تیار ہونے چلی گئی۔ شلپا کے مشورے سے اس نے اپنے لیے ایک ساڑی منتخب کی۔ پیچ کلر کی نیٹ کی ساڑی کے ساتھ ہم رنگ بلاؤز نہ صرف سلیو لیس تھا بلکہ بیک لیس بھی لیکن اب وہ ایسے لباس پہننے کی عادی ہو گئی تھی۔ سندر کپور کی دنیا کی عورتیں ایسے ہی لباس زیب تن کرتی تھیں اور خود کو اس دنیا میں ایڈجسٹ کرنے کے لیے اس نے بہت خوشی سے یہ سب قبول کر لیا تھا۔

”ایکسیلنٹ۔“ کیل کانٹوں سے لیس تیار ہو کر وہ سندر کے سامنے آئی تو اس نے بے ساختہ ہی اسے داد دی

پھر بولا۔ ”مس شلپا کی محنت رنگ لا رہی ہے۔ تم اس عرصے میں خاصی گرومڈ ہو چکی ہو۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں بس تھوڑے عرصے کی بات ہے پھر آپ مجھے وائف کے طور پر ہر ایک سے فخریہ ملوا سکیں گے۔“ رواں انگلش میں بہت ادا سے یہ جملہ بول کر اس نے سندر کو مزید خوش کر دیا۔ آج وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو خوش کرنے کے موڈ میں تھے۔ سندر ڈنر کے لیے اسے ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں نیم تاریک خواب ناک سے ماحول میں کینڈل لائٹ ڈنر کا انتظام تھا۔ ماحول کی خواب ناکی کے ساتھ ساتھ جوڑوں کو پرائیویسی بھی خوب میسر تھی۔ اپنی شہرت کے سبب سندر کو ایسی ہی جگہوں کا انتخاب کرنا پڑتا تھا۔ بے حد رومینٹک ماحول میں ان دونوں نے وہاں ڈنر کیا۔

”تمہارا بے بی دنیا میں آ جائے تو پھر میں تمہارے دعوے کی آزمائش کروں گا۔“ ڈنر کے دوران سندر نے اسے ایک بار پھر یاد دہانی کروائی۔

”کر لینا بابا، میں ریڈی ہوں۔“ وہ اس بات کو بہت لائٹ لے رہی تھی یا پھر اس کا ذہن اس مسئلے میں زیادہ الجھا ہوا تھا جسے وہ آج ہی سندر سے ڈسکس کر لینا چاہتی تھی۔ آخر کار واپسی کے سفر میں اس نے اس نازک موضوع پر گفتگو چھیڑ ہی دی جو شادی کے بعد سے اب تک ڈسکس نہیں ہو سکا تھا۔

”ہم اپنے بے بی کا نام کیا رکھیں گے سندر؟“ بہت سلجھاؤ سے اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”کوئی بھی اچھا سا اپنی پسند کا رکھ لینا یار۔ ابھی سے اس بارے میں کیا سوچنا۔ پہلے یہ تو معلوم ہو جائے کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی۔“ سندر نے بے پروائی سے جواب دیا پھر کوئی خیال آنے پر پوچھنے لگا۔ ”بچے کا جینڈر تو تمہیں معلوم ہی ہوگا؟ آج کل تو الٹرا ساؤنڈ سے پہلے ہی معلوم ہو جاتا ہے؟“

”نہیں میں نے نہیں معلوم کیا۔ اچانک معلوم ہونے سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”چلو جیسی تمہاری خوشی۔“ سندر نے بات ختم کر دی۔ وہ بچے کے موضوع پر گفتگو کرنے میں ویسی دلچسپی نہیں لے رہا تھا جیسی پہلی بار باپ بننے والے شخص کو عموماً ہوتی ہے۔

”میرے ذہن میں بابا اور بے بی دونوں کے لیے کئی خوب صورت نام ہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرا بچہ مکمل نام اور شخصیت کے ساتھ اس دنیا میں آئے لیکن اس کے لیے آپ کو اسٹیپ لینا پڑے گا۔“ اپنی بات کہتے ہوئے اس نے سندر کا چہرہ غور سے دیکھا۔

”کیا مطلب، میں سمجھا نہیں؟“ اس کی بات سن کر وہ ذرا سا الجھا۔

”کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ آپ نے ایک بات پبلک سے چھپائی ہوئی ہے اور اب وہ مناسب وقت آ چکا ہے جب آپ کو اناؤنس کر دینا چاہیے۔“

”واٹ......؟“ سندر زور سے چیخا۔ ”تم چاہتی ہو کہ......“ اس نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں سندر میرے بچے کو مکمل شناخت ملنے کے لیے یہ ضروری ہے۔“ وہ ہمت کر چکی تھی تو اب بات کو مکمل کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

”ربش۔“ سندر نے زور سے سر جھٹکا۔ ”میرا دماغ خراب ہے کہ میں اس موقع پر ایسی اناؤنسمنٹ کرتا پھروں۔ بطور ہیرو میری پہلی فلم آئندہ چند مہینوں میں ریلیز ہونے والی ہے اس فلم پر مہتا کا کروڑوں روپیہ لگا ہوا ہے میری ایسی کسی اناؤنسمنٹ سے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ لوگ فلم کا بائیکاٹ کر دیں گے اور میرا فلمی کیریئر تباہ ہو جائے گا۔“ اس نے ایک بار پھر سر کو زور سے جھٹکا۔ ”آئندہ مجھ سے ایسی کوئی فضول بات مت کرنا۔ وہ جو کچھ تھا صرف تمہیں مطمئن کرنے اور تمہارے گھر والوں کی شرط پوری کرنے کے لیے کیا تھا ورنہ میں ایسی کسی بات میں بالکل انٹرسٹڈ نہیں تھا۔“ اس کے اتنے صاف اقرار پر وہ صدمے سے منہ کھولے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ سندر کے اس اقرار نے ان کی ازدواجی زندگی پر ایک بڑا سا سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔

☆☆☆

وہ جیسے نشے میں رہنے لگی تھی۔ قدم رکھتی کہیں تھی تو پڑتا کہیں تھا۔ کھوئی کھوئی سی آنکھیں، مسکراتے لب، لہراتی چال سب نے مل کر اسے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا تھا۔ صرف پندرہ دن میں وہ ایسی نکھر گئی تھی جیسے کسی صابن، لوشن یا کریم کے اشتہار میں کام کرنے والی ماڈل کو خصوصی ٹریٹمنٹ کے ذریعے نکھار دیا جاتا ہے۔

”صباحت بیٹی کو دہلی کی فضا راس آ گئی ہے۔“ بیٹے کی دلی خواہش سے کچھ کچھ آگاہ ممانی اسے دیکھ کر تبصرہ کرتیں۔

”لڑکی جانے کن ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔“ جہاندیدہ نانی لاحول پڑھتے ہوئے منہ ہی منہ میں بدبداتیں۔

”آپی کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے بس اکیلی بیٹھ کر مسکرائے جاتی ہیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، گھومنا پھرنا اور بولنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔“ راحت اور نایاب کو

شکایت تھی۔
"کیابات ہے صبا، ہر وقت کونے کھدروں میں اکیلی کیوں بیٹھی رہتی ہو؟ یہاں ہم سب سے ملنے کے لیے آئے ہیں اور تم ہو کہ نہ کسی سے ملنے جانے کے لیے راضی ہوتی ہو نہ ملنے کے لیے آنے والوں کے پاس دو گھڑی ٹک کر بیٹھتی ہو۔" آمنہ بیگم اسے ڈانٹتیں۔
"پہلے ہی کیا کم تھیں کہ اب غضب ڈھانے لگی ہو۔ حسن کی اس دولت کو پاکستان واپس بھیجنے کا دل نہیں چاہے گا ہمارا۔" شکیل سے سامنا ہوتا تو وہ چپکے سے سرگوشی کر جاتا۔ وہ سب کی سنتی اور اپنے آپ میں مگن رہتی۔ سندر کے سوا اسے کچھ بھائی بھی کب دیتا تھا۔ سندر کا دیا قیمتی موبائل ڈوری میں بندھا بہت خاموشی سے اس کے گریبان میں چھپا رہتا۔ تھرتھراہٹ اطلاع دیتی کہ سندر کا فون ہے تو وہ سب کے درمیان سے چپکے سے اٹھ کر پچھواڑے پہنچ جاتی۔ رات کی تاریکی میں سب کے سو جانے کے بعد بھی سرگوشیوں میں گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا تو کبھی ایس ایم ایس کیے جاتے۔ موبائل کی چارجنگ بھی وہ بہت احتیاط سے اسٹور میں موجود سوئچ بورڈ کے ذریعے کرتی۔ پہلی محبت کا نشہ تو ہر ایک کو پاگل کر دیتا ہے اور اسے تو اس احساس میں مبتلا کرنے والا سندر کپور تھا جو خود لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھا۔ وہ سوچتی تو اسے خود پر فخر محسوس ہوتا۔ وہ جسے ایک دنیا چاہتی تھی اس کا دیوانہ تھا تو یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔
"میں تمہیں واپس پاکستان نہیں جانے دوں گا۔" اس کے کانوں میں رس گھولتا وہ کبھی اچانک ہی کہہ اٹھتا۔
"تو کیا کریں گے؟ کیا بارڈر پر گرفتار کروا دیں گے؟" اس کی بے تابی پر سرشار وہ کھلکھلا کر ہنستی۔
"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔" سندر کی آواز سوچ میں ڈوب جاتی پھر وہ اچانک ہی کہتا۔ "میں دہلی آجاتا ہوں تم سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔"
"میں نے بتایا تھا نا سندر کہ یہ ممکن نہیں۔ اب میں پہلے کی طرح موقع نہیں نکال سکوں گی۔" اسے اپنے حالات کا مکمل ادراک تھا۔ ان پندرہ دنوں میں وہ سب ایک بار باہر نکلی تھیں اور آمنہ بیگم نے اس کا اور راحت کا ہاتھ یوں تھام رکھا تھا جیسے وہ ننھی بچیاں ہوں اور ان کے بھیڑ بھاڑ میں گم ہو جانے کا ڈر ہو۔
"تم میری بے قراری کو سمجھتی نہیں ہو۔" سندر کو شکوہ ہوتا۔
"آپ سے زیادہ میں بے چین ہوں۔ بائیس دن بعد ہمارا ویزا ختم ہو جائے گا۔ واپس جانے کے بعد نہ جانے رابطے کی کیا صورت بنے گی؟" وہ اداس ہو جاتی۔
"واپس تو میں تمہیں کسی حال میں جانے نہیں دوں گا۔" سندر نے ایک بار پھر دعویٰ کیا۔
"پھر کیا کریں گے؟" اس نے بھی اس بار سنجیدگی سے سوال کیا۔
"میں تم سے شادی کر لیتا ہوں پھر تو تمہارے یہاں رہنے کا قانونی جواز بن جائے گا۔" سندر نے یکدم ہی وہ بات کہہ دی جو اتنے دن کے رابطے میں ایک بار بھی نہیں کہی تھی بس اس کے حسن کی تعریف اور اپنی بے قراری کے قصے ہی سناتا رہتا تھا۔
"ہماری شادی کیسے ہوسکتی ہے۔ میرے گھر والے نہیں مانیں گے۔" ناچتے ناچتے مور کی نظر اپنے پیروں پر پڑ جاتی۔
"کیوں نہیں مانیں گے۔ دھرم کی وجہ سے؟"
"ہاں۔" اسے اعتراف کرنا پڑا۔
"تو چھوڑ دو گھر والوں کو ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔" سندر کی دی ہوئی تجویز پر اس کا دل کانپا۔
"نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتی۔ میرے ماں باپ کے چہروں پر ہمیشہ کے لیے سیاہی مل جائے گی۔" اس نے انکار کر دیا۔ ماں باپ کی عزت کے خیال کے علاوہ دل میں یہ خیال بھی تھا کہ ایک ہندو سے شادی جائز نہیں۔ بچپن سے دی گئی تعلیم پندرہ دن کی محبت میں بالکل ہی ذہن سے صاف نہیں ہو گئی تھی۔
"تو پھر کیا صورت ہوگی ہمارے ملنے کی؟" سندر کے لہجے میں خفگی در آئی۔
"اگر آپ مسلمان ہوتے تو میرے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔" وہ یہ تو نہیں کہہ سکی کہ میری خاطر مسلمان ہو جاؤ لیکن ڈھکے چھپے انداز میں اپنا مدعا بیان کر گئی۔
"تمہارے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ تم انتظار کرنا کل شام میں تمہارے گھر آرہا ہوں۔" سندر نے جو کہا اسے سن کر اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ سندر نے بھی مزید یقین دہانی نہیں کروائی اور فون بند کر دیا پھر دوسرے دن تک صبا کو اس کا فون بند ہی ملتا رہا۔ وہ بار بار منتشر ہوتی دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی، جلے پیر کی بلی کی طرح پورے گھر میں چکراتی رہی۔ نہ ڈھنگ سے نیند آئی اور نہ ہی کھانا کھایا گیا۔
"کیا بات ہے بچی تیری طبیعت تو ٹھیک ہے، شکل اتری اتری سی ہے۔" اس کی طبیعت کی بے چینی کو محسوس کر کے نانی نے اس سے پوچھا بھی لیکن اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

جواب سندر کی آمد کی صورت میں سب کو اکٹھے ہی ملا۔ ماموں کے گھر کے عام سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے گھر کے جملہ بزرگ جو پہلے ہی سندر کپور جیسی شخصیت کی اپنے گھر آمد کی وجہ سے حیران تھے اس کا مطالبہ سن کر مزید دنگ رہ گئے۔ سندر سیاہ شیشوں کی گاڑی میں بہت چھپ چھپا کر وہاں آیا تھا، ورنہ گھر کے باہر لوگوں کا جم غفیر جمع ہو جاتا۔
"آپ کا شکریہ کہ آپ نے ہمیں اس عزت کے لائق سمجھا لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ جوڑی کسی طور مناسب نہیں ہے۔" نجم الدین باپ تھے اس لیے انہیں جواب دینا تھا۔
"دیکھیے بزرگوار شادی بیاہ کے معاملے میں سب سے اہم چیز لڑکے اور لڑکی کی پسند ہوتی ہے اور یہاں یہ سب سے اہم فیکٹر موجود ہے۔" وہ کہہ رہا تھا اور سب حیران تھے کہ یہ عجیب واقعہ کب کہاں اور کیوں کر پیش آیا۔
"دیکھو میاں ہوسکتا ہے تمہارے لیے یہ بات سب سے اہم ہو لیکن ہمارے لیے کچھ اور چیزوں کی اہمیت اس سے بھی بڑھ کر ہے اور اسی لیے ہم اپنی لڑکی تم سے بیاہنے کے لیے تیار نہیں۔" ایک غیر مرد ڈرائنگ روم میں بیٹھا دعویٰ کر رہا تھا کہ اس گھر کی بیٹی اس سے محبت کرتی ہے شرم سے نجم الدین کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ ایسے میں نانا صاحب یہ جنگ لڑنے میدان میں اترے۔
"غالباً آپ مذہب کی بات کر رہے ہیں۔ میں صبا کے لیے اپنا مذہب بدلنے کو تیار ہوں۔" سندر نے جیسے سب کو لاجواب کر دیا لیکن شکیل جو بزرگوں کی اس مجلس میں واحد جوان شخص تھا تڑپ اٹھا۔
"مذہب کسی کے لیے نہیں بدلا جاتا۔ مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ اسلام کو دل سے قبول کریں۔"
"آپ شاید اس قسم کے دلائل اس لیے دے رہے ہیں کہ آپ خود صبا کے امیدواروں میں سے ایک ہیں۔" سندر نے اس کی طرف ایک طنز کرتی مسکراہٹ اچھالی اور روئے سخن دوبارہ بزرگوں کی طرف کر لیا۔
"میں نے اس رشتے میں پیش آنے والی واحد رکاوٹ دور کر دی ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ کی طرف سے انکار ہوتا ہے تو میں اسے آپ کی تنگ نظری ہی سمجھوں گا لیکن انکار کرنے سے پہلے ایک بار صبا سے بھی پوچھ لیجیے گا کہ وہ آپ کے ایسے کسی فیصلے کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے یا نہیں۔" اس کا پراعتماد لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے۔ اس کی روانگی کے بعد صباحت سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ سندر سے محبت کرتی ہے اور ہر صورت اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اپنے اس فیصلے میں وہ اتنی اٹل تھی کہ نہ نانی اور ماں کی گھرکیوں کا اثر ہوا، نہ شکیل کی التجائیں رنگ لائیں، نانا اور ماموں کی خاموش ملامت بھی رائگاں گئی اور تو اور اسے اپنے عزت دار باپ کی نگاہوں میں موجود التجائیں بھی نظر نہ آسکیں۔
"بیٹا نجم الدین...... اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہے کہ اس عاقبت نااندیش لڑکی کو اپنے ہاتھوں عزت سے رخصت کر دیں ورنہ دوسری صورت میں یہ خاندان کی رہی سہی عزت بھی نیلام کر دے گی۔" آخرکار نانا صاحب نے نجم الدین کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے غصے اور رنج کی ملی جلی کیفیت میں مشورہ دیا۔
"ایسے کیسے سب کل کی لڑکی کے آگے سر جھکا دیں گے؟ اپنا سامان باندھو میاں اور لڑکی کو لے کر فوراً پاکستان لوٹ جاؤ۔" نانی نے کلبلا کر میاں کا مشورہ رد کیا اور داماد کو تجویز دی۔
"نہیں اماں، ابا میاں ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں ان کا مشورہ قبول کرنا ہوگا۔ آمنہ اور نجم الدین کے پاکستان واپس لوٹ جانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ لڑکی پر جنون سوار ہے آج کے دور میں فاصلوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ پاکستان جا کر بھی رابطے کی کوئی صورت نکال لے گی۔ سندر پیسے والا آدمی ہے اور بہت کچھ کرسکتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ تماشا کھڑا کرنے کے بجائے ہم وہ راہ اختیار کریں جس میں خاندان کی عزت ہے۔" ماموں نے بھی وہی بات کی تو نانی کو خاموش ہونا پڑا۔ آمنہ بیگم بے چاری کو تو بہت دیر سے چپ لگ گئی تھی۔ اولاد نے وہ دن دکھایا تھا جس کا کبھی انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ فیصلہ ہو جانے کے بعد صباحت کو وہاں بلایا گیا۔
"ہم نے تمہاری خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کل دوپہر تک تمہارا سندر کے ساتھ نکاح کر کے تمہیں یہاں سے رخصت کر دیا جائے گا اور پھر کبھی زندگی میں دوبارہ لوٹ کر آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ سندر کے ساتھ رخصت ہونے کے بعد تمہیں اپنے غم، خوشیاں اور پریشانیاں سب تنہا ہی جھیلنی ہوں گی۔ جب یہاں سے جاؤ تو ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھا کر جانا کہ تم اپنے والدین سمیت پورے خاندان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی ہو۔ کبھی تم لوٹ کر واپس بھی آئیں تو ہم میں سے کسی کے دروازے تمہارے لیے نہیں کھلیں گے کیونکہ ہم تمہیں یہاں سے رخصت کرتے

ہوئے یہ سوچ لیں گے کہ ہم بیٹی کی ڈولی نہیں جنازہ رخصت کر رہے ہیں۔" نجم الدین نے بیٹی کو فیصلہ سنانے کا کٹھن مرحلہ طے کیا اور فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گئے۔ کامیابی کی خوشی سے سرشار صباحت کو نہ تو باپ کا لٹا لٹا انداز نظر آیا اور نہ ہی ماں کی آنکھوں سے ٹپکنے والے خاموش آنسو۔ اس نے فوراً ہی سندر سے رابطہ کر کے اسے خوش خبری سنادی۔ اس کے بعد سندر کا فون نجم الدین کے پاس آیا۔

"میرے ساتھ میرا صرف ایک دوست آئے گا۔ آپ کے ہاں بھی میں زیادہ بھیڑ بھاڑ دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ بس سادگی سے نکاح کے بعد رخصتی کر دی جائے۔" اس نے نجم الدین سے مطالبہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔" نجم الدین نے اس سے بحث نہیں کی۔ ان کے لیے کون سا وہ خوشی کا موقع تھا کہ وہ لوگوں کو جمع کرتے۔ "اور تمہارا قبولِ اسلام......؟" یہ بات بہرحال ان کے لیے اہم تھی۔

"نکاح سے پہلے یہ کام بھی ہو جائے گا لیکن میں فی الحال اسے پبلک میں اناؤنس نہیں کر سکوں گا۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ نجم الدین پہلے ہی ہار چکے تھے اس لیے اس سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے دن ظہر سے قبل سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق انجام پا گیا۔ گھر میں موجود افراد کے علاوہ محض بڑے ماموں کو اس نکاح میں مدعو کیا گیا تھا۔ عجیب شادی تھی جس میں نہ تو دلہن کا ہار سنگار کیا گیا تھا، نہ اسے وہ وی آئی پی پروٹوکول مل رہا تھا جو گھر سے رخصت ہونے والی بیٹی کو دیا جاتا ہے۔ بزرگ خواتین ناراض تھیں تو راحت اور نایاب کچھ کچھ خوف زدہ اور متجسس۔ خوف اپنے بزرگوں کے بگڑے مزاجوں کی وجہ سے تھا تو تجسس سندر کپور جیسی مشہور ہستی سے صباحت کے تعلق پر۔ وہ حیران تھیں کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا البتہ اتنا اندازہ ضرور لگا لیا کہ کہانی جب سے ہی شروع ہوئی ہو گی جب صبا شکیل کے ساتھ کنسرٹ میں شرکت کے لیے گئی تھی۔ شاپنگ سینٹر سے اس کے غائب ہو جانے کا قصہ بھی اب سب کو سمجھ آ گیا تھا لیکن کسی بات کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سچ یہ تھا کہ صبا سب کی دلی رضامندی کے بغیر ہمیشہ کے لیے سندر کپور کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی۔ شکیل اس موقع پر گھر میں نہیں رکا تھا۔ وہ سب سے زیادہ خفا تھا لیکن بزرگوں نے اسے احتجاج کی اجازت نہیں دی تھی چنانچہ وہ خاموش احتجاج کرتے ہوئے منظر سے غائب ہو گیا تھا۔ جادو کی دنیا کے سفر پر روانہ ہوتی صبا کو کسی بھی بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ ایسی بدنصیب تھی کہ وقتِ رخصت جس کے سر پر نہ تو باپ کا ہاتھ تھا نہ ماں نے سینے سے بھینچ کر وداع کیا تھا۔ اس نے ہر رشتے کی محبت کو سندر کپور کا ہاتھ تھام کر فراموش کر دیا تھا۔

☆☆☆

"آریان کہاں ہے؟" بچے کی خالی کاٹ دیکھ کر اس نے گورنس سے دریافت کیا۔

"آئی ڈونٹ نو میڈم۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"کیا مطلب تم اس کی گورنس ہو تمہیں اس کے بارے میں معلوم نہیں ہو گا تو پھر کسے معلوم ہو گا۔" وہ زور سے چیخی جواب میں گورنس خاموش رہی۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔ میں نہانے گئی تھی تو وہ یہاں تھا اور اب نہیں ہے۔ دو مہینے کا بچہ اپنی مرضی سے تو کہیں نہیں جا سکتا۔" اسے لگ رہا تھا کہ گورنس کا دماغ چل گیا ہے یا وہ اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔

"میں نے کہا نا میڈم کہ میں کچھ نہیں جانتی۔" وہاں مرغی کی وہی ایک ٹانگ تھی۔

"تم بچے کو یہاں اکیلا چھوڑ کر کہیں باہر گئی تھیں کیا؟" اس کے پاس گورنس سے تحقیق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"نو میڈم۔" گورنس کے نفی میں دیے جواب نے اس کا سر گھما دیا۔

"باہر سے کوئی یہاں آیا تھا؟" اس نے دوسرا سوال کیا جس کے جواب میں گورنس نے ایک بار پھر خاموشی اختیار کی۔

"ودیا، اجے، سوامی...... یہاں آؤ۔" وہ بچے کے کمرے کے دروازے پر جا کر حلق کے بل دہاڑی لیکن کوئی اس کی پکار پر دوڑ کر نہیں آیا۔ وہ پاگل ہونے لگی۔ اس کا بچہ بیس منٹ کے اندر اندر اپنے ہی گھر سے غائب ہو گیا تھا اور گھر میں موجود نوکر اسے جواب نہیں دے رہے تھے۔

"کہاں مر گئے سارے کے سارے ایڈیٹس؟" وہ چلاتی ہوئی آگے بڑھی اسی وقت سندر ایک کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

"آریان آپ کے پاس ہے سندر؟" اس کی شکل دیکھتے ہی صبا نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم یہاں آؤ، میرے ساتھ۔" سندر اس کا بازو تھام کر اسے واپس کمرے میں لے گیا جہاں سے وہ نکلا تھا۔

"آریان یہاں تو نہیں ہے۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ہر طرف نظر دوڑائی اور بے قراری سے بولی۔

"وہ پورے گھر میں کہیں نہیں ہے۔" سندر نے اسے

اطلاع دی تو وہ بھونچکی رہ گئی۔ دو ماہ کا بچہ آخر گھر سے باہر کہیں کیسے جاسکتا ہے۔

"یہ سب کیا ہے سندر مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی ہے۔" اس نے اپنا سر تھام لیا۔ پریگنینسی کا سارا عرصہ اس نے تقریباً تنہا ہی گزارا تھا۔ سندر کبھی کبھی گھر آتا تھا اور کبھی فون پر بات ہوجاتی تھی۔ بچے کی ڈلیوری کے بعد بھی وہ صرف ایک بار اس سے ملنے آیا تھا۔ بچے کا نام بھی اس نے خود ہی رکھا تھا اور اب دو ماہ بعد وہ اس کی شکل دیکھ رہی تھی تو اس صورت میں کہ اس کا بچہ غائب تھا۔

"تمہیں یاد ہے ہنی تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم میرے لیے کچھ بھی کرسکتی ہو؟" اس کی الجھن دور کرنے کے بجائے سندر ایک الگ ہی موضوع نکال کر بیٹھ گیا تھا۔

"مجھے سب یاد ہے لیکن ابھی تو آپ آریان......" اس نے سندر کو ٹوکنے کی کوشش کی۔

"پہلے میری بات غور سے سنو۔" جواباً سندر نے سختی سے اسے ٹوکا تو وہ اس کی شکل دیکھنے لگی۔ "دو دن بعد میری فلم ریلیز ہونے والی ہے۔ مہتا نے مجھ سے پرامس کیا ہے کہ اگر میں اس کی ایک شرط پوری کردوں تو وہ اپنی اگلی فلم کے ہیرو کو کٹ کرکے مجھے اس کی جگہ لے گا لیکن اس کی شرط تمہارے تعاون کے بغیر پوری نہیں کی جاسکتی۔" سندر کی بات سن کر اس کے پورے وجود میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ مہتا نے کیا شرط رکھی ہوگی۔

"تم کیسے آدمی ہو سندر؟ مجھے تم سے گھن آرہی ہے۔" اس نے نفرت سے اس شخص کی طرف دیکھا جس کی محبت میں وہ کبھی اندھی ہوگئی تھی۔

"اگر تم آریان کو دوبارہ دیکھنا چاہتی ہو تو تمہیں یہ بات ماننی ہوگی۔ دوسری صورت میں نہ تو تم آریان کو دوبارہ کبھی دیکھ سکو گی اور نہ ہی تمہارے لیے اس گھر میں کوئی گنجائش رہے گی۔" سندر کو اس کی قلبی کیفیت سے کوئی غرض نہیں تھی۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے سندر، میں تمہاری بیوی ہوں۔ تم میری عزت کا سودا کیسے کرسکتے ہو؟" اس نے بے بسی سے التجا کی۔ نفرت کا اظہار کرنے کی پوزیشن میں وہ تھی بھی نہیں۔

"ہماری دنیا میں ہر چیز کا سودا ہوسکتا ہے۔" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا اور بولا۔ "تم فیصلہ کرلو کہ میری بات مانوگی یا آریان سمیت اس گھر اور مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور چلی جاؤگی؟"

"تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے؟" اس نے دہائی دی۔

"میں تو سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو پینسٹھ لڑکیوں سے محبت کرتا ہوں۔" وہ زور سے ہنسا۔

"لیکن میں تمہاری بیوی ہوں۔" اس نے یاددہانی کروائی۔

"صرف اس لیے کہ تمہارے حصول کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تمہارے حسن نے مجھے دیوانہ کردیا تھا اس لیے اس وقت جذبات میں آکر سب کچھ کر بیٹھا لیکن سچ یہ ہے کہ کسی ایک عورت پر گزارا کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ میری زندگی میں عورتیں آتی اور جاتی رہتی ہیں ہاں مجھے یہ اعتراف ہے کہ تم ان سب سے بڑھ کر حسین ہو اس لیے بھی میں نے تمہیں اپنے گھر میں ڈال لیا کہ ترقی کے زینے چڑھتے ہوئے تمہاری مدد ملتی رہے گی۔ تمہاری ٹریننگ کرکے تمہیں پالش کرنے میں، میں نے اتنا روپیہ ایسے ہی خرچ نہیں کیا ہے اور تمہاری جیسی لوئر مڈل کلاس کی عورت کو چاہیے بھی کیا۔ ڈھیر ساری عیاشیوں کے ساتھ سندر کپور کی پتنی ہونے کا اعزاز تمہارے لیے کم تو نہیں ہے۔" وہ تیر پر تیر چلا رہا تھا اور وہ اس کے گھٹیا پن کی انتہا دیکھ رہی تھی۔ محبت، قبولِ اسلام، شادی سب ایک ڈھونگ تھا اور وہ اس ڈھونگ کی وجہ سے ایسے جال میں پھنس گئی تھی جس سے آزاد ہونا اس کے بس میں نہیں تھا۔ واپسی کے سارے در اس کے لیے پہلے ہی بند تھے۔ عزت بچانے کے لیے ممتا کی قربانی دیتی بھی تو کہاں جاتی؟ باہر کی دنیا میں اس جیسی تنہا خوب صورت عورت کو شکار کرنے کے لیے سندر جیسے کئی شکاری گھوم رہے تھے۔

"میں جارہا ہوں، اگر تم خود کو راضی کرسکو تو مس شلپا کو بتادینا۔ وہ تمہیں تیار... کردے گی اور ٹھیک نو بجے گاڑی تمہیں لینے کے لیے پہنچ جائے گی۔ دوسری صورت میں رات نو بجے کے بعد تم اس گھر میں رکنے کی کوشش مت کرنا ورنہ میرے ملازم دھکے دے کر تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔" سفاک لہجے میں کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا اور وہ نڈھال سی بیٹھے بیٹھے وہیں لڑھک گئی۔ فیصلہ کیا کرتی سندر کی بات مان لینے کے سوا اس کے پاس کوئی آپشن تھا ہی نہیں یا پھر شاید اس میں جرأت کی کمی تھی۔ سندر کو جیت کر اس نے اپنے مقدر میں ہمیشہ کی شکست اور رسوائی لکھ لی تھی۔ اس رات کے بعد اس کی زندگی میں ایسی بے شمار راتیں آئیں جب وہ سج سنور کر کسی غیر مرد کے پہلو میں اس کی گاڑی میں بیٹھی۔ وہ جتنا جتنا اس دلدل میں دھنستی گئی، سندر کی کامیابی، شہرت اور دولت کا گراف اتنا ہی بلند ہوتا گیا۔ اس

نے بس اتنے پر قناعت کرلی تھی کہ اس کا بیٹا اس کے پاس ہے جسے وہ چاہنے کے باوجود کوئی واضح شناخت نہیں دے سکی تھی۔ سندر اپنے قبولِ اسلام سے صاف طور پر مکر گیا تھا اور وقت کے دھارے میں بہتی وہ خود بھی کچھ نہیں رہی تھی۔ نہ ہندو، نہ مسلمان۔ بالی وڈ کی دنیا میں ان جیسے کئی جوڑے تھے اس لیے ان کے میل ملاقات والوں میں سے کوئی اس حوالے سے سوال بھی نہیں کرتا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے لیے یہ موضوع بہت اہم بھی ہوگا اور تکلیف دہ بھی۔ ڈھیروں رسوائی کا سامنا کرتے ہوئے وہ آج بھی اس دن کا انتظار کرتے ہوں گے جب سندر اپنے قبولِ اسلام کا اعلان پبلک میں کرے گا لیکن افسوس کہ وہ دن کبھی نہیں آنا تھا۔

☆☆☆

"تم ان صاحب کو ملاقات کے لیے میرے پاس لے آؤ۔" کاغذ پر ایک نام اور پتا لکھ کر عاشر کے حوالے کرتے ہوئے اس نے بہت عرصے بعد اس سے کوئی فرمائش کی۔ عاشر سے اس کا تعلق عجیب تھا اتفاقیہ ہونے والی ملاقاتوں سے شروع ہونے والی دوستی وقت کے ساتھ اتنی گہری ہوگئی تھی کہ وہ اپنا ہر دکھ سکھ عاشر سے بیان کردیتی تھی۔ پورے دو سال سندر کے اشاروں پر ناچتے رہنے کے بعد جب اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بیمار سی رہنے لگی ہے تو عاشر کے مشورے پر ہی اپنا چیک اپ کروایا اور اس پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ مستقل شراب نوشی نے اس کے گردوں کو ہی ناکارہ نہیں کیا بلکہ وہ ایڈز جیسا مرض بھی لگا بیٹھی ہے۔ جو زندگی وہ گزار رہی تھی اس میں یہ کوئی انوکھی بات بھی نہیں تھی لیکن موت کو بالکل سامنے دیکھ کر سارے سمجھوتوں اور مصلحتوں کی دیوار یکدم ہی گر گئی تھی اور وہ آریان کو لے کر سندر کا گھر چھوڑنے کے بعد مسلسل اس فکر میں تھی کہ کسی طرح اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکے لیکن لگتا تھا اللہ بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جھنجلاہٹ اور ڈپریشن میں کبھی وہ دو سالہ آریان کو بھی تشدد کا نشانہ بنا بیٹھتی تھی لیکن پھر ممتا کے ہاتھوں مجبور ہوکر خوب پیار کرتی تھی۔ عاشر جو اس کی ذہنی کیفیت سے اچھی طرح واقف تھا ان مشکل حالات میں اس کا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ اب بھی اس نے اس کا دیا ہوا پرچہ لے کر خاموشی سے رکھ لیا۔ دو دن بعد عاشر کے اپارٹمنٹ میں شکیل اس کے روبرو تھا اور اس گھٹے ہوئے وجود کو بے نیازی سے دیکھ رہا تھا جس کی حسن و رعنائی نے کبھی اسے اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔

"مجھے یقین تھا شکیل بھائی کہ آپ میرا پیغام ملنے پر مجھ سے ملنے ضرور آئیں گے۔" بہت عرصے بعد اپنے کسی رشتے دار کو سامنے پاکر وہ تھوڑی سی جذباتی ہوگئی۔

"میں شاید نہ آتا لیکن عاشر انور صاحب نے مجھے مجبور کردیا۔" شکیل نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو اسے دکھ تو ضرور ہوا لیکن جانتی تھی کہ اس کے ماضی کے ہر رشتے کو اس سے یہ انداز اختیار کرنے کا حق ہے۔

"آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نے سندر سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔" اسے گفتگو تو بہرحال کرنی تھی۔

"ہاں، تم جیسی مشہور شخصیت کے بارے میں خبریں نہ چاہتے ہوئے بھی ہم تک پہنچ ہی جاتی ہیں۔" شکیل کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔

"میں بہت شدید بیمار ہوں شکیل بھائی، کسی بھی وقت میری زندگی ختم ہوسکتی ہے۔" اس کی آواز رندھ سی گئی۔ اپنی زبان سے کسی کو اپنے مرنے کی خبر دینا کبھی بھی آسان نہیں ہوتا۔ شکیل کے چہرے کے تاثرات میں بھی پہلی بار نرمی اتری۔

"سندر نے مجھے محبت کے نام پر دھوکا دیا۔ وہ کبھی مسلمان نہیں ہوا لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرا بیٹا ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارے۔ کیا آپ اسے اپنے ساتھ رکھ لیں گے شکیل بھائی؟" اس نے بہت آس سے پوچھا تو شکیل چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

"سوری صبا، یہ تو پہلے ہی طے ہوچکا تھا کہ ہماری زندگیوں میں تمہاری کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ میں تمہارے بیٹے کے لیے بھی گنجائش نہیں نکال سکوں گا۔ ڈیڑھ سال پہلے میری شادی ہوگئی تھی۔ ایک پانچ مہینے کی بیٹی ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ سندر کپور کے بیٹے کو رکھ کر اس کی پرورش کرنی چاہیے۔ خون کبھی نہ کبھی اپنا اثر دکھاتا ہے اور میں زندگی میں دوسری بار چوٹ کھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" اپنا فیصلہ سنا کر وہ یکدم ہی کھڑا ہوگیا۔

"خدا حافظ!" وہ باہر نکلنے کے لیے پلٹا۔

"شکیل بھائی......" صبا نے بے اختیار ہی اسے پکارا۔ وہ گردن موڑ کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"امی، ابو اور راحت......؟" برسوں بعد اس نے اپنے پیاروں کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش کی۔

"پھوپا جان تو تمہیں رخصت کرنے کے اگلے دن ہی دل بند ہوجانے کے باعث اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ پھوپو کو واثق اور راحت کے ساتھ تنہا پاکستان جانا پڑا۔ وہاں جاکر وہ مسلسل بیمار رہیں پھر ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ مرنے

سے پہلے انہوں نے ابو سے عہد لیا تھا کہ وہ راحت کو اپنی بہو بنا لیں گے۔ ابو اور پھپھو کی خواہش پر ہمارا نیٹ پر ہی نکاح ہو گیا تھا۔ پھپھو کے انتقال کے بعد میں پاکستان جا کر راحت کو یہاں لے آیا اور وہی میری بیٹی کی ماں ہے لیکن تمہیں یہ ساری خبریں کیسے ملتیں ہم کوئی تمہارے شوہر کی طرح مشہور و معروف تھوڑا ہی تھے۔'' شکیل جاتے جاتے اسے جتا گیا کہ اپنی دنیا میں مگن ہو کر اس نے کبھی اپنے پیاروں کی خبر نہیں لی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ جس نے کبھی سوچا تھا کہ ماں باپ کو کسی صورت منا ہی لے گی اپنے چہرے پر لگنے والی سیاہی کے ساتھ ان کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکی۔ شکیل کے جانے کے بعد وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ ایک طرف ماں باپ کے دنیا سے چلے جانے کا غم تھا تو دوسری طرف ایک ہی ملک میں رہنے والی بہن سے نہ مل سکنے کی کسک پھر وہ ان کا چہیتا اکلوتا بھائی واثق بھی تو تھا جو دنیا کے تھپیڑے کھانے کے لیے اکیلا رہ گیا تھا حالانکہ ابھی اسے ماں باپ کے سائے اور رہنمائی کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے بہن بھائی سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کرتی تو وہ اس کو نفرت سے دھتکار دیتے کہ انہیں ماں باپ کے سائے سے محروم کرنے کی قصوروار وہی تو تھی۔

''بس کرو صبا، رونے سے کچھ بھی نہیں بدلے گا۔'' آریان کو گود میں لیے عاشر اس کے سامنے آ بیٹھا۔

''میں کیا کروں عاشر، اس بچے کی وجہ سے میں سکون سے مر بھی نہیں سکتی۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ میرے گناہوں کا تسلسل بن کر چلے۔ میں اسے سندر کپور کا بیٹا نہیں عام سا مسلمان بن کر جیتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں جتنے نقصان اٹھا چکی ہوں ان کے مداوے کی میرے پاس کوئی صورت نہیں ہے لیکن آریان...... آریان کو تباہ ہوتا نہیں دیکھنا چاہتی۔'' اس کے لہجے میں زمانے بھر کا کرب تھا۔

''ایک بات پوچھوں صبا......؟'' عاشر نے آہستہ سے اس سے دریافت کیا تو وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''تم نے مجھے کیسا انسان پایا ہے؟''

''سندر سے شادی کے بعد میں نے ایک تم ہی کو تو انسان پایا ہے عاشر ورنہ باقی تو یہاں انسان کے روپ میں بھیڑیے ہیں۔'' اس نے پوری سچائی سے جواب دیا۔

''تمہارے خیال میں، میں مسلمان کیسا ہوں؟'' عاشر نے دوسرا سوال کیا۔

''مناسب ہی لگتے ہو۔ تمہاری عبادات وغیرہ کا مجھے علم نہیں لیکن میں نے تمہیں کبھی شراب نوشی کرتے یا عورتوں کے چکر میں پڑتے نہیں دیکھا۔'' اس کے سوالات کا مقصد نہ سمجھنے کے باوجود وہ پوری دیانت داری سے جواب دے رہی تھی۔

''کیا تین سال کے اس عرصے میں تم نے کبھی محسوس کیا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بہت شدید محبت؟'' عاشر کا یہ سوال اس کے لیے انکشاف کا درجہ رکھتا تھا کیونکہ ہر موقع پر اسے سہارا دینے کے باوجود عاشر نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس سے وہ یہ گمان کرتی کہ وہ اس کی محبت میں مبتلا ہے۔ وہ تو بس یہی سمجھتی تھی کہ وہ دوستی نبھانے والا آدمی ہے اور اس کے ساتھ بھی دوستی ہی نبھا رہا ہے۔ عاشر نے تو کبھی اس کا ہاتھ تک نہیں تھاما تھا۔

''اتنی حیران کیوں ہو؟'' وہ ذرا سا مسکرایا۔

''یقین نہیں آ رہا کہ تم جیسا آدمی بھی مجھ سے محبت کر سکتا ہے۔ میں تو بہت پستیوں میں گری ہوئی عورت ہوں۔'' آج کل اس پر ہر وقت خود ملامتی کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔

''تم کیسی ہو اور کیسی نہیں، میں اس پر تبصرہ نہیں کر سکتا لیکن ایک بات جانتا ہوں کہ محبت کسی انسان کے اختیار کا معاملہ نہیں۔ اللہ نے میرے دل میں تمہاری محبت ڈالی اور میں نے اس محبت کو تسلیم کر لیا لیکن اس محبت نے مجھے یہ حق نہیں دیا تھا کہ میں تمہاری زندگی کے فیصلے کرتا چنانچہ میں نے خود کو ایک دلاسا دینے والا دوست بنا لیا۔ تم یہ شکوہ تو نہیں کرو گی نا کہ ایک دوست کی حیثیت سے میں بھی ناکام رہا؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔ تم نے تو مجھے میری اوقات سے بڑھ کر عزت دی۔'' وہ ایک بار پھر رو پڑی تو عاشر کی گود میں موجود اس کا بیٹا بھی اسے دیکھ کر رونے لگا۔

''پلیز تم اس طرح رو کر اس معصوم کو تو مت رلاؤ نا۔'' بچے کو شانے سے لگا کر بہلانے کی کوشش کرتے ہوئے عاشر نے اس سے التجا کی تو اس نے تھوڑی سی کوشش سے خود کو سنبھال لیا۔ اس دوران عاشر بچے کو بھی بہلا چکا تھا اور اپنی جیب سے ایک چاکلیٹ نکال کر اسے تھما دی تھی۔ مزے سے چاکلیٹ کھاتے ہوئے بچے کو احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی ماں اور وہ خود کس امتحان سے دوچار ہے۔

''ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب میں ایک برا آدمی نہیں ہوں اور مسلمان بھی مناسب ہی ہوں تو کیا تم اپنے بیٹے کے سلسلے میں مجھ پر بھروسا نہیں کر سکتیں۔ یہ تمہارے وجود کا حصہ ہے اور میں ساری زندگی اسے بہت احتیاط سے سنبھالوں گا۔'' عاشر کی بات نے اسے گنگ کر دیا۔ ایک

طرف اس کا ماموں زاد شکیل تھا جو اس کے بیٹے کو صرف اس لیے رد کر گیا تھا کہ اس کی رگوں میں سندر کپور کا خون دوڑتا ہے اور یہ عاشر انور تھا کہ اس کے بیٹے کو اس لیے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے وجود کا حصہ تھا۔ اس سے محبت کے دونوں دعوے دار تھے لیکن دونوں کا طرز عمل ایک دوسرے سے کتنا مختلف تھا۔

''میرا بیٹا تمہارے ساتھ رہے اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی کیا بات ہو گی لیکن شاید سندر کپور ایسا نہ ہونے دے۔ اس کے سامنے تمہاری قانونی حیثیت بہت کمزور ہے۔ وہ آسانی سے آریان کو تم سے چھین لے گا۔'' وہ خوف زدہ تھی۔

''سندر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس وقت وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔'' عاشر نے اسے اطلاع دی تو وہ چونک گئی۔ اس کے عاشر کے اپارٹمنٹ شفٹ ہو جانے کے دو دن بعد ہی سندر کا بہت شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس ایکسیڈنٹ میں اس کی زندگی تو بچ گئی تھی لیکن وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو کر بستر کا ہو رہا۔ اس موقع پر میڈیا نے بہت خبریں دیں۔ اکثر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سندر کپور کی حسین پتنی نے برے دنوں میں شوہر کا ساتھ دینا قبول نہیں کیا اور چپکے سے اسے چھوڑ گئی۔ اسے خود پر لگنے والے ان الزامات کی پروا نہیں تھی۔ وہ مطمئن تھی تو اس بات پر کہ کوئی اس کا کھوج نہیں لگا سکا تھا اور سندر بھی اس لائق نہیں رہا تھا کہ اسے کوئی زک پہنچا سکے بلکہ شاید معذوری اور بے بسی کی زندگی نے اسے اپنے گناہوں کا احساس دلا دیا تھا۔ جب ہی اس نے ایک بار میڈیا پر یہ پیغام دیا تھا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ خود ٹیلی وژن نہیں دیکھتی تھی لیکن عاشر نے اس تک سندر کا یہ پیغام پہنچا دیا تھا لیکن وہ پھر بھی اس سے ملنے پر آمادہ نہیں ہوئی تھی اور آج پھر عاشر اسے اطلاع دے رہا تھا کہ سندر کپور موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

''سندر نے سوسائڈ کر لی ہے۔ وہ معذوری کی زندگی سے تنگ آ گیا تھا چنانچہ آج اس نے اپنے سرہانے رکھی پھل کاٹنے والی چھری سے اپنی دونوں کلائیوں کی رگیں کاٹ لیں۔ ملازم نے جب دیکھا تو اس کا بہت زیادہ خون بہہ چکا تھا۔ ڈاکٹرز کوشش کر رہے ہیں لیکن انہوں نے امید نہیں دلائی ہے۔ تمہارے کزن شکیل صاحب بھی ان خبروں سے واقف تھے لیکن میں نے انہیں کچھ بھی تمہیں بتانے سے منع کیا تھا۔ میرے پاس ایک اندر کی خبر بھی ہے۔ سندر نے کل ہی اپنے وکیل کو اپنی وِل لکھوائی تھی جس میں اپنی تمام دولت کا حق دار تمہیں اور آریان کو ٹھہرایا ہے۔ میں نے شکیل کو یہ بات نہیں بتائی تھی کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ تم اسے کس مقصد کے لیے یہاں بلا رہی ہو اور میری خواہش تھی کہ دولت کی چمک دمک کے بجائے وہ صرف تمہاری محبت کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرے۔'' آج اس کے لیے انکشافات کا دن تھا۔ ''تمہیں یہ شک تو نہیں ہے کہ میں نے تم سے محبت کا اظہار اور آریان کی حوالگی کا مطالبہ اس وِل کے سامنے آنے کے بعد کیا ہے؟'' یکدم ہی عاشر نے اس سے پوچھا تو اس نے زور سے نفی میں گردن ہلائی۔ وہ جانتی تھی کہ شوق کی خاطر گلے میں کیمرا لگائے دنیا بھر میں آوارہ گردی کرنے والا عاشر خود مالی طور پر بہت مستحکم ہے۔

''شکریہ تم نے میرا اعتبار کیا۔'' اس کے جواب پر عاشر مسکرایا۔

''تم کسی اچھے وکیل کو میرے پاس لے آنا عاشر۔ انجام تو میرا ابھی قریب ہے۔ وصیت مجھے بھی تیار کروا دینی چاہیے۔'' اس کے اس اچانک مطالبے پر عاشر نے شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی نگاہوں کے شکوے کے بجائے یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ عاشر کی گود میں بیٹھے ہوئے اس کے بیٹے نے چاکلیٹ سے اس کی صاف ستھری قیمتی شرٹ پر چاکلیٹ کے بے شمار دھبے لگا دیے تھے اور اسے پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

پانچ سالہ آریان کے ساتھ عاشر انور ایک قبر کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ آریان نے اپنے ہاتھوں میں تنکوں کی ایک ٹوکری تھام رکھی تھی جس میں پھولوں کی پتیاں تھیں۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس نے پتیاں پوری قبر پر پھیلا دیں۔ عاشر خاموشی سے کھڑا اسے یہ عمل کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آریان جب ٹوکری میں موجود تمام پتیاں قبر پر پھیلا چکا تو اس نے ٹوکری ایک طرف رکھ دی اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے اس بار عاشر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

''پیارے اللہ تعالیٰ میری مما کو معاف کر دیں اور انہیں اپنی جنت میں رہنے کی جگہ دے دیں۔'' بلند آواز میں دعا مانگتے آریان کی موہنی آواز عاشر کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ یہ دعا اسے خود صباحت نے سکھائی تھی اور عاشر سے درخواست کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ آریان سے یہ دعا کرواتا رہے کہ سنا ہے معصوموں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ آریان اتنا چھوٹا تھا کہ ڈھنگ سے گناہ کا ادراک بھی نہیں رکھتا تھا لیکن ہر ہفتے پابندی سے ماں کی قبر

پر آ کر یہ دعا ضرور مانگتا تھا۔ اس سلسلے کو جاری و ساری رکھنے میں یقیناً عاشر انور کا بہت اہم کردار تھا جس نے صباحت عرف صبا سے بالکل بے لوث اور سچی محبت کی تھی اور اب بھی آریان کو بھرپور محبت اور توجہ دے کر اس محبت کا حق ادا کر رہا تھا اس نے شادی نہیں کی تھی اور خود کو صرف اور صرف آریان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آریان اسے پاپا کہا کرتا تھا لیکن یہ طے تھا کہ جب آریان باشعور ہو جاتا تو وہ اسے اس کے اصل باپ کے بارے میں بتا دیتا۔ سچائی بتانے کے لیے اسے سب کچھ تفصیل سے بتانا ضروری نہیں تھا بس اتنا بتانا کافی ہوتا کہ اس کی ماں نے سندر کپور سے پسند کی شادی کی تھی لیکن سندر کپور اسلام پر قائم پر نہ رہ سکا اس لیے یہ شادی ختم ہو گئی اور بعد میں سندر کی ایک حادثے میں موت کے بعد اس کی مرتی ہوئی ماں نے اسے عاشر کے حوالے کر دیا۔ صباحت کے زندگی کے اہم موڑ پر کمزور ثابت ہونے کے باوجود وہ اسے اس کے بیٹے کی نظروں میں پست نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بیٹے کی نظر میں اس کی ماں کا کردار ہمیشہ بلند ہی رہنا چاہیے تا کہ وہ خود سر اٹھا کر جی سکے۔

اپنی عمر کے آخری حصے میں صباحت جس طرح گڑگڑا کر اپنے رب کے حضور معافی مانگتی رہی تھی اس سے عاشر کو یقین ہو گیا تھا کہ رب العزت مرنے کے بعد کم از کم اسے رسوا نہیں کرے گا اور وہ اپنے بیٹے کی نظروں میں معتبر ہی رہے گی۔ اس اعتبار کو قائم کرنے کے لیے وہ فلاحی ادارہ بہت مددگار ثابت ہوتا جس کی بنیاد صباحت مرنے سے پہلے رکھ گئی تھی۔ سندر کپور کی دولت کا اس سے بہتر مصرف کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس ادارے کے تحت بلا نسل، رنگ اور مذہب کے امتیاز کے دکھی انسانیت کی خدمت کی جاتی تھی۔ فی الحال عاشر خود کچھ معاونین کی مدد سے اس ادارے کا انتظام دیکھتا تھا۔ بڑے ہونے کے بعد آریان نے اس کی ذمے داری سنبھالنی تھی۔ عاشر کی پوری کوشش تھی کہ آریان کو صباحت کی خواہش کے مطابق ایک ایسا اچھا مسلمان بنائے جو اپنی دینی اقدار کے ساتھ ساتھ جدید دور کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہو۔ اصل میں اسلام تو ہے ہی دنیا کا سب سے جدید مذہب جہاں اخلاقیات اور علم و ہنر کی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے بھی جینے کے حق کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ آریان کی ایسی تربیت کرنے کے لیے عاشر کو سخت محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ اپنے تمام مشاغل چھوڑ کر وہ سنجیدگی سے کاروبار سنبھال چکا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اپنے علم میں بھی اضافہ کرتا رہے۔ اس طرح نہ صرف اسے آریان کی تربیت کرنے میں مدد مل رہی تھی بلکہ خود اس میں بھی کئی مثبت تبدیلیاں آتی جا رہی تھیں اور اپنی فطری اچھائی کے باوجود پہلے وہ جن معاملات میں بے پروائی برت جاتا تھا اب ان پر توجہ دینے لگا تھا۔ آریان شہر کے ایک بہترین اسکول میں پڑھتا تھا اور گھر پر بھی اس کی تعلیم و تربیت کے لیے... معلم اور ٹیوٹر باقاعدگی سے آتے تھے۔ وہ بہت ذہین اور ایکٹیو بچہ تھا جو ہر سیکھی ہوئی بات کو دھیان سے یاد رکھتا تھا۔ عاشر کو اس کے ساتھ وقت گزار کر دلی اور روحانی خوشی ملتی تھی جس کی وجہ سے اس نے کبھی اپنی زندگی میں کوئی ادھورا پن محسوس نہیں کیا تھا۔

”پاپا گھر چلیں۔“ آریان کی آواز اسے سوچوں سے باہر نکال لائی۔ وہ دعا ختم کر چکا تھا اور اب اسے ہاتھ ہلا کر متوجہ کر رہا تھا۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ صباحت کی قبر پر کھڑا ہو کر یادوں اور خیالوں میں کھو جاتا پھر آریان ہی اسے ہوش میں لاتا تھا۔

”ہاں چلو چلتے ہیں۔“ اس نے صباحت کی قبر پر ایک آخری نظر ڈالی۔ قبر پر لگے سنگ مرمر کے کتبے نے ہمیشہ کی طرح اس کی توجہ اپنی طرف کھینچی اور ہمیشہ کی طرح خوشی اور غم کا ایک ملا جلا سا تاثر اس کے دل میں ابھرا۔ کتبے پر لکھا تھا۔

صباحت عاشر
زوجہ عاشر انور
عمر 26 سال

ہاں صرف چھبیس سال کی عمر میں دنیا کو خیرباد کہہ دینے والی صباحت نے اس سے آخری خواہش یہی کی تھی۔

”مجھ سے نکاح کر لو عاشر۔ میں نہیں چاہتی کہ جب میں مروں تو میری قبر کے کتبے پر میرے نام کے ساتھ سندر کا نام لکھا ہو۔ اپنے نام کے ساتھ لگا اس کا نام ایک داغ ندامت ہے جو قبر میں بھی مجھے بے چین رکھے گا۔“ عاشر نے اس کی یہ خواہش پوری کر دی تھی۔ اس کے لیے تو خود یہ خوشی کی بات تھی کہ دنیا سے جاتے جاتے صباحت اپنا آپ اس کے نام لکھ گئی تھی اور وہ امید کرتا تھا کہ اگر اپنے رب کے حضور بخشش کا حق دار ٹھہرا تو وہاں اپنے لیے صباحت کو مانگ لے گا کیونکہ وہ روز حشر زوجہ عاشر انور کی حیثیت سے ہی اٹھائی جائے گی اور ایک شوہر کو یہ حق تو حاصل ہونا چاہیے تھا کہ نام کی حد تک دنیا میں ملنے والی بیوی کو دائمی زندگی میں پوری طرح اپنا سکے۔